

اسلامی نظریہ حصایت



JOIN ME FOR EASY ACCESS TO EBOOKS & NOTES



+92-310-545-450-3



Css Aspirants ebooks & Notes

<https://m.facebook.com/groups/458184410965870>



Css Aspirants Forum

<http://t.me/CssAspirantsForum>

Rules of the group.

*No irrelevant text/pic Islamic pic/videos

*No Smiley No Pm otherwise Removed + Blocked

*Personal text w/o Mutual consent Consider harassment.

Separate Group For Females with verification

The CSS Group does not hold any rights on shared the Books & Notes

I,m not Responsible for Copyrights.

This book/notes downloaded from the internet.

شعبۂ تصویف و تالیف و ترجمۂ

کراچی یونیورسٹی، کراچی

جاگہ ملک



اسلامی نظریہ حیات

مولفہ

خورشید احمد

صدر نشین

انٹی ٹوٹ آف پالیسی اسٹیڈیز

حکومت پاکستان

سابق نائب صدر نشین، نصوبہ بندی کیشن۔ ناظم اعلیٰ اسلامک فاؤنڈیشن لندن

سابق استاذ شعبہ معاشریات، کراچی یونیورسٹی

شعبہ اسلام تصنیف و تالیف و ترجمہ

کراچی یونیورسٹی، کراچی

حروفِ آغاز

کراحتی یونیورسٹی کی ذمہ داریاں سنہالنے کرے بعد سے میری یہ کوشش رہی ہے کہ یہاں علمی اور تحقیقی کام کی رفتار سز ہو جائے اور یونیورسٹی میں حقیقاً علمی ماحول پیدا ہو جائے جس کے بغیر کوئی یونیورسٹی صحیح معنوں میں یونیورسٹی کھلانے کی مسحت حق نہیں ہوئی ۔ حنادہ حبہان مختلف شعبوں اور اداروں میں تحقیقی اور علمی کام کے لیے بہتر وسائل مہیا کرنے کی کوشش کی گئی ، وہ ۔۔۔ ان اکتساب اور تحقیقی نتائج کی اساعت پر بھی توجہ ہوئی گئی ۔ ساتھ ہی ساتھ شعبہٗ تصنیف و تالیف و ترجمہ کو دوبارہ فعل ملایا گیا اور اس کے اساعتوں پروگرام کو تیز تر کیا گیا ۔

۔۔۔ زیر نظر کتاب کا یہ نیا ایڈیشن اسی تیز رفتار اشاعتی پروگرام کے تحت ساعت ہوا ہے ۔ یہ کتاب غرضہ سے طبعہ ، اسازدہ ، محققین اور عام فارئین میں مقبول رہی ہے اور وطن عزیز میں اسلامی شخص بیدار کرنے اور اسلامی اقدار کے تحفظ اور آبیانی میں اس کتاب کا بڑا حصہ ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ شعبہٗ تصنیف و تالیف و ترجمہ کسی یہ کوشش ملک میں اسلامی تہذیب و تفافت کی مزید ترویج و ترقی میں ہمیشہ کی طرح اپنا کردار ادا کرے گی ۔

حمدیل جالبی

(ڈاکٹر حمدیل جالبی)

شیخ الجامعہ

لذتِ پیغمبر، لذتِ ایمان

(اشاعت اول)

پاکستان کا قیام اس لئے ممکن ہوا کہ مسلمان یہ جاہتے تھے کہ وہ آزاد رہ کر اپنے دین اور اپنی ثقافت کو، جس کی نشاد اسلام برداشت ہے، زندگی رکھ سکیں۔ لیکن افسوس کہ قیام پاکستان کے بعد ملت و حکومت دنیوی منام کے اکتساب میں ایسی مشغول ہو گئی کہ اصل مقصد انکھوں سے اوجھل ہونا جا رہا ہے۔ دین اور اسلامی ثقافت سے سرد مہری بڑھتے بڑھتے اب ایک ایسے مزن مرض کی صورت پہکڑ چکی ہے کہ اگر اس کا علاج جلد نہ کیا گا تو ملت کی بقا دیوار ہے؛ ایمان پاس رہے کا نہ ملک، اور حصول حکومت سے جو منافع ماذی خوشحالی و آسانی کی صورت میں بعض لوگوں کو حاصل ہوئے ہیں وہ تو جب آسا کچھہ دیر کے ہی مہماں ثابت ہوں گے۔ ملتون میں عزم اور زندگی کی خواہش ایمان سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر مقصد حیات ہی ضائع ہو جائے اور اس کی جگہ مال و دولت کی ہوس لئے تو پھر زندگی کے دن بھی لمبے نہیں ہوتے۔

ہماری درسگاہوں میں یہ روح فرسا منشار دیکھنے میں آتا ہے کہ ہمارے نوجوانوں کا ایمان متزلزل ہے جس کی وجہ سے نہ ان میں کردار کی بلندی باقی رہی ہے نہ صحیح ترق کا ولولہ۔ یہی نہیں کہ ان کے عمل سے اصلاح کی بو نہیں آئی بلکہ ان کے دل بھی اسلام کی محبت سے خالی ہوتے جاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ پاکستان سے محبت کا جذبہ بھی کمزور پڑ کیا ہے۔ انہیں اپنے والدین اور بزرگوں کی زندگی میں اسلام نظر نہیں آتا تو وہ اپنے آبائی دین کی عظمت کو کیسے سمجھیں؟ شماری درسگاہیں جسد بے جان ہیں جہاں نہ عالم ہے نہ کردار، نہ دین، نہ جذبہ، ان سے تعلیم پا کر نوجوان جوش و ولولہ کہاں سے لائیں؟ ان کے دل پر جب اغیار کی عظمت کے نقوش ثبت ہیں تو وہ اپنی کسی جیز پر فخر کیسے کریں؟ اگر ان کے کانوں میں مغربی تمذیب کے راگوں کے اڈا ہی ہڑتے ہیں تو وہ اپنی تمذیب میں کسی خوبی کا نشان کیسے پائیں گے؟ اور ثقافت اور دین کا چوں کہ گھرا تعلق ہے لمبذا ان کے دل اگر ارتداد کی طرف مائل ہوں تو امر میں حیرت کی کیا بات ہے؟

کوئی جامعہ اتنی تھوڑی سی مدت میں جب نوجوان اس کی عاطفت میں ہوتے ہیں نہ ان کے گپروں کے اور کو زائل کر سکتی ہے نہ ماحول سے لگئے ہوئے مرض کا علاج کر سکتی ہے۔ درآن حالے کہ اس میں خود مختلف مقامات پر ایسے افراد ہوتے ہیں جو دین سے اپنے بعد پر علائیہ فخر کرتے ہیں اور اس کے طلبہ کی جماعت میں خصوصیت سے اپنے نوجوان موجود ہوتے ہیں جو اسلام دشمن افراد کی وجہ سے دن رات اسلام کی پیغام کرنی کے کوئی ہی نہ ہوتے ہیں۔

ان مشکلات کا ہمیں احساس ہے۔ لیکن کیا ان کے سامنے ہم ہمارا ان کے سامنے ہم دخل نہیں ہونا چاہیے۔ استاذ اللہ کے سامنے مسئلول ہے، وہ مشکلات سے خوف زدہ ہو گر اپنے فرض کو ترک نہیں کر سکتا۔ ان لیے ہم نے ارادہ کیا ہے کہ ہم حتی القدر کوشش کرنے رہیں گے اور تائید ایزدی کے شعبہ اسلامیات السعی سنا والاتمام من اللہ۔ یہی سبب ہے کہ جاسعہ کراحتی نے شعبہ اسلامیات کو ترقی دی ہے اور مسلمان طلبہ کے لئے اسلامی تعلیم سال بند کے لئے لازمی قرار دی ہے۔ وسائل کی تنگی کے باوجود ہمارا ارادہ ہے کہ اس شعبہ کو ترقی دیں اور بہان سے اپنے عالم پیدا کریں جو عصر جدید کے تقاضوں اور اسلام کی تعلیم کو شل کرنے کی سعادت ہی سے بھرہ مند ہوں گے۔

ہم اپنے مسلم طلبہ کو بلا تفریق مذاہب اسلام کی تعلیم دینا چاہتے ہیں۔ ہم کسی مذہب کی فقہ انہیں نہیں پڑھاتے، ہم کوئی مختلف فیہ بات انہیں نہیں بناتے، ہم انہیں قریب لانا چاہتے ہیں، ان میں بعد نہیں کرنا چاہتے۔ ہمارے استاذ میں مختلف اسلامی عقاید کے افراد موجود ہیں۔ ہم اسلام کی عظمت کا درس دینا چاہتے ہیں، ہم طلبہ کے دل میں اسلام سے محبت کی آئی سکنا چاہتے ہیں، ہم ان کی شمع ایمان کو فروزان کرنا چاہتے ہیں، فروعی مسائل و خود اپنی مستند کتابوں سے سیکھو لیں گے۔

(۲)

اسی مقصد کے پیش نظر یہ کتاب مرتب کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ مؤلف کی اس کوشش کو قبول فرمائے اور اسے سعادت تائیر عطا فرمائے۔ یہ کتاب اگرچہ اس جامعہ کے طلبہ کے لیے لکھی گئی ہے لیکن ہمیں امید ہے کہ اسے دوسری درسگاہیں بھی مفید ہائیں گی اور عام بڑھے لکھے مسلمان بھی اس سے مستفید ہو سکیں گے۔

یہ پیش لفظ مخصوص میرے خیالات کا آئینہ دار نہیں ہے بلکہ میرے متعدد رفاقت کار کے خیالات کو پیش کرتا ہے جن کی اعانت کے بغیر کوئی اصلاحی تحریک بروئے کار نہیں آ سکتی۔ اس میں میرا اپنا حصہ بہت تھوڑا ہے اس لیے اس آخری حصہ کے علاوہ میں نے صیغہ "واحد متکلم استعمال نہیں کیا۔" فاریں سے درخواست ہے کہ اس مقصد کی کامیابی کے لیے جس کے پیش نظر یہ کتاب مرتب کی گئی ہے دعا فرمائیں۔

اشتیاق حسین قریشی

شیخ الجامعہ

جامعہ کراچی

۲۲ رمضان المبارک ۱۴۸۲ھ

دیباچہ طبع صورت

اسلامی نظریہ حیات کا تیسرا ایڈیشن آپ کے ہاتھوں میں ہے ۔ اس کتاب کو اللہ تعالیٰ نے جو قبولِ عام عطا فرمایا ہے اس کے لیے ہمارا سر اس کے حضور میں سجدہ ریز ہے ۔ یہ صرف آس کا فضل تھا کہ بہ کتاب تیار ہوئی اور بہ صرف آسی کا کرم ہے کہ اس نے ہمارے نوجوانوں کی دینی تعلیم و تربیت میں ایک حقیر سا حصہ ادا کیا ۔ گذشتہ دس سال میں مختلف علمی حلقوں میں اس کتاب کی جس طرح پذیرائی ہوئی ہے اس کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس وقت اردو ادب میں ایک خاص علمی مطبع ہر اسلام کے جامع اور ہمہ ہبھلو تعارف اور اس کی بنیادی تعلیمات کے مجموعے کی حیثیت سے اس کتاب کو ایک منفرد مقام حاصل ہے ۔ یہ کتاب صرف پاکستان کی جامعات ہی میں استعمال نہیں ہو رہی بلکہ ہورے پڑھے لکھے طبقے کے دلوں میں اس نے اونے لیے جگہ بنالی ہے ۔ اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس کتاب میں اسلام کے ہدیغام کو اس شکل میں پھیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جیسا کہ وہ ہے ۔ نیز مدافعانہ یا مذرت خواہانہ انداز کے مقابلے میں اعتماد اور ایقان کے ساتھ داعیانہ انداز میں حق کی تعلیمات کو پھیش کیا گیا ہے اور ہوری کوشش کی گئی ہے کہ اعتدال اور توازن کا دامن کہیں ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے ۔

اسلام ان ابدی صداقتوں کے مجموعے کا نام ہے جنہیں زمین و آسمان کے مالک نے انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنا کے ذریعے سے بیان فرمایا ہے اور جن کو اپنی مکمل ترین شکل میں آخری ہیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول اور اپنے عمل کے ذریعے سے انسانیت کو تفویض فرمایا ۔ یہ وہ صداقتیں

(۵)

ہیں جن ہر کبھی کہنگ اور فرسودگی کا سایہ نہیں پڑ سکتا، جو ہر دور اور ہر زمانے کے لئے مساوی طور پر سچی ہیں اور جن میں مرور زمانہ سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ کسی انسان کے ذہن کی پیداوار نہیں ہیں جو زمان و مکان کی دلیل کے لئے زنجیر پا بن سکیں۔ آن کو جس خالق حقیقی نے بیان کیا ہے اس کے لئے ماضی، حال اور مستقبل یکسان ہیں اور اسے زمان و مکان کی کوئی مجبوری لاحق نہیں۔ جس طرح سورج "ہرانا" ہونے کے باوجود ہر صبح نو کے دامن کو نئی روشنی سے بھر دیتا ہے اسی طرح اسلام کی تعلیمات بھی تہذیب کی ہر گردش اور تاریخ کی ہر پیش قدیمی کے لئے تازہ ہیام کی علم بردار ہیں۔ البتہ ہر دور اور ہر زمانے میں جو ضرورت ابھری ہے وہ یہ ہے کہ ان ابدی صداقتیوں اور ان کے تقاضوں کو اس زبان میں بیان کیا جائے جو اس دور میں معروف اور جس کے ذریعہ اس دور کا ذہن ان کو ہو ری طرح سمجھ سکے اور انہیں اپنی گرفت میں لے کر نئی زندگی کی تعمیر و تشکیل کا کام انجام دے سکے۔ اس ضرورت کے پیش نظر ہر دور میں مسلمانوں کے نقطہ اہل علم نے اسلامی تعلیمات کو اسی دور کی زبان میں پیش کیا ہے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے اس پہلو سے اردو کا دامن بڑا مالا مال ہے۔ عربی کے بعد اسلامی علوم کا سب سے بڑا ذخیرہ مساعی کے سلسلے میں اردو زبان میں اس دور کا بہترین دینی ادب وجود میں آیا ہے یہ ادب اسلام کی نعم اور عہد افریمیں قوت کا مظہر اور نشان ہے۔ یہ دعویٰ کہ اسلام زندگی کے تمام سائل کو بہ حسن و خوبی حل کرتا ہے اور دنیا کا کوئی نظام یا نظریہ حیات اس پہلو سے اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتا مخفی ایک جذباتی دعویٰ نہیں ہے۔ ہر وہ شخص جو اسلام کا سلطان ہے بغیر کسی تعصّب کے کرے کا شہادت میں موجود ہے۔ البتہ اس بات کی ضرورت ایک عرصے سے محسوس کی جارہی تھی کہ کوئی ایسی کتاب موجود ہو جس میں اختصار مگر جامعیت کے ساتھ اسلامی تغیریہ حیات کی فکری بنیادوں اور زندگی کے تمام شعبوں کے لئے اس کا عملی ہرو گرام پیش کیا گیا ہو۔ ایک عام طالب علم کے لئے ان موضوعات پر لکھی ہوئی ان بے شمار سیتاں سے جو ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں استفادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر جامعہ کراچی میں ڈگری کلاسون میں اسلامیات کے مضمون کے اضافے نے اس ضرورت کو اور بھی شدید کر دیا۔ اس شدید ضرورت کے پیش نظر

(ک)

محترم ڈاکٹر اشٹیاق حبیب فربتے صاحب شیخ الجامعہ کراچی یونیورسٹی کے ارشاد
ہر میں نے بہ کتاب مرتب کمرے کی کوشش کی اس کتاب میں جس امر کی کوئی
کی گئی ہے وہ ہے کہ ہمارے دور کے حالات وسائل کی روشنی میں اسلام کو
ہیش کرنے کی جو بہترین کوششیں ہوئی دین ان کا عطر اور جوہر پیش کر دیا
جائے تاکہ نوجوانوں کے دل و دماغ اسلام کی حقانیت اور اس کے ہدفam کی صفات
اور اعتماد اور یقین کی دولت مالا مال ہو سکیں اور ان کو وہ علم و بصیرت شامل
ہو سکے جس کے ذریعے وہ اسلام کے بہتر نمونے بن سکیں۔ اس منصب کے حصول کے
لئے زیر نظر کتاب میں اسلامی نظریہ حیات کے تمام اہم پہلوؤں کو اختصار کے
ساتھ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ قاری کے ذہن میں اسلام کے بورے نظام انکرو
عمل کا ایک واضح نقشہ مرتب ہو جائے اور اسلام کے تقاضوں کا شعور بھی
اس میں پیدا ہو جائے۔ اس کتاب کے اصل مخاطب مسلمان نوجوان ہیں اور
ہماری مخلصانہ کوشش ہے کہ ایک طرف وہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کو اچھی
طرح سمجھ لیں اور ان دلائل سے ہمیں روشناس ہو جائیں جو ان تعلیمات کی حقانیت
کو ثابت کریں ہیں۔ اور دوسری طرف جس دین کے وہ پیرو ہیں اور جسے وہ
اپنی عزیز توبین متابع سمجھتے ہیں اس کے داعی اور مبلغ بن کر انہیں اور ساری
دنیا میں اس کا ہدفam پہنچا دین تاکہ خدا کی زمین پر اسلام کی برکتوں سے
معمور ہو جائے۔

اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہمیں حصے میں ان
سائل پر بحث کی گئی ہے جو دور جدید کی فکری اور علمی تجزیکات نے پیدا
کیے ہیں اور جن کا سطحی مطالعہ ہمارے تجھے نوجوانوں کے ذہن میں مذہب کے
خلاف ایک رد عمل پیدا کرتا ہے۔ امن حصے میں غلط نظریات کا ابطال کیا
گیا ہے اور مذہب کی ضرورت اور زندگی میں اس کے اصل مقام پر روشنی ڈال
گئی ہے۔ دوسرے حصے میں مثبت طور پر اسلام کی فکری بنیادوں اور اس کے
اساسی عقائد سے بحث کی گئی ہے اور اسلام کے تصور حیات کو واضح کیا
گیا ہے اور تیسرا حصہ میں اسلامی نظام زندگی کا ایک واضح نقشہ پیش
کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلام کسی قسم کا انسان اور کس نوعیت کا
معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ آخری باب میں اسلام کے تناظر کو اختصار کے
ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

(ل)

..... رجہ بالا تمام ابواب کو ان حضرات کی تحریروں سے مرتب کیا گیا ہے جو دور حاضر میں اسلام کے بہترین ترجمان ہیں۔ کتاب کی ذیخامت کو مناسب حدود میں رکھنے کے لئے ہمیں اخذ و تلغیص اور ترتیب نوک راستہ اختیار کرونا پڑا ہے تاکہ کم سے کم جگہ میں زیادہ مواد پیش کیا جاسکے۔ ایکنہم نے پوری کوشش کی ہے کہ مصنفین کا مدعای واضح ہو جائے اور ان کے استدلال کا زور قائم رہے۔ نظریاً آئندہ دس ہزار صفحات کا مطالعہ کر کے یہ مصنفین منتخب کیتے گئے ہیں اور دور حاضر میں اسلام کی دعوت کو جس طرح پیش کیا گیا ہے اس کا نچوڑ اس کتاب میں آگیا ہے۔ کتاب میں منطقی ربط قائم رکھنے کے لئے قطع و برد سے بھی کام لیا گیا ہے اور جہاں جہاں مونے مونے خلا۔ باقی رہ گئے تھے انہیں نئے اضافوں کے ذریعے مرتب نے پُر کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ کتاب کا تسلسل متاثر نہ ہونے ہائے۔ ہمیں توقع ہے کہ انہی موجودہ شکل میں یہ کتاب اسلامی نظریہ حیات کے ایک ابتدائی لیکن میر حاصل تعارف کا موثر ذریعہ بنے گی۔ ہر باب کے آخر میں مزید مصالحہ کے لئے کتب کی نشان دہی بھی کر دی گئی ہے تاکہ جو حضرات تحقیقی مطالعہ کرنا چاہیں انہیں ضروری رعنائی مل جائے۔ مجھے توقع ہے کہ یہ کتاب طلبہ اور دوسرے پڑھنے لکھنے لوگوں کے لئے بڑی مفید نابت ہو گی۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۳ میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا ایڈیشن نمایاں تبدیلیوں کے ساتھ سے ۱۹۶۸ میں شائع ہوا۔ ہمیں خوشی ہے کہ اب ہم اس کا تیسرا ایڈیشن پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ دوسرے اور تیسرا ایڈیشنوں کی ترتیب میں ہم نے کوشش کی ہے کہ پوزے مسودے پر مکمل نظر ثانی کر لیں اور جہاں جو کمی محسوس ہو اس کو دور کرنے کی سعی کریں۔ اس موقع پر نمایاں اضافے بھی کیتے گئے ہیں اور عبارت کو سہل اور عام فہم بنانے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ دوسرے ایڈیشن میں تین نئے ابواب کا اضافہ کیا گیا تھا اور اب ایک باب مزید بڑھایا گیا ہے۔

”اسلامی نظریہ حیات“ کی اولین ترتیب، مواد کی تلاش اور اس کی تلغیص جناب احمد انس اور جناب امیں احمد کی خصوصی معاونت حاصل رہی ہے۔ برادران ڈاکٹر منظور احمد اور ڈاکٹر ابوالغیث کشفی کے مشورے اور معاونت بھی

مجھے ہر قدم پر حاصل رہی ہے۔ میں محترم مولانا منتخب الحق صاحب صدر شعبہ معارف اسلامیہ کے منون ہوں کہ، وصرف نے سعی درخواست پر بورے مسودے کے مطالعہ فرمایا۔ متعدد مقامات پر قیمتی اصلاحات کیں اور دوسرے مسروں سے نوازا۔ اس طرح میں مخدوم محترم ڈاکٹر محمد مسعود احمد، مرحوم سابق صدر شعبہ فلسفہ کا بھی منون احسان ہوں جن کے قیمتی مشورے میرے لیے دلیل را رہے۔ اور جن کی حوصلہ افزائی میری قوت کار کے سہیز کا کام کرنے رہی۔ افسوس کے اس تیسرے ایڈیشن کی تیاری کے وقت وہ ہمارے درمیان نہ رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں بہترین اجر سے نوازے۔ سب سے زیادہ میں محترم ڈاکٹر اشتباق حسین قربی شی صاحب کا منون ہوں جن کے ارشاد کی تعجب میں یہ کتاب تیار ہوئی اور جن کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کے بغیر یہ کتابی مکمل نہ ہوئے۔ میں ڈاکٹر صاحب کا اس لیے بھی شکر گزار ہوں کہ اپنی بے ہنا مصروفیت کے باوجود آپ نے اس کتاب کے ہلے ایڈیشن کے مسودے کا مطالعہ کیا، پڑے قیمتی مشوروں سے مجھ کو نوازا اور اس کے لیے پیش لفظ تحریر فرمایا۔

میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اس کتاب میں جو کچھ حق اور صحیح ہے اسے لوگوں کے دلوں میں اتارے اور اگر کچھ غلط اور باطل ہے تو اس سے ہر پڑھنے والے کو محفوظ رکھے۔ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ

خورشید احمد

۲۸ مارچ ۱۹۷۱ء
لیسٹر - انگلستان

فہرست مضمون

ڈاکٹر اشتیاق حسین قربشی (ج)	بیش لفظ
خورشید احمد	دیباچہ طبع سوئم
(م) مرتب	اظہار شکر
۱۰ - ۱ ابتدائی تعارف	باب ۱۔ اسلامی نظریہ حیات

حصہ اول۔ مذہب اور دور جدید

تعارف ۱۵ - ۱۳

باب ۲۔ زندگی کے بنیادی مسائل اور ان کا حل ۳۱ - ۱۶

باب ۳۔ دور حاضر اور مذہب ۴۹ - ۳۲

کتاب ۴۔ مذاہب عالم : ایک مقابل مطالعہ ۴۱ - ۵۰

باب ۵۔ دور حاضر کی تحریکیں اور مذہب ۱۰۳ - ۷۴

باب ۶۔ اسلام اور تبدیلی زمانہ ۱۱۹ - ۱۰۳

حصہ دوم : اسلامی ذلیل فہد حیات

تعارف ۱۲۶ - ۱۲۳

باب ۷۔ اسلام کا نصور زندگی ۱۳۴ - ۱۲۴

باب ۸۔ اسلامی نظریہ حیات کی بنیادی خصوصیات ۱۶۳ - ۱۳۸

باب ۹۔ اسلام کے بنیادی عقائد ۱۸۲ - ۱۶۳

(f)

۱۸۳ - ۱۸۶

۲۱۴ - ۲۰۳

۲۰۵ - ۲۸۰

۲۸۱ - ۲۰۲

۲۰۳ - ۲۲۵

باب ۱۰۔ توجہ

باب ۱۱۔ رسالت

باب ۱۲۔ اسوہ حسنہ

باب ۱۳۔ عقیدہ آخرت

باب ۱۴۔ اسلامی عبادت اور اسلامی عبادات

حہ موم : اسلامی نظام حیات

۲۲۹ - ۲۲۸

۲۲۸ - ۲۸۳

۲۸۳ - ۲۰۳

۲۰۳ - ۲۱۹

۲۱۹ - ۲۰۸

۲۰۸ - ۲۲۰

۲۹۵ - ۲۲۶

۵۱۳ - ۳۶۶

۵۱۳ - ۵۱۳

۵۰۸ - ۵۰۷

تکارف
باب ۱۵۔ شریعت اسلامی کے مانند (۲۸)

باب ۱۶۔ اسلامی نظام اخلاق

باب ۱۷۔ اسلام کا معاشری نظام

باب ۱۸۔ اسلام کا نظریہ تعلیم

باب ۱۹۔ اسلام کے معاشری اصول

باب ۲۰۔ اسلام کا سیاسی نظام (۲۸)

باب ۲۱۔ اسلام کے تقاضے

اشارہ

$$385 - 404 = 11$$

$$405 - 419 = 8$$

$$446 - 465 = 10$$

$$98 \quad (اندر کا)$$

(ج)

۱ اسلامی نظریہ حیات: ابتدائی تعارف

۲۵ دین اسلام + Saeed

اسلام کسی اپسے مذہب کا نام نہیں ہے جو صرف انسان کی نسبت اور انفرادی زندگی کی اصلاح کا داعی ہو اور جس کا کل سرمایہ حیات کوہ عبادات، چند اذکار اور مٹھی بھر رسم پر مشتمل ہو بلکہ یہ ایک مکمل خابطہ حیات ہے جو خدا اور آس کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کی روشنی میں زندگی کے تمام شعبوں کی تعمیر اور صورت گری کرتا ہے اور زندگی کے ہر پہلو کو ہدایتِ الہی کے نور سے منور کرتا ہے خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، معاشری ہو یا تمدنی، مادی ہو یا روحانی، معاشی ہو یا سیاسی اور مُسلکی ہو یا بین الاقوامی۔ اسلام کی اصل دعوت یہ ہے کہ خدا کی زمین پر خدا کا قانون جاری و ساری ہو اور دل کی دنیا یہ لے کر تہذیب و تمدن کے ہو گوشے تک خالقِ حقیقی کی مرضی ہوئی ہو۔

علامہ اقبال "اسلامی ثقافت کی روح" ۱) ہر گفتگو کرنے ہونے محدود مذہبی نقطہ نظر اور اسلام کے اقلابی نقطہ نظر کا فرق بڑی خوبی سے واضح کرنے ہیں۔ ایک صوفی بزرگ واقعہ "معراج کا ذکر" کرنے ہونے فرماتے ہیں:

محمد عربی بر فلک الافلاک	محمد عربی آخري آسمان پر گئے اور واپس آگئے۔
رفت و باز آمد واله اگر من	قسم خدا کی اگر میں (اس معرفت و بلندی پر)
رفتے ہو گز نیامدے۔	گیا ہوتا تو کبھیو واپس نہ آتا۔

بے ایک جملہ محدود مذہبی نقطہ نظر اور انبیاء کے اقلابی نقطہ نظر کے فرق کو واضح کر دیتا ہے۔ جس شخص کے ہیش نظر صرف اپنی ذات کی اصلاح اور خود کو روحانی رفتگوں اور بلندیوں سے آشنا کرنا ہو وہ حق ۱۔ ڈاکٹر محمد اقبال، "تشکیل جدید حیات اسلامیہ" (ترجمہ سید نظیر نیازی)۔ بزم اقبال، لاہور، ۱۹۵۸، صفحات ۹۸۸ - ۹۸۹۔

اللّٰہی نظریہِ حیات

۴ اور اس اونچے مقام کو حاصل باری تعالیٰ تک بہنچنے کو اپنا منہج سمجھے گا اور اسے بہنچنے کے تلاطم میں داخل ہونا گواہ کرنے کے بعد دنیا کی طرف لوٹنا اور زبانے کے تلاطم میں داخل ہونا گواہ نہیں کرے گا۔ لیکن اس کے برعکس نبی کا رویدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اُس بلندی پر بہنچنے کے بعد آب و گیل کی دنیا کی طرف واپس آتا ہے اور جو معرفت اور روشی اسے حاصل ہوتی ہے اس کی سدہ ہے ابک نئی دنیا تعمیر کرتا ہے۔ وہ تاریخ ساز قوتون پر غلبہ حاصل کرتا ہے اور انسان تہذیب و تمدن کی تشکیل جدید کا اقلابی کم انعام دینا ہے۔ خدا نے اپنے انبیا اس لئے بھیجے کہ وہ ہدایت ربانی کے نور سے ہوری دنیا کو منور کر دیں اور دین، حق کی رعنائی میں ایک نیا انسان اور ایک نیا معاشرہ قائم کر دیں۔ تمام انبیا اسی مشن کو لے کر آئے اور اس کام کبو اپنی آخری، مکمل ترین اور میاری شکل میں ہمارے نبی خضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انعام دیا۔ اسلام زندگی سے فرار کی نہیں، زندگی کی تعمیر کی تعلیم دیتا ہے اور ہوری زندگی کو سوارے کے لئے ہدایت کا ایک مکمل نظام بھی پیش کرتا ہے۔ ہدایت کے اسی نظام کا نام دین اور اسلامی نظریہِ حیات یا اسلامی آئینیولوجی ہے۔

۲ دین کا مفہوم

دین کا لفظ کلام عرب میں مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن اس کے سارے استعمالات کو سامنے رکھا جانے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ لفظ چار بنیادی تصورات کی ترجمانی ہے کرتا ہے، یعنی (۱) غلبہ و تسلط، کسی ذی اقتدار کی طرف سے؛ (۲) اطاعت اور بندگی، صاحب اقتدار کے آگے جھک جانے والے کی طرف سے؛ (۳) قاعدہ و ضابطہ اور طریقہ جس کی ہابندی کی جانے؛ اور (۴) معاسبہ اور فیصلہ اور جزا و سزا۔ قرآن کی زبان میں لفظ دین ایک ہورے نظام زندگی کی نمائندگی کرتا ہے جس کے اجزاء ترکیبی یہ چار ہیں:

۱ - اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اس کا اقتدار اعلیٰ؟

۲ - اس حاکمیت کے مقابلے میں تسلیم و اطاعت؟

۳ - وہ مکمل نظام فکر و عمل جو اس حاکمیت کے زیر اثر ہے؟

۴ - جزا و سزا جو اقتدار اعلیٰ کی طرف سے اس نظام کی وفاداری و اطاعت یا اس سے سرکشی و بقاوت کے صبلے میں دی جائے۔

قرآن 'دین' کو ایک جامع اصطلاح کی جیہت ہے استعمالی کرتا ہے

اور اس کی زبان میں اس سے مراد ایک ایسا نظام زندگی ہے جس میں انسان کسی کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کر کے اس کی اطاعت و فرمان برداری قبول کرے۔ اس کے حدود و ضوابط و قوانین کے تحت زندگی بسو کرے۔ اس کی فرمان برداری بر عزت، ترق اور انعام کا امیدوار ہو اور اس کی نافرمانی پر ذلت و خواری اور سزا سے ڈرے۔ حاکمیت کا بہ مقام خدا نے واحد کو حاصل ہے اور اسلام وہ دین ہے جو اس حاکمیت کی اساس پر قائم ہے اور جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے صحیح طریقہ "زندگی قرار دیا ہے۔

لَيَوْمَ الْكِتْمَةِ لَكُمُ الْيَنْتَاجُ وَالْقِيمَةُ عَلَيْكُمُ الْعِقْلُ وَهُنَّ يَنْهَا لَكُمُ الْإِشْلَامُ وَنَهَا

آج ہم نے تمہارا دین تمہارے لیج کابل کر دیا اور اپنی نعمتوں نم
بھرپوری کر دیں اور تمہارے لیج اسلام کو دین پہنے کیا۔
(المائدہ - ۲)

إِنَّ الَّذِينَ يَعْنَدُونَ إِنَّمَا إِنَّمَاءُ الْأَسْلَامِ

(بلا شب) دین تو افہ کے نزدیک صرف
اسلام ہے۔ (آل عمران ۹۰)

وَمَنْ يَتَبَعْ غَيْرَ إِلَهَ أَنْوَاعُ الْأَنْوَاعِ لِلْفَلْوَةِ

اور جو "اسلام" کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے گا اس
سے وہ دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔ (آل عمران ۸۵)

X اسلام کے لغوی معنی اطاعت، جہکنے، سر تسلیم خم کرنے اور مکمل
سپردگی کے ہیں۔ اس کے دوسرے لفظی معنی امن، سلامتی اور آشتی کے ہیں۔
اسلام وہ دین ہے جو خدا کی حاکمیت کی بنیاد پر ایک ہورا ضابطہ "زندگی پیش
کرتا ہے، اور انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ اسے قبول کرے اور اس کی پیروی
کرے کیوں کہ خدا کے قانون کے آگے جہکنے اور اس کی اطاعت کرنے کا نام
اسلام ہے۔ اور اس میں یہ حقیقت بھی پوشیدہ ہے کہ خدا کی بندگی اور اطاعت
کے نتیجے میں زندگی کا جو نقشہ ابھرے گا وہ امن، سلامتی اور آشتی کی نعمتوں
سے ملا مال ہوگا، اس میں قلب کو اطمینان حاصل ہوگا اور انسانوں کی انفرادی

۱۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، "قرآن کی چار پہنچی اصطلاحیں"؛ اسلامک پبلیکیشنز
لیٹریٹ، لاہور، باب پنجم۔ نیز ملاحظہ ہو، سید قطب، "جادہ و متزل" (ترجمہ)
"معالم فی الطريق"، از خلیل حامدی)، لاہور، ۱۹۶۸، باب دوم و سوم۔

اور اس کی زبان میں اس سے مراد ایک ایسا نظام زندگی ہے جس میں انسان کسی کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کر کے اس کی اطاعت و فرمان برداری قبول کرے۔ اس کے حدود و ضوابط و قوانین کے تحت زندگی بسو کرے۔ اس کی فرمان برداری ہو عزت، ترق اور انعام کا امیدوار ہو اور اس کی نافرمانی پر ذلت و خواری اور سزا سے ڈرے۔^۱ حاکمیت کا بہ مقام خدا نے واحد کو حاصل ہے اور اسلام وہ دین ہے جو اس حاکمیت کی اساس پر قائم ہے اور جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے صحیح طریقہ "زندگی قرار دیا ہے۔"

﴿يَوْمَ الْحِلْلَةِ لَكُمْ دِيْنُكُمْ فَلَا تَخَافُوا يَوْمَ الْحِلْلَةِ وَلَا هُنَّ مُؤْمِنُونَ﴾

آج ہم نے تمہارا دین تمہارے لیے کامل کر دیا اور اپنی نعمتوں تم

بھر پوری کر دیں اور تمہارے لیے اسلام کو دین پسند کیا۔

(السائدہ - ۲)

إِنَّ الَّذِينَ عَنْ دِيْنِهِمْ وَلَأَنَّهُمْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

(بلا شہ) دین تو افہ کے نزدیک صرف

اسلام ہے۔ (آل عمران ۹۰)

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ إِلَهَ إِلَّا إِلَهٌ وَلَا إِلَهَ مِثْلُهُ

اور جو "اسلام" کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے گا اس

سے وہ دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔ (آل عمران ۸۵)

X اسلام کے لغوی معنوی اطاعت، جہکنے، سر تسلیم خم کرنے اور مکمل سپردگی کے ہیں۔ اس کے دوسرے لفظی معنوی امن، سلامتی اور آشتی کے ہیں۔ اسلام وہ دین ہے جو خدا کی حاکمیت کی بنیاد پر ایک ہورا ضابطہ "زندگی پیش کرتا ہے، اور انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ اسے قبول کرے اور اس کی پیروی کرے کیوں کہ خدا کے قانون کے آگے جہکنے اور اس کی اطاعت کرنے کا نام اسلام ہے۔ اور اس میں یہ حقیقت بھی پوشیدہ ہے کہ خدا کی بندگی اور اطاعت کے نتیجے میں زندگی کا جو نقشہ ابھرے گا وہ امن، سلامتی اور آشتی کی نعمتوں سے ملا مال ہوگا، اس میں قلب کو اطمینان حاصل ہوگا اور انسانوں کی انفرادی

۱۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، "قرآن کی چار بنیادی اصولاً حیثیٰ"؛ اسلامک پبلیکیشنز لیٹریڈ، لاہور، باب پنجم۔ نیز ملاحظہ ہو، سید قطب، "جده و متزل" (ترجمہ "معالم فی الطریق"، از خلیل حامدی)، لاہور، ۱۹۶۸، باب دوم و سوم۔

اسلامی نظریہٗ حیات

اور اجتماعی زندگی میں حقیقی امن اور سکون قائم ہو گا نیز اس زندگی کے بعد بھی انسان کو اس ابدی زندگی میں سلامتی اور آشتی میسر آئے گی۔

3

اسلامی نظریہٗ حیات کا ہے؟

مکمل خابطہٗ زندگی کی حیثیت سے اسلامی تعلیمات کے دو ہم لو ہیں:
 ایک طرف اسلام زندگی کی بنیادی حقیقتوں پر روشنی ڈالتا ہے اور ہمیں بتاتا ہے کہ اس کائنات کی حقیقت کیا ہے، اس میں انسان کا اصل مقام کیا ہے، زندگی کا مقصد کیا ہے اور جو اساسی قانون اس میں کار فرما ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ اسلام بنیادی عقائد کی شکل میں زندگی کی حقیقتوں سے انسان کو روشناس کرتا ہے اور کائنات اور حیات کے بارے میں اسے صحیح زاویہٗ نظر عطا کرتا ہے۔ دوسری طرف اسلام زندگی کا منفصل قانون پیش کرتا ہے تاکہ انسان افراط اور تفریط سے بچ کر اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اعتدال و توازن کی بنیاد پر استوار کرے اور کامیاب و کامران رہے۔ عقائد اور خابطہٗ عمل کے اس مجموعے کا نام 'اسلامی نظریہٗ حیات' ہے اور علوم عمرانی کی اصطلاح میں عقائد اور خابطہٗ عمل کے اسی مجموعے کو 'آنیڈیولوژی' کہا جا سکتا ہے۔ جدید عمرانی لٹریچر میں یہ لفظ ایک ایسے خابطہٗ فکر و عمل اور اجتماعی ہروگرام کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے جو اپنی فکری اور فلسفیانہ بنیاد پر رکھتا ہو اور سیاست اور تمدن و معاشرت کے لئے بھی ایک واضح لائحہٗ عمل پیش کرتا ہو۔ 'لفت فلسفہ' میں ڈاکٹر جارج بوہس اس کی یہ تعریف کرتے ہیں:

" عام نظریات کا کوئی خابطہ یا کوئی ایسا ہروگرام جس کی اساس فکر و فلسفہ پر ہو۔ "

اسی طرح مشہور ماہر لسانیات و بیسٹر اس کی یہ تعریف کرتا ہے:

" کسی تہذیبی، سیاسی یا معاشرق تعریک کے عام منصوبے یا لائحہٗ عمل کا علمی بیان۔ "

ان تعریفات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نظریہٗ حیات سے کسی تعریک یا نظام تمدن کی فکری بنیاد پر اور ان سے ماخوذ تہذیبی،

سیاسی اور معاشرہ ہروگرام و لانچہ عمل مراد ہے اور جب ہم 'اسلامی نظریہ' حیات کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو اس سے وہ نظام فکر اور وہ تمدنی اور تمدنی لانچہ عمل مراد ہوتا ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ نظریہ حیات کی اصل خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ اپنے خلص نظام فکر کی روشنی میں زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق رعنائی کرتا ہے۔ اور جس طرح ہمارے موتیوں کو ایک سرشته باہم منسلک کر دیتا ہے اس طرح ہر نظریہ حیات کی ایک مشترک روح زندگی کے تمام شعبوں کے ہروگراموں کو جوڑ کر ایک وحدت بناتی ہے۔ ہر شعبے میں یہی ایک روح اور فکر کر فرمایا ہوتا ہے۔ اس طرح ایک مکمل فنا باطھہ فکر و عمل رونما ہوتا ہے جس میں زندگی کی حقیقی وحدت جلوہ گر عوق ہے۔ اس کے نتیجے میں حیات انسان کے تمام پہلوؤں میں یک رنگ اور ہم آہنگ رونما عوق ہے۔ اور اس یک رنگ سے زندگی میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں ایمان اور عمل صالح دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ آتا ہے اور ایک کے بغیر دوسرا در اصل نامکمل رہتا ہے۔

مغرب کا اصل مسئلہ

مغرب دنیا کا العیہ ہے کہ وہ ایک طویل مدت ہے کسی حیات پیغام نظریہ حیات ہے محروم رہی ہے۔ عیسائیت اس کوں مکمل نظام حیات نہ دے سک۔ نتیجاً مغرب کا انسان الہامی عدالت ہے محروم ہو کر صرف انسان ذہن و فکر پر تکیہ کرنے پر مجبور ہوا اور ایک جامع اور متوازن نظام قائم کرنے میں ناکام رہا۔ ان ناکامیوں نے اس میں ما یوسی کی کیفیت کو جنم دیا اور بالآخر وہ آہستہ آہستہ ایک جامع نظریہ حیات کی ضرورت کا ہی منکر ہو گیا۔

جدید مغربی فکر کا ارتقا جن خطوط پر ہوا ہے وہ زندگی کی وحدت کو ہارہ ہارہ کرنے والے ہیں۔ سب سے پہلے دیکارت نے روح اور مادے کے وجود کی وحدانیت کا ابطال کیا۔ اس کے فلسفہ ثنویت میں روح اور مادہ دو مستقل بالذات وجود ہیں۔ لائینز نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور مستقل بالذات وجود کی کثرت کا نظریہ پیش کیا۔ اب ہر 'روحیہ' یا جو ہر خود ایک کائنات تھا۔ اور اپنا جدا گانہ وجود رکھتا تھا اور اپنی مخصوص نظر سے پوری کائنات کی عکسی کر رہا تھا۔ لاک اور ہیوم کے زیر اثر کمپیٹ کی اہمیت بڑھ رہی تھی اور کیفیت کی قدر کم ہو رہی تھی۔ طبیعتیات اور حسابیات کی ترقی نے اس رجحان کو

اور ہم تھوڑا کر دیا اور نتیجتاً مغربی فکر کی سب سے اہم خصوصیت 'کمل' سے 'چڑوا' کی طرف مراجعت ہو گئی۔ اس کیفیت کو جدید اہل قلم جوہری حیثیاتیت سے موسوم کرتے ہیں۔

اس فکری رجحان کے نتیجے میں زندگی کے ہر شعبے میں انتشار اور جزو اور سی رومنا ہوئے۔ عالمی ریاست کا تصور قومی ریاست کے تصور سے بدل گیا اور سلطنت روما چھوٹ چھوٹ قومی ریاستوں میں بٹ گئی۔ مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے بالکل جدا کیا گیا اور سیاست میں انفرادیت کا غلبہ ہوا۔ معاشیات میں تخصیص اور تقسیم پسندی کا رجحان رومنا ہوا اور ہوری صنعتی اور تجارتی ترقی انہی خطوط پر ہوئی۔ قومیت (نیشنلزم) ، لادینیت (سیکولرزم) ، انفرادیت، اور صنعتیت اسی ذہنیت کی ہیداوار ہیں۔

مغربی فکر کے اس رجحان کا لازمی اور منطقی نتیجہ تھا کہ کوف ایک نظریہ حیات ایسا نہیں ہو سکتا تھا جو زندگی کے تمام شعبوں میں یک رنگ پیدا کر سکتا۔ لادینیت یا دُنیویت اور مادِ پت مبنی تعریکیں نہیں۔ وہ کوف مثبت نظام زندگی فراہم نہیں کر سکتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شعبے کا ارتقا جدا جدا بنیادوں اور مختلف تعلقی خطوط پر ہوا اور زندگی میں کوف وحدت باق نہ رہی۔ معیشت کسی سمت میں جاری ہے تو معاشرت کسی اور سمت میں۔ سیاست کا انداز کچھ ہے تو اخلاق و تمدن کا کچھ اور۔ ہر معاملے میں متعدد معیار بن گئے اور کوف ایک پیمانہ ایسا نہ رہا جس سے حیات کے ہر ہملو کو ناہا جاسکنا۔ بورپ کی زندگی کا جدید انتشار اس وقت تک سمجھے میں نہیں آتا جب تک مندرجہ بالا حقیقت کو اچھی طرح نہ سمجھے لیا جائے۔ تاریخ صنعتی استبداد اور مزدوروں پر مظالم ساتھ ساتھ رومنا ہوتے ہیں، جب وہ کا طالب علم جب یہ دیکھتا ہے کہ سیاست میں جمہوریت اور معاشیات میں ساراج اور آزادی پسندی کو ہم آغوش دیکھتا ہے تو ہریشان ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تضاد اور تناقض اس لئے ہایا جاتا ہے کہ ایک سنی چیز زندگی کی وحدت کو قائم رکھتے ہوئے علمی اور عملی ذائقوں میں مکمل رعنائی فراہم کر سکتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شعبے میں مختلف سمتوں میں ترقی ہوئی ہے اور آج اس کے نتیجے میں مغربی تہذیب اندرونی انتشار کا شکار ہے۔

اشتراکیت

پورب کی جدید تاریخ میں، اسی انتشار اور ژولیڈگی کے رد عمل کے طور پر، اشتراکیت بہ حیثیت ایک نظریہ حیات اور ایک تعریک رونما ہوئی، اور آج کی دنیا میں اس کو جو بھی کامیابی حاصل ہوئی ہے اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ اس کے پاس بہ نظر ظاہر ایک ضابطہ حیات ہے۔ اسی بین اس کی کشش کا اصل راز مضمون ہے۔ لیکن چون کہ اشتراکیت بھی مغربی فکر کی منفی رو سے اپنے کو آزاد نہ کر سکی، وہ بھی مادہ اور روح اور زندگی اور اخلاق کی تقسیم ہر مبنی ہے، نہ انسانی سماج کی طبقات تقسیم پر اس کی اساس ہے، اس لیے اس نے ایک ضابطہ عمل تو دیا مگر ایک صحت مند اور حیات بخش نظریہ حیات کشش کرنے سے قاصر رہی^۱۔ جب تک اشتراکیت بعض ایک نظریہ رہی اس کی پہش کرنے سے قادر رہی۔

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا؟
طريقِ کوونکن میں بھی دشی حیلے ہیں پرویزی!

(اقبال)

ایک طرف تو جدید دنیا میں کسی صحت بخش نظریہ حیات کا فدان ہے اور دوسری طرف ایک ایسے نظریے کی ضرورت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے جو زندگی کے مسائل کو صحت مند بنیادوں پر حل کرے اور انسان کی مادی ترق کو اس کی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کرسکے۔ تعریبے نے ثابت کر دیا ہے کہ زندگی ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ انسان کی شخصیت ایک ہی ہے اور وہ بہ یک وقت دو متضاد اور متناقض کردار ادا نہیں کر سکتا اور اگر کرنے گا تو اس کی شخصیت انتشار کا شکار ہو جائے کی۔ بھی وجہ ہے کہ آج کے انسان ایک انتشار زدہ شخصیت کا حامل ہے۔ سماجی بے اطمینانی، معاشرتی کشمکش، نوجوانوں کی بے راہ روی، خود کشی اور ذہنی امراض جس تیزی سے بڑھ رہے ہیں وہ اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔ انہی حالات سے متأثر ہو کر پروفیسر جوڈے کہا تھا ۔“ہم نے فضاؤں میں پرندوں کی طرح اڑنا اور سمندروں میں چھپلیوں

۱۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو باب چہارم۔ نیز دیکھیے چراغ راہ، ”سوشلم نہبر“، کراچی، ۱۹۶۷، اور خورشید احمد، ”سوشلم یا اسلام“ مکتبہ چراغ راہ، کراچی، ۱۹۶۹۔

کی طرح تیرنا تو سیکھ لیا ہے ایکن زمین پر انسانوں کی طرح رہنا ہمیں ابھی تک نہیں آیا ہے ۔^۱

زندگی کی وحدت

یہ صحیح ہے کہ عمل سبولت کی خاطر حیات انسان کو مختلف شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے لیکن ہر شعبے کو ایک آزاد اور جداگانہ جزیرے کی شکل دے دینا نہایت مہلک ہے ۔ انفرادی اور اجتماعی، سیاسی اور معاشی، معاشرتی اور تمدنی یہ تمام شعبے ایک دوسرے سے اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ انہیں بالکل الگ الگ حصول میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا ۔ انسانی زندگی میں مختلف شعبوں کے درمیان امتیاز و تفریق ممکن نہیں ۔ جب تک تمام شعبوں کو درست نہ کیا جائے اور سب میں یک رنگ اور ہم آہنگ نہ ہو آس وقت تک انسانی زندگی خوشحالی اور کامرانی سے ہم کنار نہیں ہو سکتی ۔ اگر یہ ممکن نہیں کہ آپ کا نصف چہرہ مسکرائے اور باقی نصف ہر مسکراہٹ نہ آئے تو یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ صرف معیشت یا سیاست کی تنظیم سے ہری زندگی سنوار جائے ۔ اور جس طرح یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص یہ یک وقت مختلف ستون میں چل سکے یا دو مختلف ستون میں جانے والی کشتوں ہر سوار ہو آسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ انسان کی زندگی کے مختلف شعبوں کو یہ یک وقت مختلف منزلوں کی طرف سرگرم عمل کیا جاسکے ۔ تجربے نے اُج کے انسان کو اچھی طرح سکھا دیا ہے کہ اگر وہ اپنی شخصیت کا استعفام اور تمدن کی حقیقی ترقی چاہتا ہے تو اسے جزو ہندی کے مقابلے میں تہذیبی وحدت کی راہ اختیار کرف ہوگی ۔ یہی وجہ ہے کہ اُج کی سب سے بڑی ضرورت ایک ایسا صحت مند نظریہ حیات ہے جو دنیا کو اس انتشار سے نکال دے جس میں وہ کمیر گئی ہے اور جو اس کے لیے جان ایوا ثابت ہو رہا ہے ۔

وقت کی ضرورت

اُہر جو کچھ ہم نے عرض کیا وہ تہذیب انسان کی اندر قنفیت میں کا تقاضا نہیں ہے بلکہ کچھ ایسے ایرونزی اسباب یہی ہیدا ہو چکے ہیں جو اسے اس سمت کشان کشان لا رہے ہیں ۔ ہمیں چیز تو ریاست کا جدید تصور ہے ۔ اُج کی ریاست، ایک خاموش سیاسی انقلاب کے نتیجے کے طور پر، ایک ہمہ گیر

ریاست بن چکی ہے۔ جیمز استورٹ میں اور لارڈ میلبرون کے تصور کی "مغض انتظامی ریاست" کا آج کی دنیا کے کسی کوئے میں بھی کوئی وجود نہیں۔ اب ریاست ایک مشتبہ ریاست ہے جسے تعلیم، ثقافت، سماج، معیشت، نشر و اشاعت غرض ہر میدان میں ایک پالیسی اختیار کرنی ہے اور ہر شعبے کی صورت گردی کرنی ہے۔ مغض منفی تصورات کے سہارے ایسی کوئی ریاست قائم نہیں ہو سکتی۔ لادینیت اور آزاد خیالی آج کے وسائل کا حل نہیں۔ مذہب کو آپ زندگی سے نکال بھی دیں تو کریں گے کیا؟ لادینیت کوئی مشتبہ پروگرام نہیں دیتی۔ آزاد خیالی کے سہارے آپ ماضی کے خلاف بغاوت تو کر سکتے ہیں اور روایات کو ترک بھی کر سکتے ہیں لیکن آپ کا مشتبہ اعدام آخر کیا ہوا؟ آزاد خیالی کوئی مشتبہ نظریہ، حیات فراہم نہیں کرتی۔ جمہوریت بھی آپ کو زیادہ سے زیادہ یہ بتاچے ہے کہ "وہ کرو جو عوام چاہیں"۔ لیکن سوال یہ ہے کہ عوام کیا چاہیں؟ کوئی مشتبہ نظریہ، کوئی تعمیری لانچہ عمل جب تک عوام کے پاس نہ ہو وہ کیا کر سکتے ہیں؟ جس بہلو ہے بھی آپ غور کریں گے آپ محسوس کریں گے کہ آج ایک طرف ہمارے زمانے کے رائج فلسفے ایک صحت مند نظریہ، حیات فراہم کرنے میں ناکام ہیں اور دوسری طرف آج کی دنیا میں فرد اور ریاست دونوں کے لیے نظریہ، حیات اتنا ضروری ہو گیا ہے جتنا انسان کے لیے ہوا اور ہائی۔ اس کے بغیر ریاست کا وجود ہی یہ معنی ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر سیاسی مفکرین ایسوں صدی کی ریاست کو 'نظریاتی ریاست' کے نام سے پکارتے ہیں۔

دوسری چیز یہ ہے کہ فتنی، اور سیکانکی ترق نے اب ان نام منتشر جزیروں کو ملا دیا ہے جن میں آج تک پہلے زندگی کو تقسیم کیا گیا تھا۔ وسائل، نقل و حرکت نے جغرافیائی بُعد کو دور کر دیا ہے۔ تعلیم، پروپیگنڈے، ریڈیو اور ابلاغ، عالم کے جدید ذرائع نے زندگی کے تمام شعبوں کو مربوط کر دیا ہے۔ زمان و مکان کی تغیری نے زمین کی طناپیں کھوینچ دی ہیں۔ اب پوری دنیا ایک شہر اور ہوری انسانیت ایک خاندان بتی جا رہی ہے۔ وحدت کی طرف دنیا کی اس ہیئت قدمی کے زمانے میں 'کثرت' اور 'تقسیم' کے وہ تمام فلسفے یہ کار ہوئے ہیں جو آج تک اس کا سرمایہ، حیات رہے ہیں۔ نیا زمانہ مغرب کے تمام جزوی فلسفوں کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے:

سچ کہہ دون اے برهمن! گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدون کے بت ہو گئے بولتے

اب دنیا کو ایک ایسے نظریے، ایک ایسی آئیندیاولوجی کی ضرورت ہے جو کثرت کو وحدت میں بدل دے اور ان نئے حالات میں انسان کو رہنے کے سلیقہ سکھائے تاکہ وہ اپنی حاصل کی ہوئی نئی قوتون کو تعمیر و تشكیل کے لیے استعمال کرسکے۔ ورنہ اس بات کا شدید اندیشہ ہے کہ آج تک انسان کے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ نفرت، تقسیم ہستی اور جزو ہستی کے فلسفوں کے ہاتھوں تباہ ہو جائے۔

وہ فکر گستاخ جس نے عربیاں کیا ہے فطرت کی طاقتون کو اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

اسلام ایک مکمل ضابطہ، زندگی

دور جدید کی اس سب سے بڑی ضرورت کو اسلام ہوا کرسکتا ہے بلکہ صرف اسلام ہی ہوا کرتا ہے۔ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے۔ جو ایک طرف زندگی کے سائل کا ایسا معقول اور سائنسیک حل پیش کرتا ہے جو فکر و نظر کی ہر الجہن کو دور اور ہر عقدے کو حل کر دیتا ہے اور دوسری طرف تہذیبی اور تمدن زندگی کے لیے ایک منفصل لانعہ عمل دیتا ہے جو انسانی معاشرے کی تمام ضرورتوں کو ہوا کرتا ہے اور صحت بند بنیادوں پر اس کے مستقبل کے ارتقا کی راہیں ہموار کرتا ہے۔ اسلام پوری قوت کے ساتھ زندگی کی روحانی حقیقت کا اظہار کرتا ہے اور مادی وسائل کو اخلاق مقاصد کے حصوں کے لیے استعمال کرتا ہے۔ وہ نہ دوسرے مذاہب کی طرح مادی زندگی سے صرف نظر کرتا ہے اور نہ دور جدید کی ماذیت کی طرح مادی ہہلو کو ہر دوسرے ہہلو ہر حاوی اور غالب کرتا ہے۔ وہ انسان میں یہ جذبہ پیدا کرتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز تیرے لیے ہے لیکن تیرے مقاصد بہت بلند و بالا ہیں۔ بہ قول اقبال

نہ توبزمیں کے لیے ہے نہ آسمان کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے، تو نہیں جہاں کے لیے

حصہ اول

مذہب اور دور جدید

دنیا میں انسان کی دو بنیادی ضرورتیں ہیں۔ ایک طرف جسم اور روح کے رشتے کو قائم رکھنے کے لیے احمد مادی اور جسمان وسائل درکار ہیں اور دوسری طرف انفرادی اور اجتماعی زندگی کو صحت مند بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے اخلاقی اور تسلی اصولوں کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ان دونوں ضرورتوں کو ہمرا کیا ہے۔ مادی اور جسمان احتیاجات کی تسکین کے لیے وسائل کا ایک نہ ختم ہونے والا خزانہ زمین و آسمان میں ودیعت کر دیا ہے اور اخلاقی و تمدنی رہنمائی کے لیے اس نے انبیا بھیجے جنہوں نے انسان کو زندگی گذارنے کا طریقہ سکھایا۔ زندگی گذارنے کے اس طریقے کا نام مذہب ہے۔

مذہب انسان کی سب سے اہم اور بنیادی ضرورت ہے - بھی وجہ ہے کہ تاریخ انسانی میں کوئی معاشرہ، کوئی تمدن اور کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو مذہب سے کامیاب نیاز رہی ہو۔ لیکن دور جدید کی یہ بدقسمتی ہے کہ اس میں مذہب سے انحراف کا ایک بہت واضح اور نمایاں رجحان رونما ہوا اور بالآخر جدید مغربی تہذیب لامذہبیت کی بنیاد پر قائم ہوئی۔ ماضی میں بھی اس نوعیت کی کوششیں ہیں لیکن جدید تجربے کی طرح وہ بھی ناکام رہی ہیں۔ انسانی تجربے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مذہب کو ترک کر کے انسان نہ صرف یہ کام اخلاقی حیثیت سے تباہ ہو جاتا ہے بلکہ خود بادی وسائل کے استعمال میں بھی وہ توازن برقرار نہیں رکھ سکتا جو فلاح و خوشحالی کے لیے ناگزیر ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوت و اقتدار میں افلاط خیر و صلاح اور نیکی و فلاح میں اضافے کا باعث نہیں ہوتا۔ علامہ اقبال نے اس صورت حال کی بڑی اچھی عکاسی کی ہے :

| ذہونڈنے والا ستاروں کی گذر گاہوں کا اپنے افکار کی دنیا میں سفر کرنے کا
| جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا زندگی کی شب تاریک سحر کرنے کا
| زندگی کی شب تاریک صرف مذہب ہی کی روشنی سے منور ہو سکتی ہے۔ ✕

کتاب کے اس حصے میں ہم نے دور جدید کے پس منظر میں مذہب اور اس سے پیدا ہونے والے سوالات سے بحث کی ہے۔ پہلا مضمون مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کی تعریفات سے مakhوذ ہے۔ اس میں زندگی کے بنیادی وسائل کو ایش کیا گیا ہے اور ان ذرائع علم سے بحث کی گئی ہے جن کی مدد سے انسان

مذہب اور دورِ جدید

۱۲

ان سوالات کو حل کر سکتا ہے۔ اور پھر ان مختلف تمدنی نظائر کے خد و خالہ واضح کیجئے گئے ہیں جو مختلف قسم کے جوابات کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں۔

دوسرा مضمون جناب ڈاکٹر منفروز احمد صاحب کا تعریز کردہ ہے۔ اس مضمون میں، مذہب کی ضرورت اور انسانی زندگی میں اس کے مقام کو بیان کیا گیا ہے۔ نیز اس پوری بحث میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ علم کی عقلی نقطہ نظر سے مذہب کی اصل حقیقت کو واضح کیا جانے تاکہ علم اور اذہان میں جو شبہات پیدا ہوتے ہیں ان کا موثر طریقے پر ازالہ ہو سکے۔ جدید

تیسرا مضمون ظفر آفاق انصاری صاحب نے مرتب کیا ہے اور اس میں دنیا کے اہم مذاہب کا ایک مقابلہ بطالعہ کیا گیا ہے۔ اس باب میں ہندو مت، بدھ مت، یہودیت، عیسائیت اور اسلام کی بنیادی تعلیم کو نہایت اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ان مذاہب کی مختصر تاریخ اور موجودہ عالمی مقام اور روشنی ڈالی گئی ہے اور ایک عمومی جائزے کے ذریعے سے ان کی تعلیمات پر تنقید و تبصرہ بھی کیا گیا ہے۔

چوتھا مضمون پروفیسر عبدالحکیم صدیقی صاحب کے قلم سے ہے۔ اس میں جدید مغربی تہذیب کے عناصر ترکیبی اور اس کی فلسفیانہ بنیادوں کو پیش کیا گیا ہے اور ان پر علمی تنقید کے ذریعے سے بتایا گیا ہے کہ مذہب ہے بغاوت پر جو نظام ہے بنے کا انسانیت کے لیے تباہی کا باعث ہو گا۔ اس مقابلے میں ان نئی فکری اور عملی تعریکوں، خصوصیت سے لا دینیت اور اشتراکیت پر علمی تنقید کی گئی ہے جو مذہب اور مذہبی فکر کی بیان گئی پر آمادہ ہیں تاکہ آج کا نوجوان ان تعریکوں کی ظاہری چمک دمک سے متاثر ہو کر ان کے "تاریک تر" اندروں کو نظر انداز نہ کر دے۔ جوں کہ یہ مضمون کئی سال کر دیا گی تھا اس ایسے مرتب نے جگہ جگہ اس میں تازہ ترین مواد کا افادہ تعزیزیاتی ہے۔ یہ اضافے بڑی حد تک مضمون کے علومیاتی پہلو کے سلسلے میں

آخری باب میں اسلام اور تبدیلی، زمانہ کے موضوع سے بحث کی گئی ہے اور مذہب۔ اور خصوصیت سے اسلام۔ سے اس کے تعلق کی کیا نوعیت ہے۔

زندگی کے بنیادی سوالات اور ان کا حل *

مذہب، فلسفہ اور تمدن کے کچھ بنیادی سوالات ہیں جن کے حل پر انسان زندگی کا انحصار ہے، وہ بنیادی سوالات یہ ہیں۔

بنیادی سوالات

اس دنیا کا آغاز و انجام کیا ہے؟ کیا اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی ہدایات ہیں؟ اگر ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے اور اس کے لیے اس زندگی میں کیا

نیز یہ کائنات بہ حیثیت مجموعی کیا ہے؟ اس کو نظم و خبط میں رکھنے والی اور ایک ہمه گیر اور حکم قانون کے مطابق چلانے والی ذات کون سی ہے؟ اور اس کی کیا صفات ہیں؟ اس کا انسانوں سے کیا تعلق ہے، اور انسانوں کا اس سے کیا تعلق ہونا چاہیے؟

کیا ان قوانین طبی کے علاوہ جو اس عالم میں کارفرما ہیں کوئی اخلاق صحیح حیثیت اور منصب کیا ہے؟ انسان کی اس کائنات میں دوسری طاقت اور عدالت کے سامنے جوابدہ ہے یا آزاد اور غیر ذمہ دار؟ اس کا کمال مطلوب کیا ہے؟

یہ اولین اور بنیادی سوالات ہیں جن کو کوئی ایسا نظام ایک لمحہ کے لیے بھی نظر انداز نہیں کر سکتا جس کا تعلق زندگی کی گہرائیوں سے ہو اور جس کی جڑیں یہ مضمون مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تصنیف "مذہب اور تمدن" میں مذکور ہے البتہ ایس کی موجودہ ترتیب بڑی حد تک اپنی قیمت کرده ہے۔ (مرتب)

انسان کے قلب و دماغ میں بیوست ہوں اور اس کی شاخیں انسانی زندگی کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہوں۔ بذریعہ ان ہی سوالات کا پیغام جواب دینے کا دعویٰ کرتا ہے؛ فلسفہ ان ہی... اٹل سے بحث کرتا ہے، تمدن ان ہی بنیادوں پر اپنی عمارت قایم کرتا ہے۔ ان سوالات کا معین جواب دینے بغیر نہ ہم زندگی کا کوئی حقیقی مسئلہ طے کر سکتے ہیں، نہ تمدن و اجتماع کا کوئی نقشہ بنا سکتے ہیں۔ ہر تمدن، خواہ کتنا ہی سطحی اور مادی ہو، ان سوالات کا کوئی نہ کوئی جواب ضرور رکھتا ہے جو اس کی عمارت کے نیچے بھی بنیاد کا کام دیتا ہے اور بنیاد کی اس گہرائی سے لے کر اس کی کاخ و ایوان کی بلندی تک پکان اثر انداز ہوتا ہے۔ اس ذہنی سرچشمے سے اس کی زندگی کی ساری نیبریں پھوٹتی ہیں اور ان کے رخ معین ہوتے ہیں۔ معاشرت و معاملات، اخلاق و اجتماع، سیاست و آئین علم و فلسفہ، تبذیب و شائقی، غرض اندرونی و بیرونی زندگی کے تمام مناظر و مظاہر اس بنیادی تصور کا عکس ہوتے ہیں۔

جبکہ ان سوالات کا جواب دینا ارباب فلسفہ اور اہل دانش و بینش کا مشغله ہے وہاں ان کے حل سے متعلق کوئی نہ کوئی رائے قائم کرنا ہر خاص و عام کے لیے ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص شعوری یا غیر شعوری طور پر ان سوالات کے حل سے متعلق کوئی رائے قائم نہ کرے، اس کے لیے کوئی عمل ممکن نہیں۔ مثلاً آپ یہ سوچ کر دیکھیں کہ کیا آپ کے لیے یہ ممکن ہے کہ آپ زندگی اور موت کے متعلق کوئی رائے قائم نہ کریں اور اس کے باوجود آپ کے افعال میں منطقی ربط اور عملی حکمت پوشیدہ ہو۔ آپ کا فعل اگر شعوری اور اختیاری ہے تو یقیناً اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوگا۔ یہ مقصد یا تو فلاخ آخری ہوگا یا محض فلاخ دنیوی۔ پہلی صورت میں ضروری ہے کہ زندگی بعد موت پر ایمان رکھیں اور دوسری صورت میں اس کو لغو اور وہم خیال کریں۔

یہی وجہ ہے کہ معاشرے کا هر فرد ان مسائل کا ایک واضح یا غیر واضح جواب اپنے ذہن میں ضرور رکھتا ہے۔ یہی حال معاشری زندگی کے مختلف شعبہ جات کی بنیاد بنتا ہے۔ چنان چہ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں معاشرے نے ان سوالات کا فلاں حل قبول کیا تو ہم اس معاشرے کے سیاسی، معاشی اور دبکر سماجی نقطہ نظر کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ یا اگر ہمیں اس کے سیاسی، معاشی اور سماجی کارناموں کا علم ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے مسائل کے حل میں فلاں پہلو اختیار کیا ہوگا اور یہ سب کچھ اس لیے کہ کسی قوم کے

لے کے یہ ممکن نہیں کہ وہ ان سائل کے حل کے سلسلے میں ایک ہیلو ہر ایمان رکھے اور عملی طور پر وہ ہمدن اختیار کرے جو بالکل منضاد بنیادوں اور اقدار کا حامل ہو۔

۱ علم کے ذرائع

هم کو اس موقع پر دیکھنا ہے کہ ان سائل کے حل کے لیے ہمارے سس کیا ذرائع ہیں اور ان سوالات کو کس طرح حل کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ہم کو اپنی قوتون اور صلاحیتوں کا جائزہ لینا ہوا جن سے بہ ظاہر ہم ان سائل کے حل میں مدد لے سکتے ہیں۔

۱- **حوالہ:** حواس سے مراد وہ پانچ مشہور قوتیں ہیں جنہیں باصرہ، سامعہ، لاسہ، شامہ اور ذاتیہ کہا جاتا ہے۔ یہی حواس ہمارے علم کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ یقینی ذریعہ متعین جانے ہیں۔ دنیا سے متعلق جس قدر محسوسات کا ہم کو علم ہے ان سب کی بنیاد یہی حواس ہیں۔ ان ہی کی بنا پر ہم تجربہ اور مشاہدہ کے بعد طبعی قوانین دریافت کر کے انہی سائنسی علوم کو ترتیب دے سکتے ہیں۔ لیکن حواس اپنی اس وسعت کے باوجود محدود ہیں۔ یہ ہمیں صرف ان اشیاء سے متعلق علم فراہم کرنے ہیں جن کا محسوس کیا جانا ممکن ہے۔ لیکن ہر موجود کے لیے ضروری نہیں کہ وہ محسوس بھی ہوا۔ مثلاً

۱- بہت سے علماء حواس کو حصول علم کا ایک مشتبہ، ناقابل اعتماد اور کمزور ذریعہ مانتے ہیں۔ نیکولاوس میلبرانش (Nicolas Malebranche) اپنی کتاب "جنتجوئی صداقت" میں لکھتا ہے:

"غلطی کا ایک بڑا مأخذ یہ غلط یقین ہے کہ حواس جو حقیقت میں ہم کو محسن عمل اغراض کے لیے عطا ہوتی ہیں ممکنہ اشیا کو ہم پر منکف کر سکتے ہیں"۔ مونتین (Montaigne) لکھتا ہے:

"انسان کا علم بہت ناقص ہے۔ اس کے حواس غیر یقینی اور خطا پذیر ہیں۔ ہم کبھی نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے حقیقت کو ہمارے سامنے پیش کیا۔ حواس کو دنیا ایسی ہی معلوم ہوتی ہے جیسی ان کی فطرت و حالت ہے۔ اور اسکی میں خارجی اشیا نہیں، بلکہ مخصوص آلات حس کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ حواس پر یقین کرنے کے لیے ہمارے پاس ایک آله ہونا چاہیے جو ان کی تصدیق و تکذیب کر سکے اور پھر اس آلیے کی جانب کے لیے ایک اور آله ہونا چاہیے۔ اس طرح یہ سلسلہ غیر متناہی ہو گا"۔ (حاشیہ از مصنف)

اس سلسلے میں مزید مطالعہ کے لیے بروفیسر ل کامٹی دو نواٹ (Le Comte Du Nuay) کی کتاب **Human Destiny** کا مطالعہ بڑا مفید ہو گا جس میں حواس سے حاصل شدہ علم کی مجبوریاں اور سائنس کے مطالعہ پر مفصل تنقید موجود ہے۔ اسی طرح بروفیسر رہمن (Rhine) کی کتاب **The Reach of Mind** کا مطالعہ بھی مفید ہو گا، جو ذہن کی غیر معمولی رسمی رسانی کو علم و تجربی کی روشنی میں ثابت کرتا ہے۔ (مرتب)

زندگی ایک ایسی حققت ہے جس کا ادراک محض حواس سے ممکن نہیں۔ ہم زندگی کے مظاہر د مشاہدہ کر کے زندگی کا قیاس تو کر سکتے ہیں لیکن کسی دوسرے زندگی کو بلا واسطہ طور پر محسوس نہیں کر سکتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حواس سے صرف بادی اشیا کا علم ممکن ہے اور وہ بھی صرف ان اشیا کے آثار اور خواص کی حد تک۔ مگر جن مسائل سے ہم بحث کر رہے ہیں وہ سب مابعدالطبیعیاتی ہیں۔ مثلاً زندگی کا مبدأ اور منتها ایسی چیزوں ہیں جو نہ ہماری آنکھوں سے دیکھی جا سکتی ہیں اور نہ ہمارے کانوں سے سنی جا سکتی ہیں۔ اس لیے حواس کے ذریعے ہم ان مسائل کا حل دریافت نہیں کر سکتے۔

(۲) عقل: عقل انسان کو جانوروں سے ممیز کرتے ہے۔ انسان علوم میں ترتیب اور ربط اسی کی بنا پر ہے۔ لیکن جب ہم اس بات کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ کیا محض عقل زندگی کے بنیادی مسائل کا حل بھی دریافت کر سکتی ہے تو نتیجہ نفی کی صورت میں نکلتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل حصول علم کے لیے تنہا کافی نہیں۔ اس کو اپنے علاوہ اپنے سے کہتر چیزوں سے مدد لئی بڑی ہے۔ کسی ایسی چیز تک پہنچنے کے لئے جس کو وہ ابھی تک نہیں جانتی، ان معلومات سے کام لینا پڑتا ہے جو آس کو پہلے سے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ مقدمات محسوسات ہی ہوتے ہیں۔ تمام عقلی علوم کا تجزیہ کیجئے اور عقل کا دلچسپ و طویل سفر نامہ سنئے تو معلوم ہوگا کہ حقائق کی ان شیئیں نئی نئی دنیاؤں تک پہنچنے اور لا علمی کے بڑے بڑے سمندروں کو عبور کرنے میں اس کا زادِ سفر تحریر محسوسات اور ابتدائی معلومات تھے۔ پس جہاں حواس کام نہ کرتے ہوں وہاں عقل اسی طرح بے بس ہوتے ہے جیسے عام طیارہ بغیر ہوا کے نہیں اڑ سکتا۔ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ زیر بحث مسائل مابعدالطبیعیاتی ہیں اور اس لحاظ سے حواس کی گرفت سے باہر ہیں اور جب حواس کی گرفت سے باہر ہیں تو عقل کی رسائی سے بھی ساوا رہا ہیں۔

نکل جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

لیکن عقل کی اس نارسانی کے باوجود انسان نے اپنے تعجب اور خود فربی کی بنا پر ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ابھی کاوش کے حاصل کا نام فلسفہ ہے۔ فلسفہ، خواہ مذہب کی مخالفت میں ہو یا موافقت میں، اپنی اصلیت اور

اس کے لحاظ سے ابک ہی ہے۔ خدا کی حقیقت، اس کی صفات، اخلاق قوانین کا مقام وغیرہ ایسے سائل ہیں جو ہمارے ادراک ہے باہر ہیں اور اس لیے واحد فیصلہ جو عقل ان سے متعلق صادر کر سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی حقیقت مدرک کی اشیا سے مختلف ہے۔ لیکن یہ واقعہ دلچسپ ہے کہ ہر اس فلسفے کے نزدیک کہ جس نے ان سائل کے حل کو تفصیلی انداز سے پہش کرنے کی کوشش کی یہ اشیا عام مدرک کے اشیا ہی کی مانند ہیں۔ اور اس طرح بونانی فلسفہ اور علم کلام دونوں ہی تجسمیت کا شکار ہو گئے۔

③، وجدان: وجدان یا اشراق^۱ ہے مراد وہ مفروضہ حق بینی ہے جو حواس اور عقل کی مدد کے بغیر عالم ثانی اور غیری حقیقتوں کے علم کا ذریعہ ہے۔ قوتیں رکھتا ہے جن کو بیدار کر کے وہ کچھ ایسی معلومات حاصل کر لے جو حواس کے ذریعے ممکن نہیں، لیکن یہ قوتیں بہر حال انسانی قوتیں ہیں اور عقل و حواس کی طرح یہ بھی محدود اور خطما پذیر ہیں۔ یہ حقیقت اس واقعے سے ثابت ہوتی ہے کہ اہل اشراق عالم ثانی کی جو تصاویر کھینچتے ہیں ان میں سے ہر ایک مختلف ہے۔ اگر وجدان خطما پذیر نہ ہوتا تو یہ اختلاف بھی ممکن نہ تھا۔

ہمارے نزدیک یہ بات تو صحیح ہو سکتی ہے کہ انسان کچھ ایسی مخفی قوتیں رکھتا ہے جن کو بیدار کر کے وہ کچھ ایسی معلومات حاصل کر لے جو حواس کے ذریعے ممکن نہیں، لیکن یہ قوتیں بہر حال انسانی قوتیں ہیں اور عقل و حواس کی طرح یہ بھی محدود اور خطما پذیر ہیں۔ یہ حقیقت اس واقعے سے ثابت ہوتی ہے کہ اہل اشراق عالم ثانی کی جو تصاویر کھینچتے ہیں ان میں سے ہر ایک مختلف ہے۔ اگر وجدان خطما پذیر نہ ہوتا تو یہ اختلاف بھی ممکن نہ تھا۔

درحقیقت انسان کی قوت عقلی ہو یا قوت روحانی کوئی بھی اس کے حواس اور خارجی موثرات کے اثر سے بالکلیہ آزاد نہیں۔ اس کے ماحول، اس کے افکار و عقائد اور ان مقدمات کا، جو اس کے یا اس کی جماعت اور قوم کے نزدیک مسلم ہیں، اس کی

۱۔ مصنف نے وجدان کا لفظ اشراق کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ یہ استعمال اس اصطلاحی مفہوم سے کچھ مختلف ہے جو علم کلام اور منطق میں اس اصطلاح کو حاصل ہے۔ علم کلام میں اس کا اصل مفہوم یہ ہے:

انسانی علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک بلا واسطہ اور دوسرا بالواسطہ۔ بالواسطہ علم کی قسموں میں سے ایک قسم وجدان ہے۔ ہر شخص کو اپنی کیفیات و حالات کھلالاتا ہے۔ اور یہ علم انسان کو اس زندگی کے پہلے لمحے سے علیہ ربانی کی حیثیت ملتا ہے۔ (مرتب)

تحقیقات اور مشاهدات پر ضرور اثر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشراقیوں کو اپنے کشف و مشاہدے میں کبھی یونانی و مصری اوہام کی تائید نظر آتی ہے اور کبھی فلسفہ^۱ یونان کے بہت سے مفروضات حقیقت نظر آنے لگتے ہیں۔

پھر اگر حامی کی صحت پورے طور پر تسلیم بھی کری جائے تو سوال یہ ہے کہ اس حامی کے محسوسات کیا ہیں؟ اس سے کن چیزوں کا احساس ہوتا ہے؟ اہل کشف کہتے ہیں کہ ایک نیا عالم نظر آتا ہے، نئی صورتیں اور نئے رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ان نئی صورتوں اور نئے رنگوں سے نہ تو زندگی اور موت کا مسئلہ حل ہوتا ہے نہ خدا کی صفات معلوم ہوتی ہیں، اور نہ ہی کائنات و انسان کا باہمی تعلق واضح ہوتا ہے۔ گویا بنیادی سوالات جوں کے توں رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہل اشراق نہ تو ان مسائل کا کوئی واضح جواب دے سکتے اور نہ کوئی مفصل اور مثبت نظام زندگی پیش کر سکتے۔ خود اپنی زندگی گذارنے کے لیے بھی انہیں اپنے ہی زمانے کے نظام کی اقدار مستعار لینی پڑتیں۔ چنان چہ ہر اکس^۲ اگر مصری رسم دینی اور مذہبی تقریبات کا پابند تھا تو جولین^۳ رومی بت پرستی کا۔ ویسے دونوں کا شمار اہل کشف میں کیا جاتا ہے۔

اس مختصر بعثت کا حاصل یہ ہے کہ انسان کی تمام ظاہری اور باطنی قوتیں، اس کے حواس، اس کی عقل اور اس کا حامی^۴ باطنی، اس کی زندگی کے اہم اور بنیادی سوالات کا صحیح جواب دینے سے قاصر ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ ان سوالات کے جواب کی کوئی راہ ہی نہیں۔ ان سوالات کا حل پیش کرنے کا دعوے دار ایک ایسا گروہ بھی ہوتا ہے جو اپنے آپ کو رسول اور نبی کہتا ہے اور اپنا ذریعہ^۵ علم وحی بتاتا ہے۔ چنان چہ آئئے، وحی اور رسول کی روایات کو بھی پرکھ کر دیکھیں کہ ان کا کیا مقام ہے۔

(۶) وحی: وحی نام ہے اس علم کا جو خداوند تعالیٰ اپنے بوگزیدہ بندوں پر انسانوں کی ہدایت و معرفت کے لیے منکشف کرتا ہے۔ دوسرے تمام انسانوں تک یہ علم روایت اور نقل کے ذریعے سے پہنچتا ہے۔ چنان چہ وحی یا به الفاظ دیگر رسالتی علم سے متعلق تین باتیں خصوصی ہیں:-

(۱) اس سے جو علم حاصل ہونا ہے وہ عام طور بر ان اشیا سے متعلق ہوتا ہے جو ظاہری حواس سے مخفی ہیں۔

مذہب اور دور جدید

(ب) اس علم کا ذریعہ عام ذرائع علم سے مختلف ہوتا ہے۔ اس میں نہ ادارک حستی ہوتا ہے اوز نہ استدلال منطقی، بلکہ ایک ناقابل بیان پیرائیے ہیں نہیں یک بیک نئے حقائق سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ ان حقائق سے زیادہ واضح ہوتے ہیں جن کا ہم اپنے حواس سے ادراک کرتے ہیں۔

(ج) الہامی علوم اشراق علوم کی طرح ہے معنی اور معاشری زندگی سے ہے تعلق نہیں ہوتے بلکہ وہ زندگی ہی کی ہدایت اور شرح کے لیے ہوتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے وہ ایک عملی نظام حیات کی بنیاد بنتے ہیں۔

آئے اب ان تینوں باتوں کو ذہن میں رکھ کر یہ غور کریں کہ ان میں سے کون سی خلاف عقل اور غلط منطقی ہے۔ کیا وہی کا مابعدالطبعیاتی اشیا سے علم فراہم کرنا غیر معقول ہے؟ اگر مابعدالطبعیاتی اشیا ہیں، جیسا کہ عقل عام اشارہ کرنے ہے کہ ہیں، تو پھر ان سے متعلق علم بھی یقینی ہو گا۔ کیا وہی کا ایک خاص طریقہ پر وارد ہونا غیر منطقی ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کائنات میں ہر جانب انسان کی ضروتیں اور آسانیوں کی تکمیل کا سامان بکھرا ہوا ہے۔ اس کی چھوٹی سے چھوٹی خواہش اور حقیر سے حقیر حاجت بھی ایسی نہیں جو اس دنیا میں پوری نہ ہو سکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک سہربان آفانے انسان کی تمام ضروریات اس کائنات میں سہیا کر رکھی ہیں۔ لیکن اس دنیا میں عام انسان کی سب سے اہم ضرورت— زندگی کے بنیادی مسائل کا حل — یہ ظاہر موجود نہیں۔ عقل اشارہ کرنے ہے اور فہم مطالیہ کرتا ہے کہ وہ سہربان آفانے جس نے ہر ضرورت کا سامان تکمیل بخشا، یہ نہیں کرسکتا کہ اس عظیم ضرورت کو تشنہ، تکمیل چھوڑ دے اور چوں کہ ضرورت عام طریقے سے پوزی نہیں کی جا رہی ہے اس لیے یقیناً اس کے لیے کوئی خاص طریقہ مخصوص کیا گیا ہے۔ پھر کیا یہ بات خلاف عقل ہے کہ الہامی علوم نظام زندگی کی بنیاد ہیں؟ جب وہی متعلق ہی آن اشیا سے ہے جو عین حیات ہیں تر پیر ظاہر ہے کہ وہی کا انکشاف کردہ عام بھی زندگی کی ددایات و قیادت کے لیے ہو گا۔ چنان چہ تاریخ گواہ ہے کہ الہامی علوم عملی طور پر بعض معاشروں کے نظامات زندگی کی بنیاد رہ چکے ہیں۔

وہی کی حقانیت: اب جب کہ یہ بات ثابت ہے کہ وہی کسی طور پر بھی خلاف عقل، و دانش نہیں تو ایک عاقل و دانشمند کے لیے یہی مناسب ہے کہ وہ الہامی علوم کی اسی طرح پر کہ کرے جیسے دیگر روایتی علوم کی کی جاتی ہے، اور اگر یہ علوم ہو کہنے پر صحیح ثابت ہوں، تو ان پر ایمان لائے۔

جب کسی شخص کے قول کی تصدیق یا تکذیب کرنی مقصود ہوئے تو ہمارے بیش نظر دو باتیں ہوتی ہیں۔ ایک قول نقل کرنے والے کی شخصیت اور دوسرے قول کے معنی۔ اُنے الہی کسوٹیوں ہر ہم رسول کے دیے ہونے علم دو بھی ہو رکھیں۔

کسی قول کی صحت کے لئے ضروری ہے کہ وہ انسانی تجربے اور مشاہدے کے خلاف نہ جاتا ہو۔ اگر کوئی شخص ہاتھی کو ہوا میں آڑتا اور چیل یا گبوتر کو پانی کی سطح کے نیچے تیرتا بتاتا ہے تو اس کا قول قابل اعتبار نہیں، اس لئے کہ عام انسانی مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ لیکن نبی جو چیزیں بتاتا ہے وہ با تو مابعدالطبیعیاتی ہیں، اور اس لحاظ سے تجربے اور مشاہدے کی قلمرو سے باہر ہیں، یا عقل و حواس کے عین مطابق ہیں۔ رسالت کی ہو روی ناریخ میں کسی نبی نے کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں کہی جو خلاف عقل ہو۔ ہاں ماورائے عقل بہت سی باتیں کسی گئیں، لیکن کبھی چیز کا عقل کی دسترس سے باہر ہونا اور بات میں اور اس کا خلاف عقل ہونا بالکل دوسری شے ہے۔

قول کی صداقت کا دوسرا معیار یہ ہے کہ ایک گروہ کے افراد جو ایک دی قسم کی اشیاء سے متعلق علم فراہم کرتے ہوں، ان کے اقوال آپس میں نکراتے نہ ہوں۔ انبیاء کرام کی تعلیمات اس بات کی شاہد ہیں کہ ان میں تضاد نہیں۔ تفصیلات میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اصول و مبادی ایک ہی ہیں۔

قول کی صحت کا تیسرا معیار یہ ہے کہ اس کو عملی زندگی میں اپنانے سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں ان کا جائزہ لیا جانے۔ اگر یہ نتائج خوشگوار اور انسانیت کے حق میں مفید ہیں تو گھان غالب ہے کہ قول صادق ہوگا اور بہ صورت دیگر باطل۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب کبھی بھی انبیاء کی تعلیمات دو قبول حاصل ہوا پذیک انسانی معاشرہ کی بیشتر خرابیاں دور ہو گئیں اور وہ بہت جلد عدل و انصاف کی نعمتوں سے ہم کنار ہو گیا۔

قول کو جائز لینے کے بعد قول نقل کرنے والے کی باری آتی ہے۔ آن دیکھنی چیز سے متعلق قول کی تصدیق یا تکذیب کرنے کے لئے راوی کی شخصیت کی پرکھ اور بھی ضروری۔ قول کی صداقت پر دو صورتوں میں اثر پڑ سکتا ہے ایک شعوری اور دوسرے لا شعوری۔

قول کو نسخ اور غیر معتبر سمجھنے جانے کی ایک صورت وہ ہے کہ جب راوی بد دیانت اور بد کردار ہو۔ ایسا شخص اپنے ذاتی منافع کے لئے یا تو اقوال

گھڑ سکتا ہے یا ان کو مسخ شدہ صورت میں پیش کر سکتا ہے۔ لیکن انبیا کے بارے میں ان کے دشمنوں کو بھی ان بات کا اقرار ہوتا ہے کہ وہ بلند کردار اور راست گو ہیں۔

قول کا مسخ ہو جانا لاشعوری طور پر بھی ممکن ہے۔ یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ راوی کے حواس درست نہ ہوں۔ لیکن انبیا کے بارے میں یہ حقیقت بھی مُسلم رہی ہے کہ وہ سلیم العقل، صحیح الدماغ اور صائب الرائے ہوتے ہیں۔

لاشعوری تسبیح و تبدیلی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ قول راوی کے زمانے کے تکنیکی علوم سے متاثر ہو۔ لیکن ہر نبی اگرچہ قائم اشیا سے متعلق کماختہ معلومات رکھتا ہے، لیکن وہ تکنیکی اور ادبی علوم سے نا واقف ہوتا ہے۔ یہ امر اس بات کی ضمانت ہے کہ اس کی تعلیمات اس کے اپنے یا کسی دوسرے زمانے کے علوم کا نتیجہ نہیں بلکہ حقیقتاً کسی غیر معمولی ذریعے سے اس پر منکشف ہوئیں اور بغیر کسی تبدیلی کے اس کی زبان سے جاری ہو گئیں۔

مذہب اور تمدن

اوپر کی بحث سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ زندگی کے بنیادی سائل کے حل کی واحد صورت وحی اور رسالت ہے۔ یہ نہ تو دیگر علوم کی طرح مادی اشیا تک محدود ہیں اور نہ خطا پذیر ہیں۔ اب ہمیں یہ دریافت کرونا ہے کہ وحی اور الہام کی بنا پر جو تمدن تعمیر ہوتا ہے وہ کس حد تک ان نظامیہاً حیات اور تمدنوں سے مختلف ہوتا ہے جو حواس، عقل، اور اشراق کی بنا پر وجود میں آتے ہیں۔ آئئے ہمیں آخرالذکر تین کا مطالعہ کریں۔

۱۔ حسی تمدن^۱ : حستی تمدن انسانوں کا مقبول ترین تمدن ہے۔ اس سے زیادہ سہل اور اس سے زیادہ انسانی خواہشوں کی تکمیل کرنے والا کوئی اور نظام نہیں۔ حسی تمدن کی بنیاد حواس اور اس کے فیصلوں پر ہے۔ حواس سے چون کہ صرف مادی اشیا کا ادراک کیا جا سکتا ہے اس لیے حسی تمدن کے نزدیک صرف وہ اشیا حقیقی ہیں جو قابل ادراک ہیں۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ وهم کا نتیجہ ہے۔ نہ کسی غیر مادی خدا کا کوئی وجود ہے اور نہ حیات بعد موت کی کوئی

Sensate Culture کا اصطلاح امریکی ماهر عرائیات پروفیسر سوروسکن سے مستعار ہے اور مادہ پرستہ تمدن کے لیے اس سے بہتر اصطلاح موجود نہیں۔ عرف عام میں اب سے تمدن کو مادی تمدن (Materialistic Culture) بھی کہا جا سکتا ہے۔ (مرتب)

کہ اپنے قبیلے کا نام روشن کریں تو آج کے روشن دور میں بھی حسی تمدن کے علم پردار اپنی قوم کی سرخوفی اور عظمت کی خاطر دو عظیم جنگوں میں کروڑوں انسانوں کا خون بہا چکے ہیں اور ان دو جنگوں میں صرفے والوں کی تعداد انسانی تاریخ کی باقی تمام جنگوں میں مقتولین کی مجموعی تعداد سے زیادہ تھی!

۲۔ عقلی تمدن: خاص عقلی تمدن کی مثال تاریخ انسان میں نہیں ملتی - اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ انسان اپنے افعال میں عاقل سے زیادہ غیر عاقل ہے - عقل سے بڑھ کر جذبات عمل کی بنیاد ہیں - ایسے تمدن جو عقلی کہلاتے ہیں صرف جزوی یا سطحی طور پر عقلی ہیں - حقیقت یہ ہے کہ معاشرت اور سماج تو دور کی چیزیں ہیں خود فلسفہ بعض اوقات عقلی نہیں رہتا - افلاطون اور ارسطو جیسے فلاسفہ، جو عقل کی اہدیت و عظمت کے معترض تھے، بہت سے نظریات میں یونانی اوہام کے پیرو تھے - مزید یہ کہ عقل، بجائے جذباتی اور وہی اجزاء تمدن کی تنقید کرنے کے، خود ان کی موافقت میں دلائل تلاش کرتی ہے اور اس کو اپنے حسی تمدن کا آلهہ کار بنا لیتی ہے - چنان چہ یونانی حکیموں نے اپنے زمانے کی ان تفریعات کے لیے، جن سے بڑھ کر خون آشامی اور شفاوت کا فعل نہیں ہو سکتا، کیا کیا تاویلات نہیں کیں اور اس کی معصومیت پر کیسے کیسے دلائل قائم نہیں کیے - جاہلیت عرب کی رسم دختر کُشی اور هندوستان کی ستی کی رسم سے متعلق اس زمانے کے عقلا نے کیا فلسفے نہ تراشے ہوں گے -

یورپ کے موجودہ تمدن کو عقلی اور علمی تمدن سمجھا جاتا ہے لیکن اس میں عقل کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ حسی تجربات پر صاد کرمے اور حسی خواہشات کی تکمیل میں مدد و معاون ہو -

۳۔ اشراقی تمدن: اشراق حواس پرستی اور مادیت کی بالکل نہ ہے - حواس پرستی میں جس طرح روح اور اس کے متعلقات کا انکار کیا جاتا ہے یا ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے، اشراق میں جسم اور مادیت کے خلاف جنگ کی جاتی ہے - اس کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ انسان کا جسم ایک نفس ہے جس میں طائفہ روح اصلی اور سرچشمہ حقیقی سے اس وقت تک انتہا پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ اس نفس سے آزاد نہ ہو - اس لیے یا تو نفس توز دیا جائے یا اس کی تیلیوں کو ہرواز کو سکے -

زندگی کے بنیادی مسائل اور آن کا حل

۲۶

اس فلسفے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ جسم اور اس کے متعلقات سے غفلت بری جائے۔ مادیت کا ہر طرح ازالہ کیا جائے اور تجرد و رہبانیت کی زندگی اختیار کی جائے۔ چنانچہ جن مذاہب اور اخلاقیات پر اس اشراق فلسفہ کا اثر پڑا ان کا تمدن یورپ ہے۔ مسیحیت بہت جلد مذہب عیسیوی کے نایابینوں اور علم برداروں کی کچھ فہمی کی بنا پر اشراقیت سے زیادہ راہبانہ اور غیر فطری نظام بن گئی۔ خواتین کے وجود کو دنیا کے لئے لعنت اور دینی ترقی میں سب سے بڑا مانع سمجھا جانے لگا، شہروں کو اجازہ کر صعرافوں میں زندگی بسر کرنا معراج انسانیت خیال کیا جانے لگا۔ جسم کُشی، خود آزاری اور خلاف فطرت ریاضتوں کے جو لرزہ خیز واقعات ایک نے تاریخ یورپ^۱ میں نقل کیے ہیں، ان سے ان بے اعتدالیوں کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے جو مسخ شدہ مسیحیت نے انسانیت و تمدن کے حق میں کیں۔

اس آدم بے زار اور مردم آزار نظام روحانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسیوی سلطنت اور مذہب کا جہاں جہاں اثر تھا وہاں تمدن کی بنیادیں ہل گئیں۔ ملک کی آبادی سرعت کے ساتھ گھٹئے لگی۔ امر ارض، اموات اور قحط سالیوں کی کثیر ہوف۔ تعلیم فنا ہونے لگی۔ شہریت کے آثار مفقود ہونے لگے۔ وسائل حیات برائے نام رو گئے۔ اور پوری مسیحی دنیا میں جہالت، وحشت اور تاریکی کا دور دورہ ہو گیا۔ بہاں تک کہ قرون وسطیٰ، قرون مظلمه^۲، کا ہم معنی قرار ہایا۔

زندگی کے بنیادی مسائل اور اسلام

آپ نے دیکھا کہ محض حواس، عقل یا اشراق ایک مکمل و متوازن معاشرہ قائم کرنے میں کس طرح ناکام رہے۔ آئئے اب ہم دریافت کریں کہ وحي والہام کس طور پر ایک ایسا معاشرہ ترتیب دینے میں کامیاب ہوتے ہیں جو عدل و انصاف سے معمور ہو۔ الہامی معاشرے کی اساس وہ حل ہوتا ہے جو انبیاء کرام زندگی کے بنیادی مسائل سے متعلق پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ الہامی تمدن کے مطالعہ سے پیشتر ان تعلیمات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ انبیاء کرام کی تعلیمات، جو قرآن ہاک میں محفوظ ہیں، زندگی کے بنیادی مسائل کا مندرجہ ذیل حل پیش کرتی ہیں۔

۱۔ حوالی کے لیے ملاحظہ ہو لیکی (Lecky) کی کتاب History of Western Morals اور Burnse کا حالیہ کتاب A History of Western Morals

(ا) انسان اور اس کی زندگی - انسان اور اس کی زندگی سے متعلق چار اعم

نکات واضح دیے گئے ہیں:

اول، انسان خدا کی مخلوق اور اس دنیا میں خدا کا نائب ہے۔

دونہ، وہ اسرف المخلوقات ہے، یعنی محض حیوان ناطق نہیں بلکہ دیکھ

مخلوقات پر اخلاق برتری رکھتا ہے۔

سونہ، انسان کی زندگی خدا کی عبادت کے لیے ہے۔ یعنی انسان کی تخلیق کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ وہ زندگی کے تمام شعبوں میں خدا کی دی ہوئی ہدایتوں پر عمل پیرا ہو، خواہ یہ سجود و قیام سے متعلق ہوں خواہ تجارت و سیاست سے۔

فَعَنْ يَعْمَلُ مِثْقَلَ ذَرَّةٍ خَيْرًا إِذَا هُوَ مَنْ يَعْمَلُ وَثَقَالَ ذَرَّةٌ شَرًّا إِذَا هُوَ
پس جس نے ذرہ بھر بھلانی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا
اور جس نے ذرہ بھر برالی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔
(الزلزال۔ ۸۰)

چہارم، انسان کی موجودہ زندگی کے بعد ایک اور زندگی آنے والی ہے جس میں موجودہ زندگی کے اعمال کی جزا یا سزا دی جائے گی اور ذرہ ذرہ کا حساب ہوگا۔

(ب) کائنات کی حقیقت - کائنات سے متعلق تین نکات قرآن پاک میں واضح کئے گئے ہیں۔

اول، انسان کی طرح ہرشے خدا کی تخلیق کردہ ہے، دونہ اس کائنات کا نظام خدا کے تعین کردہ اصول (سنت الله یا فطرت) کے مطابق چل رہا ہے، سونہ، یہ دنیا انسان کے استعمال اور تصرف کے لیے ہیدا کی گئی ہے۔ اور اس طرح انسان کے لیے آزمائش کا سامان بھی بھی پہنچاتی ہے۔

(ج) خدا اور اس کی صفات - خدا اور اس کی صفات سے متعلق قرآن پاک کے صفات بھرے ہوئے ہیں، جن کا احاطہ اس مختصر باب میں ممکن نہیں۔ صرف چند صفات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

اول، خدا وہ ہستی ہے جو اس کائنات کی واحد خالق، مدبیر اور آقا ہے۔ خدا نہ جسم رکھتا ہے اور نہ جسمانی حاجات۔ چون کہ اس کی مثال موجود نہیں اور چون کہ اس کی ذات کا ادراک حواس کے لیے ممکن نہیں، اس لیے خدا کا کوئی واضح تصور کوئی ذہن انسان ترتیب نہیں دے سکتا۔

خدا خالق و آقا ہونے کے ساتھ عادل و رحیم بھی ہے۔ اس کی صفاتِ ربویت، عدل اور رحم ہی کی بنا پر کائنات میں تنوع کے ساتھ ساتھ توازن و اعتدال ہے۔ وہ جس طرح جسمانی زندگی کا رب ہے، اسی طرح اخلاقی روحانی زندگی کا بھی رب ہے، اس کی صفتِ ربویت کا اور صفتِ عدل کا بھی تقاضا تھا کہ وہ اپنے بندوں کو راہِ ہدایت دکھاتا، چنان جہاں جو اس نے وہی کے ذریعے سے یہ راہ منکش ف کی اور صفتِ عدل کی بنا پر یوم آخر میں اچھے اور بدے کام کا بدلہ دے گا۔

اب ذرا اس الہامی تمدن کے عناصر ترکیبی کا تعزیز کر کے دیکھو گے کہ ان کا انسان کی عقلیت و نفسیت اور اس کے اخلاق و اجتماع پر کیا انقلاب انگیز اثر پڑتا ہے۔

سب سے بہلے اس عالم سے متعلق یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ نہ تو بے بادشاہ کی سلطنت ہے اور نہ چند بادشاہوں کی مشترک سلطنت بلکہ اس کا ایک ہی مالک ہے، جو اس کا خالق و صانع بھی ہے اور مدبر و حاکم بھی۔ اس کا سب سے بہلا اثر ذہن انسانی پر یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی خدا کے بندے ہونے کی حیثیت سے قبائل اور اقوام کی تقسیم ظاہری اور سطحی معلوم ہونے لگتی ہے اور انسانیت کے ایک وحدت ہونے کا بین راسخ ہو جاتا ہے۔ اس عالم میں زندگی کے با مقصد ہونے کا خیال اور آخرت کا احسان عمل کی اصلاح کا عظیم ذریعہ بتتے ہیں۔ انسان کو اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی معلوم ہوتا ہے۔ عیش و تفریح میں وقت ضائع کرنا برا معلوم ہوتا ہے۔ ظلم و نا انصاف سے طبیعت گھبراتی ہے۔ احسان ذمہ داری بڑھ جاتا ہے۔ انسان کا قتل تو بہت بڑی چیز ہے معمولی ایذا رسانی بھی ضمیر ہر بار گزرتی ہے۔

خلافت اور نیابت کا تصور حاکم کو من مانی کارروائی سے باز رکھتا ہے۔ وہ اپنے کو مخلوق خدا کا مالک اور آقا نہیں بلکہ خدا کا امین اور بندوں کا خادم سمجھتا ہے۔ وہ ہر لمحہ اسی فکر میں رہتا ہے کہ کہیں اس کے سلک میں ظلم و زیادتی را نہ ہاجائیں۔ عدل و انصاف کے نفاذ کے لیے وہ ہمہ تن اور ہمد وقت مصروف رہتا ہے۔ خلافت اور آخرت کے تصور سے جو احسان ذمہ داری انسان ذہن میں پیدا ہوتا ہے اس کی چند مثالیں الہامی تمدن کے دو ادوار سے پیش کی جاتی ہیں۔

ایک جلیل القدر خلیفہ، جو اپنے زمانے کے سب سے بڑے حکمران تھے، سوٹا جھوٹا پہنتے اور روکھا سوکھا کھاتے۔ اگر کوئی شخص کوئی لذیذ کھانا پیش کرتا تو پوچھتے کہ کیا سب مسلمان یہ کھاتے ہیں یا کھا سکتے ہیں؟ جب جواب نہیں ملتا تو کھانا واپس کر دیتے۔

کسی گھوڑا دوڑ میں ایک مصری نے کہا "واٹہ میرا گھوڑا آگے ہے"۔ قریب ہی گورنر مصر کا ایک بیٹا بھی گھوڑا دوڑا رہا تھا، اس نے مصری کے یہ کہنے پر ایک طانچہ مارا اور کہا "لو ایک شریف زادے کا یہ طانچہ"۔ اس مصری نے مدینہ بنیج کر خلیفہ سے شکایت کی۔ خلیفہ نے گورنر اور اس کے لڑکے کو مدینہ طلب کیا۔ جب وہ آگئے تو مصری کے ہاتھ میں گھوڑا دیا اور کہا "مار اس شریف زادے کو"۔ جب وہ لڑکے کو مار چکا تو کہا "اب یہی گھوڑا بیاپ کے سر پر کھا، اس لئے کہ اس لڑکے نے تجوہ کو جو طانچہ مارا تھا وہ محض اپنے باپ کی حکومت کے گھمنڈ میں مارا تھا"۔ پھر، آپ نے گورنر سے کہا "تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنایا حالانکہ وہ اپنی ماں کے پیٹ سے آزاد ہیدا ہوئے تھے"۔

ایک اور خلیفہ کی احتیاط کا یہ حال تھا کہ سرکاری کام کے لئے جو شمع جلتی تھی اس کی روشنی سے ذاتی کام نہ لیتے۔ اگر کوئی ذاتی گفتگو چھیڑ دیتا تو فوراً اس کو گل کر دیتے اور اپنا ذاتی چراغ منگوا لیتے۔

یہ ہے وہ مختصر ساختا کہ جس پر الہامی تمدن قائم ہوتا ہے۔ اس میں نہ حسی تمدن کی اغراض پسندی ہوتی ہے اور نہ اشراق تمدن کا ترکی دنیا۔ فتح ہستی کے بعد اپنے چند مستقل اخلاقی اصول ہیں جو وسیع تر انسانیت کے حق میں ہر طرح سے مفید ہیں اور جن کی پابندی ہر صورت میں ضروری ہے، خواہ حالات ازکار ہوں یا نا سازگار۔

زمانہ باتو نسازد تو با زمانہ ستیز

ترک دنیا اسلام کی نظار میں ایسا ہی بڑا ہے جسما دنیا کی مصروفیات میں غرق ہوجانا اور خدا کو بچوں جانا۔ اسلام معاشر قی زندگی کی اصلاح چاہتا ہے، اس کی بیان کرنی نہیں۔ اس لئے اس نے صاف طور سے اعلان کیا کہ "لارہبانیہ فی الاسلام" (اسلام میں رہبانیت نہیں)۔ چنانچہ اسلامی معاشرہ ان تمام برائیوں سے محفوظ رہتا ہے جو نفس کشی اور آدم بیزاری کا لازمی ثمر ہیں۔

اوپر کی یوری بحث سے ہم بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ:

(۱) عقلی تنقید سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ زندگی کے بنیادی مسائل کا حل صرف وحی اور رسالت کے ذریعے ممکن ہے؛

اور (۲) ان سائل کے مختلف جوابات ہر تحدی کی جو عمارت تعبیر ہوئی
ہیں ان میں سب سے مستحکم اور صحیح سند اور لیاقت بخش و تعلق ہے جس کی
بنیاد وہی وہ الہام ہے۔

مزید مطالعے کے لئے

مولانا سید ابوالحسن ندوی، مذہب و تہذیب ادارہ، نشریات اسلام
رحیم یار خان ۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلام اور جاہلیت۔ اسلامیک
پبلیکیشنز لائٹنڈ، لاہور ۔

مولانا مناظر احمد، گیلانی، الدین القیم (باب اول و دوم)۔ فقیہ اکھنسی
کراچی ۔

مولانا سید احمد اکبر آبادی وہی المی (باب اول و دوم)۔ نہودۃ الصنفین،
دہلی ۔

رشید رضا، الوحی المحمدی (ترجمہ مولانا رشید احمد ارشد)۔ فقیہ
اکڈیشن، کراچی ۔

* دور حاضر اور مذہب

مذہب کی ضرورت کا مسئلہ

مذہب ضروری ہے یا نہیں؟ یہ ظاہر یہ ایک سیدھا سا آسان سوال ہے۔ اس سوال کا جواب جب کوئی شخص اثبات میں دبتا ہے تو عام طور پر اس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ مذہب ایک طرف تو انسان کی انفرادی فلاح کا ضامن ہے اور دوسری طرف انسانی سماج مذہب کو اپناۓ بغیر بہبود نہیں پا سکتا۔ ان وجوہ کی بنا پر مذہب انسانی زندگی کے لیے لازمی ہے۔ یہ جواب ممکن ہے کچھ لوگوں کو صحیح معلوم ہو اور کچھ کو غلط۔ ممکن ہے یہ جواب دینے والوں کے پاس اس کے حق میں محکم دلائل ہوں اور اس کے انکاریوں کے پاس اس کے غلط ہونے کے۔ اس وقت ہمیں اس جواب کی صحت یا عدم صحت سے بحث نہیں بلکہ اس سوال کے ان معنی سے بحث ہے جو اس سے زیادہ بنیادی قسم کے جواب کے طالب ہیں۔ اس لیے کہ آج کا ذہن مذہب کے متعلق جس انداز سے سوچتا ہے اور اس کے بارے میں جوشکوک و شبہات دکھنا ہے وہ اس سوال کو کہ مذہب ضروری ہے یا نہیں؟ ایک سیدھے سادھے سوال کی سطح سے انہا کو ایک بنیادی قسم کا سوال بننا دیتا ہے۔ سیری مراد اس سے یہ ہے کہ مذہب کی ضرورت کے سوال کے پس منظر میں موجودہ ذہن خود مذہب کے 'جواز' کا طالب ہے۔ اس کے لیے یہ امر کہ مذہب انسان کی انفرادی یا سماجی زندگی کے لیے 'مفید' ہے یا 'مضبوط' ایک ثانوی درجے کا سوال ہے۔

* یہ باب فلسفہ مذہب پر ڈاکٹر مفتور جحمد کی ایک زیر ترتیب کتاب سے ماخوذ ہے۔ (مرقب)

بات در اصل یہ ہے کہ انیسویں اور بیسویں صدی کی سائنسی ترقیات اور عام علمی فضا نے موجودہ ذہن پر اس طرح اثر ڈالا ہے کہ مذہب کے بارے میں وہ سوالات جو کسی زمانے میں صرف فلسفیانہ - والات سمجھے جاتے تھے اُج کل عام ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔ یہ البتہ ضروری نہیں کہ اُج کے سائل کے ذہن میں ان سوالوں کے پیچھے کوئی فلسفیانہ پس منظر بھی کار فرما ہو۔ لیکن، چون کہ اس قسم کے سوالات اور شکوک و شبہات کی نوعیت فلسفیانہ ہے اس لیے مذہب کی ضرورت کا سوال ایک ایسے جواب کا مقاضی ہے جو فکری اور فلسفیانہ بنیادوں پر دیا گیا ہو۔ اسی لیے مذہب کی ضرورت کے مسئلے پر بات کرنے کے لیے کسی حد تک فلسفہ سے سروکار ناگزیر ہے۔

مذہب کی ضرورت کے خلاف اُج کل جو بات سب سے عام ہے وہ یہ خیال ہے کہ "اُج کا دور سائنس کا دور ہے اور اس میں مذہب کی کوئی گنجائش نہیں ہے"۔ یہ جملہ جامہ کوئی کہیے یا کسی کے دل میں یہ آن کہا خیال ہی کہٹکے، اس کا منشا عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ مذہب ہم سے جن چیزوں پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے وہ سائنس نے غلط ثابت کر دی ہیں۔ یا مذہبی تصورات غیر سائنسی تصورات ہیں۔ وہ لوگ جو اس خیال کے حامی ہیں ان کے نزدیک سائنسی تحقیق نے مذہبی حقائق کے بارے میں کچھ ایسے انکشافات کرے ہیں جن کی روشنی میں مذہبی حقائق پر ایمان لانا عقل کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ فی الحال ہماری بعث اس بنیادی مفروضے سے ہے جو "سائنسی دور میں مذہب کی گنجائش نہیں ہے" کے نعرے کے پیچھے کار فرما ہے اور جس کی بنا پر ہمارے ہوش مند سائنسدان اور فلسفی مذہب کو موجودہ دور میں باطل تصور کرنے ہیں۔ آگست کوئت نے، جو انیسویں صدی کا ایک عظیم فرانسیسی مفکر سمجھا جاتا ہے، اس مفروضے کو نہایت جامع طریقے سے پیش کیا ہے اور گویا ان سارے مفکروں کے منہ میں زبان رکھ دی ہے جو سائنس کی عظمت اور مذہب کی رجعت کے قائل ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ انسانی فکر تین ادوار میں منقسم کی جاسکتی ہے۔ مذہب اس فکر کا دور اولین ہے، دوسرا دور فلسفیانہ یا نابعدالطبیعیاتی ہے اور تیسرا سائنسی ہے۔ مذہبی تصورات کو کچھ تو دوسرے دور میں فلسفہ نے ختم کیا اور رہے سیئے اس تیسرا دور میں سائنسی طریق فکر کی آمد کے ساتھ ختم ہو گئے۔

اس اجمالی کی تفعیل یہ ہے کہ انسان جب شعور کی منزل میں قدم رکھتا

میں اور خود و فکر کی ابتداء کرتا ہے تو اس کے ذہن میں لازماً کچھ سوال ابھرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ خود کیا ہے؟ کتاب سے آیا ہے؟ یہ کائنات کیا ہے؟ یہ زمین و آسمان، یہ سبز و ماء، یہ ثوابت و سیارے کتاب سے آئے؟ اس کا اور اس کائنات کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ یہ کارخانہ قدرت کس طرح چل رہا ہے؟ وغیرہ۔ مفکریق کا عام خیال یہ ہے کہ مذہب، فلسفہ اور سائنس ان ہی سوالوں کے جواب میں پیدا ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان جوابوں میں ایک تاریخی ربط پایا جاتا ہے اور وہ اس طرح کہ ابتدائی آفرینش میں جب فکر انسان عہد طفیل سے گزر دھی تھی تو انسان میں کائنات میں ہونے والے واقعات کی توجیہ خیر مرف خدا، یا خداون کے توسط سے کرتا تھا۔ مثلاً بونا ف دیوبالا کائنات کی ہر قوت کے پیغمبر کسی دبوی یا دیوتا کا ہاتھ کار فرما دیکھتی ہے۔ دیوتاؤد کی یہ مجلس آسان ہر بیٹھ کر اس دنیا میں ہونے والے واقعات کا، چاہے وہ قدیق ہوں یا انسانوں کے پیدا کردہ ہوں (مثلاً کسی جنگ کا چہڑنا یا اس میں کسی کی قبح و شکست ہونا) فیصلہ کرتی ہے اور انسان ان آسانی بازی گروں کے ہاتھوں کٹ پتلی کی طرح ناجھی رہتی ہیں۔ فکر انسان کا یہ عہد طفیل جب ختم ہوا اور عنقران شباب کا زمانہ آیا تو کائنات کے واقعات کی توجیہ میں دبوی دیوتاؤد کی جگہ قوت، مادہ، شعرو وغیرہ قسم کے ما بعد الطبعیاتی تصورات نے لے لی۔ یہ زمانہ فلسفہ کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں ما بعد الطبعیاتی نظاموں نے اس کائنات اور انسان کے بارے میں سربوت اور مکمل قسم کے نظام پیش کیے، جن کے متعلق یہ سمجھا گیا کہ کائنات کے مسئلے کا حل ان نظاموں میں پوشیدہ ہے اور ہر واقعہ گی توجیہ ان نظاموں کی مدد سے سکن ہے۔ بونا ف عبد میں ارسطو اور افلاطون، یا زمانہ جدید میں هیکل کے نظام اس قسم کی عملی توجیہوں کی مثال کی حیثیت سے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ عہد بھی اقتضائے زمانہ سے ختم ہوا۔ انسانی فکر کو جب بالیدگی اور پختگی نصیب ہوئی تو اس نے کائنات کو اس کے صحیح ہس منظروں دیکھنا شروع کیا۔ یہ دور، دور جدید ہے اور اس میں واقعات کی توجیہ خیر مریٰ تصورات یا نظاموں کی مدد سے کرنے کے بجائے ان حقائق کی معرفت کی جاتی ہے جن کو انسان بہ چشم دیکھتا ہے اور جن کی پہنچا بہ عیلات و عیقل جیسے سائنسی قوانین وضع کرتا ہے۔ سائنسی طریقے کے اس نے تصور نے ایک طرف ما بعد الطبعیاتی نظاموں کی بے وقعتی کا پول کھوں دیا اور دوسری طرف مذہب کی ضرورت کو اس طرح باطل کر دبا کہ اب انسان کو ان

دور حاضر اور مذهب

۳۵

بنیادی سوالوں کا، جن کا ہم نے اوپر تذکرہ کیا ہے، جواب دینے کے لیے کسی مانعوں الفطرت ہستی کے افوار کی حاجت نہیں ہے۔

ایک بنیادی خلط بحث

اگر تاریخ فکر انسانی کے متعلق یہ مفروضہ صحیح ہے تو عصر حاضر کے انسان کو مذهب کی ضرورت کے تسلیم کرنے میں بجا طور پر تامل ہو سکتا ہے۔ لیکن، کیا یہ مفروضہ صحیح ہے؟ اولاً تو تاریخ فکر انسانی کا ایک سرسری مطالعہ ہے اس مفروضے کی صحت کے بارے میں شکوک پیدا کر دیتا ہے۔ انسان فکر کا تاریخی ارتقا اس طرح لگے بندھے ادوار میں منقسم نہیں علوم ہوتا جس طرح کومنٹ کا یہ اصول دکھاتا ہے۔ فکر انسانی کے ارتقا کا عمل اس طرح یک رُخا نہیں ہے، بلکہ یہ ایک نہایت پیچیدہ عمل ہے۔ اس عمل میں مذهب، فلسفہ اور سائنس، تاریخی اشیع پر یکرے بعد دیگرے اس طرح نہیں آتے کہ دوسرے کے آتے سے پہلا رخصت ہو جائے۔ مذهب، فلسفہ، اور سائنس تینوں اتنے اپنے زمانے کے لحاظ میں ہے بیک وقت ارتقا پذیر رہے ہیں۔ اور ایک دوسرے پر انداز بھی ہوتے رہے ہیں۔ اندازی کی صورت بعض اوقات تعاون کی شکل اختیار کر رہی ہے اور بعض اوقات پیکار کی۔ فلسفیانہ نظاموں کے دور میں، جس کو کومنٹ تاریخ فکر انسانی کا دوسرا دور قرار دیتا ہے، فلسفے نے مذهب کے لیے عقلی بنیادوں پر دفاعی نظام تیار کیے۔ اس لیے نہیں کہ وہ مذهب کی جگہ لے لیں بلکہ اس لیے کہ مذهب قبول کرنے میں عقل حارج نہ ہو۔ یعنی لوگ خلط فہمی کی وجہ سے فلسفیانہ نظاموں کو مذهب کا بدل قرار دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ فلسفے نے وہی کام سرانجام دیا ہے جو اس سے قبل مذهب کا تھا اور ان ہی سوالوں کے جوابات فراہم کیے ہیں جن کے جواب اس سے قبل مذهب نے دیے تھے، یا آج کل سائنس وہی کام سرانجام دے رہی ہے جو کسی زمانے میں فلسفے نے کرنے کی کوشش کی۔ مذهب، فلسفہ اور سائنس کے متعلق یہ غلط فہمی، جس کا ایک نتیجہ کومنٹ کا مندرجہ بالا مفروضہ ہے، ایک بنیادی قسم کے خلط بحث سے پیدا ہوتے ہیں کہ دو پہلو ہیں، اول یہ کہ مذهب، فلسفہ اور سائنس تینوں ایک ہی قسم کے بنیادی سوالوں کے جواب میں پیدا ہوتے ہیں اور ٹانیاً مذهب، فلسفہ اور سائنس تینوں ایک ہی قسم کے جواب فراہم کرتے ہیں۔

مذہبی، فلسفیانہ اور سائنسی سوالات کو ایک ہی قسم کے سوالات سمجھنے کا رجحان عام ہے اور کیا خاص اور کیا عام ہے اس غلط فہری کا شکار ہیں۔ علماء مذہب، اور سائنسدان خاص طور پر اور فلسفی عام طور پر، سوالے معدودے چند مستیوں کے، سائنسی، مذہبی اور فلسفیانہ سوالات کو ایک دوسرے میں ملا دینے میں کوفی حرج نہیں سمجھتے، اور مذہبی، سائنسی اور فلسفیانہ جوابات کو با توضیح پیرایہ بیان کا اختلاف سمجھتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں کہ فلسفہ اور مذہب کلی جواب فراہم کرتے ہیں اور سائنس جائز۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ہدایات کرے کہ "ہان کیسے بنائے؟" اور اس کا جواب دیا جائے کہ "ہان خدا نے بنایا ہے" تو یہ جواب اس سوال کے ایک خاص معنی کا جواب ہے جو دوسرے معنوں سے، جس کا جواب یہ ہے کہ "ہان ہائیروجن اور آکسیجن کے انتزاج کا نام ہے" قطعاً میز ہے۔ سوال کا اہم، سوال کی نعوی ترکیب اور الفاظ کے ایک ہونے سے پیدا ہوتا ہے، دراں حالیے کہ سوال کے دونوں معنوں میں زمین و آسان کا فرق ہے۔ اس لئے یہ کہنا بجا نہیں ہے کہ سوال فی الاصل ایک ہی ہے، صرف اس کے جواب کے دو مختلف پیرائے ہیں۔ حقیقت یہ دو مختلف سوال ہیں جن کے دو مختلف جواب ہیں اور یہ دونوں جواب نہ تو ایک دوسرے کا بدلتے ہیں، نہ صرف پیرایہ بیان میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور نہ ہی ایک جواب جائز ہے اور دوسرا کوئی جائز ہے۔ سوال کے دونوں معنوں کا منشا مختلف ہے اور دونوں جوابوں سے جو نتائج نکلتے ہیں اور زندگی پر جس طرح انداز ہوتے ہیں وہ بھی مختلف ہیں۔

یہ بحث کہ سوال کے معنوں کا یہ اختلاف سوال کو دو علیحدہ علیحدہ سوال بنادیا ہے، یا یہ صرف جواب کے پیرایہ بیان کا اختلاف ہے محض لفظی بحث نہیں بلکہ ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ اس کی اہمیت اس سے واضح ہے کہ اسی اہمam کے نتیجے میں کومت نے مذہب کے جواز کو چیلنج کیا اور اسی کے نتیجے میں سائنسدان مذہب کی 'ضرورت' کے انکاری بن گئے۔

دوسرا غلطی، یعنی مذہبی، سائنسی اور فلسفیانہ جوابوں میں صرف پیرایہ بیان کا مختلف ہونا یا ایک کا جائز ہونا اور دوسرے کا کلی ہونا، پہلی غلطی کا لازمی نتیجہ ہے۔ آگست کومت کا مفروضہ اسی غلطی پر مبنی ہے وہ سمجھتا ہے کہ فلسفہ، مذہب کا اور سائنس، فلسفہ کا بدلتے ہو سکتے ہے اور وہ اس لئے کہ، مثلاً وجود خدا کے بارے میں مذہب، مابعدالطبیعتیات اور سائنس

دُور حاضر اور مذہب

۴۷

جو کچھ کہتے ہیں وہ ایک ہی قسم کی باتیں ہیں جو مختلف انداز میں کہی گئی ہیں۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ مثال کے طور پر فلسفہ کو لیجئے۔ خدا کے وجود کے بارے میں فلسفہ میں دلیلوں کی کمی نہیں، اور ایسے فلسفی بہت کم ہیں، جو خدا کے وجود کے منکر ہوں۔ مگر کس خدا کے؟ انسان سے کسی نہیں کہ یہودیوں نے اسے کو دھرت کے الزام میں مرتد قرار دے دیا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مذہب، فلسفہ اور سائنس جس خدا کے بارے میں لب کشان کرنے ہیں اس میں صرف لفظ خدا ہی مشترک ہوتا ہے۔ وہ شنے جس کو یہ تینوں ایک ہی نام سے موسوم کرتے ہیں اپنی صفات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے اتنی مختلف ہوئے کہ اس کو وہی خدا سمجھنا جو مذہب کا خدا ہے۔ محل نظر معلوم ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فلسفہ اور سائنس نے خدا کے مذہبیں تصور سے بعثت کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ آیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان دونوں مفہومیں کے برخلاف کی نوعیت مذہب سے اس درجہ مختلف ہے کہ نتیجتاً مذہبی تصورات ان کے ہاتھوں قلب ماہیت کر کے فلسفیانہ یا سائنسی تصورات بن جاتے ہیں۔ اس قلب ماہیت کے ما بعد یہ کہنا مذہب دیتا تھا، یا یہ کہنا کہ قانون علیٰ العیل اب وہ منشا پورا کر سکتا ہے جو نظام فلسفیانہ کرتا تھا، مذہبی، فلسفیانہ اور سائنسی حقائق سے چشم بھوٹی کرتا ہے۔

مثال کے طور پر جولین هیکسلے کے اس بیان کو لیجئے :

”نیشن نے دکھا دیا ہے کہ کوئی خدا نہیں ہے، جو سیاروں کی گردش پر حکومت کرتا ہو۔ لاپلاس نے اپنے مشہور نظریے سے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ فلک نظام کو خدائی مفروضی کی کوئی ضرورت نہیں۔ ذاروق اور ہاستیور نے بھی کام حیاتیات کے میدان میں لیا ہے اور موجودہ صدی میں علم النفس کی ترقی اور تاریخی معلومات کے اضافے نے خدا کو اس مفروضہ مقام ہے ہذا دیا ہے کہ وہ انسان زندگی اور تاریخ کو کنٹرول کرنے والا ہے۔“

دُور حاضر اور مذہب

۴۷

جو کچھ کہتے ہیں وہ ابک ہی قسم کی باتیں ہیں جو مختلف انداز میں کہی کئی ہیں۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ مثال کے طور پر للسنه کو لیجئے۔ خدا کے وجود کے بارے میں فلسفہ میں دلیلوں کی کمی نہیں، اور ایسے فلسفی بہت کم ہیں، جو خدا کے وجود کے منکر ہوں۔ مگر کس خدا کے؟ انسان سے کسی نہ عال، لیکن اسپینتوزا کے خدا ہو۔ اور اسپینتوزا کے متعلق یہ کسی کو معلوم نہیں کہ یہودیوں نے اس کو دھرت کے الزام میں مرتد قرار دے دیا تھا۔ اکثر کرنے ہیں اس میں صرف لفظ خدا ہی مشترک ہوتا ہے۔ وہ شنے جس کو یہ تینوں ایک ہی نام سے موسوم کرتے ہیں اپنی صفات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے اتنی مختلف ہوئے کہ اس کو وہی خدا سمجھنا جو مذہب کا خدا ہے مل نظر معلوم عوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فلسفہ اور سائنس نے خدا کے مذہبی تصور سے بعث کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ خدا کا تصور فی الاصل فلسفہ اور سائنس دونوں کے پاس مذہب کے راستے سے آیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان دونوں مضامین کے برخلاف کی نوعیت مذہب سے اس درجہ مختلف ہے کہ نتیجتاً مذہبی تصورات ان کے ہاتھوں قلب ماہیت کر کے فلسفیانہ یا سائنسی تصورات بن جائے ہیں۔ اس قلب ماہیت کے ما بعد یہ کہنا مذہب دیتا تھا، یا یہ کہنا کہ قانون علیٰ العیل اب وہ منشا ہوا کہ سکتا ہے جو نظام فلسفیانہ کرتا تھا، مذہبی، فلسفیانہ اور سائنسی حقائق سے چشم ہوئی کرنا ہے۔

مثال کے طور پر جولین مکسلے کے اس بیان کو لیجئے :

”نیون نے دکھا دیا ہے کہ کوئی خدا نہیں ہے، جو سیاروں کی گردش پر حکومت کرتا ہو۔ لاہاس نے انہی شہر نظریے سے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ فلکی نظام کو خدائی مفروضی کی کوئی ضرورت نہیں۔ ناروف اور ہاستیور نے یہی کام حیاتیات کے میدان میں کیا ہے اور موجودہ صدی میں خلم النفس کی ترقی اور تاریخی معلومات کے اضافے نے خدا کو اس مفروضہ مقام ہے ہٹا دیا ہے کہ وہ انسان زندگی اور تاریخ کو کنٹرول کرنے والا ہے۔“

ذرا اس عبارت پر خور کریجئے اور دیکھئے کہ جس خلط بحث کا ہم نے اوہ تذکرہ کیا ہے وہ اس ادعا میں ہو ری طرح جلوہ گو ہے۔ ہم منظر میں مذہبی اور سائنسی مسائل ایک دوسرے میں الجھے ہونے ہیں۔ اس بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا سائنس کی ابتداء مذہب ہے ہوئے ہے اور مذہبی، تصورات، ابتدائی سائنسی تصورات ہیں جن کو نئے مشاہدوں اور تحقیقات نے اس طرح باطل ثابت کر دیا ہے جس طرح کوہر نیکس نے بٹلیوس کی فلکیات کو یا آئینستان کے نظریہ اضافت نے نیون کے قوانین حرکت کو۔ ہکسلے کے نزدیک گویا خدائی مفروضہ صرف فلکی نظام کو سمجھنے کے لیے اختیاع کیا گی تھا، یا اس کی حیثیت 'قوت' کے ایک تصور ہے، جو سیاروں کی گردش کے بیچھے کار فرما ہو، زیادہ نہ تھی۔ یہ شک اگر خدا قرون اولیٰ کا ایک سائنسی تصور تھا تو ہکسلے کا یہ کہنا بھاگ ہے کہ "نیون نے دکھا دیا ہے کہ کوفن خدا نہیں ہے۔" لیکن مذاہب جس خدا پر ایمان لائے کا مطالبہ کرتے ہیں وہ بعض کائنات نظام کے بیچھے کار فرما "قوت" کے تصور سے قطعاً مختلف ہے۔ کہا اس خدا کے متعلق بھی نیون نے کوفن اپسی شہادت پیش کی ہے جو یہ "دکھلا دے، کہ یہ خدا بھی نہیں ہے؟ یا خود سائنس اس خدا کے پارے میں کوفن حکم لگا سکتی ہے؟"

سائنس کے حدود کا ر

سائنس کہا ہے اور اس کے حدود کا ر کیا ہیں؟ مختصرًا یہ کہا جاسکتا ہے کہ سائنس کے حدود کا ان سوالوں سے متعین ہوتے ہیں جن کے جواب دینے کا سائنس دعویٰ کرنے ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوہر بھان کیا ہے کہ جب کوفن یہ دریافت کرتا ہے کہ پانی کیسے بنا، اور اس سوال سے اس کی منشا یہ ہوتی ہے کہ جواب دینے والا پانی بننے کے واقعہ کا تجزیہ کر کے یہ بتلانے کہ جس مرکب کا نام پانی ہے اس کی ترکیب کن عناظم سے عومنے ہے، اور ان عناظم کو ہام ملائی کا طریقہ کیا ہے، وغیرہ، تو سوال کا یہ منشا جواب کو واقعات، ان کے مشاہدے اور ان کے درمیان علت و علل کے رشتہوں کی دریافت تک محدود کر دیتا ہے۔ سائنس کا کام ف الحقيقة یہی ہے۔ ان حدود سے آگے بڑھ کر جب کوفن سائنس دان ان مسائل کے بارے میں کلام کرتا ہے جو واقعات اور ان کی تحلیل و تجزیہ کے علاوہ ہیں تو ایک دوسرے میدان میں قدم رکھتا ہے، جو سائنس کا میدان نہیں ہے اس دوسرے میدان میں اس کے ادعا کی صحت یا عدم صحت سائنسی

دور حاضر اور مذهب

۲۹

واقعات سے متعین نہیں کی جا سکتی۔ دوسرے الفاظ میں سائنس جو کچھ ہے، اس کا تجزیہ و تحلیل کر سکتی ہے۔ اس کا مدار ان معلومات پر ہے جو انسان کے حواس، شاہدے میں آتی ہیں۔ مذہب کے بنیادی حقائق مثلاً خدا، آخرت، نبوت، بارے میں کوف حکم نہیں لکا سکتی۔ مثلاً بعض اس علم کی بنیاد ہر کے ساروں کی گردش ایک قانون کی پابند ہے، با اس کائنات میں مختلف اشیاء ایک خاص ارتقائی ترتیب میں پائی جاتی ہیں، یہ نتیجہ نہیں نکلا جاسکتا کہ خدا کا وجود باطل ہے، یا حیات بعد موت ناممکن ہے۔ سائنس جو کچھ بتا جاتی ہے، یا بتا سکتی ہے، وہ حقائق کی کسی قانون کے تحت تشریع ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

سائنس اور مذهب کے تعلق کے بارے میں ایک اصولی بات تھی ایکن بہاں اور ایک شبہ یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ مان نہیں کے بعد کہ سائنس کا دائرة کر جو اسی حسی تجربے سے چند ایسے حقائق کے خلاف ثابت ہوتے ہیں (یا ہو سکتی ہیں) جن کا مذہب مدعی رہا ہے۔ یہ شبہ اس وجہ سے اور قوی ہو جاتا ہے کہ مذہبی کتابوں میں بعض باتیں خود کائنات اور اس دنیا کے واقعات سے متعلق ہیں جن کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے۔ لہ وہ سائنس کی رو سے خلاف واقعہ ہیں۔ چون کہ یہ باتیں سماںدار حقائق سے متعلق ہیں اس لیے ان کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ سائنس کے دائیرہ کا راستے باہر ہیں قریب قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ مثال کے طور پر فرض کر لیجئے کہ کسی مذہبی کتاب میں اس کائنات کے متعلق یہ بیان موجود ہے کہ 'زمین سائنس ہے اور اس نظام شمسی کے مکر میں واقع ہے'، لیکن سائنسی معلومات اس کے خلاف ہیں، تو یہ ظاہر اس مذہبی کتاب میں لکھا ہوا یہ ایک بیان تو باطل ہو گیا۔ اب اگر مذہبی کتابیں وہی الیں ہیں اور اس وہی میں سے ایک حصہ خلاف واقعہ ہے تو کتاب کے باقی حصوں کے متعلق انسان کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ لہ سکن ہے یہ بھی غلط ہوں۔ مزید اس سے یہ وہم بھی پیدا ہوتا ہے۔ لہ جس خدا کو عالم الغیب کہا جاتا ہے وہ واقعاً ایسا نہیں ہے۔ دونوں صورتوں میں ایمان کی بنیاد ہیل جاتی ہے، مذہب کے بوجن ہونے کا تصور ماند پڑ جاتا ہے اور ان چند علی باتوں کی وجہ سے انسان مذہب کو تسلیم کرنے سے انکار پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

مذہب ہر اس قسم کے اختراضات کی ایک تاریخ ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جن باتوں پر اب تک سائنس نے اختراض کیا ہے وہ ہر مذہب میں شترک ہو۔ یہ ایک الیہ ہے کہ از منہ، وسطی میں یہودی اور خیانتی علماء نے ہندیموسکی فلکیات اور ارسطو کی سائنس کو مذہب کا ایک لازمی جزو سمجھ لیا تھا۔ مغوب میں نشانہ ثانیہ کے بعد سائنسی انقلاب کے ساتھ یہ پرانے سائنسی تصورات سنبھال ہونے تو علمائے مذہب نے ان کو مذہب کے خلاف سائنس کا ایک حربہ متصور کیا اور یہ جانا کہ مذہبی عقائد سائنس کی تحقیقات کی گرمی سے موں کی طرح پکھل جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پررب میں اس زمانے میں مذہب اور سائنس ایک دوسرے سے بوس رہا ہے۔ اس حالت کے پیدا ہونے کی ذمہ داری زیادہ تو ان علمائے مذہب پر ہے جنہوں نے مذہبی عقائد کی فہرست میں ایک خاص زمانے کی سائنسی معلومات کو بھی شامل کر دیا اور ان کو خدا اور آخرت پر ایمان کی طرح ایمانیات کا ایک لازمی جزو بنادیا۔ مسلمانوں کی بدقدامتی یہ تھی کہ یہ دور مسلمانوں کے زوال اور مغرب کے عروج اور غلبے کی ابتداء کا زمانہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے پانچویں اور چھٹی صدی میں یونانی تصورات کو جس تعلیقی قوت کے ساتھ قبول کیا تھا وہ اس دور میں سائنسی تصورات کے قبول کرنے میں ناپید تھی۔ مسلمانوں کی اس علمی اور تہذیبی مغلوبیت کا اثر یہ ہوا کہ سائنس اور مذہب کی جنگ کا یہ تصور بعینہ مسلمانوں میں بھی در آیا، دراں حالی کہ اسلام کو سائنس سے مقابلے میں وہ مسائل پیش نہیں آتے جو اس سے قبل دوسرے کتابی مذاہب کو پیش آئے ہیں۔

ف الوقت اس بحث سے ہارا منشا دوسرے مذاہب کے مقابلے میں اسلام کی برتری ثابت کرنا نہیں ہے اور نہ ہی اس بات کا اظہار مقصود ہے کہ اسلام ہم سے کسی ایسے غنیمتے پر ایمان لانے کا مطالبہ نہیں کرتا جو کسی سائنسی حقیقت کے خلاف ہو۔ ممکن ہے اسلامی تعلیمات میں کوئی شخص اس قسم کی بات لانکالی جو بظاہر کسی سائنسی تحقیق کے خلاف معلوم ہو۔ بہاں ہمیں صرف اس تضاد کی نوعیت سے بحث کرنا ہے جو کسی سائنسی مشاہدے اور اس مشاہدے سے متعلق کسی مذہبی قول کے مابین پایا جاتا ہے یا پایا جا سکتا ہے۔

سائنسی مسائل اسلامی فکر میں

فرض کیجئے نہ بہ بات باس ہو جی ہے کہ آسان صحیفے میں مذکور ہے کہ 'زمین ساکن ہے اور نظام شمسی کا مرکز ہے' ۱۱ یا کسی خلاف عادت واقعے یا معجزے کا ذکر ہے اور بہ کہ اس صحیفے کے وحی الہی ہونے میں بھی شبیہ کی کوفی گنجائش موجود نہیں ہے۔ ایسی صورت میں کوبرنیکس کے سائنسی مشاہدے یا قانون علت و علل اور اس مذہبی بیان میں تطبیق کس طرح ممکن ہوگی؟ کیا ہم اس صورت میں مذہبی بیان کو خلاف واقعہ یا غلط کہہ سکتے ہیں؟ اس قسم کے سوالوں کے علمائے مذہب نے کئی طرح جواب دیے ہیں مثلاً:

(۱) سائنس انسانی علم ہونے کی وجہ سے غلطی کرسکی ہے، اس لیے ہر سائنسی مشاہدے میں غلطی کا امکان ہے۔ اس کے برخلاف صحفہ آسمانی عالم الغیب کی دی ہوئی کتابیں ہیں اور علم الہی میں غلطی کا امکان نہیں ہے۔

(۲) سائنس حسی تجربے اور مشاہدے پر مبنی ہے، اور حسی تجربے اور مشاہدے میں 'یقین' نہیں ہوتا۔ بہ انسان کو زیادہ سے زیادہ ظن و تغییر کی منزل تک لے جانا ہے، اس لیے ہم کسی سائنسی حقیقت کے بارے میں بہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ حقیقی طور پر صحیح ہے۔

(۳) مذهب اور مذہبی عقائد کا سامنہ ایمان سے متعلق ہے اور ایمان انسان کی ایک داخلی کیفیت کا نام ہے۔ اس داخلی کیفیت کا مدار نہ کسی خارجی واقعے پر ہے اور نہ منصوب دلائل اور ثبوت پر۔ یہ دینِ خداوندی ہے، جس کو یہ دولت میسر آجائے اس کے لئے دلائل اور مستجدات بے معنی ہو جاتے ہیں۔

(۴) مذہبی کتابوں کی زبان استعاراتی ہے۔ ان کتابوں میں خرق عادت واقعات یا معجزات، یا اسی قبیل کے مشاہدات، کے معنی المفظی نہیں ہوتے بلکہ ان سے چند ماؤرا حقیقتیں مراد ہوتیں ہیں۔ جن کو عوام نہیں سمجھ سکتے۔

اسی قسم کے جواب مختلف مسائل کے ضمن میں تاریخ فکر اسلامی میں موجود ہیں۔ یہ جواب اپنے زمانے اور سیاق کے اعتبار سے لوگوں کو مطمئن ۱۔ یہ مثال میں نے محض ایک مفروضے کے طور پر لے اور اس کا مقصد ایک نیابان قسم کے تضاد کو سامنے لانا ہے۔

مذہب اور دوڑ جدید

کرنے والے ہیں اور ان میں کسی نہ کسی حد تک حق و صواب بھی موجود ہے۔
لیکن ہر زمانے کے عقلی تقاضے مختلف ہوتے ہیں اور یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک
ہی قسم کا علم کلام ہر زمانے کے لئے موزوں ہو۔ آج کل مذہب پر جس قسم
کے اعتراض کیتے جاتے ہیں ان کے لئے یہ جواب ناکافی اور غیر اطمینان بخش ہے۔
موجودہ تعلیم یا نئے انسانِ محض، اطمینانِ قلبی، یا خاطر مذہب کے بارے میں
سوالات دریافت نہیں کرتا۔ اس کی ذہنی کیفیت، براہیمی، نہیں ہے۔ یہ تو
سادی اور سفری تعلیم کا پیدا کردہ انسان ہے، جو مذہبی تشکیل کا شکار ہے۔
اور جس کے ذہنی ہس منظر میں مذہب اور سائنس کی چشک کام کر رہی ہے۔
ایسے انسان کی عقل ان جوابات کو قبول کرنے کے لئے مستعد نہیں ہوئے، چاہے
وہ بادل ناخواستہ اسلام کا معتقد ہی کیوں نہ ہو۔

اس وقت ان دلائل کے حُسن و قبح کا تفصیلی جائزہ مقصود نہیں ہے بلکہ
صرف ان وجہوں کی طرف اشارہ کرنا ہے جن کے باعث موجودہ ذہن ہر ان کی گرفت
ذہلی ہو گئی ہے۔ پہلی قسم کے جواب کو لیجئے۔ یہ صرف ان لوگوں کو
مطمئن کر سکتا ہے جن کے لئے مذہب کی ضرورت اور جواز کا وہ سئلہ ہے کہا ہی
نہیں ہوتا جس سے عام طور پر آج کا مُنشکیک دوچار ہے۔ یہ جواب اپنی
بگہ چاہے ایک حقیقت ہر ہی کیوں نہ مبنی ہو، اس کی حیثیت ایک
عقیدے کے ادعا سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ صرف ایسے ذہنوں کو اپیل
کر سکتا ہے جن کا اس عقیدے پر ایمان بختنہ ہو۔ لیکن جب کسی سائنسی
مشاعرے کی وجہ سے خود خدا کے وجود پر، یا اس کی صفات کے تصورات پر
اعتراض کی ضرب ہڑے تو اعتراض کرنے والے کا شک یہ نہ ہے کہ رفع نہیں کیا
جاسکتا کہ خدا کے علم میں خلطی کا اسکان نہیں ہے۔ وہ تو خدا کے بارے میں میں
شک ہو چکا ہے اور ساتھ ہی اس بات کو تسلیم کرنے سے انکاری ہے کہ
اس موقع پر انسانی مشاعرے غلطی کر رہا ہے اور اس بات کا مدعی ہے کہ اس
باب میں وہ اپنے سائنسی مشاعرے کو چھوڑ کر ایک مذہبی مفروضے کو تسلیم
نہیں کر سکتا۔ مثلاً اگر کسی کے پاس ایک طرف تو اس بات کی شہادتیں موجود
ہوں لہ زمین اس نظام شمسی کا مرکز نہیں ہے اور دنحرک ہے اور دوسری طرف
کوئی مذہبی عقیدہ اس کو یہ باور کرا رہا ہو کہ اس کا یہ علم مبنی ہر حقیقت
نہیں ہے۔ بلکہ زمین ساکن ہے اور نظام شمسی کا مرکز ہے، تو ایسا شخص
نہیں ہے اس مذہبی عقیدہ کو تسلیم نہیں کر سکے گا۔

دوسرًا جواب خالص فلسفیانہ ہے۔ ایک معنی میں یہ کہنا درست ہے کہ

حسی تجربہ اور مشاہدہ انسان کو 'اخلبیات' سے روشناس کرتا ہے اور 'تینقات' کا علم نہیں دیتا۔ لیکن ان معنوں میں 'اغلب' اور 'یقین' کے ایک خاص سائنسی یا فلسفیانہ معنی ہیں۔ 'اغلبیت' کا سائنسی تصور ایک ریاضیاتی تصور ہے۔ جس کی رو سے سائنسی علم کو 'اغلب' کہنے سے متاثرا ہے کہ کسی سائنسی کائنے کی صحت کا انحصار ان عوامل کے علم پر ہوتا ہے جن کی بنیاد پر وہ کایہ وضع کیا گیا ہے۔ جوں کہ ہم کو تمام عوامل کا علم کلی طور پر نہیں ہوتا، اس لئے اس کہنے کو (با کسی مشاہدے کو) 'اغلب' کہنا زیادہ صحیح ہے۔ ان معنوں میں 'اغلبیت' ایک اضافی قدر ہے۔ اس کی نسبت اولاً 'تین' کے اس مثالی تصور سے ہے جس کی رو سے ہمارا کل سائنسی علم 'اغلب' کہلاتا ہے اور ثانیاً خود کسی سائنسی علم کے داخلی نظام سے ہے۔ اس ثانوی نسبت کی وجہ سے ایک ہی سائنسی علم کو 'اغلب' اور دوسرے میں 'یقینی' ہو سکتا ہے۔ سائنسی علم کو 'اغلب' کہنے سے بعض اوقات اس کا مقابلہ استخراجی علم سے کرفنا مقصود ہوتا ہے جہاں عقلی توانی کے تحت چند دلیل ہونے قصیبیوں سے حد دیا گوا ایک نتیجہ 'یقینی' کہلاتا ہے جب کہ خود وہ قضیات 'اغلب' ہو سکتے ہیں۔

یہ موقعہ اس بیان کی تفصیل کد نہیں ہے۔ جو بات اوپر بیان کی گئی ہے اس کا خلاصہ صرف اس قدر ہے کہ سائنسی علم کا 'اغلب' ہونا ایک خاص معنی رکھتا ہے جس کی بنیاد پر یہ کہنا کہ سائنس ہم کو مذہب کے مقابلے میں صرف 'اغلب' سے روشناس کرنا ہے قیاس مع الغارق ہے۔ 'اغلبیت' کے اس تصور کا البتہ ایک دوسرا فلسفیانہ پہلو بھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ خود حسی مشاہدہ قابل بھروسہ اور لائق اعتبار نہیں ہے جو لوگ حسی مشاہدہ کے ناقابل بھروسہ ہونے کا تصور پیش کرتے ہیں وہ النیاس، خواب اور نومہت کی دنیا سے مثالیں دے کر یہ بتلاتے ہیں کہ خارجی اشیا ہم کو جس طرح سے وہ ہیں اسی طرح نظر نہیں آتیں۔ جھملاتے ستارے، قوس قزح، بانی میں بڑی سیدھی لکڑی جو نہیں نظر آتی ہے اور اسی قبیل کے دوسرے مشاہدے ان لوگوں کی نظر میں اس بات کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ حسی علم حقیقت کا غلط فاپنڈہ ہوتا ہے۔ سائنس جو صرف حسی مشاہدے کا علم عطا کرتی ہے، پھر کس طرح یہ دعوی کر سکتی ہے کہ اس کا دیا گوا عام یقینی اور ہنسی طور پر صحیح ہے؟

یہ دلیل بجائے خود صحیح نہیں ہے۔ اگر ڈارے حسی مشاہدے میں

بعض باتیں شایط ہوتی ہیں تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ ہماری ادراک قابل اعتبار نہیں ہے۔ لیکن اس قسم کی دلائل، جو مدعیان مذہب کی طرف سے دی جاتی ہے، اگر صحیح بھی ہو تو ایک ایسی دو دھاری تلوار ہے جس کی کاٹ تمام علوم انسانی ہر ہڑتی ہے اور بالآخر کسی بھی علم کے پارے میں، چاہے وہ مذہبی علم ہی کیوں نہ ہو، ہمارے پاس یہ کہنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا ہے کہ یہ علم یقینی اور حتمی ہے۔ اس باب میں امام غزالی کا ایک بیان نہایت معنی خیز ہے، اگرچہ عام طور پر یہ بیان بر عکس معنوں میں استعمال ہوتا رہتا ہے۔ امام غزالی 'المنفذ من الضلال' میں لکھتے ہیں:

"جب میں نے خور کرنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ اس قسم کا یقینی علم صرف محسوسات اور بدبیات کا حاصل ہے، لیکن جب کہ و کاؤش زیادہ بڑھی تو محسوسات میں بھی شک ہونے لگا۔ مثلاً سایہ بہ ظاہر سا کن نظر آتا ہے لیکن تجربے و مشاهدے سے ثابت ہوا کہ وہ سا کن نہیں، بلکہ آہستہ آہستہ حرکت کر رہا ہے۔ محسوسات ہر یقین نہ رہا تو بدبیات ہر بھی اعتہاد نہیں رہا۔ مثلاً یہ بدبیتی ہے کہ دس کا عدد تین کے خذل سے زائد ہے۔ لیکن جب محسوسات کے متعلق عقل نے فیصلہ کر دیا کہ وہ قابل اعتہاد نہیں ہیں تو ممکن ہے کہ عقل کے اوپر بھی ایک درجہ ہو جو فیصلہ کر دے کہ بدبیات بھی قابل یقین نہیں ہیں۔ مثلاً یہ، لیکن جب بیدار ہوتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ ان محسوسات و معموقلات کو یقینی سمجھتا ہے ممکن ہے اس کے بعد اس پر ایسی حالت طاری ہو جائے جس سے اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بیداری بھی ایک خواب تھی جس میں اس نے جن جیزوں پر یقین کیا تھا وہ قابل اعتہاد نہ تھیں یہ"۔

اپ کو معلوم ہے کہ امام غزالی تشکیک کے اس بعمر طلمات سے کم طریقے ہے؟ اس دلیل سے نہیں کہ چون کہ ہمارا علم غیر یقینی ہے، خدا کا علم یقینی ہوتا۔ تشکیک کے اس مرحلے پر ہمچن کر دلائل اور عقل سے کار ہو جاتے ہیں۔ جس شخص نے اس طریقہ تشکیک کو دلیل کی حیثیت سے استعمال کیا گواہ اس نے ہر قسم کی دلیل کی جڑ کاٹ دی، اور ایمان کے معاملے کو افہام و تفہیم کیفیت اس کو ایمان لانے پر مجبور ہکرنے کی تو وہ مومن ہو جائے گا۔ ورنہ اس

دُورِ حاضر اور مذہب

وہ اس بات کو کیوں قبول کرنے لگا کہ کوئی شخص خدا کا نبی ہی ہو
سکتا ہے۔ اس کو اس گمان سے کیوں کر نجات مل سکے گی کہ جس کلام
کو کلام الہی سمجھ کر وہ سن رہا ہے اور جس شخص کو نبی کی ذات کی
حیثیت سے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور جس کی صفات ہر اس کی عقل
گواہی دے رہی ہے، مسکن ہے وہ سب ام، واقعہ نہ ہو بلکہ خواب ہو اور
حقیقت سے متغیر ہو۔

امام غزالی کا یہ طرز فکر ہم کو تیسری قسم کے جواب سے روشناس کرتا
ہے جو یہ کہتا ہے کہ مذہبی عقائد کا معاملہ اپنے سے متعلق ہے اور اپنے
انسان کی ایک داخلی کیفیت یا وجود ان کا نام ہے۔ جو کہ یہ وجود اپنے
ہی مقولات کا متحمل نہیں ہوتا، اس لئے مذہبی حقائق کی تفہیم میں عقل یا
ہم دونوں بے کار ہیں۔ البتہ نفسیاتی طریقوں سے اکثر انسانوں میں ہے اس عدداد
سیروگی کے ساتھ اس کیفیت کے حصول کے لئے آمادہ ہوں۔

ظاہر ہے کہ اس حقیقت سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اکثر انسانوں
بیدا ہونے سے پہلے اور اس کے بیدا دوڑ کے بعد کا مسئلہ سراسر عقلی ہے اور
افہام و تفہیم پر منحصر ہے۔ وجود ان کے بیدا ہونے دوں قبل اس طرح کہ جس نکی
مذہب اور مذہبی طرز فکر کی قدر و قیمت کا اندازہ انسان کو نہ ہو وہ اس سیروگی
کے لئے تیار نہ ہوگا جس کا مطالبہ یہ طریق کار کرنا ہے۔ پھر اس وجود کے
حصول کے بعد تو معاملہ سراسر افہام و تفہیم کا ہی رہ جانا ہے اس لئے کہ یہ
وجود فی نفسه دوسرے نک متنقل نہیں ہو سکتا، البتہ اس وجود کی معرفت
جو علم حاصل ہوتا ہے اس کی تبلیغ سعکن ہو سکتی ہے۔ اور اس علم کی تبلیغ
میں اور عقلی مقولات پر منحصر ہے۔ اگر وجود ہی کافی ہوتا تو انبیائے کرام
کو نہ تبلیغ کا حکم ملتا، اس لئے کہ تبلیغ وجود کی نہیں کسی پیغام کی ہوتی
ہے، اور نہ ہی خدا اپنے بندوں سے تعلق اور تفکر کا مطالبہ کرتا۔

اس طرز فکر میں کہ اپنے کا معاملہ وجود اپنے متعلق ہے دراصل
دو باقی ایک دوسرے میں مذہب ہیں۔ ایک یہ ہے انسان لانے کا عمل عقل را
علم پر منحصر نہیں ہے بلکہ یہ ایک وجودی کیفیت کا نام ہے اور یہ وجودی کیفیت

علم کے باوجود ناپید ہو سکتی ہے۔ دوسری یہ کہ مذہبی حقائق کا ادراک اور تفہیم عقل کے ذریعے مسکن نہیں ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ایمان ایک کیفیت کا نام ہے جو علم کے باوجود مفقود ہو سکتی ہے لیکن بعض کسی کیفیت کے موجود ہونے سے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ کیفیت کسی شے سے متعلق ہے۔ خدا ہر ایمان کی کیفیت کا موجود ہونا اس بات کا مقامی ہے کہ انسان کو علم ہو کہ یہ ایمان کیفیت ایسے ذات سے متعلق ہے جو تمام صفات کمالیہ سے منصف ہے۔ یہ علم بعض 'کیفیت' عطا نہیں کرسکتی۔ اس کے لیے 'کیفیت' سے آزاد ذرائع علم کا ہونا ضروری ہے۔ ان وجہ سے یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ مذہبی حقائق کا معاملہ ایمان سے متعلق ہے۔ اس لیے کہ ایمان ان حقائق کی نوعیت ہر گھوٹ روشنی نہیں ڈالتا ابھ ان کو انسانی زندگی میں جاری و ساری کرنے میں مدد ضرور دے سکتا ہے۔

جہاں تک مذہبی حقائق کے ادراک اور تفہیم سے بالا ہوتے اور عقل کا ان معاملات میں ہے چارہ ہونے کا سلسلہ ہے تو یہ بات اس لیے درست نہیں۔ ہو سکتی کہ اگر انسان کی سمجھو سے کوفی شے اس طرح ماورا ہے کہ اس کے متعلق انسان کوفی عقلی گفتگو نہیں کرسکتا تو اس پر ایمان لانے کا مطالبہ تکلیف سالابیطاق ہے۔ یہ بات اسلامی تعلیمات کے پس منظر میں اس لیے بھی درست نہیں ہو سکتی کہ اسلام اکثر آفاق و انسن کی شہادتوں کو دلیل کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اور انسان عقل سے مطالبہ کرتا ہے کہ ان دلائل کی بنا پر وہ مذہبی حقائق، مثلاً: وجود باری اور یوم آخرت کا اقرار کرے۔

مسئلے کا چوتھا حل یہ نقطہ نظر پیش کرتا ہے کہ قرآن کی زبان استعارات ہے اور جہاں کہیں قرآن میں یہ ظاہر خلاف واقعہ یا خلاف عقل باتیں معلوم ہوئے ہیں وہاں ہر ان الفاظ کے ظاہری معنی مراد نہیں ہوتے، بلکہ ان کے پس پردہ ایک دوسرے معنی ہوتے ہیں جن کو یہ نظر غائر معلوم کیا جاستا ہے ظاہری اور باطنی معنی کی اس ثبوت کی ایک لمبی تفصیل ہے جو مذہب کی نیجری تعبیرات یہے لے کر مذہب کے متصوفانہ اسرار و رموز تک وسیع ہے۔ مسئلے کے اس حل میں خرایی گی کئی صورتیں پوشیدہ ہیں۔ اس طرح ایک طبق تو مذہب ایک چیستان بن جاتا ہے اور دوسری طرف تعبیرات کی ایسی کھلی چھٹی ملتی ہے کہ انسان کا طباع ذہن کسی آبٰت کا ابھی میلان کے مطابق ہو

چاہے مطلب حاصل کرسکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے دینی کتابوں میں مبینہ خلاف واقعہ یاتوں کی موجودگی سے عاجز ہو کر استعارات اور تعبیرات کی دنیا میں پناہ لینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ دنیا اتنی وسیع ہے کہ اس میں دین کی بنیادی حقیقتیں بھی بالآخر استعاراتی بن جاتی ہیں۔ ایسے موقعہ ہو خدا، آخرت، وحی، غرض کون سی ایسی حقیقت ہے جو استعارات کا روپ نہیں دھار سکتی۔

میرا منشا یہ نہیں کہ قرآن میں کسی جگہ بھی استعارات انداز سے گنتگو نہیں کی گئی ہے۔ یا کسی جگہ بھی تعبیر کی کنجائش موجود نہیں ہے اور ہر جگہ الفاظ کے ظاہری معنی ہی اصل معنی ہیں۔ میرا منشا صرف اس قدر ہے کہ استعارات تصور فکر اسلامی کی تاریخ میں جماں بھی استعمال ہوا ہے اس آزاد روی سے استعمال ہوا ہے کہ اس سے تعبیرات کے اختلاف کا ایک ایسا دروازہ کھل سکتا ہے جس کا بند کرنا ناممکن ہے۔ اور نتیجتاً ایسی بعید از قیاس تعبیرات پیدا ہو سکتی ہیں جو انسانی ذہن کی جدت طرازی پر تو دلالت کرنی ہوں لیکن جن کی وجہ سے قرآن کا منشا الفاظ کے گور کوہ دھندوں میں کم ہو جائے۔ خاص طور پر تعبیرات کا یہ عمل جب کسی ایسی آیت کے متعلق ہو جس میں بہ ظاہر کسی امر واقعہ کے خلاف کوئی بات موجود ہو تو یہ زیان و بیان کے ساتھ کھلی زیادتی کی شکل اختیار کرایتا ہے اور یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ گویا خدا اپنے منشا کے اظہار پر قادر نہیں ہے۔ ایک شک کو رفع کرنے کا یہ طریقہ اس طرح ایک دوسرے شک کا پیش خیمه بن جاتا ہے۔

مسئلے کا حل

سوال یہ ہے کہ اگر آج کے سائنسی فکر سے متاثر ذہن کے لیے مسئلے کے حل کے چاروں انداز غیر تسلی بخش ہیں تو پورا اس مسئلے کا تسلی بخش حل کیا ہو سکتا ہے؟ آپ کو یاد ہوگا کہ مسئلہ اس قسم کا تھا کہ فرض کر لیجئے کہ کسی الہامی کتاب میں واضح طور پر بیان ہے کہ 'زمین ساکن ہے اور آفتاب اس کے گرد گردش کر رہا ہے'۔ اگر فہم انسان ان چاروں روایتی طریقوں سے اس بیان کا کوئی جواز پیش نہیں کر سکتی تو پھر کیا اس کے انکار کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ یا یہ کہ انسان کو عقل سلیم اور مذہب کے مابین تنافض کو تسلیم کر لینا چاہیے اور مسئلے کے حل کی کوشش سے ہاتھ اٹھا لینا چاہیے؟

سذہب اور دور جدید

۳۸

در اصل اس مسئلے کے حل کی متذکرہ بالا کوششوں میں وہی خلط بجھ موجود ہے جس کا ہم نے اوپر تذکرہ کیا ہے۔ ان میں ایک بنیادی قسم کی بات سے صرف نظر کیا گیا ہے اور نتھیتاً ایک غلط قسم کے سوال کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ ایک بیش با افتادہ سی بات ہے کہ الہامی کتابیں بنیادی طور پر انسانوں کی ہدایت کے لئے نازل کی گئی ہیں۔ لیکن یہ بات اپنے عواقب کے اعتبار سے بہت اہم اور معنی خیز ہے۔ مشہود کا ایک پہلو یہ ہے کہ ہدایت کے ضمن میں اگر کسی فطری واقعے کی طرف کوئی اشارہ کیا گیا ہے تو اس سے کسی سائنسی حقیقت کا اظہار مقصود نہیں بلکہ ایک معروف حسی مشاهدے کو ایک بالکل دوسری قسم کی حقیقت کے لئے دلیل کے طور پر پیش کرنا ہے۔ ایک لحاظ سے اس قسم کا استدلال صوری استدلال سے مشابہ ہے جہاں اشارات کی تبدیلی استدلال پر اثر انداز نہیں ہو۔ رسمی حسی مشاهدے تو الہام کا موضوع ان کی صحت یا عدم صحت سے بحث کرنا نہیں ہے اس لیے کہ ان کے استعمال کی نوعیت عموماً یہ ہوئی ہے کہ ان سے مخاطب میں انفس و آفاق کی آیات کو ایک خاص نقطہ نظر سے دیکھنے کا شعور بیدار کرنا اور ایک خاص ذہنی کیفیت کا پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی سائنسی مفروضے کے حق میں یا اس کے خلاف الہامی کتابوں میں ثبوت کو تلاش کرنا ایک بنیادی قسم کی غلطی ہے۔ البته یہی حسی مشاهدے اگر کسی سائنسی کتاب میں موجود ہوں تو اس مشاهدے کی صحت یا عدم صحت ایک طرف تو ان نتائج، مقاصد یا دلائل پر اثر انداز ہو سکتی ہے جن کے لئے یہ مشاهدہ استعمال کیا گیا ہے اور دوسری طرف اس قسم کے مشاهدات کی عدم صحت کا ثبوت شاحد کی علمی غلطی کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔

یہاں ایک شبہ یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ بالفرض آزاد علمی ذرائع سے الہامی کتابوں میں بیان کردہ کسی حسی واقعے کی خدا ناخواستہ غلطی بھی ثابت ہو جائے تو کیا اس سے خدا کے عالم الغیب ہونے کے تصور پر کوئی حرف آتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ الہامی کتابیں صرف ان باتوں کو اپنے استدلال میں استعمال کریں گے جو اس زمانے کے علم کے مطابق ہوں اور ایک معروف حقیقت کی حیثیت سے تسلیم شدہ ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو تو مخاطب کا ذہن استدلال کے اصل منشا سے ہٹ کر انک ایسی بات کی طرف متوجہ ہو جائے گا جس کی صحت یا عدم صحت اس استدلال سے غیر متعلق ہے۔ اگر نعروہ کے دربار میں حضرت ابراہیم کا مطالبه

یہ ہوتا کہ ”میرا خدا تو زمین کو سورج کے گرد گھماتا ہے، تو ذرا سورج کو زمانے میں بے معنی ہوتا۔“ تو یہ خطاب آج کل بامعنی ہونے کے باوجود اس پر منکشf ہوئی جو سورج کے زمین کے گرد گھومنے اور سورج کے مشرق سے نکلنے کے سائنسی فرق سے باخبر ہوں۔ اور یہ کس کو معلوم نہیں کہ الہامی ہدایت کرچکرے ہوں بلکہ خاص و عام سب ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف حضرت ابراہیم کا استدلال کہ ”خدا تو سورج کو مشرق سے لاتا ہے، تو اس کو مغرب سے لے آ“ جس طرح اس زمانے میں بامعنی نہا اسی طرح سائنسی تحقیقات کے علی الرغم آج کل بھی بامعنی ہے۔ موجودہ دور میں اگر کوئی یہ کہیے کہ ’خدا سورج کو مشرق سے نکالتا ہے‘، اور اس کا یہ جواب دیا جائے کہ ’مگر سورج تو کسی طرف سے نہیں نکلتا، صرف زمین اس کے گرد گھومتی ہے‘، تو یہ جواب اس بیان کے اس مفہوم سے جس کا اظہار قائل کرنا چاہتا ہے ناواقفیتی دلیل ہے۔ یہاں مستعلہ یہ نہیں ہے کہ زمین اور سورج میں کون سا کن ہے اور کون روان بلکہ یہ ہے کہ آیا کارخانہ قدرت کے پیغمبر کوئی خداں قوت کار فرمایا ہے یا نہیں اور اس مستعلہ سے سورج اور زمین کی فی نفسہم حرکت غیر متعلق ہے۔

مزید مطالعے کے لیے

مولانا ممتاز احسن گیلانی، الدین القيم (باب اول و دوم)۔ نفس اکٹیمی، کراچی۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، دین حق۔ اسلامک پلیکیشنز لمبیڈ، لاہور۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تتفیعات۔ اسلامک پلیکیشنز لمبیڈ، لاہور۔

عبدالوحید خان، علم جدید کا چیلنج۔ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ۔

امام غزالی، مرکذشت غزالی۔ ادارہ نقدانت اسلامیہ، لاہور۔

محمود علی، دین و دانش۔ امرتسر۔

A. K. Brohi, *Islam in the Modern World*. Chiragh-e-Rah Publications, Karachi.

Dr. M. Iqbal, *Reconstruction of Religious Thought in Islam*. (Ch. 7) Ashraf Publications, Lahore,

مذاہب عالم: ایک نقاوی مطالعہ*

مذہب کی تعریف

مذاہب عالم کی کثرت اور ان میں خاکید و اعمال کے تنوع کی وجہ سے مذہب کی کوئی جامع و مانع تعریف کرنا مشکل ہے۔ اس کی مختصر اور سادہ ترین تعریف ای - بی - ٹیلارنے کی ہے: "مذہب روحانی موجودات پر اعتقاد کا نام ہے"۔ اس تعریف کی رو سے ہم دنیا کے بے شمار مذاہب کا جوہر سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن کئی مذاہب ایسے بھی ہیں (مثلاً ابتدآ بدھ مت اور کنفیوشا مَت) جن میں ایمان و عقاید کی چندان اہمیت نہیں اور جن کو ہم زیادہ سے زیادہ ایک با اخلاق زندگی گذارنے کا ضابطہ کہہ سکتے ہیں۔ غالباً اسی کے پیش نظر میتھیو آرنلڈ نے مذہب کو جذبات سے متاثر اخلاق یا جذباتی اخلاق کہا ہے۔ پروفیسر واٹھ ہیڈ لکھتے ہیں "مذہب اعتقاد کی امن قوت کا نام ہے جس سے انسان کی اندر وہ پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔ مذہب ان صفاتوں کے مجموعہ کا نام ہے جن میں یہ قوت ہوتی ہے کہ وہ انسانی کردار میں انقلاب پیدا کر دیں"।

* یہ مقصودون جناب ظفر آفاق انصاری، مددگار لکچر اپشاور یونیورسٹی، نے اس کتاب کے لیے بطور خاص مرتب کیا ہے۔ اس کی ترتیب میں جن کتب سے استفادہ کیا گیا ہے وہ یہ ہیں: (۱) مذاہب عالم از جناب احمد عبدالحکیم المدرسی؛ (۲) اسلام اور مذاہب عالم از مظہر الدین صدیقی؛ (۳) تفسیر القرآن از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی؛ (۴) ترجمان القرآن جلد اول از مولانا ابوالکلام آزاد؛ (۵) النبی الخاتم از مولانا مناظر احسن گیلانی؛

E. R. Pike, *Encyclopaedia of Religion and Religions* (-)

E. A. Jurji, (Ed.), *Great Religions of the World* (-)

(مرتب) Horace Shipp, *Religions that Moved the World* (-)

بے شرطے کہ انسیں خلوص کے ساتھ قبول کیا جائے اور بصیرت کے ساتھ سمجھا جائے۔“

✓ مذہب کا ارتقا

مذہب کے آغاز کے بارے میں اس وقت دو تصورات پائے جاتے ہیں - ایک ارتقائی تصور اور دوسرا وہ تصور جو خود مذاہب نے پیش کیا ہے۔

مذہب کے ارتقائی تصورات کی رو سے انسان کی ابتدا گمراہی اور لا علمی سے ہوئی اور پھر رفتہ رفتہ انسانوں نے ^۱کشرکابنہ خدا پرستی اور توحید پرستی اختیار کرلی - اس عمل کی تفصیلات میں کالی اختلافات ہیں - مثلاً کچھ کا خیال ہے کہ اس کی ابتدا آباو اجداد کی محبت سے ہوئی اور کچھ دوسرے مذہب کی ابتدا مظاہر فطرت مثلاً رعد و برق کے خوف سے کرتے ہیں - ان کا خیال ہے کہ انسان نے ابتدائیں ماہنی جہالت کم وجہ سے مظاہر فطرت کی پرستش شروع کر دی اس لیے کہ ابتدا میں اس کی زندگی و موت کا دارومند ابہت حد تک ان پر تھا؛ مثلاً زلزلے، طوفان، سیلاب، آتش فشانیاں وغیرہ - لیکن جیسے اس کا علم بڑھتا گیا اس نے محسوس کرنا شروع کر دیا کہ یہ خدائی قوتیں نہیں رکھتے - ابتدا میں لوگوں نے ہر چیز کو دیوتا بنایا تھا لیکن علمی ترق کے ساتھ ساتھ خداون کی تعداد کم ہونے لگی بہاں تک کہ صرف ایک خدا رہ گیا۔

اس کے برخلاف مذہبی نقطہ نظر یہ ہے کہ خدا نے جب انسان کو اس دنیا میں بھیجا تو ساتھ ہی اس کی تمام جسمانی ضروریات کی طرح اس کی روحانی ضروریات (ہدایت) کا بھی سامان کیا - پہلا شخص جسے خدا نے بھیجا ہدایت یافتہ بلکہ پیغمبر تھا - اس کے بعد بھی لوگوں میں جب گمراہی پہلی تو خدا نے پھر پیغمبر بھیجے جنہوں نے دنیا کو راہ ہدایت دکھائی - اس اعتبار سے توحید قدیم ہے اور شرک جدید - اس وقت دنیا میں جتنے بڑے بڑے مذاہب ہیں (عیسائیت، یہودیت، اسلام، وغیرہ) ان کے داعی خدا کے پیغمبر ہی تھے - اور اس بنا پر ابتدا ان کی تعلیمات، جزوی فرق کو چھوڑ کر، یکسان تھیں۔ بعد میں (اسلام کو چھوڑ کر) ہر مذہب کے پیروؤں نے اپنے اپنے مذہب میں تراجم کر لیں - آگے چل کر ہم نے عیسائیت اور یہودیت کے جو عقاید بیان کیے ہیں وہ در حقیقت وہ عقاید نہیں ہیں جو ان مذاہب کے پیغمبروں (حضرت عیسیٰ

مذہب اور دور جدید
میں تعریفات و ترمیمات کے بعد بن گئے ہیں بلکہ وہ ہیں جو بعد

۵۲

علیہ السلام و حضرت موسیٰ علیہ السلام) نے پہش کیے تھے بلکہ وہ ہیں جو بعد
علم انسان کی جدید تحقیق کے بعد بہت سے مغربی ماہرین بھی اپنے ارتقائی
 نقطہ نظر کو چھوڑ کر مذہبی نقطہ نظر کو ماننے پر مجبور ہو گئے ہیں - پروفیسر

شمس کے کہنے کے مطابق:

”علم شعوب و قبائل انسان کے پورے میدان میں اب پرانا ارتقائی
مذہب بالکل ہے کار ہو گیا ہے۔ نشوونما کی مرتب کڑیوں کا
وہ خوش نما سلسلہ جو اس مذہب نے پوری آمادگی کے ساتھ تیار
کیا تھا اب نکلے نکلے ہو گیا ہے اور نئے تاریخی رجحانوں نے
اسے انہا کر پہنچ دیا ہے۔“

بھی مصنف ایک اور جگہ لکھتا ہے:

”اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ انسان کے ابتدائی تصور کی
اعلیٰ تربیتی ہستی فی العقیقت توحیدی اعتقاد کا خدا نے واحد تھا
اور انسان کا دینی عقیدہ جو اس سے ظہور پذیر ہوا وہ پوری طرح
ایک توحیدی دین تھا۔“ (صفحہ ۲۶۶)

مذاہب کی تعداد کا تعین بڑا دشوار ہے۔ اس لیجے کہ ابھی ہمیں پوری
دنیا کے لوگوں کے متعین حالات کا بھی پتہ نہیں لیکن کہا جا سکتا ہے کہ اس
وقت دنیا میں اگر لاکھوں نہیں تو ہزاروں مذاہب کے پیرو موجود ہیں۔
ان میں سے کچھ مذاہب کے پیروؤں کی تعداد کروڑوں تک پہنچتی ہے اور بعض
مذاہب صرف سو دو سو افراد کے قبیلوں تک محدود ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے
مذاہب میں سے ہم صرف ہندوست، بدھ مت، یہودیت، عیسائیت اور اسلام پر
اس باب میں گفتگو کریں گے۔

۱- مذہب کے آغاز کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر یہی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام
ولے کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک سب انبیاء نے ایک ہی دین کی تبلیغ کی اور
وہ دین اسلام ہے۔ دوسری قوموں نے اصل دین کو بگاڑ دیا اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے
نبی پیغمبر تاکہ اصل حدایت دوبارہ انسانوں تک پہنچائیں۔ اور یہ دین اپنی آخری
شكل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ہم تک پہنچا ہے اور اپنی آخری
شكل میں محفوظ ہے۔ (مرتب)

Schmidt, P. W., The Origin and Growth of Religion

یہ اور اس کے بعد کا اقتباس مولانا ابوالکلام آزاد کی 'ام الکتاب' میں فرمائی گئی تھی۔
مزید تفصیل کے لیے مولانا کی کتاب میں 'قرآن اور صفات الہی کا تصور' کے باب
ملاحظہ کیجیے، بالخصوص اس کا ابتدائی حصہ۔ (مرتب)

ہندو مذہب کی تاریخ اور اس کے بنیادی عقائد کی نشاندہی نہ صرف غیر ہندو اہل علم، بلکہ ہندوؤں کے لئے بھی ایک مشکل مسئلہ رہی ہے۔ اس لئے کہ اس مذہب کے پیروؤں میں ایک سے لے کر تیس کروڑ تک خداوؤں کے مانے والے پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور بسا اوقات متناقض عقاید رکھتے ہیں۔ اس تنوع سے ہندوؤں نے بڑا فائدہ انہا یا ہے اور یہ شعار تنے نئے گروہوں کے عقاید کے لئے گنجائش پیدا کر کے انہیں ہندوؤں میں شامل کر لیا ہے۔

ہندوؤں کا مذہب بہت ہی قدیم ہے، اس کی اولین شخصیات اور تاریخ ہر گم ناسی کے بڑے دبیز پرڈے پڑے ہونے ہیں، لیکن ایک عام خیال یہ ہے کہ ہندو مت کا آغاز اس وقت سے ہوا جب آریاؤں نے ہندوستان پر حملہ کیا (قریباً ۱۷۰۰ ق.م)۔ آریاؤں کے حملے سے ہمیں بہلے بہانہ دراوڑی نسل کے لوگ آباد ہئے جن کی عظیم الشان تہذیبوں کے نشان اب بھی مونین جو دارو، ہڑپا اور دیگر بے شمار مقامات پر ملتے ہیں اگرچہ ان کے مذہب کے بارے میں ہماری معلومات بہت قطعی نہیں ہیں۔ آریاؤں کے حملے کے نتیجے کے طور پر یہ لوگ بڑی تعداد میں مارے گئے یا محکوم بنالیے گئے۔

اسی زمانے میں "ویدوں" کی تصنیف عمل میں آئی۔ ان کا زمانہ تصنیف ۱۵۰۰ ق.م کے لگ بھگ بتایا جاتا ہے۔ ان کتب میں دنیا ہے فرار اور دنباوی لذات سے کناہ کشی کی تعلیم ملتی ہے۔ اس دور میں کسی ایک طبقے کی شیادت کے آثار نہیں ملتے لیکن رفتہ رفتہ ہندوؤں میں ذات ہات کا امتیاز پیدا ہونا شروع ہوا۔ ان کے چار طبقے ہو گئے جن میں سب سے بہتر برہمن، اور سب سے کم ترشودر قرار پائے۔ اس ذات ہات کی بنیاد پیدائش ہے۔ یعنی جو شخص برہمن پیدا ہوا وہ خواہ کتنے ہی خراب کام کرے برہمن ہی رہے گا اس لئے کہ "برہما" (خالق کائنات) نے اسے اپنے سر سے پیدا کیا ہے۔ دوسری مختلف ذاتوں کو اس نے اپنے دوسرے اعضائے جسم سے پیدا کیا ہے۔ چھتریوں کو اپنے بازوؤں سے، ویشوں کو اپنے شکم سے، شودروں کو اپنے قدموں سے۔ اسی اعتبار سے ان ذاتوں کے کام معین ہوئے: برہمنوں کا کام تعلیم علم، پوجا پاٹ اور تلقین و وعظ ہے، چھتریوں کا جنگ اور حکومت، ویشوں کا کھیتی باڑی اور تجارت اور شودروں کا کام چال کری ہے۔ ان ذاتوں کی بندشیں اس قدر سخت ہیں کہ آہس

میں شادی بیاہ بھی مسکن نہیں۔ سب سے بُرا درجہ اچھوتوں کا ہے جن کے چھوٹے سے بلکہ ہن کے محض سائے سے اونچی ذات کے لوگ ناپاک ہو جائے ہیں۔ اچھوت اس کنوئی سے ہانی نہیں بھر سکتے جس سے اونچی ذات کے لوگ ہانی بھرتے ہیں، ان کے برتوں میں کھانا نہیں کھا سکتے۔ حتیٰ کہ اونچی ذات والوں کے متوروں میں جا بھی نہیں سکتے، بہت سے هندو مصلحین نے اس شدت کے ختم کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے اور ذات پات کی یہ تقسیم اب بھی ہندوستان میں ہر قوارے ہے۔

ویدوں کے علاوہ هندوؤں کی مقدس کتابیں اپنے ہیں جن کا زمانہ تصنیف ۸۰ ق-م کے بعد کا ہے۔ ان میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ تمام مظاہر کائنات میں ایک ہی روح کارفرما ہے جسے "برہما" کہا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں تناش کے عقیدے ہر بھی روشنی ڈالی گئی ہے (اگرچہ یہ عقیدہ آریاون کی آمد سے ہمیں ہی ہندوستان میں موجود تھا)۔ عقیدہ تناش کے معنی یہ ہیں کہ انسان مرنے کے بعد فنا نہیں ہوتا بلکہ دوسرا جنم لیتا ہے۔ نئے جنم میں وہ جو شکل اختیار کرے گا وہ اس کے پھولے اعمال پر منحصر ہے۔ اچھے اعمال کر کے شود کے گھر پیدا ہو سکتا ہے یا بھر کسی جانور کی صورت میں پیدا کیا جاسکتا ہے۔ چور کی سزا یہ ہوئی کہ اکلے جنم میں وہ چوہا بن کر پیدا ہوا اور قاتل شیر کی شکل میں پیدا ہو سکتا ہے۔

مندرجہ بالا دو کتب کے علاوہ هندوؤں کی مذہبی کتب میں سب سے اہم مہا بھارت اور رامائن ہیں جو قدیم رجیزہ مشتبیا ہیں۔ مہا بھارت میں کوروں اور پانڈوں کی جنگ کے حالات ہیں اور ساتھ ہی ساتھ مختلف نصیحتیں ہیں جن میں خاص طور پر دنیا کی بے ثبات اور ظواہری کم حقیقی پر زور دیا گیا ہے۔ رامائن میں رام کا واقعہ ہے جو هندوؤں کے بڑے اوتار تھے۔ هندو مذہب میں دنیا اور اس کے عیش و آرام کو ترک کرنا روحانی ترق کے لئے بڑا ضروری ہے اس واسطے اکثر ہندو سادھو آبادیاں جھوڑ کر ویرانیوں میں نکل جاتے ہیں اور وہاں عبادت و ریاضت کے ذریعے اپنے نفس کی اصلاح کرتے ہیں۔ ریاضت کے لئے وہ نئے نئے طریقے ایجاد کرتے ہیں مثلاً ایک ثانگ پر کھٹے رہنا، سکلوں کے فروش پر لیٹنا، انکاروں پر چلنا وغیرہ۔

لیکن اس کے باوجود ہندو مت میں اس بات کی گنجائش موجود ہے کہ

انسان دنیا سے کنارہ کشی اختیار نہ بھی کرے اگرچہ ایسی صورت میں وہ بلند تر روحانی مدرجہ کا مستحق نہ ہوگا۔ ایسے اُدسمی کی زندگی کے لیے چار ادوار مقرر کر دیے گئے ہیں۔ پہلا طلب علم کے لیے، دوسرا گھر گھستی کے لیے، تیسرا غور و فکر کے لیے اور چوتھا محض پوجا پاٹ کے لیے۔

جیسا کہ اوپر بتایا گیا، هندوؤں کے دیوبھوتاون کا کوئی شمار نہیں لیکن ان میں سے اعم تین ہیں۔ برہما، وشنو اور شیوا۔ برہما اس کائنات کا خالق ہے لیکن اس سے آگے اس کے اختیارات نہیں۔ وہ محض کائنات کے لیے نقطہ آغاز ہے اور اسی بنا پر هندوؤں میں اس کی عبادت بہت شاذ ہی ہوتی ہے۔ وشنو سلامتی اور بقا کا دیوبھوتا ہے۔ برہما تو انسانی زندگی سے اس سے زیادہ متعلق نہیں کہ اس نے انسان کو پیدا کیا لیکن وشنو کا تعلق زیادہ دائمی ہے۔ بعض اوقات یہ انسان شکل میں بھی نمودار ہوتا ہے۔ هندو اپنے بڑے رہنماؤں مثلاً رام اور کرشن کو وشنو ہی کا اوتار کہتے ہیں جس کے معنی یہ ہونے کہ وشنو ان میں حلول کر گیا تھا۔ وشنو تو سلامتی کا دیوبھوتا ہے۔ اس کے پر عکس شیوا کام حیات کو ختم کرنا ہے۔ اس طرح عملی زندگی میں راج کرنے والے شیوا اور وشنو ہی ہیں جن کے کام ایک دوسرے کے مخالف ہوتے ہیں۔

اس وقت هندوؤں کی تعداد (اچھوتوں کو ملا کو) ۲ کروڑ سے کچھ زیادہ ہے۔ ان میں بیشتر ہندوستان میں آباد ہیں۔ اس کے علاوہ پاکستان، برماء، سیام، سلیا، اور انڈونیشیا میں بھی تھوڑے بہت هندو ہیں۔

بده مت

*
بده مت کا آغاز چھٹی صدی قبل مسیح میں ہوا۔ اس کے باقی گوتم بده، جن کا اصل نام ساکھیا مسی تھا، نیپال کے جنوب میں دپل وستو کے مقام پر پیدا ہوئے۔ وہ ایک شاہی خاندان کے فرد تھے اور ان کی ابتدائی زندگی شہزادوں کی طرح عیش و عشرت میں گذری۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی پیدائش پر ایک نجومی نے بیش نگوئی کی تھی کہ اگر انہوں نے دنیا کے مصائب کا مشاہدہ کر لیا تو تارک الدنیا ہو جائیں گے ورنہ ان کی قسمت میں دنیا کی بادشاہت ہے۔ بده کے والد بنے یہ سن کر اس بات کا بڑا اہتمام کیا کہ وہ مصائب و آلام سے اُشنا بھی نہ ہو سکیں۔ لیکن اس عیش و عشرت کی زندگی کے باوجود ان کی

طبیعت میں غور و فکر کا مادہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ ساری احتیاطوں کے باوجود انہیں ایک مرتبہ اپنے ملازم کے ساتھ باہر جانے کا اتفاق ہوا اور یک بارگی چند ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے ان کی زندگی پیکسر بدل دی۔ انہیں ایک بوڑھا دکھانی دیا جس کی کدر ضعف پیری سے خم ہو رہی تھی۔ پھر ایک مریض بہ نظر پڑی جو حالت مرض اور شدت تکلیف سے ہے قرار تھا، پھر ایک لاش راستے میں نظر آئی۔ اس کے بعد انہوں نے ایک تارک الدنیا فقیر کو دیکھا جس کا چہرہ سکون و صفائی سے بھرپور تھا، ان واقعات نے ان پر بڑا اثر کیا۔ زندگی کیا ہے؟ اس میں اس درجہ مصائب و آلام کیوں ہیں؟ ان سے نجات کیسے حاصل کی جا سکتی ہے؟ یہ وہ سوالات تھے جن کے جواب کے لیے ان کا ذہن مضطرب تھا۔ مخلوق کی عیش و عشرت اور ہما ہمی سے بھرپور فضا ان مسائل پر غور و فکر کے لیے کسی طرح موزوں نہ تھی لہذا انہوں نے طے کیا کہ ویرانیوں کے سکون میں اس مسئلے پر غور کریں گے۔

تین سال کی عمر میں گھر چھوڑ کر وہ ادھر ادھر گھومتے رہے۔ جو لوگ اس زمانے میں اہل علم سمجھے جاتے تھے ان سے استفادہ کیا، اگرچہ بہت کچھ سیکھا لیکن تسلی نہ ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے ریاضتیں کرنی شروع کر دیں۔ ہر آسانش نرک کردی حتیٰ کہ چند دانوں سے زیادہ غذا کا بھی استعمال چھوڑ دیا۔ اس کی انتہا یہ ہوئی کہ سات دن تک سلسل ایک درخت کے نیچے مراقبے میں بیٹھنے رہے جس کے بعد انہیں اچانک وہ کیفیت حاصل ہوئی جسے 'عرفان'، کہتے ہیں۔ جس جکہ اتبیں یہ عرفان حاصل ہوا تھا اسے 'بدھ گیا' کہتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی یاق زندگی تبلیغ و تلقین میں بسرا کردی۔ ۳۸۰ قسم میں ۸۰ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

گوتام بدھ نے اگرچہ صراحتاً خدا کا انکار کہیں نہیں کیا لیکن ان کی تعلیمات میں کسی ^{مابعد الطبيعی} وجود کا زیادہ نشان نہیں ملتا۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اپنی زندگی کی بہتری کے لیے انسان کو کسی مادوائی طاقت کے سہارے کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص عبادت و ریاضت کر کے اپنے نفس برفتح ہا سکتا ہے اور اس طرح وہ 'نیروان' حاصل کر لے گا۔ نیروان ہے مراد ارتقائے نفس کا وہ درجہ افکار و آلام سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ یہ کویا طبائیت، سکون اور ثہیروائی بہشت کا نام ہے۔

گوتم بدھ کی تعلیمات میں 'ہشت پہلو راہ' کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ ہشت پہلو سے مراد آئندہ چیزوں کی صفت ہے۔ صحیح ایمان، صحیح ارادہ، صحیح گفتگو، صحیح دردار، صحیح معاشر، صحیح فکر، صحیح انکسار اور صحیح سراقبہ۔ ان آئندہ چیزوں کے علاوہ بھی بدھ متیوں ہر پانچ چیزیں لازم قوار دی گئی ہیں۔ اول یہ کہ کسی ذی حیات شے کو زندگی سے محروم نہ کیا جائے۔ دوم، کوئی چیز زبردستی یا دھوکے سے حاصل نہ کی جانے۔ سوم، جہوٹ نہ بولا جائے۔ چہارم، منشیات سے پڑھیز کیا جائے۔ پنجم، جسم کے گناہوں سے بھا جائے۔ ان کے علاوہ گوتم بدھ نے اپنی تعلیمات میں راہ اعتدال اختیار کرنے ہر زندہ دیا ہے۔ اس دور میں یا تو هندو یا وی ٹھیں جنہوں نے آسائش و آرام کو اپنے اوپر حرام قرار دے رکھا تھا یا رُوسا تھے جو نعائم میں کھرے ہونے تھے۔ گوتم بدھ نے کہا کہ ان دونوں کے درمیان کی راہ— راہ اعتدال— اختیار کی جائے لیکن اس کے باوجود روحاںی تقدس حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان دنیا کو نرک کر کے خانقاہی زندگی بر کرے۔ اس مذہب کی تعلیمات کو حد سے حد ایک ضابطہ اخلاق کہا جا سکتا ہے۔ جس میں انفرادی مسائل اور روحانی تسلیں کا سامان موجود ہے لیکن انسان کی سیاسی، سماجی، تمدنی اور معاشی زندگی کے لیے کوئی ہدایت نہیں ملتی۔

شروع میں بدھ مت میں بت پرستی منع تھی اور ابتدائی تصویروں میں مہاتما بدھ کو کسی نشان کے ذریعے سے ظاہر کیا جاتا تھا، مثلاً کھڑاؤں یا خالی تخت سے ان کی موجودگی کا تصور پیدا کیا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ هندو مت کے اثر تے بدھ مت میں بہت سے عقیدے اور رواج داخل ہو گئے جنہوں نے اس کی شکل بدل دی۔ اس نئی شکل کا نام 'مہابیان' قرار پایا۔ مہابیان کے معنی ہیں 'بڑا بار اٹھانے والا' یہ نام اس لیے مناسب ہے کہ اس میں بہت سے عقیدوں اور رسوم کا بار اٹھانے کی صلاحیت تھی۔ پرانا طریقہ چوں کہ ان نئے عقائد اور رسوم کا حامل نہ تھا وہ اس لیے 'ہنابان'، یعنی کم بار اٹھانے والا، قوار پایا۔

مہاراجہ اشوک نے بدھ مت کو پھیلانے کے لیے ہرجکہ مبلغین سفر لئے، عبادت کاہیں تعمیر کیں، کتبوں میں بدھ مت کی تعلیمات لکھوا کر نصب کرائیں، اور غیر ممالک میں سفیر بھیج کر اس ملک سے باہر بدھ مت کی اشاعت کی۔ عجیب ہات یہ کہ اگرچہ یہ مذہب ہندوستان میں پیدا ہوا لیکن اب

ہندوستان میں اس کے پیرو بہت کم ہیں۔ اس کے ماننے والے زیادہ تو دوسرے
مالک کے باشندے ہیں۔

گوتم بدھ کی تعلیم ہندوستان میں برہمنیت کے خلاف ایک رد عمل تھا

اس میں ذات پات کی تعریق اور کسی مخصوص طبقے کی سیاست کی نفی کی کفر
اور اسی وجہ سے بہ مذہب بڑی تیزی سے پھیلا تھا۔ لیکن یہ زیادہ عمر سے تک
اہنی پاکی برقرار نہ رکھ سکا اور خود برہمنی تصورات سے الودھ ہو گیا۔ چنان چہ
سہایاں فرقے میں برہمنیت کا عنصر غالب ہوتا گیا اور گوتم بدھ کی پیشہ
اصلاحات خارج کر دی گئیں۔ چنان چہ ان میں بت ہوتی کا رواج بہت بڑہ
کیا۔ در اصل لفظ بت خود 'بدھ' کی ایک شکل ہے اور اصنام ہوتی کے
داخل ہو جانے سے بعض مقامات ہر سہایاں اور ہندو مت کا اختلاف بہرہ
کم ہو گیا۔

یہودیوں کی تعداد کے بارے میں بڑا اختلاف ہے۔ بعض نے ان کی تعداد
پچاس کروڑ تک بتائی ہے لیکن در حقیقت اس وقت ان کی تعداد پانچ کروڑ
کے لگ بھگ ہے اور یہ چین، برماء، سیام، نیپال، بھوپان، سبلون وغیرہ
میں آباد ہیں۔

یہودیت

یہودیت کی بنیاد دو عقائد ہر ہے۔ اول خدا کی وحدانیت اور دوم بنی اسرائیل
کا خدا کی مستحب اور مخصوص است ہونا۔

تمام الہامی مذاہب میں خدا کی وحدانیت کا تصور موجود ہے، اگرچہ
اکثر جکہ بعد کے اضافوں اور ترمیموں کی وجہ سے یہ عقیدہ کمزور اور دعندلا
ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر عیسائیت میں (جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے)
ابتدآ خدا کی وحدانیت کا تصور موجود تھا لیکن بعد میں تین خداوں کا چرچا ہو گیا۔
موجودہ شکل میں توحید کی تعلیم اسلام کے علاوہ صرف یہودیت میں ملتی ہے،
اگرچہ اس کے ساتھ ساتھ ایسے عقائد بھی ہیں جن کی وجہ سے یہودیت بھی توحید
خالص سے محروم ہو گئی ہے۔

یہودی اپنی نسل کے اعتبار سے بنی اسرائیل ہیں۔ اسرائیل عبرانی لفظ ہے،
جس کے معنی ہیں 'خدا کا بنہ' اور یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا عبرانی زبان
1۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو احمد عبد القادر المدرس، 'مذاہب عالم'۔

میں نام تھا۔ اس طرح بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ یہودیوں نے یہ دعویٰ کہ وہ خدا کے منتخب اور چھوٹے بندے ہیں اور خدا سے ان کا تعلق خصوصی نوعیت رکھتا ہے، غلط سبھی مگر بالکل ہے بنیاد نہیں۔ خود قرآن نے کئی جگہ بنی اسرائیل کی فضیلت کا ذکر کیا ہے:

يَعْلَمُ إِنَّهُنَّ أَذْلَلُوا نَفْعَلَى الَّتِي أَنْهَى اللَّهُمَّ وَأَنِّي فَكِلْمَلُهُ عَلَى الْعَلَمَيْنَ

اے بنی اسرائیل! میری نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تمہیں دی تھیں اور یہ کہ میں نے تمہیں پوری دنیا پر فضیلت بخشی۔
(البقرہ۔ ۱۲۲)

لیکن جیسا کہ قرآن میں دوسری جگہوں پر کہا گیا ہے، اس فضیلت کا سبب کوئی نسلی یا تواریق امتیاز نہ تھا بلکہ یہ تھا کہ خدا نے بنی اسرائیل کو اسلام کی دعوت ساری دنیا تک پہنچانے کے فریضے پر مامور کیا تھا۔ پھر جب بنی اسرائیل نے اس فریضے سے رو گردانی کی تو ان کو اس مستد فضیلت سے اتار دیا گیا۔

بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانے ہی میں مصر آگئے تھے۔ بہاں ان کی نسل خوب پہلی بھولی۔ اس وقت مصر میں بنی اسرائیل کے علاوہ ایک نسل قبطیوں کی تھی۔ آگے چل کر جب بنی اسرائیل اپنے فریضہ دعوت حق سے غافل ہوئے تو قبطیوں نے انہیں اپنا غلام بنایا۔ اسی غلامانہ انحطاط کے دور میں حضرت موسیٰ علیہ السلام مبعوث کیے گئے۔ آپ کا زمانہ بعثت حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً ۱۳ صدی قبل ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرکردگی میں بنی اسرائیل نے بغاوت کی اور مصر سے مہجرت کر کے جزیرہ نما سینا کی طرف آئے۔ کوہ سینا ہی میں آپ پر توراۃ کے بیشتر احکام نازل ہوئے۔ ایک طویل عرصے تک خانہ بدوانہ زندگی بسر کرنے کے بعد بنی اسرائیل نے فلسطین پر قبضہ کیا اور اپنی حکومت قائم کی۔ یہ حکومت کو قلیل زیبی میں تھی اور اس کی آبادی بھی بہت نہ تھی لیکن ہر حدیث سے برتر اور بہت دولت مند تھی۔

یہودیوں کی تاریخ مسلسل عروج و زوال کی داستان ہے۔ یہ عروج و زوال مادی بھی تھا اور روحانی بھی۔ جب انہوں نے خدا کی نافرمانی کی انہیں زوال ہوا، پھر ان میں پیغمبر مبعوث ہوئے اور انہوں نے ان کو قدر مذلت سے نکلا۔ ان میں داؤد اور سلیمان علیہم السلام جیسے پیغمبر بھی مبعوث ہوئے جو ساتھ

ہی سانہ بادشاہ بھی تھے اور جن کے عہد میں بنی اسرائیل کی سلطنت اپنی شوکر کی معراج پر ہو چکی، لیکن بنی اسرائیل کی نافرمانیوں کی سزا کے طور پر خدا نے اپسے فاتعین بھیجے جنہوں نے فلسطین کی ایٹھ سے اپنی بجادی اور انہیں وقار سے نکال دیا۔ اب موجودہ دور میں مغربی طاقتوں نے انہیں فلسطین میں دوبار آباد کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہودیوں کے عقاید کا ہم اپر ذکر کر چکے ہیں۔ ایک یہودی فلسفی موسیٰ بن سیمون نے ان عقائد کو ذرا تفصیلاً اس طرح بیان کیا ہے:

(۱) وجود خداوندی ہر ایمان، (۲) امن کی وحدت ہر ایمان، (۳) اس کے دائم ہونے پر ایمان، (۴) اس کے غیر مادی ہونے کا تصور، (۵) اس پر ایمان کہ عبادت صرف اسی کی کی جائے، (۶) پیغمبر پر ایمان، (۷) اس پر ایمان کہ حضرت موسیٰ سب سے بڑے پیغمبر تھے، (۸) اس پر ایمان کہ توراہ (زبانی و تعریری دونوں) حضرت موسیٰ کو کوہ سینا پر عطا کی گئی، (۹) اس پر ایمان کہ وہ ناقابل تغیرت، (۱۰) اس پر ایمان کہ خدا عالم و خبیر ہے، (۱۱) یوم آخرت کی جزا و سزا اور حیات بعد موت پر ایمان، (۱۲) سبیع کے آنے پر ایمان، اور (۱۳) مُردوں کے جلانے جانے پر ایمان۔

یہودیوں کے بہان سبت کی تعطیل بڑی احمدیت رکھتی ہے۔ سبت کا دن جمعہ کے دن غروب آفتاب سے شروع ہو کر سنیجر کے دن ساروں کے نمودار ہوتے ہر ختم ہوتا ہے۔ اس دوران میں راسخ العقیدہ یہودی دنیاوی کاموں کو چھوڑ کر زیادہ ہے زیادہ عبادت اور مراقبی میں مشغول رہتے ہیں۔

یہودیوں کی مقدس کتاب توراہ ہے۔ توراہ کا اصل اطلاق تو ان ہائج کتابوں پر ہوتا ہے جو کوہ سینا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملی تھیں، لیکن اکثر لفظ توراہ کو زیادہ وسیع معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے اور اس میں یہودیت کا طرز معاشرت، اخلاق اور طریقہ عبادت سب شامل ہو جاتے ہیں۔ ضبط تعریر میں لانے کا جو انتظام ممکن ہو سکتا تھا ظاہر ہے۔ اس وقت کتب کو احکام کو تغتیلوں پر کنندہ کرایا گیا، لیکن وہ بھی فاتعین کے حملوں کی وجہ سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ جس نے بھی یروشلم فتح کیا ان نسخوں کو اُگ لکا دی، اور اگرچہ یہودیوں نے اسے محفوظ رکھنے کی بڑی کوشش کی لیکن نہ کر سکے۔ ہر اس سے بڑھ کر خرابی یہ ہوئی کہ یہودیوں کا اخلاق بتکر مذہبی طبقے میں

بھی بھیل گیا اور چون کہ نشر و اشاعت کے ذرائع محدود تھے اور تورات صرف ان لوگوں کے پاس تھی لہذا انہوں نے اس میں من مانی تبدیلیاں کر دالیں۔

اہنی طویل تاریخ اور حکم رائی کے باوجود دنیا میں یہودیوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے اور ہمیشہ تھوڑی ہی رہی ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں جوان کی شان و شوکت اور عروج کا زمانہ تھا، ان کی تعداد دس لاکھ سے زیادہ نہ تھی۔ عددی اعتبار سے وہ سب سے زیادہ عروج ہر جنگ عظیم دوم سے قبل تھی اور اس وقت ان کی تعداد ڈیڑھ کروڑ تھی یہودیوں کے اپنے دعوے کے مطابق اب ان کی آبادی دو کروڑ ہے۔

عیسائیت

موجودہ دنیا کی تیس فیصد آبادی عیسائی مذہب کی پیروی ہے۔ اور اس اعتبار سے وہ لحاظ آبادی دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے۔

یہودیت کی طرح عیسائی مذہب بھی در حقیقت بواہیمی مذاہب کی شاخوں میں سے ایک ہے۔ یہودیت سے بھی اس کا تعلق بہت ہی گہرا ہے یہاں تک کہ ابتدأً عیسائیت کو یہودی مذہب کی ایک شاخ ہی تصور کیا جاتا تھا، اس بنا پر عیسائیت کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم یہودیت کی تاریخ اور اس کے پیروؤں کے حالات سے باخبر ہوں۔

جیسا کہ ہم سطور بالا میں دیکھ چکے ہیں، یہودیوں کو کچھ عرصے کے لیے فلسطین کی حکومت ملی لیکن ان کی گمراہیوں کی وجہ سے دوبارہ چھن گئی۔ اس طرح وہ روحانی اور مادی دونوں اعتبار سے زوال کا شکار ہوئے۔ پھر بعد دیگرے انبیا مبعوث ہوئے لیکن حالات بدستور خراب رہے۔ یہودی حسب سابق اپنی پستیوں کا شکار رہے۔ اور نہ صرف یہ بلکہ جن انبیا نے ان کی اصلاح کرنی چاہی ان کے ساتھ ان کا رویہ انتہائی شرمناک رہا۔ کچھ کو قتل کیا گیا، کچھ کو قید خانوں میں محبوس کر دیا کیا، کچھ کو سنگسار کر دیا گیا، کچھ کو وطن سے نکلا کیا اور کچھ تو کو آروں سے چیر ڈالا گیا۔^۱ گویا معاشرے میں برافی اس درجہ بھیل چکی تھی کہ راہ حق کو اختیار کرنا تو درکنار، اس کے لیے کوئی آواز برداشت کرنا بھی اس قوم کے لیے ممکن نہ رہا۔ یاد رہے کہ یہ اس وقت کی حالت ہے جب یہودیوں سے فلسطین کی حکومت جن چکی تھی اور وہ خود اپنے وطن میں روپیوں کے حکوم تھے۔ لیکن اس ساری

^۱ یہ سنہ واقعات خود بالبل میں مرقوم ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیجیے 'تفہیم القرآن' جلد اول از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، صفحات ۸۲-۸۱۔

مذہب اور دور جدید ۔

ذلت اور محکومی کے باوجود عام یہودی جہالت اور توهہمات میں گرفتار تھے۔ ان کے فقیہ مخصوص قانونی موشگافیوں اور علاماً چھوٹے چھوٹے سائل پر جنگ کرنے میں مصروف تھے۔ دین موسیٰ کی روح غالب ہو چکی تھی۔ صرف ایک بے روح ڈھانچہ موجود تھا۔ جس میں علمائے یہود نے اپنے حسب منشا ترسیم و تنسیخ کر لی تھی۔

یہ وہ حالات تھے جن میں (آج سے تقریباً دو ہزار سال قبل) حضرت عیسیٰ علیہ السلام بروشلم کے قریب ایک مقام بیت اللحم میں کنواری مسیم (علیہا السلام) کے بطن سے پیدا ہوئے۔ تاریخی نقطہ نظر سے آپ کی بالعلوم خیال ہے کہ آپ سنہ ۶۹ میں اس دینا سے تشریف لے گئے، اور آس وقت آپ کی عمر ساڑھے تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ آپ کی ابتدائی زندگی کے حالات پر بھی اسی طرح گمناسی کا پرده پڑا ہوا ہے۔ تیس سال کی عمر میں آپ نے تبلیغ کا کام شروع کیا۔ اس مقصد کے لیے آپ نے جگہ جگہ وعظ کیے اور معجزوں کا مظاہرہ کیا۔ آپ کے معجزوں میں بیماروں کو اپنچا کرنا، اس زمانے میں یہودیوں کی حالت جیسی کہ تھی بیان کی جا پچکے ہے۔ آپ نے ان علمائے یہود کو خاص طور پر ملک بنایا جسپوں نے دین موسیٰ میں اپنی من مانی خواہشات کے مطابق ترسیمات کر لی تھیں اور جن کا کام صرف ظواہر ہوتی اور قانونی کہیجے تان رہ گیا تھا۔ آپ کی ان تعلیمات سے اس وقت بہت زیادہ لوگ متاثر نہ ہوئے۔ آپ کے ابتدائی متاثرین میں سے اکثر بظاہر معمول حیثیت کے لوگ تھے مثلاً ماہی گیر وغیرہ اولہ مخالفت میں یہود کا بالآخر اور ذی علم طبقہ تھا۔ ان لوگوں نے یہ سوچ کر کہ لوگ آپ کی تعلیمات سے متاثر نہ ہو جائیں رومی گورنر کو اسکا کر آپ کو بغاوت کے جرم میں گرفتار کرا دیا اور صلیب کی سزا طے ہوئی۔ رومی گورنر آپ کی گرفتاری سے چندان خوش نہ تھا اور غالباً اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ آپ بے گناہ ہیں۔ چنانچہ اس نے یہودیوں کے سامنے یہ انتخاب رکھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بریابا ڈاکو میں سے ایک قومی تہوار کے موقع پر جھوڑ دیا جائے۔ یہ بریابا ڈاکو وقت کا مشہور قاتل تھا اور اسے بھی گرفتار کر کے مصلوب کرنے کا فیصلہ ہوا تھا لیکن ۱۔ ملاطفہ ہو "انسان کلوب پیڈیا آف ریلیجن ایٹ ریلیجٹ"، اچ۔ رائشن پائزک، صفحہ ۲۰۹۔

کہ ہوپ نے "جنت کے سریفیکٹ" بیچنے شروع کر دیئے۔ ان کی قوت کا استعمال صرف بہ رہ گیا کہ ابک دوسرے پر کفر کے فتوے لگائیں اور ان اختلافات میں اس درجہ تک گئے کہ معمولی سا اختلاف رکھنے والوں کو موت کی سزا دے دی جاتی تھی۔ اس مقصد کے لئے خاص عدالتیں قابیم کی گئیں جنہیں احتسابی عدالت کہتے ہیں۔ ایک اندازہ یہ ہے کہ ۱۸۸۱ء سے ۱۸۰۸ء تک ان عدالتوں نے تقریباً تین لاکھ چالیس ہزار آدمیوں کو مختلف سزاویں دیں؛ ان میں صرف ۳۲ ہزار وہ تھے جنہیں دھکتی آگ کی نذر کر دیا گیا۔ جن لوگوں کو سزاویں دی گئیں ان میں کلیلو جیسے ماہرین سائنس شامل تھے، الی بکے مشہور سائنسدان برونو کو بھی اثاثت علم کے جرم میں آگ کی نذر کر دیا گیا؛ فلکیات پر کوپرنیکس کی کتاب مدتیو سنوے رہی۔^۱

چرچ کے انہی مظالم کی بنا پر بہت سے لوگوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مذہب اور سائنس ایک دوسرے کے مخالف ہیں اور اسی پس منظر کی بنا پر اُج بھی بعض لوگ مذہب اور سائنس کو متضاد تصور کرنے ہیں حالانکہ جس چیز میں تضاد و تصادم تھا وہ مذہب اور سائنس نہیں بلکہ عیسائیت کی بگڑی ہونے کے شکل اور انیسویں صدی کے سائنسی فلسفہ تھا۔

عیسائی مذہب کے عقائد میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ تثلیث (Trinity) کا عقیدہ ہے۔ اس خدائی تثلیث میں باپ، بیٹا اور روح القدس شامل ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تثلیث کا دوسرا فرد تسلیم کیا جاتا ہے، وہ خدا کے بیشتر قرار پائے اور الوہیت میں اس کے شریک ہونے۔ رومی کیتھولک چرچ کے نزدیک اس تثلیث میں مقدس مریم کا بھی اضافہ ہونا چاہیے۔

تثلیث کا عقیدہ اگرچہ عیسائیت کے بنیادی عقائد میں سے ہے لیکن ہمارے پاس اس بات کے بڑے قوی دلائل ہیں کہ ابتداء میں یہ کوئی مستقیم عقیدہ نہ تھا۔ عیسائیت کی ابتداء میں ہمیں یہ شمار ایسے فرقوں کا نشان ملتا ہے جو عقیدہ تثلیث کے قائل نہ تھے بلکہ حضور مسیح کو خداۓ واحد کا بنہ تسلیم کرتے تھے۔ تیسرا صدی عیسوی میں نائیہ کی کونسل میں جب اس عقیدے کو پیش کیا گیا تو وہاں بڑے شدید اختلاف ہوئے۔ اگرچہ اس عقیدے کو

۱۔ ان سب کے لیے ملاحظہ ہو، ابوسعید بزمی، "تاریخ انقلابات عالم" اور ایج - جی - ویلز، Outlines of World History

منظور کر لیا گیا میکن اختلاف کرنے والے اپنے اختلاف پر مصروف ہے۔ ایک مشہور عیسائی عالم چارلس اینڈرسن اسکات کے کہنے کے مطابق "ابتدانِ تین انجیل میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی بنا پر یہ گمان ہو کہ ان انجیلوں کے لکھنے والے مسیح کو انسان کے علاوہ کچھ اور سمجھتے ہیں؛ ان کی نگاہ میں وہ ایک انسان تھا، ایک ایسا انسان جو خاص طور پر خدا کی روح سے فیض یا بہا تھا... انجیل کی متعدد عبارتوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت مسیح اپنے آپ کو صرف نبی کی حبیثت سے پیش کرتے تھے^۱، بلکہ ایک فرقہ اس وقت بھی موجود ہے جو اپنے آپ کو موحد کہتا ہے اور حضرت عیسیٰ کی الوہیت کا قائل نہیں ہے۔

عیسائیوں کی مذہبی کتاب بائبل ہے جو عہد نامہ^۲ تدبیم اور عہد نامہ^{*} جدید پر مشتمل ہے۔ عہد نامہ جدید میں چار انجیل شامل ہیں متی، لوقا، مرقس اور یوحنا۔ ان کے علاوہ کچھ خطوط بھی اس میں شامل ہیں۔ ان انجیل کے علاوہ اور بھی انجیل موجود ہیں لیکن ان کو غیر مستند قرار دیا جاتا ہے۔ ان چار انجیل میں بھی باہمی اختلافات موجود ہیں۔ حضرت عیسیٰ کے نسب نامے میں بھی یکسانیت نہیں ہے۔ ان انجیل کے متعلق عقیدہ ہے کہ وہ ان چار مصنفوں کو فردآ فردآ عابدہ الفا ہوئی تھیں۔ الفا ہونے کا زمانہ حضرت عیسیٰ سے دور ہے اور قام بند ہونے کا زمانہ الفا ہونے کے زمانے سے مختلف۔ شرق اردن میں جو دستاویزیں برآمد ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض یہودی فرقوں کے عقائد حضرت عیسیٰ کی تعلیم میں پیوست ہو گئے ہیں جس سے قرآن کے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے کہ موجودہ مسیحیت حضرت عیسیٰ کی تعلیم نہیں بلکہ اس کی تعریف شدہ شکل ہے۔

عیسائیوں کی تعداد اس وقت ۸ کروڑ کے لگ بھگ ہے اور اس وقت وہ تین بڑے فرقوں میں منقسم ہیں۔ (۱) مشرق تقلید پسند، (۲) رومن کیتھولک، اور (۳) پروٹسٹنٹ۔ ان میں سب سے بڑا فرقہ رومن کیتھولک ہے جس کا مرکز روم اور رہنمای پاپائے روم ہے۔ مشرق تقلید پسندی کا مرکز روس ہے، اور پروٹسٹنٹ یورپ اور امریکہ میں ہائے جاتے ہیں۔

۱ - ملاحظہ ہو، مولانا امین احسن اصلاحی، "حقیقت شرک"۔

۲ - 'انسائیکلو پیڈیا بریٹنکا' (چودھوار ایڈیشن)، مفسون یسوع مسیح، مصنفہ چارلس اور رمن اسکات۔

اسلام

اکثر لوگ اسلام کی ابتداء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کرتے ہیں لیکن یہ درست نہیں۔ اسلام وہی مذہب ہے جس کی تبلیغ و اشاعت حضرت آدم سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر پیغمبر نے کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سب درحقیقت مسلمان تھے اور اسلام کے داعی ہیں لیکن بعد میں ان کے بیروں نے ان کی تعلیمات سے کر ڈالیں۔ عیسائیت اور بیوویت درحقیقت اسلام ہی کی بنیادی ہوئیں شکاریں ہیں۔

"اسلام" کے لفظی معنی ہیں اطاعت۔ اصطلاحاً یہ سمجھنا چاہیے کہ اسلام خدا کی اطاعت کا دوسرا نام ہے۔ کائنات کی ہر چیز چاند، سورج، ستارے درخت، خدا کے بنائے ہوئے قانون کے تابع اور مطیع ہیں، اس اعتبار سے وہ "مسلم" ہیں۔ انسان بھی اپنی زندگی کے ایک بڑے حصے میں چار و ناچار خدا کا مطیع ہے۔ اس کا جسم، اس کا ذہن، اس کی خواہشات، یہ سب ان قوانین کے ماتحت ہیں جو خدا نے مقرر کر دیے ہیں۔ لیکن انسانی زندگی کا ایک حصہ ایسا ہے جس کو خدا نے انسان کے ارادے اور شعور پر چھوڑ دیا ہے۔ جو لوگ اپنی اس شعوری اور ارادی زندگی میں اسلام کی تعلیمات پر کاربند ہونے کا فیصلہ کریں انہیں "مسلم" کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اسلام کسی خاندان یا ذات سے وابستہ نہیں، ایک عقیدے اور نظریہ، حیات کا نام ہے اور مسلم کا اطلاق بھی کسی مخصوص نسلی گروہ پر نہیں ہوتا بلکہ ان تمام افراد پر ہوتا ہے جو اسلام کو اپنے دین کی حیثیت سے قبول کریں خواہ ان کا تعلق کسی بھی نسل سے ہو، کسی بھی خطہ، زمین سے ہو، اور وہ کوئی سی بھی زبان بولیں۔

اسلام جن چیزوں کے ماننے کا مطالبہ ہر انسان سے کرتا ہے ان میں اہم ترین تین ہیں۔ توحید، رسالت اور آخرت۔ توحید سے مراد یہ ہے کہ انسان خدائے تعالیٰ کو تسليم کرے اور یہ مانے کہ اس کے سوا کوئی عبادت و اطاعت کا حقدار نہیں ہے۔ رسالت پر ایمان سے مراد یہ ہے کہ ان انبیا یا پیغمبروں پر ایمان لائے جن کے ذریعے سے خدا نے اپنا پیغام ہم تک پہنچایا ہے۔ ان انبیا میں سے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور عقیدہ آخرت کے معنی یہ

ہیں کہ موجودہ زندگی کے خاتمے کے بعد لوگوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور ان کے اعمال کے اعتبار سے انہیں سزا یا جزا ملے گی۔

ان عقیدوں کے علاوہ اسلام جن عملی چیزوں کا مطالبہ کرتا ہے ان میں

بانج وقت کی نماز، سال میں ایک ماہ کے روزے، عمر میں کم از کم ایک بار حج، سالانہ زکوٰۃ اور فربضہ، جہاد فی سبیل اللہ کی ادائیگی شامل ہیں۔

چون کہ اس پوری کتاب میں اسلام کے نظام زندگی کا تعارف کرانے کی کوشش کی گئی ہے اس لئے اس باب میں اسلام کی تعلیمات کا انتہائی مختصراً خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی تعداد ۱۲۶ کروڑ کے قریب ہے۔ آبادی کے لحاظ سے عیسائیت کے بعد اسلام دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے۔ اور یہ وہ واحد مذہب ہے جس کے پیرو دنیا کے تمام برا عظموں میں پائے جاتے ہیں۔ نیز اس وقت اقوام متعدد کے ۱۲۶ ممبر ملکوں میں سے ۷۳ مسلمان سماںک ہیں۔ بیسویں صدی میں سامراج کے خلاف سب سے موثر جنگ مسلمانوں نے کی ہے اور اسی جدوجہد کے نتیجے برابر ان کے ۱۰۰ آزاد ملک موجود ہیں۔

ایک تقابل مطالعہ

اوہر ہم دنیا کے بڑے مذاہب کی تعلیمات کا خلاصہ بیان کر چکرے ہیں۔ ان سب کے مطالعے کے بعد فطری طور پر یہ سوال ابھرتا ہے کہ موجودہ دور میں ان مذاہب کی حیثیت کیا ہے؟ کیا یہ مذاہب اپنی اصلی شکل میں موجود ہیں؟ کیا ان کی کتب جن پر ان کا مدار ہے پوری صحت کے ساتھ محفوظ ہیں؟ کیا یہ مذاہب موجودہ دور کی ترقیوں کا ساتھ دے سکتے ہیں؟ اور آج کی دنیا میں کوئی موثر تعمیری کارنامہ انجام دے سکتے ہیں؟ کیا یہ قابل عمل ہیں؟ کیا یہ انسان کو ایک مکمل نظام حیات عطا کر سکتے ہیں؟

كتب کی حفاظت کے معاملے کو لیجئے۔ هندوؤں کی مقدس کتاب ویدوں کا زمانہ ہی آج تک مستین نہیں ہو سکا۔ خود ہندو اس کی عدم صحت کے معرفہ ہیں اور اب ان میں سے اکثر بڑھے لکھنے لوگ ان کو الہامی کتب کے بجائے انسانوں کی تصنیف خیال کرتے ہیں۔ بدھ مت کا معاملہ اس سے بھی آگے ہے۔ گوتم بدھ نے کوئی کتاب نہیں چھوڑی؛ صرف ان کی زبانی تعلیمات تھیں جو

سینہ بہ سینہ حلنی رہیں اور سنکڑوں سال کے بعد جا کر مدون ہوئیں۔ یہودیوں کی کتاب مقدس توراۃ کو ایجھے تو معلوم ہو گا کہ اس کتاب کے پارے میں یہ شعار تاریخی شبادتیں ملتی ہیں کہ یہ کتاب طویل طویل عرصوں کے لمحے بالکل نیست و نابود ہو گئی تھی۔ مثال کے طور پر بخت نصر نے جب بیت المقدس پر حملہ کیا تو ہیکل سلیمانی کی ایشٹ سے ایشٹ بجا کر رکھ دی۔ توراۃ کا صرف انک نسخہ تھا جو ہیکل میں تھا اور وہ تباہ و برباد کر دیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ بخت نصر پوری یہودی قوم کو بابل پکڑ کر لے گیا جہاں انہیں اپنی مذہبی رسماں کے بجا لانے کی بالکل اجازت نہ تھی۔ ایران کے بادشاہ سائنس نے جب بابل فتح کر کے یہودیوں کو رہائی دی تو پھر انہوں نے نہ جانے کہاں سے توراۃ کا ایک نسخہ ڈھونڈ لیا۔ اس کے بعد یہی کم از کم تین مرتبہ توراۃ کا نسخہ دنیا سے بالکل تباہ کر دیا گیا اور پھر یہودیوں نے دوبارہ پیدا کر لیا۔ ظاہر ہے کہ اس عمل میں نہ جانے کتنی تبدیلیاں ہو گئیں۔ تعریفات کا ایک معمول اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اس کتاب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعبیز و تکفین کے واقعات تک درج ہیں۔

یہی معاملہ انجلیل کا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد آپ کے شاگردوں نے آپ کی سوانح عمری مرتب کرنے کی کوشش کی اور انہی کوششوں کا نتیجہ بانبل کی صورت میں نمودار ہوا۔ اس زمانے میں اس قسم کی انجلیل کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ ایک روایت کی رو سے اس طرح کی ۲۴ انجلیل کا پنہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک بڑی تعداد حواریوں کے خطوط کی ہے۔ ۳۲۵ میں نیقہ کی کوتسل کے سامنے یہ سارا لشیجر رکھا گیا۔ کاف جنگ و جدال کے بعد ان ساری انجلیلوں کو اوپر تلے رکھ دیا گیا اور صبح آکر دیکھا گیا تو چار انجلیل اور کچھ خطوط کو چھوڑ کر باقی سب نیچے بڑی ہوئی تھیں۔ ان ہی چار انجلیل، متی، لوقا، مرقس اور یوحنا کو صحیح قرار دیا گیا^۱۔ ان کے ساتھ ساتھ کچھ خطوط بھی بچے تھے انہیں بھی درست قرار دیا گیا لیکن اس نیقہ کی انجلیل کا آج بھی پتہ نہیں۔ آج کل قدیم ترین انجلیل چوتھی ہانجویں صدی کی ملتی ہے وہ بھی یونانی زبان میں جب کہ حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کے حواریوں کی زبان آرامی تھی۔

۱۔ متألف احسن گیلانی، "النبی الخاتم"۔

۲۔ ایضاً۔ مزید لاحظہ ہو، ابن احسن اصلاحی، 'حقیقت شرک'۔

مذاہب عالم : ایک تقابل مطالعہ

۶۹

اس سب کے بخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن اپنی اصل زبان (عربی) میں آج تک اسی صورت سے محفوظ ہے جیسے وہ اتوا تھا۔ قرآن دراصل حضور نے اس کے مختلف نسخے کراذر مختلف جگہوں پر بھیجے۔ چنان چہ اس کے قدیم، ترین اور جدید ترین نسخوں میں ایک شو شے کا فرق بھی نہیں ملتا۔ اسلام کے کثر مخالف بھی اس بات کے معترض ہیں کہ قرآن ہر قسم کی تعریف سے ہاک اور منزہ ہے۔^۱

اس کے بعد دیکھنا یہ ہے کہ یہ مذاہب کس قسم کا نظام زندگی پیش کرتے ہیں۔ اور وہ اس دنیا کے لئے قابل عمل ہیں یا نہیں؟ اس نقطہ نظر سے دیکھیے تو بعض مذاہب سیرے سے نظام زندگی ہی نہیں دیتے۔ مثال کے طور پر بدھ مت یا عیسائیت مکمل نظام زندگی نہیں۔ ان دونوں مذاہب کا موضوع محض اخلاق ہے لہذا یہ انسان کی زندگی میں وہ تواافق اور عدم آہنگ نہیں پیدا کرسکتے جو کوئی جامع نظام حیات کر سکتا ہے۔ ہندومت اور یہودیت بلاشبہ اس اعتبار سے بہتر ہیں کہ وہ زندگی کے لئے خابطہ اخلاق سے آگے بڑھ کر بھی تہوڑی بہت ہدایات دیتے ہیں۔ لیکن ہندومت میں ذات پات نہیں ہے کہ وہ اس دور کو متأثر کرسکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں منوسرا کے قوانین کے بجائے نئے قوانین بنانے جانے ہیں۔ اسی طرح یہودیت ایک نسل تک محدود ہے۔ یہودی خود بھی تبلیغ نہیں کرتے اور نہ ہی یہ بات زیادہ پسند کرتے ہیں کہ کوئی ان کا مذہب اختیار نہیں۔ لیکن ہندومت اور یہودیت بھی درحقیقت ایسا جامع و مانع نظام زندگی نہیں جو آج کے دور پا آئندہ کے ادوار میں انسانیت کی رہنمائی کرسکے۔ اس کی وجہ ان کے قوانین اجتماعی زندگی سے علاقہ ہی نہیں رکھتے لہذا لا محدود آزادی دے دیتے ہیں۔ باقی ہندومت اور یہودیت نے لچک عونے کی وجہ سے ترقی پذیر نہیں ہیں۔ اور اس بنا پر زمانے کے ارشاد سانہ نہیں نہ سکتے۔ ہمارا ان میں سے کوئی مذہب بھی اپنے مکمل عونے کا دعویٰ نہیں درتا۔ ہندومت اور بدھ مت کے سلسلے میں تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رہی یہودیت اور عیسائیت تو ان کی

^۱ ملاحظہ ہو، باب ۱۵، شریعت اسلامی کے مأخذ۔ (مرتب)

قدس کتب بھی شاعد ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے بعد ایک آنے والے کی خبر دی تھی جو دین کو مکمل کرے گا۔ توراۃ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اللہ کی اس وحی کا ذکر ہے۔

”میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تعہ سا ایک نبی بروپا کروں گا، اور اپنا کلام اس کے سند میں ذالوں کا اور جو کچھ میں اسے فرمائیں گا وہ سب ان سے کہی کا۔“ (امتنان ۱۸-۱۹)

دوسرے الفاظ میں حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ ان کے بعد ایک اور نبی آئے گا جو صاحب شریعت ہو گا اور جس کے منہ میں اللہ تعالیٰ خود اپنا کلام ڈالے گا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

”لیکن وہ فارقلیط (احمد صلی اللہ علیہ وسلم) پاکیزگی کی روح ہے، جسے باپ (خدا) میرے نام سے پھیلیے گا، وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا، اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں تمہیں یاد دلائے گا۔“ (یوحننا ۱۳-۲۶)

نیز یہ کہ:

”اور وہ فارقلیط (احمد صلی اللہ علیہ وسلم) اُکر دنیا کو گناہ سے راستی اور عدالت سے مصور وار نہ رائے کا، گناہ اس لیے کہ وہ مجھہ ہر ایمان نہیں لاتے۔ میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ میں تم سے کہوں، ہر اب تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے، لیکن جب وہ یعنی سجائی کی روح آئے گی تو وہ تمہیں ساری سجائی کی راہ بتائے گی، اس لیے نہ وہ اپنی نہ لیجے کی، لیکن جو کچھ سنے گی، سو کچھ کی میری بزرگی کرے گی۔“ (یوحننا ۱۴-۸)

یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ہمیں اپنے کلام کو ناتمام قرار دیا اور اس امر کا پتھہ دیا کہ دین کو مکمل کرنے والا اپنی آئے گا۔

اس کے برعکس حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دین پیش کیا وہ مکمل ہے اور انسانیت کے لیے خدا کا آخری پیغام ہے۔ وحی الہی نے آپ کی زبان مبارک سے ہری انسانیت کے لیے عام اعلان کرایا کہ:

الْيَوْمَ أَكْلَمُ لِكُفَّارَتُهُ تَمَّتْ عَيْنَاهُ تَقْعِيلُهُ تَعْبِيرُهُ تَكُونُ إِشْكَارَتُهُ

آج ہم نے تمہارا دین تمہارے لیے کابل کر دیا اور اپنے فتحیں تم پر پوری کر دیں اور تمہارے لیے مسلم کو دین پسند کیا۔
(السٹھ - ۳)

مذاہب عالم : ایک تقابلی مطالعہ

۶۱

اسلام کی تعلیمات نہایت ہم کبیر اور جامع ہیں۔ اسلام انفرادی زندگی کے لئے بھی ہدایات دیتا ہے اور اجتماعی زندگی کے لئے بھی۔ اسلام میں جسی اہم اخلاقی نظام اور عبادت کی ہے اتنی ہی اہمیت سیاسی، معاشری، سدنی اور اقتصادی نظام کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلام کی ایک نمایاں خصوصیات یہ ہے کہ ان میں نہ انسان تو لا محدود آزادی دی گئی ہے اور نہ اسے بے انتہا جائز در رہا گیا ہے۔ قرآن اور سنت کے ذریعے زندگی کے بنیادی اصول متعین کر دیے گئے ہیں۔ ان اصول کی روشنی میں ہر زمانے کے حالات کے تحت قوانین مدون کیے جا سکتے ہیں۔ اس حکیمانہ نظام کی بنا پر اسلام میں ہر دور دساتھ دینے کی کنجائش رکھ دی گئی ہے۔

مزید مطالعے کے لئے

مظہر الدین صدیقی، اسلام اور مذاہب عالم۔ ادارہ نفاذ اسلامیہ، لاہور۔
احمد عبداللہ المددوسي، مذاہب عالم۔ کراچی۔
رتید احمد رشید، مذاہب عالم۔ پشاور۔

-
- Horace Shipp, *Faiths that Moved the World*. Princeton University Press.
- J. Juiji (Ed.), *Great Religions of the World*. Macmillan, London.
- Trevor Ling, *A History of Religion East and West*. Macmillan, London.
- M. M. Sharif, *A History of Muslim Philosophy*. Otto Harrassowitz, Wiesbaden, Vol. I, Chap. 1 and 3.

دور حاضر کی تحریکیں اور مذہب

مغربی ممالک کے ہمیشہ سے اس قدر متعدد اور ترقی باقاعدہ نہ تھے جتنے کہ آج ہیں - مغربی تہذیب اپنی موجودہ شکل میں صرف پانچ سو سال قدیم ہے - یورپ میں اس سے پہلے کا زمانہ "دور تاریک" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے - جس کے معنی یہ ہیں کہ اس وقت نہ تو تہذیب و تمدن کا نور تھا اور نہ علوم و فنون کی روشنی - اس باب میں ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ اس پس منظر سے جدید تہذیب کس طرح رونما ہوئی؟ کن ماخذ سے اس نے اکتساب کیا؟ کن بنیادوں پر وہ استوار ہوئی؟ کن کن تحریکات کو اس نے جنم دیا؟ اور بہ حیثیت مجموعی اس کے تسلط سے انسانیت نے کیا پایا اور کیا کھویا؟

جدید تہذیب کا ارتقا^۱

کسی تہذیب کی روشنی یا ظلمت در اصل نتیجہ ہوتی ہے اس کے اصول و عقائد، اخلاق اقدار اور سماجی اداروں کا - یہی وہ عناصر ترکیبی ہیں جن کے مجموعے کا نام تمدن ہے۔ ان عناصر میں کچھ اثر قبول کرنے والے ہوئے ہیں اور کچھ اثر ڈالنے والے - جو عناصر اثر ڈالنے والے ہوئے ہیں در اصل وہی کسی دور کی مخصوص تہذیب کا ڈھانچہ متعین کرنے ہیں، اور اسی لحاظ سے ان عناصر کو عصری تحریکات کا نام دیا جاتا ہے - جدید عصری تحریکوں میں پانچ عناصر تہذیب کو شامل کیا جاسکتا ہے۔ فلسفہ، مادیت، نظریہ، العاد،

۱۔ یہ باب پروفیسر عبد الحمید صدیقی کی کتاب "انسانیت کی تغیریں نو اور اسلام" سے مانعوذ ہے چند مبحث کا افادہ مرتب نے کیا ہے۔ (مرتب)

ماسکیت، جمہور، جذبہ، قوم پرستی اور حیوانی ازدواج کا نظریہ۔ یہی وہ قوانین
خسے ہیں جو جدید تہذیب کی بلند و ہرشکوہ عمارت کو سپارا دیتے ہوئے ہیں اور
یہی وہ برق قلعے ہیں جن سے انکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی نکل رہی ہے۔
ان جدید عصری تعریکات کو بہ خوبی سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ
میری طور پر ان کے تاریخی ارتقا کا جائزہ لیا جائے۔

عناصر تہذیب دو عوامل کے پیدا کردہ ہوتے ہیں، ایک تو ماضی کے
اثرات اور دوسرے اس دور کے مخصوص حالات و تصورات۔ موجودہ تہذیب بھی
انہی دو عوامل کے عمل اور رد عمل کا نتیجہ ہے۔

جبکہ تک یورپ کے ماضی کا تعلق ہے، فرون وسطی میں اہل یورپ
نکر بیں قدامت پسند اور مذہب میں گمراہ تھے۔ سیاحت بہت بہلے اپنی اصلی
شکل کھو چکی تھی اور اس کی جگہ جس چیز کو آسانی مذہب کا نام دیا جاتا
تھا وہ چند غیر عقلی اوہام اور کچھ غیر فطری ریاضتوں کا مجموعہ تھا۔ ان اوہام
کے علاوہ ہر نئی فکر ارتداد اور ہر نیا خیال کفر سمجھنا جاتا تھا۔

سیاست اور معیشت پر جا گیردارانہ نظام حاوی تھا۔ ہر سلک چھوٹی چھوٹی
جا گیروں میں منقسم تھا اور ہر جا گیردار اپنے علاقے میں خود مختار۔ جا گیردار
انہی "آدمیوں" کے ارادہ و عمل ہر کلی اختیار رکھتا تھا۔ اس کے زیر حکم
افراد اکچھے اصطلاحی معنوں میں اس کے غلام نہ تھے لیکن ان کی حیثیت
غلاموں سے کسی طرح بہتر نہ تھی۔ ایک نیم غلام کاشتکارا کو اپنی زمین
چھوڑ کر جانے کا حق نہ تھا اور اسے کاشت پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔ وہ
معاشی اور سماجی ہر لحاظ سے جا گیردار کے دست نکر تھے۔ کاشت کاری واحد
پیشہ تھا، صنعت و حرفت برائے نام تھی اور چون کہ کسی قسم کی منظم صنعت
نہ تھی اس لیے تجارت بھی غیر موثر تھی۔

معاشرے میں صرف دو طبقے تھے۔ ایک امراء اور جا گیرداروں کا جس میں
امحاب جائداد اور مذہبی پیشوشا شامل تھے اور دوسرے نیم غلام عوام۔ ان دو
طبقات کی زندگی میں زمین و آسان کا فرق تھا۔ ایک کی زندگی اگر مکمل ساز تھی
تو دوسرے کی مکمل سوز، ایک میسا و جام ہے دل بہلاتا تھا تو دوسرا نان شبینہ
کا محتاج تھا، ایک سحمل و کمخواب زیب تن کرتا تو دوسرا ہمٹے چیتھڑوں کو
ترستا تھا۔

مذہب اور دورِ جدید

۴۳

جنگ و جدال جاگیرداروں کا دن رات کا شغل تھا۔ وہ ہدیہ ایک دوسرے سے نہ رہ آزمائتے۔ اس زبانے میں چوں کہ مساجر سپاہیوں کا دستور نہ تھا اس لیے معولی کسان بھی اس بات پر بجبور تھے کہ اپنے آقا کی جانب اپنے خروج پر جنگ میں شریک ہوں۔ کسان ایک تو وہ سے ہی تنگ دست تھے پھر ہمہ وقتی جنکوں نے تو ان کی کمر بالکل ہی توڑ دی تھی۔

یہ سب کچھ تو تھا ہی لیکن سنم یہ کہ ان تمام نا انصافیوں اور زیادتیوں کو برعق ثابت کرنے کے لئے یہاڑا مذہب ہی کا لیا جاتا تھا۔ اس دور کا سعی شدہ مذہب ایک ایسا ملمع بنا ہوا تھا جس کو ہر قبیع اور بدنتما چیز پر چڑھا کر خوش نما اور قابل قبول بنایا جا سکتا تھا۔ وہ ہر اقتدار صبغت کے ہاتھ میں حقیقتاً ایک ایسا ہتھکنڈہ تھا جس سے یہ ملبئہ اپنی ہرجائز و ناجائز

غرض پوری کرتا تھا۔

یہ حالات تھے کہ جب مسلمانوں نے یورپ کے کچھ حصے لو فتح کیا اور باقی کچھ سے تجارتی تعلقات استوار کیے۔ اس دور کا مسلمان علم و هنر کا دلدادہ اور صنعت و حرف کا ماہر تھا۔ مسلمانوں سے تعلقات کی بنا پر یورپ کے عیسائیوں میں بھی علمی ذوق پیدا ہوا، اور ان میں سے کچھ نے سلم علما اور قدیم یونانی فلسفیوں کے افکار کا مطالعہ کیا۔ اسی طرح تقریباً ایک ہزار سال کے بعد یورپ میں علوم و فنون کی تجدید ہوئی۔ تاریخ کی اصطلاح میں اس تجدید کو "نشاہِ ثانیہ" کہا جاتا ہے۔ اس مطالعے کی بنا پر یورپ کے عیسائیوں میں روشن خیالی پیدا ہوئی۔ ان کی نظر میں غیر معقول نظریات گھٹکر لکھے۔ بہت سے لوگوں نے جاہلانہ اوہام کے خلاف احتجاج کیا۔ لیکن عیسائیت کے مذہبی رہنماؤں نے ان سب پر ارتکاد کا فتویٰ لکا کر نہایت سخت سزا میں دین۔ ایک اندازے کے مطابق کا ایسا کے سزا یا نہ افراد کی تعداد تین لاکھ سے کسی طرح کم نہیں۔ ان میں بتیں ہزار کو زندہ جلا دیا گیا۔ انہی زندہ جلانے والوں میں ہیئت اور طبیعیات کا مشہور عالم برونو بھی ہے جس کا سب سے بڑا جرم ارباب کیسا کے نزدیک یہ تھا کہ وہ اس کرہ ارض کے علاوہ دوسری دنیاوف اور آبادیوں کا بھی قائل تھا۔ اسی طرح مشہور طبیعی عالم گلیلیو کو بھی اس بنا پر قید و بند کی سزا دی گئی کہ وہ زمین کے سورج کے گرد گھومنے کا قائل تھا۔

اہل کا ایسا کے ان لزروں خیز مظالم اور چیزوں دستیوں نے ہدیے یورپ

دور حاضر کی تعریبکش اور مذهب

۵

میں ایک ہلچل مجاہدی - ان لوگوں کو چھوڑ کر جن کے مفادات کا یسا سے
وابستہ تھے، سب کے سب کا یسا سے نفرت کرتے لگے اور عداوت کے اس جوش
میں بد قسمتی سے انہوں نے مذہب کے پورے نظام کو تہ و بالا کر دینے
کا تہیہ کر لیا - چنان چہ وہ جنگ جو شروع شروع میں عیاشی قسم کے اہل
کیسا کے خلاف لڑی جا رہی تھی، وہ بعد میں عیاسی مذہب کے خلاف بھی
شروع ہو گئی، اور اس کے بعد ہر مذہب کے خلاف - ان آزاد خیال اور تعدد
پسند لوگوں میں اتنا صبر و ضبط، غور و مطالعہ کی قوت اور تعقل و اجتہاد
کی قابلیت نہ تھی کہ وہ اصل دین کی خلط نمایندگی کرنے والوں کے
درمیان تہیز کر سکتے - انہوں نے جذبات کی رو میں بھی کر یہ سوچنا تک
گوارہ نہ دیا کہ ان نفرت انگیز واقعات کا مذہب تمہارا تک ذمہ دار ہے
اور کہاں تک اس مذہب کے نام ایجاد کی ذاتی حرص و جہالت - چنان چہ
غصہ میں آکر وہ ہدایت اللہی ہی کے باعث ہو گئے - گویا اہل کیسا کی حماۃ
کی وجہ سے پندرہوں اور سولہوں صدیوں میں ایک ایسی جذباتی کشمکش
شروع ہوئی جس میں چڑھتے ہیں تبدیلی کے جذبات خالص العاد
کے راستے پر ہٹ گئے - اس طویل کشمکش کے بعد مغرب میں تہذیب العاد کا
دور دوڑہ شروع ہوا -

علوم و فنون اور صنعت و حرفت بہ مر حال پہلتے ہوئے رہے اور صنعت کی
اسی روز افزون ترقی کی بنا پر معاشرے میں ایک تیسرے طبقے نے جنم لیا - اس
طبقے میں کاربکر، صنعت کار، ساہوکار، اور تاجر شامل تھے - جیسے جیسے
صنعت و تجارت میں اضافہ ہوتا گیا اس طبقے کے افراد بھی بڑھتے گئے - ہر چند
کہ مملکتیں ابھی تک جاگیروں میں منقسم تھیں لیکن صنعت کار اور تاجر کا مقام
اسی میں تھا کہ ان معنوں سرحدوں کا جس قدر جلد مسکن ہو خاتمه ہو جائے -
چنان چہ اس طبقے نے جاگیرداری خائد کر دہ پابندیوں سے رفتہ رفتہ چھٹکارا
حاصل کرنے کی مستقل کوشش کا آغاز کیا - شہروں میں تجارتی انجمنوں کا
قیام عمل میں آیا جن کا بڑا مقصد اسی کوشش کو منظم کرنا تھا -

جاگیردارانہ نظام کی مناسبت سے قرون وسطی میں سیاسی اختیارات بادشاہ
اور جاگیردار میں منقسم تھے اور اسی بنا پر بادشاہ اور اس کے نوابوں میں
اقتدار کی رسم کشی رہتی تھی - بادشاہ ملک کے انتظام میں زیادہ سے زیادہ
دخل رکھنا چاہتا تھا اور جاگیردار اس کے اختیارات کو کم سے کم کرنے کی فکر

مذہب اور دور جدید ۔

میں رہتے تھے ۔ ناجر طبقے کو اپنا مفاد اسی میں نظر آیا کہ جاگیروں کی سرحدوں کا خاتمہ کرنے اور اپنی تجارت کو وسیع تر کرنے کے لیے وہ هر طرح سے بادشاہ نے ہاتھ مضبوط کریں ۔ چنان چہ یورپ کے تقریباً ہر ملک میں اس طبقے نے بادشاہ کا ساتھ دے کر کہیں قوت کے ذریعے سے اور ایک لخت اور کہیں بلا جبر اور تدریجی طور پر جاگیرداروں کو ان کے سیاسی حقوق سے بے دخل کر دیا اور اس طرح قومی ریاست کی بنیاد پڑی ۔

قومی ریاست کے قیام سے قبل ہی یورپ کے ممالک میں جذبہ، قومیت کا آغاز ہو چکا تھا ۔ کیسا کی بدانتظامی اور ہوب کی بد عملی کے خلاف احتجاج کرنے والے دو گروہوں سے تعلق رکھتے تھے ۔ ایک وہ جنہوں نے اس بدانتظامی اور بد عملی کا ذمہ دار خود مذہب کے وجود کو نہ رایا، اور دوسرے وہ جو مذہب کے خلاف تو نہ تھے لیکن ان کے نزدیک اصل سبب یورپ کے لیے بورٹی اور اقتدار کا انکار کیا اور قومی چرخ کی کلی خود مختاری کی پرزاور تائید کی ۔ تاریخ میں یہ تعریک 'اصلاح مذہب' کے نام سے یاد کی جانی ہے ۔ چنان چہ اس لحاظ سے میکاول جیسا منکر مذہب ہو یا لوٹھر جیسا مؤید مذہب، دونوں ہی نے جذبہ، قوم پرستی کی توسعہ و انسانیت میں بڑہ چڑھ کر حصہ لیا ۔

قومی ریاستوں کے قیام کے ساتھ دخافی انجن کی دریافت اور اس کے وسیع استعمال سے صنعتی پیداوار میں کثیر اضافہ ہوا اور اس صنعتی پیداوار کی فروخت کے لیے تجارتی منڈیوں کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی ۔ چنان چہ یورپ کی بہت سی قومیں اسی مقصد کے حصول کے لیے انہی کھروں سے نکل ہیں ۔ اس نگ ودو میں مسابقت کے جذبے کا ابھرنا بالکل ایک فطری امر تھا ۔ مگر مختلف سلطنتوں کے درمیان جنگ کی صورت اختیار کریں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس نظریے نے لوگوں کو سرگرم عمل کیا اور انہیں لٹونے سنتے ہو ابھارا، وہ قومیت کا نظریہ تھا ۔ مغربی انسان نے اس نئے بست کے تواشی جانے کے بعد کسی قدر اطمینان محسوس کیا ۔ ایک آن دیکھنے خدا کی پرستش کی جگہ ہیشانیاں اب اس "ہیکر محسوس" کے سامنے جھکنے لگیں اور انسان انہی زندگی میں بندگی کا جو خلا محسوس کر رہا تھا وہ ایک حد تک پُر ہو گیا ۔ فرد فرد میں یہ احساس انہرنے لگا کہ اس کی ساری سرگرمیوں کا محور قوم کا بت ہے ۔

ان تازہ خداوں میں بڑا سب سے وطن ہے

دور حاضر کی تعریبکش اور مذهب

۶۶

عرض ہے کہ وہ لوگ جو مذهب کو کسی خاص شکل میں ایک اجتماعی
خاتمے کا سبب بنے، اور اس طرح جذبہ "قوم ہوتی" کے راستہ ہو جانے کے بعد
تہذیب مغربی بہت جلد اپنے مزاج کی دوڑی سے باک ہو گئی۔ فلسفہ، اخلاق،
تجربہ علم کا واحد ذریعہ بنے، ہر آن دیکھی چیز کا انکار روشن خیالی کا
ثبوت قرار ہایا، اخلاق کا معیار ذاتی منافع سمجھا گیا، زندگی بعد موت کا عقیدہ
باطل گردانا گیا، قانون سازی کی راہ میں الہام اور اخلاق پابندیوں کو جہالت
اور نادافی ہو مبنی رکاوٹیں قرار دیا گیا اور اس طرح ہوری زندگی کو غیر مذهبی
اور مادی بنادیا گیا۔

تہذیب جدید کے عناصر ترکیبی

اس عمل اور رد عمل سے جو تہذیب ظبور میں اُنیں اس کا جوہر ہیں
عنصر خمسہ ہیں جن کے تاریخی ارتقا کا مختصر جائزہ ہم نے اوپر لیا۔ مناسب
ہوا اگر ہم یہ ہی معلوم کروں کہ مغربی تہذیب میں ان کا صحیح مقام کیا ہے۔

(۱) فلسفہ مادیت

فلسفہ مادیت سے مراد دو چیزوں ہیں۔ اول ایک خاص ما بعد الطبيعیاتی
(یا زیادہ صحیح معنوں میں طبیعیاتی) نظریہ جو عبارت ہے زندگی کے میکانیکی
تصور سے اور دوم مادیت کا اخلاقی نظریہ۔ پہلے نظریے کے مطابق دنیا
میں مادتے کے سوا کوئی چیز حقیقی نہیں حتیٰ کہ انسان کا شعور و ارادہ
بھی ہر قیہ اور سالہ ہی کی کرشمہ سازی ہے اور اس کائنات کو سمعنے کے
لیے طبیعی قوانین کے علاوہ کسی چیز کی طرف رجوع کی ضرورت نہیں۔ مادتے کے
اخلاقی نظریے کے مطابق، جو حقیقتاً مادیت کے ما بعد الطبیعیاتی نظریے ہی کا
منطقی نتیجہ ہے، انسان کو اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو وہ صرف جسمانی
احتیاجات کی تسکین ہے۔ لہذا قابل غور شئے وہی ہے جو ان ضروریات کی

۱۔ یعنی کائنات اور دنیا کے ماردا اور انسانی زندگی کے بنیادی سوالات کی حقیقت کے بارے
میں ایک نظریہ اور چون کہ یہ نظریہ خالص طبیعیاتی تھا اس لیے اس نے طبیعی دائرة سے
باہر کی دنیا کو بھی اسی نگاہ سے دیکھا اور اسی انداز میں اس کی تعمیر کی۔

تکمیل کرے۔ اس کے علاوہ کسی دوسری جیز کی کیوں قیمت نہیں۔ انسان کوششوں کا مقصود بھی صرف وہی جیز ہو سکتی ہے جو بلا واسطہ یا بالواسطہ طور پر لذت و منفعت کا باعث ہو۔ یہ طرز فکر کس حد تک بورپ کی عمل زندگی میں دخل رکھنا ہے، اس کا اندازہ انک مغربی مفکر کے اس بیان سے ہوتا ہے:

”بورپ کا عام اور متوسط آدس خواہ وہ جمہوریت پر ابیان رکھتا ہو یا فاشزم پر، سرمائیہ دار ہو یا اشتراکی، جسمانی مشقت کرتا ہو یا دماغی مشقت کرنے والا ہو، وہ ایک ہی مذہب رکھتا ہے، اور وہ مادی ترقی کی برتری ہے۔ اور اس کی خاتمہ حیات صرف بھی ہے کہ وہ زندگی کو زیادہ آسان، پُر راحت اور عام محاورے کے مطابق فطرت سے آزاد بناسکے۔“

(ب) لا دینیت

مادی طرز فکر کا لازمی نتیجہ لا دینیت ہے۔ اگر مادہ سب کچھ ہے اور اگر یہ کائنات خود بخود بیدا ہو گئی ہے تو ظاہر ہے کہ کائنات کا نہ کوئی خالق ہو سکتا ہے اور نہ کوئی نظم۔ اہر جب نعمود باللہ کوئی خالق و ناظم ہے ہی نہیں تو اعمال کا حساب اور ان کی جزا اور سزا کا کوئی سوال ہی بیدا نہیں ہوتا۔ جناب جہ سیکانکی تصور حیات کے غلبے کے بعد مغربی ممالک کے نسبتاً کم لوگ صحیح معنوں میں خدا کے قائل ہیں۔ اپنے مذہب سے والہانہ محبت کے باوجود لا دینی خیالات کے غلبے کی وجہ سے وہ دوسرے مذاہب سے تعصیب و عناد کے علاوہ اور کسی طریقہ فکر پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوتے اور زندگی کے عام دھارے کو موڑ نہیں سکتے۔

(ج) حاکمیت جمہور

فلسفہ^۱ مادیت کا دوسرا منطقی نتیجہ حاکمیت انسان ہے۔ اگر یہ دنیا بغیر کسی خالق کے بیدا ہو گئی اور اگر اس کا کوئی مالک و آغا بھی نہیں ہے تو کسی ایسی ہستی کا ذکر کرنا ہی بے سود ہے جس سے کسی قسم کی ہدایت اور رہبری کی امید کی جا سکے۔ لہذا انسان خود ہی اپنا مالک ہے۔ جس طرح وہ چاہے اصول وضع کرے اور جس اصول کو چاہے تولیے۔ لیکن

۱۔ یہ تصور بعض سیاسی تصور نہیں ہے بلکہ ایک فلسفیانہ تصور ہے جس کی رو سے قانون اور اصول حیات اور خبر و شرک اقدار کا اصل مأخذ انسانی فکر کو قرار دیا جاتا ہے۔ پہاں اس تصور سے بعثت کی جا رہی ہے۔

اب سوال بہ تھا کہ مختلف انسانوں کے خیالات میں عظیم اختلاف ہوتا ہے، رائے مانی جائے تو کس کی؟ اقتدار تسلیم کیا جائے تو کس کا؟ اس کے جواب میں ایک خیالی شئے کی دریافت کی گئی جس کا نام روسونے رائے عامہ بن ہیوینز کیا۔ حاکمیت انسان کا تصور عمل طور پر حاکمیت جمہور کا تصور ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہیں، وہ جس چیز کو چاہیں اپنے لئے خود حلال پا عوام نہیں سکتے ہیں۔ مذہب و اخلاق کا کوئی ضابطہ ان کے فیصلے کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ چون کہ کسی ریاست کی اصل قوت کا انحصار وہاں کے عوام پر ہوتا ہے اس لئے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ حاکمیت بھی اور حکوم کی دوفی کو مٹا دیا ہے۔ اب عوام ہی حاکم بھی ہیں اور حکوم بھی۔

بہ ظاہر یہ نظریہ نہایت ہی معقول معلوم ہوتا ہے۔ اس کی رو سے عوام کو بادشاہوں کے ظلم و ستم سے نجات حاصل ہوں۔ انہیں یہ حق نصیب ہوا کہ وہ اپنی بہتری کے لئے ہر قسم کی تدبیر اختیار کر سکیں۔ مگر حاکمیت کو عوام کے ہاتھوں میں اس طرح دے دینے کے بعد بھی انسانیت کے حقیقی معاشر ختم نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رائے عامہ محض ایک فریب ہے۔ انتخاب اور استصواب کے باوجود جو رائے حقیقتاً نافذ ہوئے ہے وہ یا تو کسی امر کی ہوئی ہے یا چند بُرسر اقتدار افراد کی۔ الفرڈ کاپن نے بالکل درست کہا ہے کہ عوام کو حاکمیت کا سونپ دیا جانا ان کو وہی حقوق عطا کرتا ہے جو حقوقِ ربانی کے نظریے کی رو سے از منہ۔ وسطی میں بادشاہ مر تکب کو حاصل تھے اور اس طرح جن جن بے اعتمادیوں کے برائے بادشاہ مر تکب ہوئے تھے انہی بے اعتمادیوں کا ارتکاب آج حاکمیت جمہور کے نام بر دنیا کا ہوشیار طبقہ کر رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جمہور کو دوسروں کے ظلم سے نجات حاصل ہونی چاہیے اور انہیں امر کی اختیار ہونا چاہیے کہ کوئی ان کے جائز مفاد و حقوق کو نفعان نہ پہونچا سکے۔ لیکن خود ان کی فلاخ کے لئے یہ ضروری ہے کہ ان کے لئے شمع را ایسے اصول و احکام ہوں جو انصاف و فلاخ کے حامل ہوں اور جن میں کسی کی خود غرضی یا کچھ روی کو دخل نہ ہو۔ یہ مرتبہ دینِ حق کو ہی حاصل ہو سکتا ہے اور اس کی

رہبری اور اس کے اصول کی ہاتندی انہی اوپر عائد کرنے سے میں جمہور فلک
ما سکتے ہیں۔

(د) جذبہ قوم ہوتی

قوم ہوتی ایک ایسا جذبہ ہے جو مذہب کے خاتمے کے بعد اجتماعی
نصب العین اور اتحادی عامل کی کمی کو بورا کرتا ہے۔ قرون وسطی میں
سیاحت بورب کے مختلف ممالک کو جوڑنے والی قوت تھی۔ اس اشتراک
کی بنا پر بورب باوجود سیاسی تقسیم کے ایک وحدت تصور کیا جاتا تھا۔
لیکن مذہب کے کافی استعمال کے بعد قوم ہی اصل وحدت قوار بانی۔ اس
عقیدے کے مطابق قوم کو وہی درجہ حاصل ہے جو مذہب میں شارع کو دیا
گیا ہے۔ قوم خطا و نسیان سے معصوم ہے۔ اس سے لفڑش اور غلطی کا صدور
میں نہیں۔ تمام افراد اس کی ملک ہیں اور ان پر اس کی اطاعت فرض عین
ہے۔ اس کو حق ہے کہ جس امر میں جو چاہے فیصلہ کرے۔ فرد کی بھل
اور آخری وفاداری صرف قوم کے لئے ہے اور اس میں کوتاہی کفر سے کم
نہیں۔ اس طرز تکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف قوموں اور ملکوں نے انہی
سیاسی تسلط اور اسحصار کے جو چھوٹے چھوٹے دائرے کوہینجھے تھے ان کی حدود
سے نکل کر سوچنا ان کے لیے قریب قریب نامیں ہو گیا۔ انہوں نے ہر اس
چیز کو باطل خیال کیا جو ان کی خاک وطن سے تعلق نہ رکھتی تھی۔ ہر
قوم درستاہ ذہنیت تو یہاں تک بڑھ گئی کہ قوموں نے کسی غیر ملک سے
آنی ہوئی ان اعلیٰ اقدار کو ماننے سے انکار کر دیا جن کو خدا کے پاک
بندوں نے وہاں فوقاً بیش کیا تھا اور جن میں کسی ایک قوم یا ملک کے
مناد کی حفاظت مقصود نہ تھی بلکہ بوری نوع انسان کی فلاح مطلوب تھی۔
جو منی کے ایک پروفیسر ایترنے کے ہے الفاظ اس ذہنیت کی بوری غستازی
کرتے ہیں۔

”ہمارے بھرے کیوں ایک غیر قوم کی تاریخ بڑھیں، انہیں کیوں
ابراهیم اور اسحاق کے قصے سنائے جائیں۔؟ ہمارا خدا جو منی ہونا
چاہیے۔“

ان نظریوں سے جو برپا ہیں واقع ہوئیں وہ تاریخ کے صفحات کو خونیں
بنانے کا سبب ہیں اور ان کے نتیجے میں انساں کے دکھوں میں اخافہ ہوا۔

(۵) حیوانی ازدواج کا نظریہ

۸۱

امن خطرناک فلسفے کے معنی یہ ہیں کہ شرم و حبا اور عصمت و غفت، جو زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ آج کے دور میں ان کی حیثیت ماضی کے افسانوں سے زیادہ کچھ نہیں۔ درحقیقت یہ وہ زریں حال ہیں جو عورت کے لئے تیار کیے گئے ہیں۔ عورتوں کو چاہئے کہ وہ ان کی بوسیدہ رسیوں کو توڑ کر آزاد ہو جائیں۔ عورتیں ہر لحاظ سے مرد کے برابر ہیں۔ انہیں زندگی دوڑ دھوپ میں برابر کا شریک ہونا چاہئے۔ خانہ داری کے فرائض میں مقید رہنا غیر نظری ہے۔ جنس انک حیوانی جذبہ ہے جس کی تکمیل کے لئے کردار کی دلیل فراہم ہوئی ہے۔ اس باطل فلسفے کا اثر یہ ہوا کہ پہلے تو نکاح کی گرفت ڈھیلی ہوئی، مس کے بعد نکاح سے عام ہے زاری کا رجحان پرورش ہانے لگا اور خاندانی نظام کی مضبوط عمارت ہبوند خاک ہو گئی۔ اولاد کی خواہش بھی آہستہ آہستہ سرد ہٹنے لگی اور تعریبک، ضبط، ولادت نے اسے رکھنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس میں کمی ہوئی تو خاندانی نظام اور بھی کمزور ہوا۔ اس کی تباہی نے انسان معاشرے پر جو اثرات ڈالے ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(۱) بچوں کی تربیت اور نگهداری سے عام لاہروانی،

(ب) صینی انار کی۔

امن سلسلے میں مناسب یہ ہے کہ ہم اسی تہذیب کے چند سربراور داعیوں کی آراء پیش کر دیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ وہ خود اس کے متعلق کس طرز پر سوچتے ہیں۔ چنان چہ عہدِ جدید کا ایک سفکر الکسوس کیوبیل لکھتا ہے:

”موجودہ سماج نے سب سے فاش غلطی یہ کی ہے کہ اس نے تربیت کے لئے خاندان کے مقابلے میں مدرسون پر اعتماد کیا۔ آج کی ماں اپنے بھی کو نرسی اسکول میں صرف اس غرض کے لئے چھوڑ آئی ہے کہ وہ اپنی معاشرے کے لئے، آزاد شہوت رافی کے لئے، فضول قسم کی آرٹ ہرستی کے لئے، اور برج کھیلنے یا سنبھالنا کے لئے زیادہ سے زیادہ

وقت بجا سکرے اور اس طرح ایک طرح کی مساعوں بے کاری میں منہمک رہے۔ اس طرزِ زندگی نے خاندان کے نظام کو، جس کے زیر اثر رہ کر بعده بہت کچھ سیکھتا ہے، بالکل در عالم بorum کر دیا۔ ۱۰۰

حیوان ازدواج کے اس فلسفے نے جہاں ایک طرف خاندانی نظام کو تباہ و برباد کیا ہے وہاں اس نے فطرت کی طرف رجعت کے رنگین دردے میں صیغہ بے اصولی کا بیع بودیا۔ اس نے لوگوں کو نہایت ہی دلچسپ انداز میں یہ درس دیا کہ آزاد محبت عین تقاضائے فطرت ہے۔ یہ نکاح وغیرہ کی پابندیاں محفوظ مصنوعی ہیں اور تاریخ کے تاریک ادوار کی بادگار ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بورب ٹا ہر ہوٹل، ہر پارک، ہر محلہ بد اخلاق کا مرکز بن گیا۔ یہ ایک ایسی کھلی حقیقت ہے جس کے لئے ثبوت کی ضرورت نہیں۔

روس بھی اسی مرض کا شکار ہے۔ اشتراکیت نے وہاں اخلاق سطح کو اور بھی پست کر دیا ہے۔ اشتراکی رہنماؤں نے زیادہ زور اسی بات پر دیا ہے کہ کوئی چیز بھی اشتراکی سوسائٹی کی راہ میں رکاوٹ نہ بننے پائے۔ جنسی عمل میں انسان کو اس کے مذاق اور طبیعت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور آزاد اس آزادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے شہروں میں جہاں اشتراکی اخلاقیات اور صفتی انارکی کا براہ راست اثر پڑا وہاں اخلاقی اقدار بالکل مت گئی ہیں۔^۲

انہی حالات کی بنا پر علم طبیعیات کی مشہور ماگر ستر ہڈن شا مغرب در بھی حیثیت کیم تبصرہ کرنے ہوئے کہتی ہیں۔

”ہماری تہذیب کی عمارت کی دیواریں منہدم ہونے کو ہیں۔ اس کی بنیادوں میں ضفف آگیا ہے اور اس کے شہر تبریل رہے ہیں۔ نہ معلوم یہ ساری عمارت کب پیوندِ خاک ہو جائے۔ ہم گذشہ کئی سال سے بہ دیکھ رہے ہیں کہ اب لوگ نظم و ضبط کی پابندیوں کو اختیار کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ اس کی بقا کی صرف ایک ہی صورت باقی ہے کہ مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میل جوں پر ہابندی عائد کر دی جائے۔“^۳

Alixes Carrel, *Man the Unknown.* - ۱

۲ - ملاحظہ ہو پیٹ سیلوں کی کتاب *Russia without Illusions* اور فلکن جے۔ شین کی تصنیف *Communism and the Conscience of the West*۔

۳ - Shaw, Mrs. Hudson, *Sex and Commonsense.*

دُورِ حاضر کی تعریکیں اور مذہب معاشرتی ارتقا کا نصویر اور اس کے نتائج

۸۳

اور اخلاق اقدار کو تباہ کرنے میں جو حصہ ایسا ہے اس سے بڑھ جڑھ کر کام ہوا، افادی طرز فکر نے اسے پروان چڑھایا اور زمان و مکان پر انسانیت کی فتح نے شرافت کا روپ دھار لیا۔ پھر خون ریزی، سفاکی اور کمزور کشی اخلاق عالیہ لیا ہے لیکن ہیگل، مارکس اور ڈارون کے نام خص طور پر قابل ذکر ہیں۔ معاشرتی نتائج کا جائزہ ایسے گے۔

(۱) ہیگل - فلسفہ کی فنی پیغمبریوں سے بھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہیگل کے نزدیک انسانی تہذیب و تمدن کا ارتقا دراصل انداد کے ظہور، تعاصم اور استزاج سے واقع ہوتا ہے۔ تاریخ انسانی کا ہر دور ایک وحدت ہے، ایک کٹل ہے۔ اس دور میں انساف زندگی کے مختلف شعبے ایک خاص سرتاسر پر ہوتے ہیں، ان سب کے اندر ایک گہرا ربط ہوتا ہے اور یہ عناصر ایک عصری وحدت کے رخ زیما کا عکس ہوتے ہیں۔ جب تاریخ انسانی کا قافلہ روح مطلق کے اشارے پر کچھ قدم آگے بڑھتا ہے تو خود اس کے اپنے قافلے میں سے کچھ حریفانہ افکار، رجحانات اور نظریات علمیں بغاوت بلند کرنے ہوئے میدان جنگ میں آ جاتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان ایک زبردست لڑائی شروع ہوئے۔ مگر کچھ مدت ایک دوسرے سے بر سر پیکار رہنے کے بعد ان میں اخیار کار صلح ہو جاتے ہے اور دونوں گروہوں اپنے میں سے کمزور عناصر چھانٹ کر، علیحدہ کر دیتے ہیں۔ اور اس کے بعد ایک ایسی وحدت کو جنم دیتے ہیں جو دونوں گروہوں کے صالح عناصر پر مشتمل ہوئے۔ یہ وحدت ایک بالکل نئے نظام فکر و عمل کی حیثیت سے آگے بڑھتی ہے لیکن کچھ مدت گزر جانے کے بعد اس کا بھی یہی سحر ہوتا ہے اور انسانی تہذیب اس طرح ترق کر کر چلی جاتی ہے۔

مذہب اور دور جدید

فکر و عمل کے نظاموں اور عناصر تمدن کا بہ نکراو سلا اقوام کے نکراو کی صورت میں ہوتا ہے۔ ہیگل کے طرز فکر کے مطابق ہر قوم ایک خاص کلہر کا مظہر اور اسک خاص فکری حامل ہوئے ہے۔ لہذا افکار کا تصادم دراصل اقوام کا تصادم ہے۔ اور اسی بنا پر ہیگل اقوام کے سنتل پیکار کو انسانی ترق کے لیے ایک لازمہ قرار دبتا ہے۔

(ب) مارکس۔ کارل مارکس نے اپنا فکری خاکہ ہیگل سے مستعار لیا مگر اس میں خود اپنے وحدان سے رنگ بورا۔ اس نے روح کے تصور کو الگ کرنے ہوئے سادی اسیاب، با معاشی محرکات کو تاریخی ارتقا کی بنیاد قرار دیا۔ ہیگل کے نزدیک اگر موثر طاقت افکاری ہے تو مارکس کے نزدیک اصل اور فیصلہ کئی قوت صرف مادی ماحول ہے اور اس میں بھی حقیقی اہمیت ذرائع بیداوار اور روابط بیداوار کو حاصل ہے۔ مارکس کے نظریے کے مطابق بیدائش دولت کے مختلف طریقے ہی گئی دور کی ذہنی اور سیاسی زندگی کا ہیولی تیار کرتے ہیں۔ انسانیت کے ارتقا کی اس کے نزدیک یہ صورت ہے کہ بہیں معاشی بیداوار کے طریقوں میں ایک تبدیلی ہوئی ہے۔ اس کا براہ راست اثر اسیاب زندگی کی تقسیم اور ملکی تعلقات پر پڑتا ہے اور اس سے زندگی کی ساری قدوسی از خود بدل جاتی ہیں اور اس طرح ایک نیا نظام وجود میں آتا ہے۔ اب دونوں نظاموں میں ہیگل کے جدی عمل کی طرح کشمکش شروع ہوئی ہے۔ بالآخر وہ صلح پر آمادہ ہو جائے ہیں۔ اور اس کے بعد دونوں مل کر ایسے نظام کی بنیاد رکھتے ہیں جس میں تمام صالح اجزا شامل ہوئے ہیں۔ اسی طریقے سے انسانیت کا ارتقا ہو رہا ہے۔

مارکس کی نگاہ میں ستضاد اجزاء تعدد اور اقدار اخلاق کے نکراو کا مظہر تصادم اقوام نہیں بلکہ تصادم طبقات ہوتا ہے اور ہیگل کے برخلاف اس کے نزدیک اصل وحدت قوم نہیں، طبقہ ہے۔

قوم کا انحصار معنوی اور سطحی ہوتا ہے۔ چنان چہ اقوام کی باہمی جنگ اگر ہیگل کے نزدیک ارتقائے انسانی کے لیے ضروری ہے تو مارکس کے نزدیک طبقات کی باہمی کشمکش۔

(ج) ڈارون۔ تیرا مفکر جس نے اپنے طرز فکر سے سعاشرق ارتقا کے نظریے کو ایک زبردست قوت فراہم کی وہ ڈارون ہے۔ اس کے خیال ہے کہ جانداروں کے اندر غیر محدود طور پر پڑھنے، ترق کرنے اور شکل و صورت میں تغیر کرنے کا ایک قدرتی رجحان ہایا جاتا ہے۔ لیکن انواع حیوانات

دُور حاضر کی تعریبیکسی اور مذہب

۸۵

کا ارتھا فدرت کے کسی تعزیری عمل کا رعنی منت نہیں بلکہ تغیری عمل کا
دینہ ہے کیوں کہ وہ حیوانات کی باعثی جنگ، نفع اور موت کے بغیر معکن
نہیں ہوتا۔

دارون کائنات کو ایک میدان کارزار کی حیثیت سے دیکھتا ہے جس میں
ہر آن ہر طرف زندگی اور بقا کے لئے طاقتور کمزوروں کو ختم کرنے میں مصروف
ہیں۔ لہذا جو جاندار اپنے دشمنوں سے بہتر جسمانی طاقت کا مالک ہے وہی
زندہ رہتا ہے۔ اور اصل میں وہی زندگی کی نعمت کا معیع مستحق ہی ہے۔ اس
بے رسم نظام میں جو فنا ہوتا ہے وہ اس اتنے ہوتا ہے کہ وہ کمزور ہے۔ الفرض
زین اور اس کا ماحول اور اس کے وسائل زندگی صرف طاقتور کے وجود کو برداشت
کرنے ہیں۔ کمزوروں کے لئے بہاں کوئی جکہ نہیں اور نہ ہوف چاہیے۔ لہذا
انہیں چاہیے کہ کائنات کو اپنے ناتوان وجود سے جلد از جلد ہاک کر دیں۔
اس طرح حالات کی مجبوری سے ارتقا شروع ہوتا ہے، اور ایک سلسلہ کشکش
کے ذریعے سے بلند تر حیوانات پیدا کرتا ہے۔ انسان بھی جدوجہد کی انسی پر ہیچ
راہوں سے گذرتا ہوا انسانیت کی بلندی تک پہنچا ہے۔ جو کوئی بھی تنازع لیلتا
ہی بھی میں سے کامیابی کے ساتھ گذر جاتا ہے وہ صالح ہے اور کائنات اپنی
اخوش صرف اسی کے لئے کھولتی ہے۔

معاشری ارتقا کے بنیادی اصول اور ان کے نتائج

اب ان تینوں مفکرین کے افکار کو جمع کرنے سے معاشری ارتقا کا جو نظریہ
وجود میں آتا ہے اس کے بڑے بڑے اصول یہ ہیں:

- ۱۔ زندگی میں ارتقا صرف کشکش کی وجہ سے ہو رہا ہے۔
- ۲۔ اسی کشکش کے نتیجے میں انسانیت ترقی کرے۔
- ۳۔ اس کائنات میں جنمے اور ترقی کرنے کا حق صرف اسی کو ہے جو زیادہ
سے زیادہ قوت کا مظاہرہ کرے۔
- ۴۔ بہاں اصل مقصد کامیابی ہے خواہ کسی ذریعے سے حاصل ہو۔

اس وقت ہمارے ہیش نظر اس فلسفے کی فکری لفاظوں کی نشان دہی نہیں
بلکہ بنانا یہ مقصود ہے کہ اس طرز فکر نے انسان کو انسان بنانے کے بجائے
درلنہ بنا دے۔ اور دلیا کو جنت نشان بنانے کے بجائے جہنم زار بنا ڈالا ہے۔

۱۔ اس کا پہلا اثر جو انسانیت نے قبول کیا وہ یہ ہے کہ انسان کی مادی ترقی ہی انسانی زندگی کی سعاج قرار پائی۔ چنانچہ انسانوں کے مختلف گروہ اور طبقات مادی اسباب کی فراہمی کے لیے دبوانہ وار جدوجہد کرنے لگے اور اس سلسلے میں کسی اخلاقی خابطے کے پاہنڈ نہ رہے کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو خود موت کو دعوت دیتے۔ اس طرزِ فکر نے لوگوں کے اندر ایک مستقل خوف زدگی کی کیفیت پیدا کر دی۔ فرد ہو یا قوم سب کے دل پر اسی خونغواز جذبے کا پورا سلط دکھائی دبتا ہے اور سب لوگ ایک دوسرے سے لرزائی نظر آئے ہیں۔ اس سلسل خوف نے انسانیت کے اندر نہایت ذلیل خصائص کو اپہار دیا ہے۔ مثلاً خود غرضی، سنگدلی، بُخل، تنگ نظری، بد عہدی، خیانت اور ریاکاری۔ عمدہ حاضر کے ماہرین نفسیات نے اپنے انکشافات سے اس حقیقت کو ثابت کیا ہے کہ انسان کے وہ اعمال جن کی غایبت اپنی قوت کا اظہار ہے ان کے باوجود خوف کا جذبہ ہی کار فرما ہوتا ہے۔ لہذا یہ فوجی قوت کی بے جا نمائش، خسروانہ جدل اور غیر مسئول اقتدار کی ہوس سب اسی کے نتیجے ہیں۔

۲۔ اس طرزِ خیال نے انسانیت کے مستقبل کو سراسر تاریک کر دیا۔ جو فلسفہ انسانی انا کے عمل، تخلیق کی توجیہ زمان و مکان کے ذریعے سے کرے گا وہ انسان کو کائنات کے قواعد و حدود تو بتا سکتا ہے مگر اس کی زنجیروں سے انسان کو کہیں نجات نہیں دلا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ انسان اپنے مستقبل کے ہارے میں روز بروز سابوس ہوتا جا رہا ہے۔

۳۔ چون کہ یہ نظریہ باہمی کشمکش کو انسانیت کے ارتقا کا سب سمجھتا ہے اس لیے انسان میں تعاون کے احساس ابھرنے کے بعد می خاصمت اور حسد کے جذبات بھڑکتے ہیں۔ یہ نظریہ انسان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ اگر تمہیں پہلو نا پہلنا ہے تو تمہیں اپنے اپنے کچھ اس کشمکش میں جھونک دینا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ انعام بالکل بے رحم اور سنگدل بن گیا ہے۔ اس کی رو سے اگر کوئی قوی کسی کمزور کو پامال کر کے آگے بڑھتا ہے تو وہ عین فطرت کے تقاضوں کو پورا کر رہا ہے اور اپنی صلاحیتوں سے یہ ثابت کر رہا ہے کہ جینے کا حق صرف اسی کو ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی خلم سہتا ہے اور طاقتوروں کے پاؤں تلے پامال ہوتا ہے تو اسی قابل ہے کہ اس کے ساتھ یہ سلوک کیا جائے۔ اس نظریے نے نہ صرف انسانیت کو جابر اور ظالم بنادیا ہے بلکہ ہر صاحب قوت کو برعکس

دود حاضر کی تعریکیں اور مذہب

۸۶

ثابت کرد کے سرمایہ داری اور استعماریت کے لیے عقلی زمین فراہم کرنے کی کوشش ہی ہے۔ لیٹنے جنگل کے دم اگرچہ بہلے بھی انسان کرتا رہا ہے مگر بہلے اسے شرمسجھ کر کیا جاتا تھا، اس فلسفے نے اسے سراسر خیر میں تبدیل کر دیا ہے۔ بہلے لوگ ظلم کرنے والے کو ظالم سمجھتے تھے، اب اسے عادل سمجھا جاتا ہے۔ چنان چہ ایک فرانسیسی مصنف اکھتا ہے:

”انسانیت کا احترام دلوں سے مٹ گیا ہے۔ زندگی اپنی حقیقی قدر و قیمت نہیں رکھتا اور واقعہ یہ ہے کہ درندگی اپنی انتہا کو بہنج چکی ہے۔“

۴- پھر اس تصورِ حیات نے لوگوں کے دلوں میں اس خیال کو راسخ کر دیا ہے کہ ہر قسم کی حرکت اور کشمکش، بہ شرطے کہ وہ مادی اعتبار سے کامیاب ہو، انسان ارتقا کی ضامن ہے۔ اس خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان نے حق اور انصاف کے بجائے قوت اور طاقت کی ہستش شروع کی۔ اس نے اپنی ذہانت اور طبیاعی کو ایسے امور کے دریافت کرنے میں صرف کیا جن سے اس کی طاقت اور قوت میں اضافہ ہو۔ جارحانہ ملوکیت اور ظالماں سامراج اسی تصور کے شاخانے ہیں۔

۵- نیز اس طرز فکر نے لوگوں کو مذہب و اخلاق کی اجتماعی حیثیت سے انکار کرنے کا درس دیا۔ اس نے انسانوں کو یہ تعلیم دی کہ ان کا فرض یہی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی بقا و استحکام اور حصول قوت و اقتدار کے لیے کوشش رہیں، چاہے وہ کسی طور پر بھی حاصل ہو۔ اگر یہ مقصد مذہب و اخلاق کی پروفی سے حاصل ہو تو اسے اختیار کر لیا جائے۔ اگر کامیابی ان کو ترک کر دینے سے حاصل ہو تو انہیں فی الفور نظر انداز کر دینا چاہیے۔ بچھلی چار صد یوں میں سیکیاولی کی تعلیم کو جو قبول عام نصیب ہوا اس کی بڑی وجہ یہی نظریہ ہے۔ ”گوبیلز کے مندرجہ ذیل الفاظ اس فکر کی صحیح ترجیح کرتے ہیں:

”ساری قوت اور طاقت کا مقصد صرف ایک ہے کہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے مخالف کو شکست دی جائے۔ ہماری تعریک مذہب کی پیش کردہ اخلاقی قیود سے یکسر آزاد ہے۔“

یہ ہیں مغربی تہذیب کے عناصر ترکیبی اور ان کے انسانی زندگی پر اثرات۔ خواہ بورپ کی لادینی جمہوریت ہو یا روس و چین کی اشتراکیت یا ہتلر اور

سولہنی کی سلطانیت، یہ سب اسی ایک تہذیب کے مختلف رخ ہیں۔ ان کی اساس اور بنتیادی روح ایک ہی ہے اور یہ سب ایک ہی مان باپ کی اولاد کی بنند ہیں۔ ان کے ہاتھ اختلافات بجا، لیکن ان کا بنیادی مزاج ایک ہی ہے۔ ان کی جڑیں ایک ہی تہذیبی روایت میں پیوست ہیں۔
لادینیت اور اس کے اثرات کا جانبہ مندرجہ بالا صفحات میں آگیا ہے۔
اب ہم آئندہ صفحات میں اختصار کے ساتھ اشتراکیت کا مطالعہ کریں گے۔

اشتراکیت

اشتراکیت سرمایہ دارانہ جمہوریت کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔ اشتراکی ریاست کے قیام کا اصل مقصد یہی تھا کہ ان خرابیوں سے چھٹکارا حاصل کیا جائے جو دورِ جدید کے معاشرے کو لاحق ہیں، اور اگرچہ اشتراکیت کے علمبردار سرمایہ دارانہ تہذیب کی اقدار ہر کڑی تنقید کرنے ہیں لیکن اشتراکیت کے بہ غور مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دین مادیت کے خلاف رد عمل نہیں بلکہ اس کی تکمبل ہے۔ ان دونوں میں بہت حد تک ممائنت ہائی جاتی ہے کیوں کہ دونوں کو ایک ہی سرچشمہ سے فکری خدا ملتی ہے۔ معاشرت و معاملات، اخلاق و اجتماع، سیاست و آئین اور علم و فلسفہ کی بنتیادی قدریں دونوں میں مشترک ہیں۔ اگر ان میں کچھ فرق ہے تو صرف مظاہر کا ہے نوع کا نہیں۔ اشتراکیت مادیت ہی کی زیادہ موثر، وسیع اور ہمہ گیر تحریک ہے۔ اس نے زندگی کے سارے شعبوں کو مادہ پرستی کی بنیادوں پر استوار کر کے نہ صرف انہیں ہم رنگ بلکہ ہم آہنگ بھی بنایا ہے۔ لہذا اس کے مطالعے کے لیے ضروری ہے کہ ہم یہ بات اچھی صرح ذہن نشین کر لیں کہ یہ محض غریبوں اور مفلسوں کے سماںی سائل کا حل نہیں بلکہ فکر و نظر، فلسفہ و اخلاق۔ تمدن و نہدیب اور مابعدالطبیعیاتی تخیلات کا ایک مستقل نظام ہے اور اس لحاظ سے کوئی شخص اس پورے نظام کو قبول کریے بغیر محض اشتراکی معاشریات کو اختیار نہیں کرسکتا۔ اور اگر کوئی ایسی ناممکن اور خلاف عقل بات کا دعویٰ کرتا ہے تو یا تو وہ کم علم ہے یا منافت سے کام لیتا ہے۔ اس نظام فکر میں اس بات کی کوئی گنجانش نہیں کہ آپ اس کی ایک چیز لے لیں اور باقی چیزوں کو چھوڑ دیں۔ اس کے سارے پہلو ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور اپنی بغا کے لیے اپنے دوسرے اجزا سے غذا حاصل کرنے ہیں۔

اشتراكی فلسفہ حیات

دور حاضر کی تعریفکن اور مذہب

۸۹

اشتراكیت کے حامی اور اس کے مخالف عام طور پر اپنی بحث کا آغاز
تاریخ کی مادی تعبیر سے کرتے ہیں۔ یہی ان کے نزدیک اشتراكی فلسفے کی
جان ہے۔ مگر ہم اس کے متعلق کچھ عرض کرنے سے ایستر اس نقطہ نظر کا
کہوں لکانا چاہتے ہیں جو اشتراكیت اس کائنات کے متعلق انسان کو عطا کریں
ہے۔ انسان خواہ کسی خیال کا حامی ہو، وہ اس امر پر غور کرنے کے لیے
جبور ہے کہ جس دنیا میں وہ زندگی گذار رہا ہے اس میں اس کی کیا حیثیت ہے
و اگر اس کو برئے تو کیا سمجھو کر برئے؟ اس کی زندگی کا مقصد و متنہ
کیا ہے؟ یہ وہ اولین اور بنیادی سوالات^۱ ہیں جن کو کوئی ایسا نظام نظر انداز
نہیں کر سکتا جس کا تعلق زندگی کی گھرائیوں سے ہو۔ اپنی سوالات کے حل پر

مارکسی فکر کی اساس یہ ہے کہ اس کائنات کی اصل حقیقت مادہ ہے جو
جوہر کے مجموعے سے عبارت ہے جن کی تشویح طبیعت کے اصول سوچوں کے
ذریعے سے ہی کی جاسکتی ہے۔ عالم میں جو کچھ بھی موجود ہے وہ ان قوانین کا
ہابند ہے۔ اس طرز خیال کے حامیوں کے نزدیک کسی بالاتر ہستی کا وجود پا
نہایت خطرناک اور سہلک بھی ہے۔ خدا خود کوئی قائم بالذات ہستی نہیں
بلکہ اس کے وجود کا اقرار انسان کی عاجزی اور درمانگی کا اعتراف ہے۔ نوع
انسان جب کائنات کے اسباب و اثرات کے وسیع اور پیچیدہ طبقہ کو جو غیر
محدود زمان و مکان میں پھیلا ہوا ہے سمجھنے سے عاجز آجائی ہے تو وہ مجبور
ہو کر ایک بالاتر ذات کو تسلیم کر لیتی ہے۔ مگر جب انسان طبیعی قوانین
کی ان پیچیدگیوں کو حل کر لے کا تو ہر اس کے دل میں خود بخود کسی بلند و
بالا ذات کا خوف باق نہیں رہے گا۔ اس لحاظ سے خدا کا وجود دراصل قوانین طبیعی
سے لامعنی کا نتیجہ ہے۔

وہ فلسفہ جو انسان کو یہ تعلیم دے کہ اس دنیا میں کوئی بالاتر
ہستی موجود نہیں وہ قدرت طور پر ذہن انسان میں اس خیال کو بھی رائخ
کر دیتا ہے کہ اس کی اپنی حیثیت اس کارخانہ^۲ حیات میں ایک عارضی اور اتفاق شے

۱. زندگی کے بنیادی سوالات پر مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو باب اول۔ مرتب

مذہب اور دور جدید

ب سی شے جو فطرت کی اندری قوتون کی نہ صرف تخلیق ہے بلکہ ان کے ہاتھ
بیس لے بس کھاؤنا بھی ہے -

پھر جب ہم یہ تصور کرنے ہیں کہ اس عالم کی مالکیت رہان و مکان
کے علاوہ کچھ بھی نہیں تو ہمیں از خود اس بات کو بھی تسلیم کرنا پڑنے کا
کہ مادے کی یہ منظم دنیا صرف توانائی کی لہروں سے تعمیر ہوئی ہے - اور
اس عالم کے علاوہ کوئی دوسرا عالم نہیں۔

اس میکانکی تصور حیات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے عمل سے
غیر ذمہدار اور خود غرض ہو جاتا ہے - معاشری زندگی میں بجا نے تعاون کے
مسابقت و مخالفت کا جذبہ کار فرمایا ہوتا ہے - اور اس طرح معاشرہ میں چمن و سکون
کے بجائے فساد و اضطراب کا دور دورہ ہوتا ہے -

ن ابتدائی گذارشات کے بعد اب ہم اشتراکی فلسفے پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

تاریخ کی مادی تعبیر

مارکسی فکر کا پہلا عنصر تاریخ کی مادی تعبیر ہے - مارکس کے اس
نظریے نے مطابق کسی عہد کا معاشی نظام کے اس عمد میں معاشی
زندگی کی اصل بنیاد ہے - مذہب، تہذیب، فلسفہ حیات، فنون لطیفہ سب اسی
کا عکس ہیں - یہی نہیں بلکہ تمام انسانی تغییلات و جذبات اسی سے ماحوذ ہوئے
ہیں - فکر معاش کی تگ و تاز ہی فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود
کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے - الغرض یہی معاشی نظام حیات انسانی کے سارے
مشاهدات کا اصل خالق ہے - لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ پیٹ کے
تقاضوں کے علاوہ بھی کچھ اور تقاضے ہیں - مگر وہ سب غلط فہمی کا شکار ہیں۔
انسانی زندگی کا اصل معنک صرف معاشی ضروریات ہیں - مارکس نے اس
طرز فکر کو اپنے فلسفہ تمدن اور تاریخ کا سنگ بنیاد قرار دیا ہے کیوں کہ
اس کے نزدیک زندگی کی تمام قدریں اسی کے توسط سے تخلیق پائی ہیں -

معاشی نظام دو چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے، ایک ہیداواری قوتیں اور دوسرے
معاشی تعلقات - معاشی تعلقات بذات خود ہیداواری قوتون کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

۱- میکانیک تصور حیات کے نتائج کا تفصیل مطالعہ ہم باب ۱ میں کر چکے ہیں - اشتراکت
کے فلسفہ حیات کا مختصر اور جامیان اینجلز کی 'رد ڈورنگ'، (Anti-Dühring)
میں ہے۔ (مرتب)

رفار زمانہ کے ساتھ جب طریق پیدائش کی نئی گردیں کھلتی ہیں تو زندگی کے دوسرے شعبوں سے ہم آہنگ باقی نہیں رہتی اور معاشرتی تعلقات کو ایک نئی شکل دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہی وہ کوشش ہیں جنہیں ہم تاریخ عالم میں انقلابات کے نام سے تعبیر کرے گئے ہیں۔ چون کہ ایجادات و اکشافات کا ایک لامتناہی سلسلہ طریق پیدائش میں ہر آن تبدیلی پیدا کرتا رہتا ہے اس لیے انسانیت کو بھی کسی منزل پر سکون و قرار نصیب نہیں ہوتا۔ جب ایک منزل ہر اس کا قافلہ پہنچ جاتا ہے تو پھر پیداوار کے طریقوں میں ایک تغیر رونما ہوتا ہے جو انسانیت کو پھر بے چین کر کے اسے آگے بڑھنے کی دعوت دیتا ہے۔

اس نظریے سے نہ صرف انسانی ارتقا کی شاہراہ، علوم عوقہ ہے بلکہ اس سے اخلاق اقدار کا ایک نیا تصور بھی سامنے آتا ہے۔ اس کے مطابق دنیا کی ساری صداقتی اخلاق اور غیر مستغل قرار ہاتی ہیں۔ یہ حقیقت جس دور کے خارجی حالات سے وجود ہڈیر ہوتی ہے اس دور کے ختم ہو جانے پر ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے۔ ابھی کوئی صفات نہیں اور نہ ہو سکتی ہے جو ہر زمانے کے لیے پکان طور پر صحیح اور ابدی ہونے کا دعویٰ کرے۔ لہذا ہر دور کے جدا گانہ معتقدات ہوتے ہیں۔ نیک و بد، محمود و مذموم اور حق و باطل کی تفہیق سراسر فربہ ہے۔ ایک چیز جو ایک دور میں حق ہے وہی دوسرے دور میں باطل ہو سکتی ہے۔ اسی طرح ایک عمل ایک خاص ماحول میں نیک تصور کیا جاتا ہے تو ماحول تبدیل ہونے کے ساتھ ہی اس کے متعلق ہمارا نظریہ ہمیں بدل جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام انسان تصورات و تخیلات اور اخلاق اقدار خارجی احوال و واقعات کا اور خصوصاً معاشی نظام کا عکس ہونے ہیں۔

جہاں تک اس نظریے کی محنت کا تعلق ہے ہمیں اس حقیقت سے انکار نہیں کہ معاشری تفاضلی انسانی زندگی میں بڑا اعم مقام رکھتے ہیں۔ ہمیں اس امر میں جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف اتنا ہے کہ تہذیب و تمدن کی ہر چیز

۱۔ مارکس کے اس استدلال میں ایک بڑا اہم منطقی مغالطہ کار فرمائے۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ ابدی صداقت کا کوئی وجود نہیں اور یہ کہ، زمانے کی ذکر اور امر کے تصورات و نظریات اس زمانے کے خصوصی، ماشی حالات کی پیداوار ہتے ہیں تو پھر کبود نہ یہ بھی سمجھا جائے کہ خود مارکس کا یہ فلسفہ بھی ایسوں صہی پر خصوصی، ماشی حلات کی پیداوار ہے۔ آخر اس فلسفے کو تاریخ کا ائل اور ابدی قانون کیسے مان لیا جائے؟ مارکس کی اپنی منطق کا اگر اس نے انکار بر اطلاق کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا فلسفہ ایک خاص دور کی پیداوار تھا اور اس دور کے ختم ہوئے پر وہ بھی باطل ہوگا۔ فکر آنسائی میں اس کی کوئی مستقل بنیاد موجود نہیں ہے۔ (مرتب)

ان تفاوضوں کی کوشش سازی نہیں بلکہ اس کی تعمیر میں دوسرے عوامل بھی اس کی طرح شامل ہیں جس طرح کہ معاشری - انسان کو حیاتِ مستعار کی چند گھنٹیاں کڑائے کے لئے کھانے کی ضرورت ہے، گرسی اور سردی سے بچنے کے لئے لباس درکار ہے اور سرچہ بانے کے لئے وہ مکان کا محتاج ہے مگر یہ ضروریات اور ان کی فراہمی کی مختلف تدبیر اس کی ذہنی اور شعوری کیفیات کی تعلیق نہیں کرتیں۔ ایک مصور تصویر بنانے میں مختلف رنگوں سے کام لیتا ہے مگر اس سے یہ نتیجہ کبھی نہیں نکلا جا سکتا کہ مصور کے مختلف رنگ ہی اس کے آرٹ کے اصل خالق ہیں۔

مارکس کے اس فلسفے کے مطابق وہ معاشرے جو ایک ہی سامعاشی نظام رکھتے ہیں لازمی طور پر ایک ہی جیسا تمدن اور ایک ہی قسم کی اقدار رکھتے ہوں گے۔ مارکس نے تاریخ انسانی کو جن ادوار میں تقسیم کیا ہے اس کے مطابق رومی اور قرونِ اولیٰ کے مسلمان میشہ کے ایک ہی دور میں تھے۔ یعنی دونوں اقوام میں غلامی کا رواج تھا۔ پیدائش دولت کے طریق بھی دونوں کے ہاں ایک جیسے تھے۔ مارکس کے نظریے کے مطابق ان دونوں قوموں کے اخلاق کو ایک ہی سطح پر ہوتا چاہیے تھا لیکن تاریخ کی شہادتیں اس کے بخلاف ہیں۔ تاریخ کا ایک مبتدا بھی اس عظیم فرق کو بہ خوبی محسوس کرتا ہے جو ان دونوں قوموں کے تصورات کے درمیان پایا جاتا ہے۔ رومیوں کا اپنے غلاموں سے سلوک اس قدر سخت اور دھشت ناک تھا کہ اس کے تصور سے آج بھی جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلام نے اس مظلوم طبقے کو ظلم و استبداد سے نجات دلائی۔ اسے حیوانات کی سطح سے انہا کر انسانیت کی معراج پر ہمہنگا دیا۔

اس کے علاوہ بھی بہت سی اقوام ایسی گذری ہیں جن کا سماشی نظام ایک سا ہونے کے باوجود تمدن و اقدار ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ اقوام و افراد کی زندگی کی تعمیر میں فیصلہ کرن چیز معاشری قوت نہیں بلکہ وہ مقاصد ہیں جن کی سعی و طلب کے لئے وہ زندہ ہیں۔

۱۔ معاشری وسائل انسانی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے درکار ہیں لیکن انسان اپنے مقاصد کے حصول کے لئے اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ چیز زیادہ موثر اور اہم ہے جس سے زندگی کی ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں یا وہ جن کی خاطر انسان زندہ ہے اور جان دیتا ہے۔ (مرتب)

دور حاضر کی تحریکیں اور مذہب

۹۳

کلی طور پر معاشی ذرائع پیداوار کا نتیجہ قوار دینا ہے۔ انسانی ارادہ و عمل کو معاشی عوامل سے منائر تو ہو سکتا ہے لیکن وہ کلی طور پر ان کا پیدا گردہ نہیں بلکہ انسانی ارادہ و عمل کا محرك انسان کی خودی یا انا ہے جو قائم بالذات ہے۔ مارکس کا مادی فلسفہ ایک اور طرح ہے بھی اس کے نظریہ، تاریخ ذات نہیں جو حرکت و تغیر کا سبب ہے۔ مادے کی ایک حرکت ہی دوسروی پہلے ہنسنے والے دائرے کا نتیجہ ہے۔ گویا پانی کا ارتباش ہے جس کا ہر دائڑہ اپنے سے سیاسی نظام میں تبدیلی کا نتیجہ ہے۔ چنان جہاں اخلاق و قانون میں تبدیلی میں تغیر کا سبب ہے، اور معاشی تعلقات میں تغیر پیداواری قوتون کے تغیر کا مرہون منت ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ پیداواری قوتون میں تبدیلی کس بنا پر واقع ہوئے؟ اور کیون ایسا ہوتا ہے کہ کسی دور میں ذرائع پیداوار میں افافہ اور تغیر ہوتا ہے اور کسی دور میں جمود و سکوت رہتا ہے؟ ذرائع پیداوار میں تغیر کا سبب مارکس 'قوت تاریخ' کو قوار دینا ہے۔ لیکن اس 'قوت تاریخ' کی حقیقت کیا ہے، مارکس اس کی کوفی توجیہ نہ کر سکا۔ بہر حال یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کا کوفی تصور مادی تصور کائنات سے مطابقت نہیں رکھتا اور یہ کہ مارکس نے اس قسم کا تصور کر کے خود اپنے انسانی نظریات کی نفی کی ہے۔

بہر مارکس کے اسی نظریہ، تاریخ کی رو سے یہ بھی فروری ہے کہ اخلاق و مذہب کی اقدار جوں کہ معاشی نظام کا نتیجہ ہوئے ہیں اس لئے اخلاق و مذہب کے بدلتے سے پہلے معاشی نظام کا بدلتا ضروری ہے۔ لیکن تاریخ میں اسی سے شمار مثالیں ملیں گی کہ اخلاق و مذہب کی تبدیلی کے بہت بعد ذرائع پیداوار اور معاشی تعلقات بدلتے۔ خود مسلمانوں کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ رسول اکرم صلعم کے صحابہ میں اخلاق و مذہب کے اعتبار سے عظیم انقلاب واقع ہو چکا تھا۔ مدینہ میں ایک مکمل نظام سیاست وجود میں آ چکا تھا، کائنات و حیات کے بارے میں خیالات یک ستر بدلتے چکے تھے، لیکن نظام میں تغیر کا تون نہیں۔ ان حقائق کی توجیہ سوانی اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ انقلاب و تغیر کا اصل سبب شعور و ارادہ ہے نہ کہ معاشی عوامل۔

طبقانی نزاع

تاریخ کی مادی تعبیر سے ہی طبقانی نزاع ہے تصور کو اخذ کیا گیا ہے
مارکس کے نزدیک ہر معاشری نظام جب ترقی کرے ابک خاص منزل ہو ہنچ
جاتا ہے تو اس کے اندر سے بعض نئی پیداواری قوتی نودار ہو کر اپنے زمانے
کے حالات پیداوار سے مصادم ہو جاتے ہیں۔ نئی قوتیں اس بات کی متفاضتی ہوتی
ہیں کہ سُروجہ نظام جس طبقانی تقسیم برپی ہے اسے بدل کر طبقوں کی تقسیم
از سُر نو عمل میں لانی جائے اور وہ ملکیتی نظام ہی بدل دیا جائے جو افراد
معاشرہ کے ملکیتی تعلقات منہن کرتا ہے۔ یہ طبقہ ایک جانب تو اس طبقے
ہر سخت شاق گزرتا ہے جس نے نہایت عیاری سے صریحہ معاشری تنظیم اور
طبقانی تقسیم میں دوسرے طبقوں سے زیادہ قوت و التدار حاصل کر لیا ہے،
اور دوسری جانب مظلوم طبقہ جب نئی پیداواری قوتیوں کو آئے دیکھنا ہے
تو ان کا نہایت ہی گرم جوشی سے استقبال کرتا ہے کیونکہ ان کا معاشر
سفاد آئے والی نظام سے وابستہ ہوتا ہے۔ اسی طرح غالب و مغلوب، ظالم
و مظلوم میں ایک سلسلہ کشمکش جاری رہتی ہے جسے عام طور پر 'طبقانی
نزاع' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مارکس کے نزدیک ہر انقلاب اسی کشمکش
کا نتیجہ تھا اور ہر اہم جنگ کے پس منظر میں یہی چیز کام کرو رہی تھی۔

مارکس کے اس نظریے سے متعلق بھی ہمیں صرف اس قدر اتفاق ہے کہ
بسا اوقات مظلوم جائز حقوق کے حصول کے لئے ظالموں کے مقابلے میں
صف آرا ہو گئے۔ مگر یہ کہنا یقیناً غلط ہے کہ باری تاریخ میں اس
نزاع و کشمکش کی داستان ہے نا یہ کہ انسانی معاشرے کے تمام انقلابات کا
سب صرف یہی طبقانی تقسیم اور کشمکش ہے۔ تاریخ کے اوراق سے ہمیں
یہ چلتا ہے کہ قومی لڑائیوں کے اثرات طفہ واری لڑائیوں سے کسی طرح
کس نہ تھے، بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ قومی لڑائیاں طفہ واری لڑائیوں
سے زیادہ کثیر الواقع، زیادہ تُند و تیز، زیادہ خونریز اور انسانی مستقبل
کے لئے زیادہ فیصلہ کن تھیں۔ خود عمارے زمانے میں، جب کہ دنیا کے
سارے انسان مارکسیوں کے بہ قول دو طبقوں میں بٹ گئے ہیں، جتنی
لڑائیاں ہوئی ہیں ان میں قومی احساس اور ہم وطنی کے جذبات طبقانی شعور
سے زیادہ سوژ و عاقبتور ثابت ہوئے ہیں۔ کیا جرمی کا مزدور طبقہ روس
کے پرولتاری بھائیوں کے خلاف صفت آرا نہ ہوا؟ اور کیا انگلستان کے

JOIN ME FOR EASY ACCESS TO EBOOKS & NOTES

+92-310-545-450-3

 Css Aspirants ebooks & Notes
<https://m.facebook.com/groups/458184410965870>

 **Css Aspirants Forum**
<http://t.me/CssAspirantsForum>

Rules of the group.

*No irrelevant text/pic Islamic pic/videos

*No Smiley No Pm otherwise Removed + Blocked

*Personal text w/o Mutual consent Consider harassment.

Separate Group For Females with verification

The CSS Group does not hold any rights on shared the Books & Notes

I,m not Responsible for Copyrights.

This book/notes downloaded from the internet.

دور حاضر کی تحریکیں اور مذہب

۹۵

سرمایہ دار طبقے نے جو منی کے بورڈوا طبقے سے کوئی رعایت کی ۱۹ ہر اسلام
کا لایا ہوا ہے گیر انقلاب کس طبقہ نزاع کا نتیجہ تھا؟ کیا مسلمانوں
بین عثمان غنی^{رض} اور بلال جبشی^{رض} کا باہمی برtaوہ بھائیوں جیسا نہ تھا؟ کیا وہ
انہی ہی طبقے کے امراء اور خربا سے اسلام کی سر بلندی کی خاطر شانہ بشانہ
نہیں لڑے؟ صحیح ہے کہ انقلاب فرانس میں کسی حد تک معاشی عامل کا
ہاتھ تھا، یہ بھی درست ہے کہ یہ نزاع دو ایسے طبقات کے درمیان تھی جن
میں سے ایک کا مفاد پرانی پیداواری قوتون سے اور دوسرے کا نئے ذرائع پیداوار
ہے وابستہ تھا۔ لیکن تاریخ کے تمام انقلابات اسی نوعیت کے نہیں۔ ہر انقلاب
فرانس میں بھی معاشی عامل دوسرے بہت سے عوامل میں سے صرف ایک تھا
اگرچہ اس کا اثر دوسروں کی نسبت زیادہ تھا۔ اگر طبقات کی تقسیم ہی واحد
سبب ہوتا تو انقلاب فرانس سے زیادہ شدید انقلاب، فرانس سے قبل انگلستان
میں آنا چاہیے تھا، اس لیے کہ وہاں زیادہ تیز صنعتی ترقی کی بنا پر طبقات کی
نئی تقسیم زیادہ واضح تھی۔ لیکن انقلاب انگلستان کو اس کے پُرانے اور غیر
شدید ہونے کی بنا پر 'شاندار انقلاب' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

نظریہ 'قدر زائد'

اشتراکیت کا تیسرا اصول یہ ہے کہ کسی شے کی اصل قدر محت کی وہ مقدار
ہے جو اسے پیدا کرنے میں صرف ہو۔ چنان چہ مارکس کے نزدیک اس شے کی
قیمت کا واحد حق دار صرف مزدور ہے۔ وہ کہتا ہے کہ چون کہ اس دور میں
مزدور کو قیمتی آلات پیدائش خریدنے کی ہت نہیں ہوئی اس لیے وہ، مجبور ہے
کہ صرف اس پر قناعت کرے جو صنعت کار اس کو بخش دے۔ ایک شے کی
اصل قیمت مزدور کو دی جانے والی اجرت سے کہیں زیادہ ہوئی ہے جسے 'قدر زائد'

۱۔ یہ ایک دلچسپ تاریخی واقعہ ہے کہ پہلی جنگ عظیم سے قبل اشتراکیوں کی عالمی تحریک
‘دوسری انٹرنسیشنل’ نے متفقہ طور پر یہ طے کیا تھا کہ جنگ کا موقع عالمی اشتراکی
انقلاب کے لیے یعنی حد سازگار ہے اور اس موقع پر ہر ملک کے مزدور اور اشتراکی
پارٹیاں اپنی حکومتوں کے خلاف بغاوت کریں۔ لیکن ہوا یہ کہ اس کافرنیس سے واپس
آکر روس کو چھوڑ کر باقی تمام ممالک کے اشتراکی فالانین نے اپنی حکومتوں کی
تاہید کی اور کچھ تو وزیر جنگ، تک بن گئے۔ قوبیت کا عنصر طبقاتی مفاد کے
 مقابلے میں کہیں زیادہ موثر رہا اور دوسری انٹرنسیشنل قوبیت کی اس چنان سے نکرا کر ہاں
ہو گئی۔ لیزن نے بڑا سرپیٹا لیکن قوبیت کی روکے آگے اس کے کچھ نہ چل سکی۔ (مرتب)

Surplus value.

لہا جاتا ہے، حقیقتاً تو یہ مزدور کا حصہ ہے لیکن صنعت کار اسے 'قانونی ڈاکھ زن' کے ذریعے سے ہٹپ کر جاتا ہے۔

۲۔ ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے مارکس سے بڑھ کر اس بات کے حامی ہیں کہ مزدور کو اس کا حق ملنا چاہیے۔ رسول اکرم صلعم کی حدیث ہے کہ مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کردو۔ اس حدیث کے جہاں یہ معنی ہیں کہ اجرت کی ادائیگی میں عجلت ضروری ہے وہاں یہ معنی بھی پوشند ہیں کہ اجرت ایسی ہو جو کام کی منصافانہ مزدوری کھلانے کی مستحق ہو۔ لیکن کوئی بھی سمجھ دار آدمی یہ ماننے کو تیار نہ ہوگا کہ شے کی قیمت بعض مزدور کی ریجت کا نتیجہ ہے۔ کسی شے کی تیاری میں موجود کی ذہنی صلاحیت، استعمال کی بنا پر مشین کی شکست و ریخت، صنعت کار کا حسن انتظام، کارپکر کی سبارت، اور مزدور کی محنت سب ہی کچھ شامل ہے۔ نا انصاف ہوگی اگر بورا نفع مزدور ہی کو لوٹا دیا جائے۔ چنان چہ جو چیز اصل اہمیت کی حامل ہے وہ ملکیت کا مزدور کو سونا جانا نہیں بلکہ منافع کی منصافانہ تقسیم ہے۔

تصور ریاست

اشتراکیت کا خوتھا اصول ریاست سے ستعلق ہے۔ اس کے مطابق ریاست ایک ایسا ادارہ ہے جس کی غرض بھی اس کے کچھ نہیں کہ دولت مندوں اور برسر اقتدار طبقوں کے مخصوص مفادات کی پاسبانی کرے۔ ہر عمرانی ادارے کی طرح ہو سیاسی ادارہ بھی اس کے نزدیک مروجہ نظام معیشت کا خارجی قلب ہوتا ہے، جس کا مقصد انتظامیہ کی نگاہ میں بس یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے سے برسر اقتدار لوگوں کے ہاتھوں کو مضبوط کرے اور ان کی منفعت اور غربب طبقے کے استعمال کو قانونی شکل دئے کر ان کے مفادات کو کچلتی رہے۔

یہ صحیح ہے کہ اکثر اوقات سرمایہ دار اپنے اثر و رسوخ کی بنا پر سیاسی قوت کو اپنے مفاد کی خاطر استعمال کرنا چاہتے ہیں اور بسا اوقات وہ اس میں کا سیاہ بھی ہو جاتے ہیں۔ ہم خود کبھی چکے ہیں کہ موجودہ سرمایہ دارانہ ریاست دولت مند طبقے کے ہاتھ میں کھلونا بنی ہوئی ہے۔ لیکن کسی چیز کے غلط استعمال سے یہ بات ثابت نہیں ہوئی کہ وہ شے بہ ذات خود بڑی ہے۔ پھر تاریخ گوہ ہے کہ دنیا میں ایسی ریاستوں کا وجود بھی رہا ہے جن کو

دور حاضر کی تعریکیں اور مذہب

۹۶

برما یہ دار طبقہ اپنے مفاد کے لئے باوجود کوشش کے استعمال نہ کر سکا۔ اس ہے ثابت ہوتا ہے کہ ریاست کا اصل مقصد تو عدل و میزان کا قیام ہے، یہ انسان کی بدقسمتی ہے کہ وہ اپنی خود غرضی کی بنا پر کبھی کبھی اسے ظلم و زیادت کے لئے بھی استعمال کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اسلامی ریاست کا وجود برس اقتدار لوگوں کے مفادات کی حفاظت کے لئے نہ تھا بلکہ اس کی خاتم سماج کے مختلف طبقوں میں ساوات قائم کرنا تھا۔ چنانچہ خلیفہ اول اپنی حکومت کا بنیادی مقصد بنانے ہونے فرمائے ہیں:

”اور تم میں جو بے اثر عین میرے نزدیک وہ با اثر ہیں بہاں تک ہیں وہ میرے نزدیک بے اثر ہیں بہاں تک کہ میں ان سے دوسروں کا حق وصول نہ کرلوں (انشا اللہ)۔“

اشتراکیت کے ان بنیادی تصورات پر اشتراکی تعریک کی جو عظیم الشان عمارت تعمیر کی گئی اس کے تحت لوگوں کو بنایا گیا کہ دنیا کی ساری برکتیں اسی کو اپنانے سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ جو قوم بھی اسے قبول کرے گی اسے اس دنیا میں جنت کی نعمتیں حاصل ہونی گی۔ خصوصاً:

- ۱۔ اس کے اندر طبقاتی تقسیم نابید ہو گی۔
- ۲۔ کوئی طبقہ دوسرے طبقہ پر ظلم نہ کر سکے گا۔
- ۳۔ ساوات شکم کے اصول پر کاربنڈ ہونے سے معاشری عدل قائم ہو گا۔
- ۴۔ ریاست، جو جبرا کا سب سے بڑا اوزار ہے، خود بغود ختم ہو جائے گی۔

اشتراکیت جن ذرائع سے ان مقاصد کو حاصل کرنا چاہتی تھی اس کے بنیادی اصول یہ ہیں:

- ۱۔ دولت کی شخصی ملکیت کا استحصال کر دیا جائے۔
- ۲۔ دولت اور وسائل دولت آفرینی پر تمام حقوق مالکانہ جماعت کو حاصل ہو گی۔
- ۳۔ دولت آفرینی اور تقسیم دولت کا بورا انتظام جماعت کے ہاتھ میں ہو جس کی طرف سے حکومت اس فریضہ کو سرانجام دے۔

اس ”مشترک ملکیت“ کا حصول بہر حال کوئی کھیل نہ تھا کہ بس

ہنسی خوشی انعام ہا جاتا۔ جہاں کہیں بھی اشتراکی بوس، اقتدار اُنے سر کامیاب ہونے ہیں اول تو خود فربی، دخا اور قتل و غارتگری کے بعد حصول حکومت میں کامیاب ہونے۔ پھر برسوں تک مسلسل نہایت ہولناک ظلم و ستم کے بعد اجتماعی ملکت کا نفاذ ہو سکا۔ صرف روس میں اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے جس قدر ظلم و تشدد اور قتل و خون ہوا اس کا کچھ اندازہ ذیل کے اعداد و شمار سے ہو سکے گا جو جان وین ہڑنے اپنے تیس سالہ قیام روس کے زمانے میں فراہم کئے اور جو ڈبلی گروٹ کراہی کی اشاعت مورخہ ۶، ۵ جون ۱۹۳۸ع میں شائع ہوئے۔

تعداد مقتولین

اساقیف	امرا و روسا	۳۱	۶۵،۸۹۰
اہل خدمات کیا	فوجی افسر	۱۰۵۶۰	۵۹،۳۳۰
جمع، وکلا، مجسٹریٹ	مزدور	۳۲،۵۸۵	۱،۹۹۶۰۰
اساندہ و طلبہ	سپاہی اور ملاح	۱۹،۳۶۴	۳۹،۰۰۰
سول حکم	شان	۷۹،۹۰۰	۸۶۹،۰۰۰

ان اعداد و شمار پر ایک نگاہ ڈالیے اور دیکھئے، کیا یونانیوں کی ستم ریزیاں، ایرانیوں کی لشکر انگریزیاں اور چنگیز و ہلائوی قتل و غارتگری اس فہرست کے مقابلے میں کوفی حیثیت رکھتی ہے؟

پھر بہ سارا ظلم و تشدد بھی گوارا کر لیا جاتا اگر اس سے وہ نتائج برآمد ہوئے جن کی اشتراکیت دعوے دار تھی۔ ذرائع بیداوار کو حکومت کی تعویل میں دے دینا اصل مقصد نہ تھا بلکہ یہ اصل نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے ذریعہ تھا۔ اصل مقصد طبقاتی تقسیم کا خاتمه تھا وہ اب بھی موجود ہے۔ خود ایک فرانسیسی اشتراکی یوان کا بیان ہے:

”روس کے اندر طبقہ واریت ہوئی آب و ناب سے جلوہ گر ہے۔ یہاں امرا بھی ہیں غربا بھی، غالب بھی مغلوب بھی۔ ان کے معیار زندگی میں نمایاں فرق ہے۔ ڈبل کے ڈبوں، جہاڑوں اور رستورانوں میں مختلف درجوں کا ہایا جانا طبقہ واریت کی کھلی اور بین دلیل ہے۔“

طبقہ واری تقسیم کا اندازہ تنخواہوں کے اس تفاوت سے بھی ہوتا ہے جو روس میں عام ہے۔ چنانچہ ایک عام مزدور کی زیادہ بھے زیادہ تنخواہ ۲۰۰ روپیے

ماہانہ ہے جب کہ منتظمین اور ماہرین ۳۰،۰۰۰ روپے ماہانہ ہاتے ہیں۔ تھوڑا ہوں میں اتنا عظیم فرق دوسرے جموروی سالک میں بھی نہیں ہے۔

اشتراکت کے مؤیدین بڑے شد و مدد سے روس کی قومی آمدی میں اضافہ کے اعداد و شمار گئے ہیں۔ لیکن ایسا کرنے وقت وہ بہول جاتے ہیں کہ اس اضافے میں کتنے ہے گناہوں کا خون شامل ہے۔ روس کے اکثر بڑے منصوبے چیزوں میں کتنے ہے گناہوں کا خون شامل ہے۔ مشہور عالم کتاب ”میں نے آزادی کا انتخاب کیا“ کا صحف جو ابک سابق اشتراکی ہے اہنی تصنیف میں لکھتا ہے :

”ہماری صنعت کا سب سے بڑا سہارا قیدیوں کی ایک بہت بڑی فوج تھی جس میں ہر آن اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سرکاری حلقوں کا بیان ہے کہ پہ تعداد کروڑوں سے بھی زیادہ تھی۔“

بہ وہ لوگ تھے جن ہر غدار وطن اور اشتراکت دشمن ہونے کا شہ تھا۔ چنان چہ ابھی افراد کو پکڑ کر سائبیریا بھیج دیا جاتا جہاں ان سے صبح چار بجے شام کے سات بھی تک کام لیا جاتا۔^۱

بہر اگر ان بیانات کو ہم ’روس کے خلاف سازش‘ قرار دے کر نظر انداز کر دیں تو قومی آمدی میں اضافہ تو منصوبہ بند معیشت کے ذریعے سے کہیں بھی ممکن ہے۔ اس کے لیے نہ اجتماعی ملکیت کی ضرورت ہے اور نہ جبر و تشدد ہے۔ جاہاں اور جو میں نے ماضی قریب میں اشتراکت کے بغیر جو اقتصادی ترقی ہے وہ اس دعوے کا عمل نبوت ہے۔^۲

مغربی تہذیب کا مستقبل

اوپر ہم نے جن عناصر تہذیب کا مطالعہ کیا ہے ان کے متعلق یہ کہنا انہاں و دیانت کے بالکل خلاف ہوا کہ ان میں حق اور خیر و افادت کا سرے ہے کوئی بھلو ہی نہیں۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ دنیا میں خالص باطل اور خالص شروعہ نہیں کا ایک لمحے کے لیے بھی زندہ رہنا محال ہے۔ دنیا میں جب کبھی ہی سلبی اقدار پر اوان چڑھتی ہیں تو وہ اس بات پر مجبور ہوتی ہیں کہ اپنے جلو میں چند ایجادی اقدار کو لے کر چلیں۔ اس کے بغیر ان کا قافلہ ایک قدم

۱۔ ملاحظہ ہو ڈیوڈ ڈالن کی کتاب، *Forced Labour in Russia*

۲۔ اس سلسلے میں تفصیل بحث کے لیے ملاحظہ ہو: خورشید احمد، سو شلزم یا اسلام؟ مکتبہ چراغ راء، کراچی۔

مذہب اور دور جدید

۱۰۰

بھی نہیں بڑھ سکتا۔ دنیا میں خالص باطل کا تصور تو کیا جا سکتا ہے مگر اسے عملی زندگی میں نافذ نہیں کیا جا سکتا۔

بھی حال اس تہذیبِ مادیت کا ہے۔ اس تمدن نے انسانیت پر
پہلوؤں سے بڑی خدمت انجام دی ہے۔ انسان عقل کو ایک زوال بہذیر دی
مذہب کے لئے حس بندھنوں سے نجات دلائی، اسے سوچنے اور سمجھنے پر ابھرا۔
لوگوں کے دلؤں پر سے جمہالت اور علمی کے پردوں کو چاک کر کے انہیں
اکتسابِ علم اور اجتہادِ فکر کے لیے تیار کیا اور اس طرح کلاسیک سکون
آفرینی کے نظریے کی جگہ حرکت اور حرارت کے اصول کو انسانی زندگی کا رہبر
بنایا اور اس طرح قلب و نگاہ کی تبدیلی سے بوری زندگی کو متاثر کیا۔ پھر اس
دور میں انسان نے معاشی پیداوار، سائنسی اکتشافات و اکتشافات، تسبیح کائنات،
ترٹیں، تمدن وغیرہ کے میدان میں غیر معمولی ترقی کی ہے۔ اس نے بنجر ریمنوں
کو سبزہ زاروں میں تبدیل کر دیا ہے، بڑے بڑے شہر آباد کر دیے ہیں، فلک
بوس عمارتیں تعبیر کر لی ہیں اور چاند تک پروہ کرندیں ڈالنے لکھے۔^۱

مگر اسے انسانیت کی بد قسمتی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ
جب اہل بورب نے ایک بار عقل سے مذہب کی گرفت کو ڈھیلا کیا تو اس
کا سیلاب اس رخ پر بہ نکلا جہاں انسانیت کو شدید قسم کے مصائب کا
سامنا کرنا پڑا۔ دنیا میں آج کر جس قدر فکری اور عملی ہے راہ روی پانی جاتی
ہے وہ سب عقل کی اسی ہے لکاسی کا نتیجہ ہے اور جب عقل انسانی خالص
مادیت کے دھارے پر پہنچتے ہوئے بہت دور نکل آئی تو آج وہ خود یہ بات سوچنے
پر مجبور ہے کہ آخر کیا وہ ہے کہ علم و فن کی ترقی کے باوجود اور مادی
سر و سامان کی فراوانی کے ہوتے ہوئے بھی انسان کو سکون اور خوشی حاصل
نہیں ہے؟ زیمن ہر سال اربوں نن غلہ آگئی ہے مگر اس کے باوجود نوع انسانی
بھوک کا شکار ہے؟ بعمر و بی اور شمس و قمر مسخر ہیں! لیکن پھر بھی انسان
کو اطمینان قلب حاصل نہیں؟ انسان قتل و غارت گری سے نجات چاہتا ہے
لیکن اس کے باوجود ہر چند سال بعد خود اپنی بنائی ہوئی مشینوں کے استعمال
سے اور خود اپنے ہی ہاتھوں کروڑوں ابناۓ جیس کو موت کے گھاٹ اتار
دیتا ہے؟ انسان خود اپنے کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کے دریے ہے۔ خود کشی

۱۔ اس سلسلے میں تفصیل بعث کے لیے ملاحظہ ہو۔ خورشید احمد، سو شلزم یا اسلام؟ مکتبہ چراغ راہ، کراچی۔

تئیں ہیں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ ذہنی امراض روز بروز بڑھ رہے ہیں۔ عقل جو مادیت کی راہ پر کچھ عرصہ پہلے کشاں کشاں چلی جا رہی ہے، آج یہ دیکھ کر حیران و پریشان ہے کہ اسے جن منازل تک پہنچنے کی نہیں وہ باوجود طویل سفر کے اب پہلے سے بھی زیادہ دور نظر آتی ہیں۔ آج بھی مظلوم ہے، آج بھی خوفزدہ ہے، معاشری عدل آج بھی منفعت دار ہے، آج بھی دھوکہ ہے، فریب ہے، مستقل قتل و غارت گری ہے، لوث مار ہے، ظلم ہے، نا انصافی ہے اور بعض ہم لوگوں سے پہلے سے کہیں بڑھ کر ہے۔ پہلے کہ آج کے انسان نے فطرت کی تسخیر کی، بعروس بر پر قابو حاصل کیا، نہایات کی دوری کو سکم کیا، ذرات کا جگر چیر کران کی توانائی کو استعمال کیا۔ لیکن یہ سب باتیں یہ ذات خود مقصود زندگی نہیں بلکہ امن و سکون اور مہانت قلب کے حصول کا ذریعہ ہیں، چین اور آرام کا وسیلہ ہیں۔ اور جب یہ بننے کے کو ہوا نہ کریں تو یہ کار ہیں۔

یادی تہذیب کے ہدایا کردہ خطرناک نتائج کو دیکھ کر خود اہل بذریعہ خوفزدہ ہیں۔ ہم یہاں صرف دو بڑے مفکرین کے چند اقوال نقل کرتے ہیں تاکہ آپ کو ان کے اضطراب کا معمولی سا اندازہ ہو سکے۔ مشہور ماہر عربانیات پروفیسر ساروکن اپنی معروف عالم کتاب ”ہمارے زمانے کا بعران“،^۱ میں لکھتے ہیں :

”بھی شہادتوں کے ہیش نظر مجھے اس بات کا ہوری طرح
الجنان ہو گیا ہے کہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ، ہماری تنظیم اور
ہماری سوسائٹی، ایک زبردست بعران سے گذر رہی ہے۔ جسم کا
کوئی حصہ، قلب و دماغ کا کوئی ریشه ایسا نہیں جو صحیح طور
پر کام کر رہا ہو۔ ہمارے سارے بدن میں ناسور ہیں۔“^۲

تاریخ انساف کے عظیم المرتب عالم پروفیسر آرنلڈ - جے - ٹائن بی نے اپنے ایک مضمون ”تاریخ جدید انسان“ کو متبع کر رہی ہے،^۳ میں بڑی صفائی اور تفصیل سے تہذیب جدید کی ناکامی کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں :

”جدید انسان کا حال جوئے کے اس کھلاڑی کا باہم جس
نے اپنا داؤ بڑھاتے بڑھاتے یہاں تک پہنچا دیا کہ اس کا بنک
اڈؤنٹ، اس کی معاش اور اس کی زندگی سب بساط پر رکھئے ہیں۔“

مذہب اور دور جدید

۱۰۲

تعطل بڑا خطرناک ہے وہ سوچتا ہے کہ بازی مار لینی چاہیے لیکن اسے اپنے ہر بڑھوئے نہیں کہ جس کے بل بڑاں کی کامیابی ہو۔“
ظاہر ہے یہ عدم اعتمادی ان ہے درجے شکستوں کا نتیجہ ہے جو اے
ناقص ہنر کی بنا پر ماضی میں سہنا ہٹیں۔

”ہوئی تاریخ سے مجھے ایک ہی سبق ملتا ہے، یہاں کوئی چیز دنیاوی کامیابی سے بڑھ کر ناکام نہیں، اکیس تیونوں کے مطالعے کے بعد سیرا اس بات پر پختہ پقین ہو گیا ہے کہ تمدن اسی وقت تک صحت میں رہتے ہیں جب تک ان میں تخلیق کی صلاحیت برقرار عمل رہتی ہے۔ ہماری سائنسی ترقیات منعیتی دور کے چیلنج کا ایک تخلیقی جواب نہیں، اور ایک نہایت ہی عملہ جواب۔ لیکن جو سائل ہیں در پیش ہیں وہ اس نوعیت کے نہیں کہ ان کا جواب تجربہ کا ہوں سے دیا جائے۔ یہ اخلاق سائل ہیں اور سائنس اخلاق کے دائرے میں کوئی دخل نہیں رکھتی۔ اپنے سائل کو خالص مادی تدبیر سے حل کرنے کی ہماری حالیہ سماںی بداہہ۔“
ناکام ہو چکی ہیں اور ہمارے تمام بلند بانگ دعوے بعض مذاق بن کر رہ گئے ہیں۔ اپنی معاشرتی بیماریوں کو خدا کے بغیر حل کرنے کے نتائج ہمارے سامنے آچکے ہیں۔“

چنان چہ وہ نتیجہ اخذ کرنے ہیں کہ

”دور حاضر کی سب سے بڑی ضرورت ایک فوق الطبعی ایمان کا احیاء ہے۔“

تہذیب العاد کے بارے میں جو چند آراء پیش کی گئی ہیں وہ مغربی ادب کی سیلونوں سے ذہونڈ کر نہیں لائی گئی بلکہ یہ وہ عام رجحان ہے جو یورپ میں بڑی سرعت سے پھیل رہا ہے۔ اپ کوئی کتاب انہا کر دیکھیں اس میں اس کا تذکرہ پائیں گے، کسی رسالے کے اوراق الیں اس میں یہی خیال جمکاتا نظر آئے گا، یہ نہیک وہ لمحہ ہے جس میں انسان مذہب کی ضرورت کو نہایت شدت سے محسوس کر رہا ہے۔

لیکن آج کے سائنسک انسان کے لیے صرف وہی مذہب قابل قبول ہو سکتا ہے جو عقل و خرد کے خلاف نہ ہو، جو توهم و تعصب کا نتیجہ نہ ہو، جو غیر فطری عبادات و اعمال کا طلب کار نہ ہو۔ ان معیارات پر ہر کہنے سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو زمانہ حاضر کی ضرورتوں

دور حاضر کی تعریکیں اور مذہب

۱۰۳

کوئی خوبی سے ہورا کرسکتا ہے۔ ہندو مت اور بدھ مت کے خیالی فلسفے انسان کو مسحور تو کر لیتے ہیں لیکن اس کی عملی زندگی میں رہنا نہیں ہے۔ یہ مذاہب اصلاح باطن سے آگے نہیں پڑھتے؛ انہوں نے اخلاق بداعظ و نصانع کا مجموعہ تو بڑا دلاویز پیش کیا ہے مگر سیاست و مدینت کا کوئی خارجی نظام نہیں دیا جو ان مواضع و نصانع کی ہابتدی کے لیے نظر بازگار کر سکے۔ عیسائیت نے تو خود مذہب و سیاست کی تفریق کو قبول کر لیا، لہذا، وجودہ انسان کی بیماریاں دور ہو سکتی ہیں تو صرف اسلام سے اور انسائیت کی فوز و فلاح اگر ممکن ہے تو اسلامی نظام زندگی کو بعثت کر لے آئے ہے۔ اسلام در حقیقت وقت کی ہکار ہے، حالات کا مطالبہ ہے، زمانے کا مقام ہے، پریشان انسائیت کا مداوا ہے، حقیقی شادمانی کی ضمانت ہے۔

اب یہ فرض مسلمان کا ہے کہ وہ اس ہکار ہر سب سے بھلے لبیک کرے، خود اپنی زندگی کو اسلامی سانحہ میں ڈھال کر دوسروں کے سامنے مثال پیش کرے۔ وہ اس طرح نیا کی امامت کا منصب حاصل کرے۔ کائنات کی ساری نوبتیں اس کے اس نہک عمل میں تعاون کے لیے تیار ہیں اور خود یہ دعوت دے رہی ہیں لہ

انہ کہ خورشید کا سامان سفر تازہ کریں
نفس سوختہ شام و سحر تازہ کریں

مزید مطالعے کے لیے

پروفیسر عبدالحید صدیقی، انسائیت کی تعمیر نو اور اسلام۔ اسلامک پبلیکیشنز
لیٹل، لاہور۔

نیم صدیقی، اسلامی تعریک دوسری تعریکوں کے مقابلے میں۔ اسلامک پبلیکیشنز
لیٹل، لاہور۔

سید ابوالحسن علی ندوی، انسانی دنیا ہر مسلمانوں کے ہرروج و زوال کا اثر۔
محل تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ۔

خورشید احمد، موشیزم یا اسلام۔ مکتبہ چراغ راہ، کراچی۔

Muhammad Asad (Leopold Weiss), *Islam at the Crossroads*

۱۔ تفصیل بحث کے لیے ملاحظہ ہو باب ۲، ”مذاہب عالم، ایک مقابل مطالعہ“۔

اسلام اور تبدیلیِ زمانہ*

ہر دور کے کچھ مخصوص نعرے ہوتے ہیں جو رفتہ رفتہ ہر شخص کی زبان ہر روان ہو جاتے ہیں اور ہر کس و ناکس بلا ادنیٰ غور و فکر ان کو رنگی اور دھرانے لکتا ہے۔ ان نعروں کا رواج عام عقل و فہم کی موت کے متادف ہے۔ جب یہ ذہنوں پر چھا جاتے ہیں تو آزادیٰ فکر باق نہیں رہتی۔ عامی اور عالم، آن ہڑہ اور ہڑھے لکھئے، سب ان ہی کامہارا لینے لگتے ہیں اور سمجھو بوجہ کی صلاحیتوں کو یہ آکاش بیل نیم مردہ کر دیتی ہے۔

ہمارے دور میں بھی کچھ نعرے ہیں جو رواج عام اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں نہ رہے ہے "با زمانہ بساز"۔ ائے دن یہ بات بڑے زور شور سے دھرانی جا رہی ہے کہ

"زمانہ بدل چکا ہے۔ مذہب کو زمانے کی تبدیلیوں کا ساتھ دیتے ہوئے نئے حالات کے مطابق بدلنا چاہئے۔ اگر مذہب دور حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ کیا گیا تو اس کے خلاف بغاوت ہوگی اور وہ زندگی سے بے دخل ہو جائے گا۔ جمود کا نتیجہ موت ہے۔ ہم کو زمانے کی تبدیلی کے ساتھ بدلنا عوکا ورنہ موت کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔"

ضرورت ہے کہ اس نعرے پر 'ایمان بالغیب' لانے کے بعد اس کے تمام بہلوؤں پر عقل و تجربے کی روشنی میں غور کیا جائے اور محض اس لئے کسی بات کو قبول کرنے کی غلطی نہ کی جائے کہ اس کا اظہار بد تکرار ہو رہا ہے۔

* یہ بب مرتب کے قلم ہے۔

اس امر میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں کہ زمانہ ہمیشہ رنگ بدلتا رہا ہے، بہت کچھ بدل چکا ہے اور مزید بدلتے گا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جمود ایک صیبیت ہے جو قوم کی تغلیقی قوتون کو بخستہ کر دیتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہر تبدیلی صحت مند ہے؟ کیا ہر تغیر باعث خیر ہے؟ کیا تاریخ کا ہر قدم عروج ہی کی طرف انہتا ہے؟ اور کیا ہر حرکت بلندی ہی کی صحت جاتی ہے؟

ان سوالات پر جب آپ تاریخ کی روشنی میں غور کریں گے تو لازماً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ان کا جواب نفی میں ہے۔ ہر حرکت ترق کے متراکف نہیں۔ ایک نوع کی حرکت اگر آپ کو ثریا کی بلندیوں تک لے جاسکتی ہے تو ایک دوسری قسم کی حرکت تخت الشیخ کی پستیوں تک لے اترنے ہے۔ مطلوب نفس حرکت نہیں بلکہ صحیح صحت میں حرکت ہے۔

ترق ایک اضافی اصطلاح ہے۔ ترق اور تنزل کا فیصلہ منزل کے لعاظ میں ہو سکتا ہے۔ ہم صرف اسی حرکت کو ترق کہہ سکتے ہیں جو صحیح راستے سے ہمیں اپنی منزل کی طرف لے جاری ہو۔ جو حرکت منزل کے برعکس صحت میں لے جانے والے ترق نہیں بلکہ تنزل ہے۔

اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ حرکت سے پہلے صحت حرکت اور منزل مقصود کا تعین ہونا چاہیے ورنہ محض جمود کو توڑنے کے شوق میں کوئی حرکت کر کے آپ اپنی منزل سے اور دور بھی ہٹ سکتے ہیں۔ تبدل اور تہذیبیں زندگی میں اصل معیار وہ مقصود ہوتا ہے جو آپ حاصل کرنا چاہیں۔ اگر آپ کا مقصد اور آپ کی منزل اسلام ہے تو پھر وہ حرکت جو اس کی مخالف صحت میں لے جانے، خواہ وہ کتنی ہی سبک خرام کیوں نہ ہو، ترق' معمکوس ہوگی۔ بلکہ وہ حرکت جتنی تیز ہو، تنزل اتنا ہی تیز رفتار ہوگا۔

اسی طرح اندھی نقید اور کورانہ نقالی صرف ماضی ہی کی نہیں ہوئی، حال کے بروجہ طریقوں اور ضابطوں کی بھی ہو سکتی ہے، اور کسی فرد یا قوم کی خودی اور اس کے صحت مدنانہ ارتقا کے لیے جتنی سہلک ماضی کے بتون کی اندھی پرستش ہے اتنی علی ہم ملک نئے بتون کی ہو جا بھی ہے۔ بلکہ اگر گھری نظر سے دیکھا جائے تو نقالی دراصل جمود ہی کی ایک شکل ہے۔ اگرچہ یہ بڑی

مذہب اور دور جدید

پُر فریب! عقل و فکر کو دونوں ہی صورتوں میں معطل کر دیا جاتا ہے۔ جمود میں آپ ماضی کی پرستش کرتے ہیں اور لکھیر کے فقیر بنے رہتے ہیں تو ناقالی میں آپ ماضی کے بجائے کسی نئے سورج کی پرستش سروخ کر دیتے ہیں۔ آپ کی انہی خودی کے لیے دونوں تباہ کن ہیں۔

جو لوگ زمانے کے چلن کی ہیروی کا بلا وادینے ہیں وہ بھول جائے ہیں کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ دراصل دوسروں کی تقليد ہی کی دعوت دے رہے ہیں، اور تقليد اگر 'جدید' کی کی جائے تو وہ کوئی نظر کے قابل چیز نہیں ہے جاتی۔ اس کے نقصانات علی حالہ قائم رہتے ہیں جن کی بنا پر قوم کی اپنی تخلیقی صلاحیتیں کبھی آپھرنے نہیں ہاتیں۔ اس کی وجہ سے انسان کی روح میں جمود اور احسان کمتری پہلوت ہو جاتا ہے۔ ہیروی قوم زمانے کو بدلتے کے ساتھ سے آگے بڑھنا کبھی اسے نصیب نہیں ہوتا۔

ہر زمانے کی تبدیلی کا ذہن دوارا پہنچے والے اس امر کو بھی ملحوظ نہیں رکھتے کہ زمانہ تو بدلتے ہی کے لیے بنا ہے۔ اُج وہ ایک خاص سمت میں تبدیل ہوتا ہے تو کل کسی دوسری سمت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ چڑھتے سورج کی پوچھ رہے ہیں۔ لیکن چشم تاریخ نے اس امر کا بارہا مشاهدہ کیا ہے کہ بڑی ہے بڑی طاقتور تہذیب بھی ایک دن زوال کی نذر ہو جاتی ہے۔ یونانی تہذیب کے غلبے کے زمانے میں یونانیت زدہ لوگ اسی کو تہذیب انسان کا حرف اُخر سمجھتے تھے اور اس سے انعام و اختلاف کو دیوانگی، ہدیشان خیال اور کفر خیال کرتے تھے۔ لیکن ایک دن اس تہذیب کی ابٹ سے ابٹ بیٹھ گئی اور اب اس کی حیثیت آثار قدیمه کی سی ہے۔ روم کے دور عروج میں بھی ساقام روسی اس کے آثار بالائے زمین نہیں بلکہ زیر زمین ڈھوندے جا رہے ہیں! ابوقی تہذیب کی قسم بھی اس سے مختلف نہ ہوں اور یہی کچھ ان ۲۶ تہذیبوں کے ساتھ ہوا جو اپنے انہی زمانے میں غالب اور ناقابل تغیر سمجھی جاتی تھیں۔ اگر ماضی کی تمام غالب تہذیبوں قابل تغیر ثابت ہوئیں اور ایک دن کامیاب وہی لوگ ہوئے جو ان کی ناقالی نہیں کرتے تھے ان کی جگہ ایک دوسرا نظام بخش لرئے تھے تو مستقبل کے متعلق یہ کیوں تصور کر لیا جائے ہے جدید مغربی

نہذب کو۔ باوجود اس کے موجودہ غلبے کے۔ مسخر نہیں کیا جا سکتا؟

محض یہ چیزیں کہ آج ایک خاص تہذیب کو غلبہ حاصل ہے اس بات کا بیوت نہیں ہے کہ یہی تہذیب مبنی برحق نہیں ہے۔ نہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اسی کو ہمیشہ قائم رہنا ہے اور نوع انسانی کے لیے اب اس کے سوا کوئی نچارہ نہیں کہ انہرے آپ کو اسی کے سطابق ڈھال لے۔ طاقت اور غلبہ حق کے لذتیارات کو تبدیل نہیں کر دیتا اور اقتدار کسی چیز کو محاسن کا پیکر نہیں بنادیتا۔ نہ۔ ہر رائج شدہ چیز ناقابل تغیر اور ناقابل تغیر ہوتی ہے۔ یہ کمزوروں کی سنت ہے کہ وہ طاقت کی ہوجا کرتے ہیں اور ہر چڑھتے سورج کے آگے جہک جانے ہیں۔ یہ کم نظرؤں کا طریقہ ہے کہ وہ محض اس بنا پر کسی سلک کو اختیار کر لبھنے ہیں کہ اسے اقتدار اور غلبہ حاصل ہے اور یہ نہیں دیکھتے کہ وہ کہاں تک صحیح ہے اور کہاں تک غلط۔ حالانکہ دیکھنے کی اصل چیز غلبہ اور طاقت نہیں بلکہ کسی چیز کا حق یا باطل ہونا ہے۔ اگر زمانہ بدل رہا ہے تو اس کو مزید بھی بدلہ جاسکتا ہے۔ لیکن محض زین و آسان کی گردش اور ماہ و سال کی امداد رفت کی وجہ سے زندگی کے اصول، حق و باطل کے معیار، اور نیک و شر کے تعینات نہیں بدلتے جا سکتے۔

ناگزیر ترقی کا نظریہ

جدید ذہن کی تعمیر جن ہوامل نے کی ہے ان میں وہ فکر و فلسفہ بھی شامل ہے جو ہر نئی چیز کو خوب تر اور قابل احترام اور لائق اختیار سمجھتا ہے۔ مغرب کے ذہن کو 'ہیومنز' ^۱ کے فلسفے نے بہت متاثر کیا ہے اور اس فلسفے کی اساس تاریخ میں 'ناگزیر ترق کا اصول' ہے۔ اس کی رو سے ہر آنے والا دن گزرے ہوئے دن سے بہتر ہے۔ انسان کا ورنہ روز بروز بڑھ رہا ہے۔ حال ماضی سے اچھا ہے اور مستقبل حال سے بہتر ہو گا۔ ہمارے قدم لازماً ترق اور عروج کی طرف الہ رہے ہیں اور اب پیچھے ہٹنے کا کوئی اسکان نہیں۔ اس اصول کو ہیگل کے فلسفہ تاریخ اور مارکس کی معاشری تعبیر تاریخ نے بڑی تقویت پہنچائی۔ یہ اس انداز فکر کا نتیجہ ہے کہ ماضی کی ہر چیز کو کم مایہ اور حقیر اور حال کی ہوشی کو قابل قدر سمجھا جا رہا ہے اور ترق کا لازمی تقاضا یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ تغیر زمانہ کے نام پر ہر قدیم چیز کو بدل ڈالا جائے۔

یہ نظریہ بدیہی طور پر غلط ہے۔ ہمیں انسان تاریخ میں ارتقا کی کوئی سیدھی لکیر نہ نہیں آتی۔ یہ تاریخ بڑی دلچسپی واقع ہوئی۔ اس میں ترقی بھی ہے اور تنزل بھی، عروج بھی ہے اور زوال بھی، ارتقا بھی ہے اور انحطاط سمجھنا تاریخی لعاظ سے ایک بالکل غلط مفروضہ ہے جسے ہرگز صحیح ثابت نہیں دیا جا سکتا۔ جدید فلاں نہ تاریخ میں سے کوئی ایک بھی ہیکل اور مارکس کی اس توجیہ کو صحیح نہیں سمجھتا اور تاریخی حقائق اس کی توثیق کرنے سے انکاری عین۔ مسلسل ارتقا کا نظریہ آج علمی حیثیت سے ایک مستروک نظریہ ہے۔ لیکن اس کے بطن سے جس فاسد تصور نے جنم لیا ہے وہ عام پڑھنے لکھنے لوگوں کے دماغ پر مسلط ہے اور وہ اپنی ترقی پسندی کا ذہول پیش کے لیے محض فیشن کے طور پر ہر قدیم چیز پر ناک بھوں چڑھاتے اور ہر نئی چیز کی طرف بے سوچ سمجھے لپک پڑتے ہیں۔ حالانکہ قدیم کو لازماً برا اور جدید کو لازماً اچھا سمجھنا اور تمام قدیم چیزوں کو تبدیلی کے خراد پر چڑھا دینا ایک غلط روش ہے جس کے لئے کوئی دلیل موجود نہیں۔

پھر سوال یہ بھی ہے کہ زمانے کے تغیر کی نوعیت کیا ہے اور یہ تغیر زندگی کے کس دائرے میں واقع ہو رہا ہے؟

کائنات کا وہ دور جو زمین پر انسان کی آمد سے شروع ہوا ہے اب تک جاری ہے۔ ارتقائے کائنات کے نقطہ نظر سے اگر غور کیا جائے تو یہ امر صاف ظاہر ہے کہ یہ دور اپنی چند متعین خصوصیات رکھتا ہے جو انسانی تہذیب کے سارے ہی مرحلوں میں نمایاں نظر آتی ہیں۔ ان خصوصیات میں کوئی اساسی تبدیلی اسی وقت واقع ہوئی جب یہ دور ختم ہو جائے گا اور کوئی دوسرا دور شروع ہو گا (مثلاً دور آخرت)۔ اس پورے زمانے میں انسان کی فطرت، کائنات کے فطری قوانین، انسانی زندگی کے اساسی اصول، حیات و موت کے ضابطے، انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بنیادیں، هدایت و خلافات کے قواعد، یہ تمام ایک ہی رہے ہیں اور ایک ہی رہیں گے۔ افراد پیدا ہوتے ہیں اور مرنے ہیں۔ تہذیبوں ابھر قوانین غیر متبدل ہیں۔ زندگی کی اصل غیر متغیر ہے، اور اجتماع و تمدن کے اساسی ضابطے ثابت و مستحکم ہیں۔ ایک ہی اصول ہیں جو کار فرما ہیں، ایک ہی حقیقت ہے جو جلوہ گر ہے۔ تغیر و تبدل صرف ظاہری اور سطحی چیزوں میں

اسلام اور تبدیلی زمانہ

۱۰۹

ہے، بنیادی اور اساسی چیزوں میں نہیں۔ اس لئے بہ اچھی طرح سمجھو اپنا چاہئے کہ زندگی کے موجودہ دور میں جو تغیرات بھی واقع ہو رہے ہیں وہ ایک محدود دائرے میں ہیں، بنیادوں میں نہیں صرف فروع میں ہیں، اور ان کی بنا پر قدیم وجدید کا جھگڑا بہ جز کوتاه نظری کے اور کچھ نہیں۔ بہ قول اقبال

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیل، کم نظری، قصہ، قدیم و جدید!

ہم تغیر کے وجود کے منکرو نہیں ہیں۔ یہ تو ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن ہی نہیں۔ لیکن جس چیز کا سمجھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس تغیر کی نوعیت کیا ہے۔ اس لئے کہ اس کی نوعیت کو سمجھئے بغیر کوئی صحت مند اجتماعی پالیسی اختیار نہیں کی جا سکتی۔

انسان کی اجتماعی زندگی میں جو تبدیلی ہوئی آرٹی ہے وہ ذرائع اور وسائل تکنیکی انسکافات انسان کے وسائل اور فطری قوتوں پر اس کے اختیار کو برابر پڑھا رہے ہیں۔ زمان و مکان کو رکاوٹیں دور ہو رہی ہیں، اور انسان کا انتدار پڑھ رہا ہے۔ لیکن یہ ساری تبدیلی ذرائع و وسائل ہی کی حد تک ہو رہی ہے۔ اس تبدیلی کا یہ تقاضا ہرگز نہیں کہ مقاصد زندگی، اصول اخلاق اور اقدار حیات کو بھی تبدیل کر دیا جائے۔ اگر ہوائی جہاز، جیٹ اور راکٹ کے استعمال سے زمین کی طابیں کچھ گئی ہیں تو اس کے یہ معنی کب ہیں کہ زنا جو کل تک حرام نہیں آج حلال ہو جائے؟ اگر برق قوت کے ذریعے سے انسان کے پاس وہ طاقتیں آگئی ہیں جو پہلے صرف جنوں اور فرشتوں کو حاصل تھیں تو خیر و شر کے اصولوں کی صداقت پر اس کا آخر کیا اثر پڑتا ہے؟ میزائل اور اسٹنک کے استعمال کا آخر یہ تقاضا کب ہے کہ جہوٹ، صود، سٹہ، شراب اور دوسرے منکرات کو جائز توارد میں دیا جائے؟ صنعتی ترق کا آخر یہ تقاضا کب ہے کہ امول انصاف کو بھی بدل دیا جائے؟

جو حضرات سطحی نظر رکھتے ہیں وہی اس قسم کی باتیں کرتے ہیں کہ بہ تغیرات بھولوں میں رد و بدل کے مقتضی ہیں۔ درحقیقت تمام ایجادات و اکتشافات انسان کے لئے ہیں، انسان ان کے لئے نہیں۔ تمام مادی ترقیات آسیں لات مفید ہو سکتی ہیں جب وہ انسان کی بہلانگ کے لئے اپتممال ہوئی، خود بہلانگ

اور براہی کے اصول ان کی خاطر نہ بدل جائیں۔ بہ قوتیں جو انسان کو حاصل ہوں ہیں اسی وقت نافع ہیں جب وہ اعلیٰ مقام دِ حیات کی تابع ہوں، اپنے ریلے میں آپریں بھاکر نہ لے جائیں۔ مقاصد و اصول کو ان کے مطابق نہیں بلکہ ان کو مقاصد و اصول کے مطابق بدلتا چاہیے۔ مقاصد اور اصولوں کی حیثیت تو ان معیاروں کی ہے جن سے تکنیکی ترقیات کے حسن و قبح کو ناہا جائے گا۔ اگر ان ترقیات کے باوجود انسان ہی پربشان و منفطر ب رہنا ہے تو پھر ساری مادی ترقی بے کار ہے۔

نہ کلی ہے وجہ نظر کشی، نہ کنوں کے ہمول میں تازگی
 فقط ایک دل کی شکفتگی سببِ نشاط بھار ہے

ثبتات اور نہیر

انسان زندگی میں تغیر کا منہاج کچھ ایسا ہے کہ تبدیلی کے ساتھ ساتھ ثبات اور دوام کا بھی ایک پہلو موجود ہے۔ تبدیل ہر لعظہ اُتی ہے لیکن بنیادی حقیقت کو متاثر کیجئے بغیر اپنا ظہور کرنی رہتی ہے۔ مثلاً انسان کے جسم اور اس کی ذات کو لیجیجئے۔ سائنس کے مشاهدات میں بناتے ہیں کہ انسان کے نظام جسمانی میں ہر لمحہ تغیرات ہو رہے ہیں۔ ایک بچھ کے جسم کا ایک ایک روشنہ جوان ہونے تک بدل جاتا ہے۔ اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہتا ہے حتیٰ کہ ایک خاص مدت میں ہر مرتبہ انسان کا جسم اپنے کو بالکل تبدیل کر کے ایک نئی جسم بن جاتا ہے۔ لیکن اس تبدیل میں بنیادی نظام وہی رہتا ہے اور ہر شخص کی اساسی شخصیت، اس کی "انا" غیر متبدل رہتی ہے۔ اسی کیفیت کو نکولان برداشت ایف ایف ان الفاظ سے تعبیر کرتا ہے کہ "انسان ذات، تغیرات کے جلو میں عدم تغیر کا نام ہے۔" اور برگان نے اس بات کو یوں ادا کیا ہے کہ "ہم میں تغیر تو آتا ہے لیکن ہماری بنیادی حقیقت معدوم نہیں ہوتی۔"

اسی طرح درختوں کو دیکھئے۔ ایک درخت ایک خاص مدت میں اپنے ہمول پتے بالکل تبدیل کر لیتا ہے۔ اس کی زندگی میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن یہ تبدیل اس کی اصل کو نہیں بدلتی بلکہ اس سے ہم آہنگ رہتی

م۔ ابک بنیادی رنگ ہے جو بہر صورت غالب رہتا ہے اور بھی اس کی انفرادیت ہے۔

صحب بھار آئی ہے کرو، مرت نہیں نہیں، شاخیں نہیں نہیں
خندجہ و کل کے رخ ہو لیکن رنگ قدامت آج بھی ہے
یہ فطرت کا قانون ہے جو ہوشعبہ زندگی میں جاری و ساری ہے۔ انسان کی اجتماعی اور تہذیبی زندگی میں بھی ہمیں یہی جلوہ گر نظر آتا ہے۔ اسی بنیاد پر علامہ اقبال نے کہا تھا کہ

" ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ زندگی مغض تغیر ہی نہیں، اس میں حفظ و ثبات کا ابک عصر بھی موجود ہے ... لہذا اس ہر لحظہ آگے ہی آگے بڑھنے والی حرکت میں انسان اپنے مااضی کو تنظیر انداز نہیں کرسکتا اسی بات کو ہم دوسرے لفظوں میں یوں ادا کریں گے کہ زندگی چون کہ مااضی کا بوجہ اٹھانے آگے بڑھنی ہے اس لیے ہمیں چاہیے کہ جماعت میں تغیر و تبدل کا جو نقشہ بھی ہم نے قائم کیا ہو اس میں قدامت پسندانہ قوتوں کی قدر و قیمت اور وظائف کو فراموش نہ کریں۔"

(خطابات صفحہ ۲۵۴ - ترجمہ نذیر نیازی)

سدرجہ بالا بعثت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ

(۱) ہر تبدیلی موجب خیر ہی نہیں ہوتی ہے۔ جو چیز مطلوب ہے وہ مغض تبدیلی نہیں بلکہ صحیح سمت میں تبدیلی ہے۔

(۲) مغض زمانے کے چلن کی اتباع کسی فرد یا قوم کے لیے فلاح کا باعث نہیں ہو سکتی۔

(۳) کسی چیز کے غالب ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ لازماً، اچھی اور صحیح بھی ہے، یا یہ کہ وہ ناقابل تغیر ہے۔

(۴) ناگزیر ترق کا اصول ایک فاسد اصول ہے جس کی تائید تاریخ سے نہیں ہوتی۔

(۵) زمانے کے تغیر کی نوعیت بڑی غور طلب ہے۔ تبدیلی کا دائرہ بڑا محدود ہے۔ تبدیلی بنیادوں میں نہیں، صرف فروع اور ظواہر میں ہوتی ہے۔ انسان فطرت، کائنات کے بنیادی قوایں اور ہدایت و مخلالت کے خاطبے میں کسی تغیر کا سوال نہیں۔

(۶) زندگی صرف تغیر کا نام نہیں بلکہ وہ تغیر اور ثبات دونوں کے

توازن سے قائم ہے اور صحت میں نظام وہی ہو سکتا ہے جو دونوں پہلوؤں میں کامل توازن قائم کرے۔

ان امور کے متعلق ہو جانے کے بعد اب سئلے کی مزید تفییج ہمارا
لیے بہت آسان ہو جاتا ہے۔

اسلام اور تغیر

اسلام خدا کی اس مددیت کا نام ہے جو اس نے اپنے برگزیدہ نبیوں کے ذریعے
ہے انسان کی رعنائی کے لیے وقتاً فوقتاً بھیجی ہے اور جو اپنی آخری اور مکمل
شکل میں ہم کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے پہنچی ہے۔ یہ
خاطرہ، حیات ہے جو عین فطرت کے اصولوں پر قائم ہے اور انسان اس کے ذریعے
سے دنیاوی اور اخروی دو کوں کامیابیاں حاصل کر سکتا ہے۔ یہ زندگی کا مکمل
قانون ہے۔ اس قانون کو انسان نے نہیں خدا نے بنایا ہے۔ یہ ابد الایاد تک
کے لیے ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔

لَا تَبُدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ

الله کی باتوں میں تبدیل نہیں ہوتی۔
(يونس - ۶۲)

وَلَا تَبُدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ (الانعام - ۳۸)

اور خدا کی باتوں کو بلاخے والا کوئی نہیں۔
(الانعام - ۳۸)

لَا تَبُدِيلَ لِحَقِّ اللَّهِ ذَلِكَ الَّذِي أَنْتَ تَقِيمُهُ وَلَكِنَّ الْكُفَّارَ أُولَئِكَ لَا يَعْلَمُونَ اللَّهَ (الروم - ۳۰)

خدا کی بنائی ہوئی (ساخت) میں تغیر و تبدل نہیں
ہو سکتا۔ یہی سلسلہ دین ہے لیکن اکثر لوگ
جانشی نہیں۔ (الروم - ۳۰)

فَلَمَّا جَاءَهُمْ بِالْحُكْمِ لَمْ يُؤْمِنُوا بِهِ بَلْ قَالُوا هُوَ بِهِ مُبْدِلٌ لِّكَلِمَاتِ اللَّهِ (مثہل - ۲۲)

پس تم خدا کے طریقے میں تبدیل نہ پاوے۔ (فاطر - ۴۲)

قرآن پاک کی یہ آیات بالکل صاف اور واضح ہیں اور اس امر کو ثابت کرنے
کے لیے کافی ہیں کہ خدا کا دین، اس کے احکام اور قوانین ہمیشہ ہمیشہ کے لیے

اسلام اور تبدیلی، زمانہ

۱۱۳

ہیں اور مغض زمانے کی تبدیلی کی وجہ سے ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

خود بدلتے نہیں، قرآن کو بدل دیتے ہیں

یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا میں

بدعت شروع کرنے والے اور بدعتی کی بعیرف کرنے والے ہو خدا کی لعنت ہو۔
اگر اس مسئلے پر عقل سلیم کی روشنی میں غور کیا جائے تو فکر و نظر کا

ضور ہے اور نہ گنجائش۔ اور اس کی وجہ بھی بہت واضح ہے۔ زمانے کی تبدیل کا اثر اس قانون پر پڑتا ہے جسے انسان نے بنایا ہو۔ انسان فکر زمان و مکان کی حدود میں مقید ہے۔ وہ ماضی، حال اور مستقبل کے تمام حفائق سے واقف نہیں۔ وہ ایک محدود بصیرت کے ساتھ آج ایک چیز کو متعین سمجھ کر پہش کر رہا ہے۔ مگر کل جب وہ حالات بامانی آتے ہیں جن کا کوئی تصور پہلے موجود نہ تھا، تو وہ غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ لیکن خدا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کا علم ہرشے ہر محیط ہے۔ زمان و مکان کی قیود اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ جو قانون ایسے خدا کی طرف سے ہو آس کا کسی ایک مخصوص زمانے کے ساتھ محدود ہو جانا کیسے ممکن ہے۔ خدا کے علم اور خدا کے دیے ہوئے قانون کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ کبھی ازکار رفتہ ہو جائے۔ وہ تو ہمیشہ اتنا ہی تازہ رہے گا جتنی صحیح نو!

ثانیاً، خدا کا یہ قانون بنیادی طور پر هدایت و ضلالت کی حقیقت کو واضح کرتا ہے اور ان اصولوں اور ان اقدار کو بیان کرتا ہے جن پرستی کے تغیرات، تہذیبوں کے عروج و زوال اور ماہ و سال کی آمد و رفت کا کوئی اثر نہیں۔ فطرت کے اصولوں کو بیان کرتا ہے اور فطرت کا قانون قائم و مستحکم ہے۔

ثالثاً، قرآن و سنت اصولی رہنمائی دیتے ہیں، انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بنیادیں فراہم کرتے ہیں اور ان اساسی اداروں کو قائم کرتے ہیں جنہیں ہر زمانے میں قائم رہنا چاہیے۔ ان چیزوں پر زمان و مکان کے تغیر کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ اصول غیر متبدل ہیں اور ان میں تبدیلی فطرت کے قانون کے خلاف ہوگی۔

مذہب اور دور جدید

ان وجوہ کی بنا پر زمانے کی تبدیلی کے مطابق اسلام کے تبدیل کرنے والے
کا قطعاً کوئی امکان نہیں۔

یہی چیز ہے جو انبیا و صلحاء کی سنت کے مطابق سے معلوم ہوتی ہے۔
ہر نبی ایسے حالات میں سبتوں ہوا جب زمانے کا بکار اپنی انتہا کو ہٹھج کرایا
اور زندگی کا دریا بالکل غلط رخ پر روان دوان تھا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ
کسی بھی نبی نے زمانے کے چلن کے مطابق اسلام کو تبدیل کرنے کی کوشش
نہیں کی۔ وہ زمانے کے رنگ سے متاثر نہ ہونے بلکہ زمانے کو اپنے رنگ میں
رنگ کرنے کی سعی میں معروف ہو گئے اور بالآخر اس پر صبغۃ اللہ کو غالب کر دیا
قرآن میں اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ یوں بیان فرماتا ہے۔

مُوَلَّدُنَّ اَرْسَلَ رَسُولًاٰ لِّهُدَىٰ وَرَحْمَةٍٰ لِّتُظْهِرَ عَلَى الْهَمَّٰنِ كُلُّهُ وَلَوْكِمَةُ الشَّفَرِ كُلُّهُ

وہی (پاک ذات) تو جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا
ناکہ اسے نام دیگر ادبیان پر غلبہ عطا کر کے خواہ یہ مشرکین کو (کرتا ہے)
ناگوار کیوں نہ گلتے۔ (الصف - ۹)

ہدایت اور دین، حق ہیں ہی اس لیے کہ انبیا ان کو دنیا کے باقی تمام
نظموں اور طریقوں پر غالب کریں۔ خدا کا دین اس لیے نہیں ہے کہ اسے زمانے
کے چلن کے مطابق بدلا جائے بلکہ اس لیے ہے کہ زمانے کو اس کے مطابق بدلا
جائے اور اس کو غلبہ و اختیار کا مقام حاصل ہو۔ مشرکوں، کافروں اور منافقوں
کی تودی تباہی یہ ہوتی ہے کہ دین کو ان کے مثنا کے مطابق بدلا جائے،
لیکن خدا اس بات کو صاف کر دیتا ہے کہ ان کی ناخوشی کا ہرگز کوئی خیال
نہیں کیا جاسکتا۔ سربلندی دین کو حاصل ہونے چاہیے اور زمانے پر اس کی
حکمرانی قائم ہونے چاہیے۔

انبیا کی سیرت اسی حقیقت پر شاہد ہے۔ حضرت نوح عليه السلام کی قوم
بغاوت پر تلی رہی۔ آپ نے ساری نوسوال تک دین، حق کی دعوت دی لیکن
ایک دن کے لیے بھی وہ وقت کے تقاضوں کے مطابق دین کو تبدیل کرنے پر
راضی نہ ہوئے۔ ان کی دعوت وہی رہی کہ

يَقُولُونَ إِنَّا نَعْبُدُ اللَّهَ مَا لَكُمْ فِي إِلَّا عَذَابٌ (عِزْمَةٌ)

اے بیرونی قوم! خدا کی بندگی کرو اس کے سوا
نہ سارا کوئی معبد نہیں۔ (امراfat ۲۳)

ابوالانبیا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے زمانے کی تہذیب کے کئی بڑے مراکز ہو دعوتِ حق دی لیکن کہیں بھی زمانے کے تقاضوں کے سطابق دین کو نہیں ڈھالا۔ انہوں نے اُسکے اور جلاوطنی کے معافی کو برداشت کیا لیکن دین کو حرف نہ آئے دیا۔ حضرت لوٹ علیہ السلام کی قوم شدید قسم کی اخلاقی برائیوں میں مبتلا تھی مگر اُپ نے زمانے کے چلن کو دیکھ کر دین میں ترسیم نہیں کی بلکہ زمانے کے خلاف بغاوت کی۔ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کے طور طریقوں کو اختیار کرنے کے بعد اپنے اسے خدا کے غیر متبدل قانون کی پیروی کے لیے پکارا۔ حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کی سوکشی کے لیے کوئی رعایت نہ دی اور انہیں خوش کرنے کے لیے دین میں کسی کمی یا بشی کو گوارا نہ کیا۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کی معاشی ترقی کی خاطر ان کے ظالماںہ معاشی نظام کو قبول کر کے دین میں ترمیمات نہ کیں بلکہ ان کو کامل اطاعت کی دعوب دی۔ تمام انبیا کی سنت یہی رہی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مشرق سے سغرب تک جو نظام چل رہا تھا اسے قبول کرنے اور اس کے مطابق اپنے اُپ کو اور اپنے دین کو بدلنے کے بعد اپنے اُپ نے اسے ایک فاسد نظام قرار دیا۔

ظہر الفساد فی البر والبحر (خشک اور نری میں فساد پہلی گیا ہے)

لیکن خدا کے نبی نے زمانے کے تقاضوں سے سمجھوتہ اور اس کے ساتھ صالحت کرنے کے بعد اس کی ہر گر خرابی کے خلاف جنگ لڑی۔ زمانے کے آگے جہکنے کا مشورہ دینے والوں کو اُپ کا صاف جواب یہ تھا:

وَاللَّهُ لَوْ وَضَعَوْا الشَّمْسَ فِي يَعْنَى
وَالْقَمَرَ فِي يَسَارِي عَلَى أَنْ
أَتْرَكَ هَذَا الْأَمْرَ مَا تَرَكْتَهُ حَتَّى
يَظْهُرَهُ اللَّهُ أَوْ أَهْلُكَ فِيهِ -

خدا کی قسم اگر یہ میرے دانیں ہاتھ پر سورج اور باشیں ہاتھ پر چاند رکھ کر کہیں کہ مہر و ماہ کے عوض میں اس دعوت کو ترک کر دوں تو میں ہرگز اسے ترک نہ کروں گا، یہاں تک کہ یا تو اللہ اس دعوت کو کامیاب فرما دے یا میں اس را میں جان دے دوں۔

انبیا کا طریقہ یہ نہیں رہا کہ وہ زمانے کے آگے جہکن اور لوگوں کو راضی کرنے کے لیے خدا کے دین کو بدلتی۔ وہ حق کے ہیغامبر ہوتے ہیں اور زمانے کی رو کے خلاف اپنی دعوت پیش کر کے اسے تبدیل کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں۔ اگر وہی زمانے سے مطابقت اختیار کر لیں تو پھر انسانیت کی فلاح و اصلاح کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

مذہب اور دور جدید

اس اسوہ انبیا کی اتباع کی بہترین مثال ہیں اپ صلعم کے تربیث یافتہ صحابہ کی زندگی میں نظر آتی ہے۔ حضور اکرم صلعم کی وفات کے بعد یکاکہ عرب کا نقشہ پڑھ گیا۔ ہر طرف سے بغاوتوں نے سر انہا لیا۔ نئے نئے نبی انہ کھڑے ہوئے۔ بہت سے قبائل نے زکواہ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ چند صحابہ، کیبار تک اس صورت حال پر پریشان ہو گئے اور لوگ یہ رائے پیش کرنے لگے کہ مصلحت وقت کی خاطر قبائل کے ساتھ نرسی برقرار کیا جائے اور وقت کے تقاضوں کا لحاظ کیا جائے۔ مگر جو مزاج شناس سنت انبیا تھا اس کا جواب یہ تھا کہ

”والله مجھے ہر یہ فرض ہے کہ جو کام میں رسول اللہ کو کرنے دیکھو چکا ہوں خود بھی وہی کروں اور اس سے سریمو انعرف نہ کروں۔ اگر جنگل کے کتنے اور بھیڑیے مدینے میں داخل ہو کر مجھے انہالے جائیں تو بھی میں وہ کام کرنے سے باز نہ آؤں گا جسے رسول اللہ نے کرنے کا حکم دیا ہے۔“

”والله اگر مانعین زکواہ اونٹ باندھنے کی ایک رسی دینے سے بھی انکار کریں گے جسے وہ رسول اللہ کے زمانے میں ادا کرنے تھے، تو بھی میں ان سے جنگ کروں گا! خدا کی قسم میں زکواہ اور صلوٰۃ میں فرق کرنے والے لوگوں سے ضرور لڑوں گا۔“

اسلام عبارت ہی نبی کی سنت کی بیروی سے ہے۔ اگر زمانے کی سنت نبی کی سنت سے متعارض ہے تو وہ شخص اپنے دعوہ، ایمان میں جھوٹا ہے جو نبی کی سنت کو جھوڑ کر زمانے کی سنت کا اتباع کرے۔

تجدد اور تجدید

یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا کا دین ثابت و محکم ہے اور محض زمانے کے انداز دیکھ کر اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔ لیکن یہ خیال کرونا بھی غلط ہوا کہ زمانے کے تغیرات کو دین اسلام کی طور پر نظر انداز کرتا ہے۔ اسلام کا طریقہ کار یہ ہے کہ وہ هدایت و خلافات کے بنیادی اصول پتا دیتا ہے اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے وہ حدود واضح کر دیتا ہے جو انسان کو صراط مستقیم پر قائم رکھنے کے لیے درکار ہیں۔ رہے جزوی اور وقتی امور تو ان کو شریعت کے دیے ہوئے بنیادی اصولوں کی روشنی میں اور اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کے اندر ہر وقت اور ہر زمانے میں طے کرنے کی اجازت ہے۔ یہ کام اجتہاد

کے ذریعے سے انعام پاتا ہے اور اسی کے ذریعے سے نظام دین میں حرکت و ارتقا کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔

زمانے کے تغیرات پر دو قسم کے رد عمل اسلامی تاریخ میں نظر آئے ہیں۔
ایک کا نام 'تجدد' ہے اور دوسرے کا 'تجدد'۔

'تجدد' یہ ہے کہ زمانے کے تغیرات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اصل دین کو بلا کم و کاست پیش کیا جائے اور اپنے دور اور اپنے زمانے کی زبان میں حکم استدلال کے ساتھ پیش کیا جائے۔ نیز تدبیر و اجتہاد کے ذریعے سے دین کو اپنے دور کے حالات پر نافذ کرنے کی عملی جدوجہد کی جائے۔ آن تمام ذرائع سے ہورا ہورا فائدہ اٹھایا جائے جو قدرت نے انسان کو فراہم کیے ہیں اور اسلامی بصیرت کے ساتھ نئے پیش آمدہ مسائل کو قرآن و سنت کی روشنی میں طے کیا جائے۔ تجدید کے ذریعے سے ہر زمانے میں دین کی تعلیمات اور زندگی کے بہاو کے درمیان تعلق اور رابطہ گھرا ہوتا جاتا ہے اور زندگی کا دریا اسلام کی شاہراہ سے ہٹ کر چلنے نہیں ہاتا۔ یہاں مخلصانہ اجتہاد کے ذریعے سے نئے مسائل اور نئی شکلات کو حل کیا جاتا ہے اور دین اپنے رنگ اور قایم رہتا ہے۔

'تجدد' اس کے مقابلے میں وہ کوشش ہے جو زمانے کے تقاضوں کے نام پر خود دین کو بدل ڈالنے کے لیے کی جاتی ہے۔ زندگی اور زمانے کے درمیان ربط اس طریقے سے بھی قائم ہو جاتا ہے لیکن یہ ربط اسلام کی سر زمین پر نہیں غیر اسلام کی سر زمین پر قائم ہوتا ہے۔ اس میں اسلام کو اصل قرار دے کر حالات کو اس کے مطابق ڈھالنے کے بعد زمانے کی چلتی ہوئی تہذیب کو اصل مان کو اس کے پیدا کیے ہوئے حالات پر اسلام کو ڈھال دیا جاتا ہے۔ اس طریقے کار کو اگر مسلمان ہر زمانے میں اختیار کرنے چلے جائیں تو اسلام کی کوئی چیز بھی اپنی جگہ پر باق نہیں رہ سکتی، بلکہ اسلام سیرے سے کسی معین مذہب و سلک اور نظریے و نظام کا نام ہی نہیں رہتا۔

اسلام میں تجدید کے دروازے ہبیثہ کھلے رہے ہیں اور ہر یہ تاریخ میں اسلام کے سچے خادم یہ کارنامہ انعام دیتے ہوئے نظر آئے ہیں۔ لیکن تجدید کی اسلام کے سچے گنجائش نہیں۔ ماضی میں جب بھی تجدد نے سرانھایا ہے مسلمانوں میں کوئی گنجائش نہیں۔ ماضی میں جب بھی تجدد نے سرانھایا ہے مسلمانوں نے سختی کے ساتھ اس کے مقابلہ کیا ہے اور ہر ایسی تغیری کوشش ملت کی رائے عامہ سے نکرا کر آخر کار ختم ہو گئی ہے۔

اج بھی بنیادی کشمکش تجدید اور تجدد ہے کے درسیان ہے - اور ہماری ہوئی تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ دین کو متعددین کی خاطر نہ کبھی ماضی میں بدلا گیا ہے اور نہ اج بدلا جاسکتا ہے - کسی صاحب اثر شخصیت کی پہ طاقت نہیں ہے نہ زمانے کے تقاضوں کا نام لے کر اسلام کو بدلتے سکے - اس معاملے میں جو انجام اکبر بادشاہ کی کوششوں کا ہو چکا ہے وہی انجام ان نے متعددین کے لیے بھی مقدر ہے - دین میں مسیح و تحریف کی کوئی تدبیر اگر طاقت کے بل ہر زبردستی نافذ کر بھی دی جائے تو اسے مسلمانوں کے اجتماعی ضمیر نے نہ ماضی میں کبھی قبول کیا ہے اور نہ اج قبول کر سکتا ہے - اس دین کی حفاظت کی ذمہ داری خدا نے لی ہے اور اس نے ایسے ذرائع بھی پیدا کر دیے ہیں کہ اس کی حفاظت ہوتی رہے -

إِنَّمَا نُنَزِّلُ لَكُمْ مِنَ الْكِتَابِ مَا لَمْ يُظْهِرُواْ (الْجَهَنَّمُ ۹)

م نے ہی اس ذکر کو نازل کیا ہے اوزمہ می
اس کی حفاظت کرنے والی ہیں -

آخر میں ابک بات کی طرف ہم اور اشارہ کرنا چاہتے ہیں - ہوئی انسانی تاریخ اس امر پر گواہ ہے کہ ہمیشہ عظیم کارنائے ان ہی لوگوں نے انجام دیتے ہیں جو حالات کی رو ہر بھنے کے بعد ان کا مقابلہ کرنے انہی ہیں - زندگی ہر انسٹ نتو شر انہوں نے نہیں چھوڑے جو سرغ بادنا کی طرح ہوا کے رخ ہو مرتے اور دوسروں کی فضیل کرنے بلکہ ان لوگوں نے چھوڑے ہیں جو ہوا کے رخ سے لڑتے ہیں اور زندگی کے دھارے کو سوڑ کر رکھ دیا ہے - قابل تقلید وہ نہیں ہے جو گرگٹ کی طرح صبح و شام رنگ بدلنا ہے بلکہ وہ ہے جو خود اپنا کوئی رنگ رکھتا ہے اور دنیا کو اپنے رنگ میں رنگ دیتا ہے - سلمان دنیا میں زمانے کے پہچھے چلے کئے نہیں پیدا نہیں کیتے گئے ہیں - وہ تو ہوئی انسانیت کی طرف اس لیے بھیجنے گئے ہیں لہ جسے خدا نیک کہنا ہے اس کا حکم دیں، جسے خدا بدی نہتا ہے اسے مٹا دیں اور دنیا میں خدا کی اطاعت کی روشن کو عام کر دیں۔ وہ دوسروں کے رنگ میں رنگے جانے کے لیے نہیں ہیں - دوسروں کو اپنے رنگ میں رنگئے کے لیے ہیں :

لَتَتَرَدَّدْ أَفْرَجُ اللَّاثَارِسْ تَأْمُرُونَ بِالْعِزْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ النَّكَرِ وَ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (الْهُدُونَ - ۹۰)

جتنی امتیں (یعنی قومیں) لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو کہ نبک کام کرنے کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے منع کرتے ہو اور افہم بر ایمان رکھتے ہو - (آل عمران - ۱۱۰)

اسلام اور تبدیلی^{*} زمانہ

۱۱۹

بہ ہے مسلمانوں کا اصل مقام - مگر انہیں ڈالا کس راہ پر جا رہا ہے ؟ بقولِ اقبال

کو سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امام
وہ کہنہ دماغ، اپنے زمانے کے دین پتیرو

در حقیقت مسلمان کے لیے اس سے بڑی ذلت کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ
خدا کے پیغام کا امین ہونے کے باوجود زمانے کو اپنے دین کے مطابق بدلنے کے
بجائے خود زمانے کی رو ہر بہنے لگے اور اس کے ساتھ اپنے دین کو بھی سخت
کرنے کی کوشش کرے - بہ بزدلوں اور کم نظر لوگوں کا طریقہ ہے - بہ ان
لوگوں کا طریقہ ہے جنہیں ہواں خس و خاشاک کی طرح آڑاتے لیے بھرقی ہیں ،
جن کی اپنی جڑ نہیں ہے کہ وہ اس ہر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو سکیں - بہ
مسلمان کا شیوه نہیں - مسلمان کا شیوه تو یہ ہے کہ

زمانہ با تو نہ سازد تُو با زمانہ ستیز



حصہ دوم

اسلامی فلسفہٗ حیات

کتاب کے ہلے ہم میں ہم علمی، عقلی اور تاریخی نقطہ ہائے نظر سے
بھی دیکھے چکے ہیں کہ انسان کی سب سے بہادی ضرورت مذہب ہے۔ اس کے
بغیر انفرادی زندگی ہرگز نہ اور اجتماعی زندگی فتنہ و فساد کی آماجکہ بنی
رہتی ہے۔ مختلف مذاہب اور اجتماعی تعریبات کا جائزہ لے کر ہم یہ بھی
دیکھے چکے ہیں کہ آج کے مسائل کو صرف اسلام ہی حل کر سکتا ہے۔ اب
ہم اسلام کے فلسفہ، زندگی کو اس کے دلائل کے ساتھ پیش کریں گے۔ آجے
کی بعثت کو سمجھنے کے لیے چند باتیں ذہن میں رہنی چاہیں:

۱ - انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نظم و ترتیب اُس وقت
روئنا ہوتی ہے جب اس کی ایک مستقل اور متعین سیرت ہن جائے۔ ایک مستقل
سیرت کے بغیر انسان کی زندگی ہر انتشار اور ہرگز کا غلبہ رہتا ہے اور وہ
اپنا کوئی مستقل رنگ پیدا نہیں کر پاتا بلکہ مرغ باد نما کی طرح ہوا کے ہر
جنونکے کے ساتھ اپنا رخ بھی بدل لیتا ہے۔

۲ - جس طرح فرد واحد کی زندگی کو ہرگز سے بچانے اور اس میں فیض
اور نظم پیدا کرنے کے لیے ایک مستقل سیرت کی ضرورت ہے اسی طرح بہت سے
اشخاص اور ایک معاشرے کو انتشار اور ترقی سے بچانے اور اسے ایک سنظم
اور متعدد جمیعت بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی اساس مشترک اقدار
ہر ہو، اس پر ایک ہی رنگ غالب ہو اور ایک ہی رشتہ اتحاد میں سب
جزئے ہوئے ہوں۔

۳ - انفرادی اور اجتماعی سیرت کی بنیاد ان تصورات پر قائم ہوتی ہے جو
ذہن میں ہوئی قوت کے ساتھ راسخ ہو جائیں۔ اور اتنا غلبہ حاصل کر لیں کہ
انسان کی ساری عملی قوتوں انہی کے زیر اثر رہ کر کام کریں۔ اسی رسوخ کا
امظاہی نام 'ایمان' ہے اور اس طرح راسخ ہو جانے والے تصورات کو
'ایمانیات' یا 'عقائد' کے لفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں
انسانی سیرت کی ذہنی بنیاد کا نام 'ایمان' ہے۔ ایمان کا لفظ 'ان' سے نکلا

ہے 'امن' کے اصلی معنی نفس کے مطمئن اور بے خوف ہو جانے کے لیے، اسی سے 'امانت' ہے جو 'خیانت' کی ضد ہے، یعنی امانت وہ ہے جس میں خیانت کا خوف نہ ہو۔ امین کو امین اس لیے کہتے ہیں کہ اس کی نیک معاملگی ہر دل کو اطمینان اور وثوق ہوتا ہے کہ وہ بد معاملگی نہیں کرے گا، جو اونٹھی غریب اور مطعیح ہوئے ہے اس کو آمنہ کہتے ہیں کیون کہ اس سے سرکشی اور شرارت کا خوف نہیں ہوتا۔ اس مادے کا باب افعال 'ایمان' ہے۔ اس سے مراد ہے کہ نفس میں کوئی بات بر بنائے تصدیق و یقین اس طرح جمالی جائے کہ اب اس کے خلاف کسی بات کے راه پانے اور داخل ہو جانے کا خوف ہی باق نہ رہے۔ ایمان کمزور ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ نفس اس بات پر پوری طرح مطمئن نہیں ہوا، قلب کو پوری طرح سکون نہیں ہوا، اس کے خلاف باتوں کو بھی ذہن میں داخل ہو جانے کا موقع مل گیا۔ اسی سے سیرت کمزور ہوتی ہے اور اسی سے عملی زندگی میں یہ نظمی پیدا ہوتی ہے۔ ایمان کا قوی اور مضبوط ہونا اس کا برعکس ہے۔ مضبوط ایمان کے معنی یہ ہیں کہ سیرت بالکل نہیں اور یقینی بنیادوں پر قائم ہو گئی، اب اعتناد کیا جا سکتا ہے کہ اعمالِ تھیک نہیں اس تغییل کے مطابق و مناسب صادر ہوں گے جو دل میں جم کیا ہے اور جس سے سیرت کا سانچہ تھار ہوا ہے۔

۴۔ اگر مختلف افراد مختلف قسم کے عقائد و افکار پر ایمان رکھتے ہوں اور ان کی سیرتیں مختلف اور مختلف بنیادوں پر قائم ہو جائیں تو کوئی اجتماعی ہیئت نہیں بن سکتی۔ ان کی مثال ایسی ہوگی جیسے ایک میدان میں بہت سے پتوہ بکھرے پڑے ہوں۔ ہر پتوہ بلاشبہ اپنی جگہ مضبوط ہے، مگر ان کے دریان کوئی ربط نہیں ہے۔ بخلاف اس کے اگر ایک ہی مشترک تخیل بہت سے افراد کے دلوں میں ایمان بن کر جم جائے تو اشتراکِ ایمانی کا رابطہ ان کو ایک قوم بنادے گا۔ گویا وہی پتوہ جو بکھرے پڑے تھے چونے سے جوڑ دیے گئے اور ایک مضبوط دیوار قائم ہو گئی۔ اب ان کے دریان تعامل اور تعاون شروع ہو جائے گا، جس سے ترقی کی رفتار تیز اور تیز تر ہوئی چل جائے گی۔ ایک قسم کا ایمان ان کی سیرتوں میں ہم آہنگ اور ان کے اعمال میں یک رنگ پیدا کر دے گا۔ اس سے ایک خاص تمدن پیدا ہو گا، ایک خاص شان کی تہذیب ظاہر ہو گی، ایک نئی قوم، نئی سیرت، نئی ذہنیت،

نئے خیالات اور نئے طریق عمل کے ماتھے انھے کی اور تہذیب کا قصر ایک نئے انداز پر تعمیر کرے کی ۔

۵- جس قوم کے ایمانیات روحانی امور پر مشتمل ہوتے ہیں اس کا مذہب اور اس کی تہذیب دونوں ایک ہوتے ہیں ۔ اور جس کے ایمانیات مخصوص دنیوی امور پر مشتمل ہوں اس کی تہذیب اس کے مذہب سے جدا ہوتی ہے ۔ اس دوسری صورت میں شخصی اور قومی زندگی پر مذہب کا کوئی خاص اثر باقی نہیں رہتا ۔

۶- تہذیب کا مذہب سے آزاد ہو جانا آخر کار اخلاق انحطاط اور تباہی کا موجب ہوتا ہے ۔ لیکن تہذیب کا مذہب کے زیر اثر رہنا منحصر ہے اس پر کہ مذہب کے ایمانیات ایسے روحانی امور پر مشتمل ہوں جو ادنیٰ مدارج سے لے کر بلند ترین مدارج تک انسان کے ارتقا عقل کا ماتھے دے سکیں، اور جن سے انسانی سیرت کی تشكیل اس طرح پر ہو کہ وہ بیک وقت اعلیٰ درجے کا دیندار بھی ہو اور دنیا دار بھی ، بلکہ اس کی دنیا داری میں دینداری ہو اور دین داری میں دنیا داری ۔

۷- جس قوم کا مذہب اور تہذیب ایک ہوں اس کا ایمان مخصوص مذہبی ایمان نہیں ہوتا بلکہ بعینہ دنیوی ایمان بھی ہوتا ہے ۔ اس کے ایمان کا متزلزل ہونا اس کے مذہب اور اس کی تہذیب دونوں کے لیے غارتگر ہے اور اس کی دنیا اور اس کے دین دونوں کے لیے تباہ کن ہے ۔ امت مسلمہ ایسی ہی ایک است ہے ۔ اس کی تہذیب اس کے مذہب سے ماخوذ ہے اور امن و جہ سے دین و تمدن دونوں کا انحصار ایمان ہی پر ہے ۔

یہ چند کلی اصول^۱ ہیں جن سے تہذیب انسانی کا ہر طالب علم اتفاق کرے گا ۔ آئندہ صفحات میں ہم ان ایمانیات پر تفصیلی بحث کریں گے جو اسلام پیش کرتا ہے اور جن پر وہ اپنے پورے نظام زندگی کی عمارت کھڑی کرتا ہے ۔

اس حصے میں آنہ ابواب ہیں جن میں اسلام کے تصویر حیات ، اسلامی نظریہ حیات کی بنیادی خصوصیات اور اسلام کے بنیادی عقائد کو تعمیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ۔ توحید ، رسالت اور آخرت پر مفصل بحث کی گئی ہے اور زندگی پر ان کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

۱- اس بحث کا بیشتر حصہ ماخوذ ہے ۔ (مرتب)

کے اسوہ، حسنہ کی تاریخی اور تہذیبی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے اور اس کے حند نقش و نکار پر بن کر یہ گئے ہیں اور اسلام کے تصور عبادت ہر روشی ڈالی گئی ہے۔ یہ حصہ تقریباً پانچ چھوڑ ہزار صفحات پر بھیلے ہوئے مباحثت کا عطر ہے۔ تقریباً تمام مضامین میں ایک نئی ترتیب قائم کی گئی ہے اور مباحثت میں منطقی اور معنوی ربط قائم کرنے کے لیے جگہ جگہ مرتب کو خلا ہر کرنے پڑے ہیں۔ تلغیص کی صورت میں اصل مصنف کی زبان سے استفادہ کیا گیا ہے لیکن اس کی پابندی نہیں کی گئی۔ نیز مشکل الفاظ اور فقرہوں کو تبدیل کیا گیا ہے تاکہ طلبہ اور عام قاری زیادہ فائدہ انہا سکیں۔ اس طرح اپنی موجودہ شکل میں یہ تمام مضامین ایک حد تک بالکل نئی چیز ان گئے ہیں۔ ہمیں نوچ ہے کہ اس حصے کے مطالعے سے اسلام کے فلسفہ، زندگی کا ایک مکمل خاکہ فارغین کے سامنے آجائے گا۔

مرتب



اسلام کا نصور زندگی

۱ کائنات و انسان

۱ کائنات سے متعلق انسان کے نظریات میں عظیم تضاد رہا ہے۔ کسی کے نزدیک یہ مغض ایک اتفاق خادم کا نتیجہ ہے۔ اس میں جو تنظیم یا ترتیب نظر آئی ہے وہ بھی اتفاق ہے۔ ورنہ بہیت کل نہ اس کا کوئی مقصد ہے اور نہ اس میں ہند گیر نظم پایا جاتا ہے۔ انسان خود بھی ایسے ہی ایک اتفاق خادم کا نتیجہ ہے، اس کا بھی کوئی مقصد نہیں، اس کی زندگی میں بھی ترتیب اور اخلاق نظم کی حاجت نہیں۔ لہذا وہ تعلق جو کائنات اور انسان کے مابین قائم ہوتا ہے یہ ہے کہ انسان چند طبعی خواہشات رکھتا ہے اور کائنات ان خواہشات کی تکمیل کا سامان بھیں بہنجائی ہے، اور اس طرح حیات طبعی کے قیام میں مدد دیتی ہے۔ بہر چون کہ کائنات مکمل نظم و انتظام ہے عاری ہے اس لیے کبھی زندگی کے قیام کے بعدی زندگی کے اختتام کا سبب بنتی ہے۔ چنان چہ کبھی وہ طوفانوں کے ذریعے انسان بستیوں کو تباہ کر کر ہے، کبھی زلزلوں کے ذریعہ زندگی کو نیست و نابود کر کر ہے اور کبھی آتش فشانی کے ذریعے انسانی آبادیوں کو خاکستر کر کر ہے۔

۲ کسی کے نزدیک یہ کائنات مغض ایک وجود کی مظہر ہے۔ درخت، دریا، ہبھاڑ، چاند، سورج، اور خود انسان اسی ایک واحد الوجود کے جلوہ نما ہے باب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب "اسلام اور جاہلیت" اور "اسلامی تہذیب" اور اس کے اصول و مبادی" سے مانعوذ ہے۔ (مرتب)

ہیں - ان کا اپنا نہ کوئی وجود ہے اور نہ کوئی حیثیت - ان کا عمل خدا کا عمل ، ان کی حرکت خدائی حرکت اور ان کا ارادہ خدا کا ارادہ ہے - چون کہ حقیقتاً یہ سب ایک ہی وجود کے مظاہر ہیں اس لیے کسی ترتیب یا نظم کے ہونے یا نہ ہونے کا سوال ہی بیان نہیں ہوتا ، کہ ترتیب ایک سے زائد اشیا ہی میں ہو سکتی ہے - پھر چون کہ انسان بہ ذات خود کوئی ارادہ نہیں رکھتا اس لیے جو کچھ وہ کرتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود نہیں - اور چون کہ اس کا اپنا کوئی مقصد نہیں اس لیے اس کے اور کائنات کے درمیان کسی مستقل رشتے کا تعین ممکن نہیں - انسان کائنات میں اپنی منفعت کی خاطر تصریف کرتا ہے تو ، اس کو خواہ مخواہ تباہ کرتا ہے تو ، اس سے بلا وجہ اجتناب کرتا ہے تو ، یا خود اس کا شکار ہوتا ہے تو ، سب نہیں ہے اس لیے کہ جس وقت جو کچھ بھی ہوا ، اسی واحد الوجود کے ارادے اور رضا سے ہوا -

(3) کسی اور کے نزدیک کائنات کی ہر وہ شے ایک آله ہے جو کسی قوت کی حامل یا کسی منفعت کا سبب ہے - چنان چہ دریا اگر بھالے جانے کی قوت رکھتا ہے تو معبد ہے ، اُسی اگر جلا سکتی ہے تو پرستش کے قابل ہے ، سانپ اگر کس لیتا ہے تو لاثق تعظیم و معبدیت ہے - غرض کائنات کی ہر شے مخدوم اور انسان ان کا خادم ہے -

ان کے علاوہ بھی کائنات اور انسان سے متعلق کچھ نظریات ہیں لیکن انہما پسندی اور کجروی ان سب کا خاصہ ہے - اسلام ہی ایک ایسا نظام فکر و عمل ہے جو کائنات و انسان سے متعلق ایک متوازن و معقول نظریہ دیتا ہے -

اسلام کا نصور کائنات

اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ سارا عالم ہست و بود جو انسان کے گرد و پیش پہلا ہوا ہے کوئی اتفاق ہنکامہ نہیں ، بلکہ منظم ، باخابطہ سلطنت ہے - اللہ نے اس کو بنایا ، وہی اس کا مالک اور وہی اس کا حکم ہے - یہ ایک نظام کی ہے جس میں تمام اختیارات مرکزی اقتدار کے ہائی میں ہیں - اس مقدار اعلیٰ کے سوا یہاں کسی اور گا حکم نہیں چلتا - تمام قوتیں جو نظام عالم میں کام کر رہی ہیں اسی کے زیر حکم میں اور کسی کی مجال نہیں ہے کہ اس کے حکم سے سرتاسری کر سکے - اس ہمہ گیر نظام میں

کسی کی خود مختاری اور غیر ذمہ داری کے لئے کوئی جگہ نہیں، اور لہ فطرت اسی
ہو سکتی ہے۔

بے ظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سلطنتِ عالم کا سارا کرویار ایک
نظام کے ساتھ چل رہا ہے مگر نہ خود سلطان نظر آتا ہے اور نہ اس کے کار دردaz
کام کرتے دکھائی دیتے ہیں اور ایک طرح کی خود مختاری انسان اپنے
اندر محسوس کرتا ہے کہ جس طرح جاہے کام کرے، مالکانہ روشن بھی اختیار
کر سکتا ہے اور اصل مالک کے سوا دوسروں کے سامنے بھی اطاعت و بندگی میں
سر جھکا سکتا ہے، ہر صورت میں اس کو رزق ملتا ہے، وسائل کار بھی بہنجھے
ہیں اور بغاوت کی سزا فوراً نہیں دی جاتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ
انسان کی صلاحیتیں بروئے کار آئیں اور وہ مادی، اخلاقی اور روحانی ترقی کے
مدارج طے کر سکے، اس نے اس کو سمجھنا بوجھ، انتیخاب کی آزادی اور ایک
طرح کی خود مختاری عطا کر کے جھوڑ دیا ہے۔

یہ عالم جس میں ہم اس وقت ہیں دراصل عالم طبیعی ہے نہ کہ عالم
اخلاقی۔ جن قوانین پر کائنات کا موجودہ نظام چل رہا ہے وہ اخلاقی قوانین نہیں
بلکہ طبیعی قوانین ہیں۔ اس لیے موجودہ نظام کائنات میں اعمال کے اخلاقی
نتائج پوری طرح مرتب نہیں ہو سکتے، اور اگر وہ مرتب ہو سکتے ہیں تو
صرف اس حد تک جس حد تک قوانین طبیعی ان کو مرتب ہونے کا موقع دیں
ورنہ جہاں قوانین طبیعی ان کے ظہور کے لئے سازگار نہ ہوں وہاں ان کا ظاہر
ہونا معال ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کسی کو قتل کر دے تو
اس فعل کا اخلاقی نتیجہ مرتب ہونا موقوف ہے اس امر پر کہ قوانین طبیعی
اس کا سراغ لگنے اور اس پر جرم ثابت ہونے اور اس پر اخلاقی سزا کے نافذ
ہونے میں مددگار ہوں۔ اگر وہ مددگار نہ ہوں تو کوئی اخلاقی نتیجہ سرے
سے مرتب ہی نہ ہوگا اور اگر وہ سازگاری کر بھی لیں تب بھی اس فعل کے
ہوئے اخلاقی نتائج مرتب نہ ہو سکیں گے۔ کیوں کہ مقتول کے عوض قاتل کا
محض قتل کر دیا جانا اسی فعل کا پورا اخلاقی نتیجہ نہیں ہے جس کا ارتکاب اس نے
کیا تھا۔ اس لیے یہ دنیا دارالجزا نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ چنان چہ
بہاں جو کچھ دیا جانا ہے لازم نہیں کہ وہ کسی عمل نیک کا انعام ہی ہو۔
و اس بات کی علامت نہیں کہ اللہ تم سے خوش ہے یا جو کچھ تم کر رہے ہو

وہ درست ہے۔ بلکہ دراصل وہ محض امتحان کا سامان ہے۔ مال، دولت، اولاد، خدام، حکومت، اسباب زندگی، یہ سب وہ چیزیں ہیں جو تم کو امتحان کی خرچ سے دی جائیں ہیں تاکہ تم ان بڑے کام کو کر سکے دکھاؤ اور اپنی اچھی بڑی قابلیتوں کا اطمینان کرو۔ اسی طرح جو تکالیفیں، نعمات، مصائب وغیرہ آئے ہیں وہ بھی لازماً کسی عمل بد کی سزا نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بعض مانون فطرت کے تحت آپ سے آپ ظاہر ہونے والے نتائج ہیں، بعض آزمائش کے ذریعے ہیں آئے ہیں اور بعض اس وجہ سے پیش آئے ہیں کہ حقیقت کے خلاف رائے قابو کیوں کے جب تم اسک روپ اختیار کرنے ہو تو لا محالہ حوت لکھی ہے۔ یہ ہر حال یہ دنیا دارالجزا نہیں بلکہ دارالامتحان ہے۔

اسلام کا تصور انسان

انسان کو ابتداء سے ہی گائنات کی طرح اپنے متعلق بھی بڑی غلط فہمی رہی ہے اور اب تک اس کی یہ غلط فہمی باقی ہے۔ کہنی وہ افواط پر آترتا ہے تو اپنے آپ کو دنیا کی سب سے بلند ہستی سمجھو لیتا ہے، غرور و تکبر اور سر دشی کی ہوا اس کے دماغ میں بور جاق ہے، کسی طاقت کو اپنے پس بالآخر کیا اپنے مد مقابل بھی نہیں سمجھتا، اپنے آپ کو غیر ذمہ دار اور شیر جواب دے سمجھو کر جبر و قہر کا دیوتا، ظلم و جور اور شر و فساد کا مجسمہ بن جاتا ہے۔ کہی تعریط کی طرف مائل ہوتا ہے تو اپنے آپ کو دنیا کی سب سے ذمہ باری سمجھو لیتا ہے۔ درخت، پتھر، دریا، پہاڑ، ہوا، آگ، بادل، جلی، حانہ، سورج، تارے، غرض ہر اس چیز کے سامنے گردن جھکا دیتا ہے جس کے اندر کسی قسم کی طاقت یا صفت یا سمعت نظر آتی ہے۔ اور خود اپنے جس سے آنہیوں میں بھی کوئی قوت دیکھتا ہے تو ان کو بھی دیوتا، معبد و اور حاکم مطلق و مان اپنے ہیں تامل نہیں کرتا۔

اسلام نے ان دونوں انتہائی تصورات کو باطل درکے انسان کی اصل حقیقت اس کے سامنے پیش کی ہے۔

يَا إِنَّهَا إِلَّا نَّارٌ مَا غَرَّكَ بِرِبِّ الْكَوْنِيُّوْنَ الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوْكَ فَعَدَكَ فِي أَيِّ صُورَةٍ قَاتَكَ رَبُّكَ هُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ

ای انسان! کس چیز نے تجویز اپنے ربِ کریم سے مغروز کر دیا؟ اس رب سے جس نے تجویز پیدا کیا اور تیرے لعضا دوست کیا اور قویا میں اعتدال کیا۔ جس صورت میں چاہا (تیرے عذر کو) ترکیب ہے۔ (الانفطار - ۸-۹)

اسلام کا تصور زندگی

۱۳۱

اس اور اسی قسم کی دوسری آیات میں انسان کے غرور و تکبر کے بتون
کو توڑا گیا ہے - اسے اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ ذرا اپنی حقیقت تو
دیکھو! خدا تجھے کن اجزا سے پیدا کرتا ہے - ہمہ رحم مادر میں ایک
گوشت کا لوٹھرا بنایا ہے، پھر اپنی قدرت سے اس لوٹھرے میں جان ڈالنا ہے،
اس میں حواس پیدا کرتا ہے اور ان آلات اور ان قوتوں سے اس کو مسلح
کرتا ہے جن کی انسان کو دنیوی زندگی میں ضرورت ہوئی ہے - اس طرح تو
دنیا میں آتا ہے مگر تیری ابتدائی حالت یہ ہوئی ہے کہ تو ایک یہ بس بعد
ہوتا ہے جس کو اپنی کوئی حاجت پوری کرنے کی قدرت حاصل نہیں ہوئی
خدا ہی نے اپنی قدرت سے ابسا سامان کیا ہے کہ تیری پرورش ہوئی ہے،
تو بڑھتا ہے، جوان ہوتا ہے، طاقت ور اور قادر ہوتا ہے - پھر تیری قوتوں
میں انعطاطی شروع ہوتا ہے - تو جوان سے بڑھائیں کی طرف جاتا ہے - بہان
تک کہ ایک وقت میں تجھ پر پھر وہی ہے بسی کی کیفیت طاری ہو جاتا ہے
جو بچپن میں تھی - تیرے حواس جواب دے دیتے ہیں، تیری قوتیں ضعیف ہو
جاتی ہیں، تیرا عالم نسیاً منسیاً ہو جاتا ہے - اور آخر کار تیری شمع حیات بجھو
جاتی ہے - مال املاک، عزیز، دوست، اقارب سب کو چھوڑ کر قبر میں جا پہنچتا
ہے - اس مختصر عرصہ حیات میں تو ایک لمحے کے لیے اپنے آپ کو زندہ
رکھنے ہر قادر نہیں - تجھ سے بالآخر ایک اور قوت ہے جو تجھ کو زندہ
رکھتی ہے اور جب چاہتی ہے تجھ کو دنیا چھوڑنے پر مجبور کر دیتی ہے -
پھر جتنی مدت تو زندہ رہتا ہے، قوانین قدرت سے جکڑا رہتا ہے - یہ ہوا،
یہ پانی، یہ روشی، یہ حرارت، یہ زمین کی پیداوار، یہ قدرتی ساز و سامان
جن پر تیری زندگی کا انعصار ہے، ان میں سے کوئی بھی تیرے میں نہیں -
نہ تو ان کو پیدا کرتا ہے نہ یہ تیرے احکام کے تابع ہیں - بھی چیزوں جب
تیرے خلاف آمادہ پیکار ہو جاتی ہیں تو تو اپنے آپ کو ان کے مقابلے
میں بس پاتا ہے - ایک ہوا کا جھکڑا تیری بستیوں کو تہ و بالا کر دیتا ہے -
ایک پانی کا طوفان تجھے غرقاب کر دیتا ہے - ایک زلزلے کا جھٹکا تجھے پیوند
خاک کر دیتا ہے - تو خواہ کتنے ہی آلات سے مسلح ہو، اپنے علم سے (جو
خود بھی تیرا اپنا پیدا کیا ہوا نہیں ہے) کیسی ہی تدبیر میں ایجاد کر لے،
اپنی عقل سے (جو خود بھی تیری حاصل کر رہا نہیں ہے) کیسے ہی سامان مہیا
کر لے، قدرت کی طاقتوں کے سامنے یہ سب دھری کی دھری وہ جاتی ہیں -

اس بل بونے پر اکبرتا ہے، بہولا نہیں سماتا، کسی طاقت کو خاطر میں نہیں لاتا فرعونیت اور نعروبدت کا دم بھرتا ہے۔ جیثار و قہثار بتا ہے، ظالم و سرکش بتا ہے، خدا کے مقابلے میں بقاوت کرتا ہے خدا کے بندوں کا معبد بتا ہے اور خدا کی زمین میں فساد پھیلاتا ہے۔

اس تکبیر شکنی کے بعد اسلام وہ اعلیٰ مقام بھی متعین کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہم کائنات میں انسان کو عطا فرمایا ہے۔ وہ نوع بشر کو بتاتا ہے کہ وہ اتنا ذلیل بھی نہیں ہے جتنا اس نے اپنے آپ کو سمجھے لیا ہے وہ کہتا ہے:

وَلَقَدْ كَرِئَ لَنَا بِقَيْمَةِ أَدْمَرٍ وَسَهْلَنَمٍ فِي الْبَرِّ وَالْمَرْأَةُ وَرَبُّهُمْ مُؤْمِنٌ فَضْلَلَنَمُّهُ عَلَى كَثِيرٍ مِّنْ كُفَّارٍ فَلَعْنَاهُ كَفِيلٌ لَّهُ

میں نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو خشک اور تری میں سواریاں دیں اور ان کو پاک چیزوں سے رزق عطا کیا اور بہت سی ان چیزوں پر جو مم نے پیدا کی ہیں ان کو ایک طرح کی فضیلت عطا کی ہے۔ (بنی اسرائیل۔ ۷)

۱۱) الْمُرْتَلَانَ اللَّهُ سَطَرَ لَكُفَّارَ الْأَرْضِ

اے انسان! کیا تو دبکھتا نہیں
کہ اللہ نے ان چیزوں کو جو
زمین میں ہیں تیرے لیے مطبع
بنا دیا ہے۔ (الحج۔ ۹)

ان آیات میں اور ایسی ہی بہت سی دوسری آیات میں انسان کو ہے بتایا گیا ہے کہ زمین میں جتنی چیزوں ہیں وہ سب تمہارے فائدے اور خدمت کے لیے ساختہ کر دی گئی ہیں۔ اور آسمان کی بھی بہت سی چیزوں کا یہیں حال ہے۔ یہ درخت، یہ دریا، یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ جانور، یہ رات اور دن، یہ تاریخ اور یہ روشنی، یہ چاند، یہ سورج، یہ تارے غرض یہ سب چیزوں جن کو تم دیکھ رہے ہو تمہاری خادم ہیں اور دراصل تمہاری منفعت کے لیے ہیں۔ تمہارے لیے انہیں کار آمد بنایا گیا ہے۔ تم ان سب پر فضیلت رکھتے ہو۔ تم کو ان سب سے زیادہ عزت دی گئی ہے تم کو ان کا مخدوم بنایا گیا ہے۔ پھر کہا تم انہیں خادموں کے آگے سر جھکاتے ہو؟ ان کو اپنا حاجت روا سمجھتے ہو؟ ان کے آگے دست سوال دراز کرنے ہو؟ ان سے اپنی مدد کی التجا کرنے ہو؟ ان سے ڈرتے اور خوف کھاتے ہو؟ ان کی عظمت و بزرگی کے گیت کائے ہو؟ اس طرح تو تم اپنے آپ کو ذلیل کرنے ہو، آپ اپنا مرتبہ گرانے ہو، خادموں کے خادم، غلاموں کے غلام خود بتتے ہو۔

اسلام کا تصور زندگی

۱۳۳

انہے آپ کو سمجھتا ہے اور نہ اتنا پست و ذلیل ہے جتنا وہ بہ زعم خود کبوہنا لیا ہے - اب سوال یہ ہے کہ انسان کا صحیح مرتبہ کیا ہے؟

خليفة الله في الأرض

اس کا جواب اسلام بدینا ہے کہ وہ اس زمین پر خدا کا خلینہ (نائب) ہے -

”اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ زمین میں ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں تو انہوں نے عرض کیا، کیا اور خون ریزیاں کرے گا، حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تیری باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے“ اور اس نے آدم کو پیش کیا اور کہا ”اگر مجھے ہو تو ان چیزوں کے سامنے مجھے بتاؤ“ انسوں نے کہا ”پاک ذات ہے تیری ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے جو تو نے ہم کو سکھا دیا ہے۔ تو ہم علم رکھنے والا ہے اور تو ہی حکمت کا مالک“ خدا نے کہا ”اے آدم ان فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ پس جب میں تم سے نہ کہتا تھا کہ میں انسانوں اور زمین کی سب مخفی باتیں جانتا ہوں اور جو کچھ تم چھپائے ہو اور ظاہر کرنے ہو اس سب کا علم رکھتا ہوں“ اور جب ہم نے ملانکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ان سب نے سجدہ کیا بہ جز ابلیس کے کہ اس نے انکار اور تکبر کیا اور نافرمانوں میں سے ہو گیا۔ اور ہم نے آدم سے کہا کہ ”اے آدم تو اور تیری بیوی دونوں جنت میں رہو اور اس میں جہاں چاہو بہ فراغت کھاؤ۔ مگر اس درخت کے پاس بھی نہ پہنکو کہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے“ مگر شیطان نے ان کو جنت سے اکھاڑ دیا اور وہ جس خوشحالی میں تھے ان کو وہاں سے نکلوا دیا۔“ (البقرہ رکوع - ۲۲)

اس مضمون کو مختلف طریقوں سے قرآن مجید میں متعدد مquamات پر بیان کیا گیا۔ اور اس کا خلاجہ یہ ہے کہ انسان کو خدا نے زمین میں اپنا نائب بنایا،

اسی دو فرشتوں سے بڑھ کر علم دیا، اس کے علم کو فرشتوں کی تسبیح و تقدیس ہر ترجیح دی، فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کو سجدہ کروں ۔ فرشتوں نے اس کو سجدہ کر لیا اور اس طرح ملکوتیت اس کے آگے جہک گئی۔ مگر اپدیس نے انکار کیا اور ان طرح شیطانی قوتیں انسان کے آگے نہ جہک سکیں۔ حقیقت میں تو وہ مٹی کا ایک حقیر پتلا تھا مگر خدا نے اس میں جو روح بھونک تھی اور اس کو جو علم بخشنا تھا اس نے اس کو نیابت خداوندی کا اہل بنا دیا۔ فرشتوں نے اس کی فضیلت کو تسلیم کیا اور اس کے آگے جہک گئے لیکن شیطان نے اس کو تسلیم نہ کیا۔ اس جرم میں شیطان پر لعنت بھیجی گئی مگر اس نے قیامت تک کے لئے سہلت مانگ لی تھے انسان کو بھکانے کی کوشش کرے۔ چنان چہ شیطان نے ان ان کو بھکا کر جنت سے نکلوا دیا۔ اور اس وقت سے انسان اور شیطان میں کشمکش بروبا ہے۔ خدا نے انسان سے کہہ دیا کہ جو ہدایت میں تبعیغ بھیجوں اس کو مانے گا تو جنت میں جانے کا، اور اپنے ازلی دشمن شیطان کا حکم مانے گا تو دوزخ تیرا نہ کانا ہوگا۔

منصب نیابت کی حقبت

اس بیان سے چند امور معلوم ہوتے ہیں۔

(1) اولاً یہ کہ انسان خلینہ ہونے کی حیثیت سے صرف خدا ہی کا ماتحت ہے۔ اس کا درجہ تمام چیزوں سے افضل اور اعلیٰ ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں اس کی خادم ہیں اور اس لئے ہیں کہ وہ ان کو استعمال کرے اور اپنے آفے کے بنائے ہوئے طریقے پر ان سے خدمت لے۔ ان ماتحتوں کے آگے جہکنا اس کے ایسے ذات ہے۔ اگر جہکے گا تو اپنے اور ظلم کرنے گا اور گویا نیابت الہی کے منصب سے خود دست بردار ہوگا۔

(2) دوسرا یہ کہ نائب کا کام یہ ہے کہ وہ جس کا نائب ہے اس کی اطاعت کرنے۔ اسے اس بات کا اختیار نہیں کہ اپنے آفے کی رعیت اور اس کے نوکروں اور خادموں کو خود اپنی رعیت، اپنا نوکر اور اپنا خادم بنالے تھے ابسا کرے گا تو باغی قرار پائے گا۔ اس کو جس جگہ نائب ہنا یا گیا ہے وہاں اپنے آفے کی املاک کو استعمال کر سکتا ہے، اس کی رعیت پر حکومت کر سکتا ہے،

اسلام کا تصور زندگی

۱۲۵

اپنے سے خدمت لے سکتا ہے، ان کی نکرانی کر سکتا ہے، مگر اس حیثیت نہیں کہ وہ خود آقا ہے بلکہ اس حیثیت سے کہ وہ اپنے آقا کا نمایاں ہے، اور جتنی چیزیں اس کے زیر حکم ہیں ان ہر اپنے آقا کا امین ہے۔ اس بنا پر وہ سمجھا اور پسندیدہ اور مستحق انعام نائب اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ وہ آقا کی امانت میں خیانت نہ کرے۔

اس امانت میں نہ صرف دنیا کی ہر چیز شامل ہے بلکہ خود انسان کا اپنا نفس بھی اس کا ایک حصہ ہے۔ لہذا جس طرح بقیہ اشیا کا وہی تصرف مناسب ہے جو آقا کی مرضی کے مطابق ہو اسی طرح خود انسان کا جسم اور اس کی جان بھی خدا کی هدایات کے مطابق استعمال ہونی چاہیں۔ خدا نے اپنی مریضی وہی و الہام کے ذریعے انسانوں تک پہنچا دی اور خدا کا مربوط اور منصل قانون کتاب و سنت میں محفوظ ہے۔ انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اس کو سمجھو کر اپنے اعمال و افعال خدا کی مرضی کے مطابق ڈھالے۔

(3) تیسرے یہ کہ نہ صرف انسان کا عمل خدا کے دلیر ہونے قانون کے مطابق ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ مطابقت اتفاق نہ ہو۔ نائب کا کام بھی نہیں کہ وہ ایسے افعال انجام دے جو آقا کی نظر میں پسندیدہ ہوں بلکہ یہ بھی ہے کہ نائب یہ افعال آقا کے انتدار اعلیٰ کو تسلیم کر کے اس کی رضا کی خاطر کرے۔ اگر ایسا نہ کرے گا تو نہ اپنے نائب ہونے کی حیثیت کو سمجھ سکے گا، نہ اپنے امین ہونے کے منصب کا کوئی صحیح تصور اس کے ذہن میں پیدا ہوگا، نہ اپنے ذمہ دار اور جواب دہ ہونے کا احسان کر سکے گا، اور نہ اس امانت میں جو اس کے سپرد کی گئی ہے اپنی ذمہ داریاں اور اپنے فرائض صحیح طور پر ادا کرنے کے قابل ہوگا۔ اول تو یہ ممکن نہیں کہ کسی دوسرے تعغیل کے تحت انسان وہ طرز عمل اختیار کر سکے جو نیابت و امانت کے تحت وہ اختیار کرے گا۔ اور اگر بفرض محال اس کا طرز عمل ویسا ہو بھی تو اس کی کوئی قیمت نہیں کیوں کہ آقا کی فرمانروائی تسلیم کرنے سے انکار کر کے تو وہ بھلے ہی باغی ہو چکا ہے۔ اب اگر اس نے اپنے نفس یا کسی اور کی اتباع میں اچھی عمل کیے بھی تو اس کا اجر اس سے طلب کرے جس کی اس نے اتباع کی ہے۔ اس کے آقا کے ہاں اس کے وہ اعمال یہ کار اور سے وزن ہیں۔

۴ چونہے اسی لفظ خلافت و نیابت سے ایک اہم نکتہ یہ بھی نکلا ہے کہ نائب کا اصل تعالیٰ ہے کہ وہ اپنے آقا کی املاک میں اس کی جائزیتی کا حق ادا کرنے کی کوشش کرے اور جہاں تک ممکن ہو ان میں اسی شان کا تصرف کرے جس شان کا وہ حقیقی مالک کرتا ہے۔ بادشاہ اگر اپنی رعیت پر کسی شخص کو اپنا نائب بنائے تو اس کے لیے اپنے منصب نیابت کے استعمال کا بہترین طریقہ بہ ہوگا کہ رعیت کی خبر گیری، شفقت، مہربالی حفاظت، عدل اور حسب موقع سختی کرنے میں وہی سیرت اختیار کرے جو خود بادشاہ کی سیرت ہے۔ اور بادشاہ کی املاک اور اس کے اموال میں ویسی ہی حکمت، تدبیر، دانائی اور احتیاط سے تصرف کرے جس سے خود بادشاہ ان میں تصرف کرتا ہے۔ پس انسان کو بھی نائب خدا ہونے کی حیثیت سے وہی روش اختیار لزی چاہیے جو خود خدا کی روش ہے۔ مخلوق کی ویسی ہی خبر گیری، وہی رحمانی و رحیمی، وہی عدل، وہی رحم و کرم، ویسا ہی قہر و جبر جو خود خدا کے اخلاق میں شامل ہے، انسان کو چاہیے کہ اپنے کردار میں بھی راستہ کرے۔ یہی مفہوم ہے جو "تخلقوا بالخلق اللہ" کے حکیمانہ جملے میں ادا کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ انسان اپنے میں یہ صفات اس حد تک پیدا نہیں کر سکتا جس حد تک خدا کی ہیں، کہ درجہ نیابت درجہ خدا وندی کے آگے ہیجے ہے، لیکن اپنی حد تک ان صفات میں زیادہ سے زیادہ سلکہ پیدا کرنا ہی صحیح اسلامی زندگی ہے۔

۵ پانووں یہ کہ انسان جب تک زمین میں ہے اور جب تک مشی کے پتلے (جسم انسان) اور خدا کی پہونچ ہوں روح میں تعلق باقی ہے اس وقت تک وہ خدا کا نائب ہے۔ یہ تعلق منقطع ہوتے ہی وہ خلافت ارضی کے منصب سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ اس کے زمانہ نیابت کے افعال و اعمال کی جانچ پڑتاں ہوں چاہیے۔ اس کے سپرد جو امانت کی گئی تھی اس کا حساب کتاب ہونا چاہیے۔ اس پر نائب ہونے کی حیثیت سے جو ذمہ داریاں عائد کی گئی تھیں ان کی تحقیقات ہوں چاہیے کہ اس نے کہنے طرح انجام دیں۔ اگر اس نے غبن، خیانت، نافرمانی، بغاوت اور فرض ناشناسی کی ہے تو اس کو سزا ملنی چاہیے اور اگر ایمان داری، فرض شناسی اور اطاعت کو شی سے کام کیا ہے تو اس کا انعام بھی ملتا ضروری ہے۔

۶ چہئے یہ کہ ہر انسان نائب ہونے کی حیثیت سے اپنے اچھے برسے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ نہ بہ امید باقی رہنے دی گئی ہے کہ کوئی ہماری غلطیوں

کوتاہیوں کا کفارہ ادا کرے کا، نہ اس موقع کی کوئی گنجائش چھوڑی
اول کہ دسی کے تعلق اور دسی کے واسطے سے ہم اپنے جرائم کے نتائج
لئے ہے اسی سے بچ جائیں گے۔ اور نہ اس کا کوئی خطرہ باق رکھا گیا ہے
اور ان کی سزا سے بچ جائیں گے۔ کسی کا جرم ہمارے حسن عمل پر اندر انداز ہو گا۔ یا خدا کے سوا کسی
کو ہمارے اعمال کی مقبولیت و نامقبولیت میں کوئی دخل نہ ہے۔ لہذا
دنیا برتنے میں هر شخص دو اپنی پوری ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیے اور
دنیا و مافیا سے قطع نظر کر کے یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرنی چاہیے کہ
انہیں ہر عمل کا ذمہ دار میں خود ہوں۔

اسلامی نظریہ کا علمی مقام

دنیا اور انسان کے متعلق یہ نظریہ جو اسلام نے پیش کیا ہے ابک
مکمل نظریہ ہے۔ اس کے تمام اجزا میں منطقی ربط ہے۔ کوئی جز دوسرے
جز سے متناقض نہیں ہے۔ اس سے تمام واقعات عالم کی پوری توجیہ اور تمام
آثار کائنات کی پوری تعبیر ملتی ہے۔ کوئی ایک چیز مشاهدے یا تجربے میں ایسی
نہیں آتی جس کی توجیہ اس نظریے سے نہ کی جا سکتی ہو۔ لہذا یہ ایک علمی
نظریہ ہے۔ 'علمی نظریہ'^۱ کی جو تعریف بھی کی جائے وہ اس پر مصادق آتی ہے۔

پھر کوئی مشاهدہ یا تجربہ آج تک ایسا نہیں ہوا جس سے یہ نظریہ
ٹوٹ جاتا ہو لہذا یہ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ ٹوٹنے ہوئے نظریات میں اس کو
شار نہیں کیا جا سکتا۔

پھر نظام عالم کا جو مشاهدہ ہم کرتے ہیں اور اس سے اس نظریے کی صداقت
اور بورتی پر روشنی پڑتی ہے۔ کائنات میں جو زبردست تنظیم باقی جاگ ہے اس
کو دیکھ کر یہ کہنا زیادہ قرین عقل ہے کہ اس کا کوئی ناظم ہے یہ نسبت
اس کے کہ کوئی ناظم نہیں ہے۔ اسی طرح اس تنظیم کو دیکھ کر یہ نتیجہ

1 - Scientific Theory

۲۔ کسی زمانے کے کچھ علمی نظریات کا بہ ظاہر اس کے خلاف ہونا اس بات کا ثبوت نہیں
ہے کہ یہ نظریہ ٹوٹ گیا۔ ایک علمی نظریے کو صرف حقائق توڑ سکتے ہیں نہ کہ
نظریات۔ لہذا جب تک یہ نہ بنایا جائے کہ انبیا کے پیش کیے ہوئے اس تصور کائنات
و انسان کو کس ثابت شدہ حقیقت نے غلط ثابت کر دیا ہے، اس کو ٹوٹنے ہوئے
نظریات میں شار کرنا قطعاً ایک غیر علمی اور متعصبانہ دعویٰ ہے۔

نکالنا زیادہ معقول ہے کہ یہ مركبی نظام ہے اور ایک ہی مختار کل اس کا ناظم ہے، بہ نسبت اس کے کہ یہ لا مركبی نظام ہے اور بہت سے ناظموں کے ماتحت چل رہا ہے۔ اسی طرح جو حکمت کی شان اس کائنات کے نظام میں علازیہ محسوس ہوتی ہے آئے دیکھ کر یہ رائے قائم کرنا زیادہ قریب از عقل ہے کہ یہ حکیمانہ اور با مقصد نظام ہے، بہ نسبت اس کے کہ یہ مقصد ہے اور بعض ایک بھجے کو کوہل ہے۔

پھر جب ہم اس حیثیت سے غور کرنے ہیں کہ اگر واقعی یہ نظام کائنات ایک سلطنت ہے اور انسان اس نظام کا ایک جز ہے تو یہ بات ہم کو سراسر معمول معلوم ہوتی ہے کہ اس نظام میں انسان کی خود مختاری وغیر ذمہ داری کے لئے کوئی جکہ نہ ہون چاہیے اور اس کا صحیح مقام رعیت ہی کا ہونا چاہیے۔ اس لحاظ سے یہ ہم کو نہایت معمول نظریہ معلوم ہوتا ہے۔

پھر جب عملی نقطہ نظر سے ہم دیکھنے ہیں تو یہ بالکل ایک قابل بنتا ہے۔ زندگی کا پورا نظام اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ اس نظریے پر میں ہے۔ فلسفے اور اخلاق کے لئے، علوم و فنون کے لئے، ادب اور هنر کے لئے، سیاست اور انتظام ملک کے لئے، صلح و جنگ اور بین الاقوامی تعلقات کے لئے، غرض زندگی کے ہر ہملو اور ضرورت کے لئے یہ ایک مستقل بنیاد فراہم کرتا ہے اور کسی شعبہ زندگی میں بھی انسان کو اپنا رویہ متعین کرنے کے لئے اس نظریے سے باہر جانے کی ضرورت پہش نہیں آتی۔

افرادی و اجتماعی زندگی پر نظریہ اسلامی کے الران

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ اس نظریے سے دنیا کی زندگی میں کسی قسم کا رویہ بنتا ہے اور اس کے نتائج کیا ہیں۔

I dividually. افرادی زندگی میں یہ نظریہ دوسرے جاہلی نظریات کے بر عکس ایک نہایت ذمہ دارانہ اور نہایت منضبط رویہ پیدا کرتا ہے۔ اس نظریے پر ایمان اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اپنے جسم اور اس کی طاقتیں کو اور دنیا اور بلکہ خدا کی ملکیت سمجھے کر صرف اس کے قانون کی پابندی میں استعمال نہ کرے۔ ہر چیز کو جو آسے حاصل ہے خدا کی امانت سمجھئے اور یہ سمجھتے ہوئے اس میں تصریف کرے کہ مجھے اس امانت کا بورا حساب دینا ہے، اور حساب بھی

اس کو دینا ہے جس کی نظر سے میرا کوئی فعل بلکہ دل میں چھپا ہوا گون
ارادہ تک پوشیدہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ اپسا شخص ہر حال میں ایک ضابطے
کا ہابند ہو گا، وہ خواہشات کی بندگی میں کبھی شتر نے مہار نہیں بن سکتا۔
وہ ظالم اور خائن نہیں ہو سکتا۔ اس کی سیرت پر کامل اعتماد کیا جا سکتا۔
وہ ضابطے کی ہابندی کے لیے کسی خارجی دباؤ کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس کے
انہے نفس میں ایک زبردست اخلاقی انضباط پیدا ہو جاتا ہے جو اسے ان موقع پر
بھی راستی اور حق پر قائم رکھتا ہے جہاں آسے کسی دنیوی طاقت کی باز پرس
کا خطرہ نہیں ہوتا۔ یہ خدا کا خوف اور امانت کا احسان و چیز ہے جس سے
بڑھ کر معاشرے کو قابل اعتماد افراد فراہم کرنے کا کوئی دوسرا ذریعہ تصور
میں نہیں آ سکتا۔

مزید برأں یہ نظریہ آدمی کونہ صرف سعی و جہد کا آدمی بناتا ہے
بلکہ اس کی سعی و جہد کو خود غرضی، نفس پرستی یا قوم پرستی کے بجائے
حق پرستی اور بلند تر اخلاقی مقاصد کی راہ پر لگا دینا ہے۔ جو شخص انہے متعلق
یہ رائے رکھتا ہو کہ میں دنیا میں یہ کار نہیں آیا ہوں بلکہ خدا نے مجھے
کام کرنے کے لیے بہاں بھیجا ہے، اور میری زندگی انہے لیے یا انہے دوسرے
متعلقین کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کام کے لیے جس میں خدا کی رضا ہو، اور
میں یونہی چھوڑا نہ جاؤں گا بلکہ مجھ سے پورا حساب لیا جائے گا کہ میں نے
اپنے وقت کا اور اپنی قوتون کا کتنا اور کس طرح استعمال کیا، ایسے شخص سے
زیادہ کوشش کرنے والا اور نتیجہ خیز اور صحیح کوشش کرنے والا آدمی
اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ لہذا یہ نظریہ ایسے بہتر افراد پیدا کرتا ہے کہ ان
سے بہتر انفرادی رویہ رکھنے والے افراد کا تصور کرنا مشکل ہے۔

Ab اجتماعی پہلو پر غور کیجئے - Collectively

سب سے پہلے تو یہ نظریہ انسان اجتماع کی پہیاں بدل دینا ہے۔ اس
نظریے کی رو سے تمام انسان خدا کی رعیت ہیں۔ رعیت ہونے کی حیثیت سے سب
کے حقوق یکسان، سب کی حیثیت یکسان، اور سب کے لیے موقع یکسان۔
کسی شخص، کسی خاندان، کسی طبقے، کسی قوم، کسی نسل کے لیے
دوسرے انسانوں پر نہ کسی قسم کی برتری و فویت ہے نہ امتیازی حقوق۔ اس
طرح انسان پر انسان کی حاکمیت اور فضیلت کی جڑ کٹ جاتی ہے، اور وہ تمام
خراہیاں بک لخت دور ہو جاتی ہیں جو بادشاہی، جاگیرداری، اشراحت،
برعمنیت و پاپائیت اور آمریت سے پیدا ہوتی ہیں۔

پھر یہ چیز قبیلے، قوم، نسل، وطن اور رنگ کے ان تفصیلات کا بھی خانعہ نہ دستی ہے جن کی پدوات دنیا میں سب سے زیادہ خوب ریزیاں ہوئی ہیں۔ اس نظریے کی رو سے تمام روئے زمین خدا کی ملک ہے، تمام انسان ادم کی اولاد اور خدا کے بندے ہیں، اور فضیلت کی بنیاد نسل و نسب، مال و دولت یا رنگ کی سپیدی و سرخی پر نہیں بلکہ اخلاق کی پاکیزگی اور خدا کے خوف ہے۔ جو سب سے زیادہ خدا سے ذرٹے والا اور صلاح و تقویٰ پر عمل کرنے والا ہے وہی سب سے افضل ہے۔

اسی طرح انسان اور انسان کے درمیان اجتماعی ربط و تعلق یا فرق و امتیاز کی بنا بھی اس نظریے میں کائیا تبدیل کر دی گئی ہے۔ انسان نے اپنی ایجاد سے جن چیزوں کو اجتماع و افتراق کی، بنا نہیں رکھا ہے وہ انسانیت کو بے شمار حصوں میں تقسیم کرتی ہیں اور ان حصوں کے درمیان ناقابل عبور دیواریں کھڑی کر دیتی ہیں۔ کیوں کہ نسل، یا وطن، یا قومیت یا رنگ، چیزیں نہیں ہیں جن کو اُدسی تبدیل کر سکتا ہو اور ایک گروہ میں سے دوسرے گروہ میں جا سکتا ہو۔ برعکس اس کے بہ نظریہ انسان اور انسان کے درمیان اجتماع و افتراق کی بینا خدا کی بندگی اور اس کے قانون کی ہیروی ہر رکھتا ہے۔ جو لوگ مخلوقات کی بندگی چھوڑ کر خدا کی بندگی اختیار کر لیں اور خدا کے قانون کو اپنی زندگی کا واحد قانون تسلیم کر لیں وہ سب ایک جماعت ہیں، اور جو ایسا نہ کر لیں وہ دوسری جماعت۔ اس طرح تمام اختلافات مٹ کر صرف ایک اختلاف باق رہ جاتا ہے اور وہ اختلاف بھی قابل غور ہے کیوں کہ ہر وقت ایک شخص کے لیے ممکن ہے کہ اپنا عقیدہ اور طرز زندگی بدل دے اور ایک جماعت سے دوسری جماعت میں چلا جائے۔ اس طرح اگر دنیا میں کوئی عالم گیر بین الاقوامی برادری بننی ممکن ہے تو وہ اسی نظریے ہر بن سکتی ہے۔ دوسرے تمام نظریات انسانیت کو پہاڑنے والی ہیں، جمع کرنے والی نہیں ہیں۔

ان تمام اصلاحات کے بعد جو معاشرہ اس نظریے پر بنتا ہے اس کی ذہنیت، روح اور اجتماعی تعمیر بالکل بدی وقی ہوتی ہے۔ اس میں ریاست انسان کی حادیت پر نہیں بلکہ خدا کی حادیت پر بنتی ہے۔ ۱۔ حکومت خدا کی ہوتی ہے۔

۱۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، سید ابوالاعلیٰ مودودی، 'اسلامی ریاست' (مرتبہ خورشید احمد) اسلامک پبلیکیشنز لیٹری، لاہور، اور محمد اسد، 'اسلامی دستور سازی' بیورو آف نیشنل زیکنسر کش، حکومت مغربی پاکستان، لاہور۔

اللہ خدا کا ہوتا ہے - انسان صرف خدا کے ابجٹ کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔
اپنے اول تو ان ساری خرابیوں کو دور کر دیتی ہے جو انسان ہر انسان کی
مکونت اور انسان کی قانون سازی سے پیدا ہوتی ہے۔ ہر ابک عظیم الشان فرق
بوجان نظریہ ہر ریاست بتنے سے واقع ہو جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ریاست کے پورے
نظام میں عبادت اور تقویٰ کی رنج بھیل جاتی ہے - راعی اور رعیت دونوں یہ سمجھتے
ہیں کہ ہم خدا کی حکومت میں ہیں اور ہمارا معاملہ براہ راست اُس خدا سے ہے
جو عالم الغیب والشہادۃ ہے - ٹیکس دینے والا یہ سمجھو کر ٹیکس دینا ہے کہ خدا
کو ٹیکس دے رہا ہے، اور ٹیکس لینے والے اور اُس ٹیکس کو خرج کرنے والے یہ
سچھنے ہوئے کام کرتے ہیں کہ یہ مال خدا کا مال ہے اور ہم امین کی
حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ایک سپاہی سے لے کر ابک جمع اور گورنر تک
ہر کارنہ، جکومت اپنے فرانض اسی ذہنیت کے ساتھ انجام دینا ہے جس ذہنیت
ہر نماز ہڑھتا ہے۔ دونوں کام اس کے لیے عبادت ہیں اور دونوں
بین وہی ایک تقویٰ اور خشیت کی روح درکار ہے۔ باشندے اپنے اندر سے جن
لوگوں کو خدا کی نیابت کا کام انجام دینے کے لیے چنتے ہیں ان میں سب سے
اہل ہے جو صفت تلاش کی جاتی ہے وہ خوف خدا اور ایمان و صداقت کی صفت
ہے۔ اس طرح سطح پر وہ لوگ آبھر آتے ہیں اور اختیارات ان کے ہاتھوں میں
دینے جانے ہیں جو موسائلی میں سب سے بہتر اخلاق کے حامل ہوتے ہیں۔

تمدن و معاشرت میں بھی یہ نظریہ تقویٰ اور طہارت اخلاق کی بھی۔

روح بھیلا دینا ہے۔ اس میں نفس پرستی کے بعد خدا پرستی ہوتی ہے، ہر
ابک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان خدا کا واسطہ حائل ہوتا ہے، اور
خدا کا قانون دونوں کے تعلقات کو منضبط کرتا ہے۔ یہ قانون چون کہ اس نے
بنایا ہے جو تمام نفسانی خواہشات اور ذاتی اغراض سے پاک ہے، اور علیم و حکیم
بھی ہے، اس لیے اس میں فتنے کا ہر دروازہ اور ظلم کا ہر راستہ بند کیا گیا ہے
اور انسانی فطرت کے ہر پہلو اور اس کی ہر ضرورت کی رعایت کی گئی ہے۔

جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ پیغمبروں
نے جو نظریہ، کائنات و انسان ہیش کیا ہے وہ کس قسم کا رویہ پیدا کرتا ہے
اور اس کے نتائج کیا ہیں اور کیا ہو سکتے ہیں۔ ہر یہ بات بھی نہیں کہ
یہ مخف کاغذ پر ایک خیالی نقشہ ہو۔ بلکہ تاریخ میں اس نظریے پر ابک
اجتماعی نظام اور ایک ریاست بنا کر دکھائی جا چکی ہے۔ اور تاریخ شاهد

ہے کہ جیسے افراد اس نظریے ہر تیار کیجئے گئے تھے نہ اس سے بہتر الفراد زمین پر ہانے گئے اور نہ اس ریاست سے بڑھ کر کوئی ریاست انسان کے لئے رحمت ثابت ہوئی۔ اس کے افراد میں اپنی اخلاق ذمہ داری کا احسان اتنا بڑھ گیا تھا کہ ابک صورتی عورت کو زنا سے حل ہو جاتا ہے، وہ جانتی ہے کہ میرے لیے اس جرم کی سزا منگاری جیسی ہولناک سزا ہے، مگر وہ خود چل کر آتی ہے اور درخواست کرنے ہے کہ اس ہر سزا نافذ کی جائے اس سے کہا جاتا ہے کہ وضع حمل کے بعد آئیو، اور بغیر کسی سوچ لکھ، ضمانت کے آئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وضع حمل کے بعد وہ بھر صمرا سے آئی ہے اور سزا دیے جانے کی درخواست کرنے ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ بھی کو دودھ پلا اور جب دودھ پلانے کی مدت ختم ہو جائے تب آئیو۔ بھر وہ صمرا کی طرف واپس چلی جاتی ہے اور کوئی ہولیں کی نگرانی اس ہر نہیں ہوتی۔ رضاعت کی مدت ختم ہو جانے کے بعد وہ بھر آکر التجا کرنے ہے کہ اب اسے سزا دے کر اس گناہ سے پاک کر دیا جائے جو اس سے سرزد ہو چکا ہے۔ چنانچہ اسے منگار کیا جاتا ہے اور جب وہ مر جاتی ہے تو اس کے لیے دعاۓ رحمت کی جاتی ہے۔ اور جب ابک شخص کی زبان سے اس کے حق میں اتفاقاً یہ کلمہ نکل جاتا ہے کہ کیسی بے حیا عورت تھی تو جواب میں فرمایا جاتا ہے کہ "خدا کی قسم! اس نے ایسی توبہ کی تھی کہ اگر ناجائز محصول لینے والا یہی ایسی توبہ کرتا تو بخش دیا جاتا۔" یہ تو اس معاشرے کے افراد کا حال تھا اور اس ریاست کا حال یہ تھا کہ جس حکومت کی آمدی کروڑوں روپے تک بہنچی ہوئی اور جس کے خزانے ایران و شام و مصر کی دولت سے بھرے ہوئے تھے اس کا صدر صرف ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار لیتا تھا، اور اس کے شہریوں میں ڈھونٹنے سے بھی بہ مشکل کوئی ابسا ملتا تھا جو خیرات لینے کا مستحق ہو۔

اس تجربے کے بعد بھی اگر کسی شخص کو یہ اطمینان حاصل نہ ہو کہ انبیا نے نظام کائنات کی حقیقت اور اس میں انسان کی حیثیت کے متعلق جو نظریہ پیش کیا ہے وہ حق ہے تو ایسے شخص کے اطمینان کے لیے کوئی دوسری صورت ممکن نہیں ہے۔ کیوں کہ خدا اور فرشتوں اور آخرت کی زندگی کا براہ راست عینی مشاهدہ تو آسے بھر حال حاصل نہیں ہو سکتا۔ جہاں مشاہدہ ممکن نہ ہو وہاں تجربے سے بڑھ کر صحت کا کوئی دوسرا معیار نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک طبیب بیمار کے اندر مشاہدہ کر کے یہ نہیں دیکھ سکتا کہ فی الواقع

اسلام کا تصور زندگی

۱۴۳

نظام میں کیا خرابی پیدا ہو گئی ہے تو مختلف دوائیں دے کر دیکھنا ہے، اور جو دوا اس اندھیری کونہزی میں نہیں نشانے پر جا کر بیٹھتی ہے اس کا مرض کو دور کر دینا ہی اس بات پر قطعی دلیل ہوتا ہے کہ نظام میں ف الواقع جو خرابی تھی یہ دوا اس کے عین مطابق تھی۔ اسی طرح جب انسان نظریے ہی سے درست ہوتی ہے تو یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ نظریہ حقیقت کے مطابق ہے، ف الواقع یہ کائنات اللہ کی سلطنت ہے اور ف الواقع اس زندگی کے بعد ایک زندگی ہے جس میں انسان کو اپنے کارنامہ حیات دنیوی کا حساب دینا ہے۔

انسان کا نصب العین

نصب العین کا سوال در حقیقت تصور حیات کے سوال سے کھرا تعلق رکھتا ہے۔ ہم دنیوی زندگی کے متعلق جو تصور رکھتے ہیں اور دنیا میں اپنی حیثیت اور اپنے لیے دنیا کی حیثیت کا جو نظریہ ہمارے ذہن میں ہوتا ہے وہی فطری طور پر زندگی کا نصب العین متعین کر دیتا ہے اور ہم اپنی تمام قوتیں اسی نصب العین کے حصول کی راہ میں صرف کرنے لگتے ہیں۔ اگر دنیا کو ہم اپنے لیے ایک چراگاہ تصور کرتے ہیں اور ہمارے ذہن میں زندگی عبارت ہے ایک مہلت ہے جو ہم کو کھانے پینے اور باقی لذتوں سے متعن ہونے کے لیے ملی ہوئی ہے تو بلاشبہ یہ حیوانی تصور ہمارے نفس میں زندگی کا ایک حیوانی نصب العین راسخ کر دے گا اور ہم تمام عمر اپنے لیے جنسی لذتوں کا سامان فراہم کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ بخلاف اس کے اگر ہم اپنے آپ کو پیدائشی مجرم اور فطری گنگار سمجھتے ہیں اور دنیا کے متعلق ہمارا تصور ہے کہ یہ کوئی سزا کھہ رہے جہاں ہم اپنے پیدائشی جرم کی سزا بھگتی کے لیے پہنچ دیجے گئے ہیں تو قدری طور پر یہ تصور ہمارے نفس میں اس عذاب سے رہائی حاصل کرنے کی خواہش پیدا کرے گا اور اس بنیاد پر ہم نجات کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیں گے۔ لیکن اگر دنیا کے متعلق ہمارا تصور چراگاہ اور دارالعذاب دونوں سے برتر ہو اور انسان ہونے کی حیثیت سے ہم اپنے آپ کو حیوان اور مجرم دونوں سے ارفع و اعلیٰ سمجھتے ہوں تو ہمارے نفس کو مادی لذات کی طلب اور نجات کے حصول دونوں

سے زیادہ بلند نصب العین کی تلاش ہوگی اور کسی پست اور ادنیٰ مطبع نظر ہر
ھماری نگاہ نہ نہیں رکھے گی۔

اس قاعدے کو پیش نظر رکھ کر جب آپ دیکھیں گے کہ اسلام نے انسان
کو خدا کا خلائق اور روئے زمین پر اس کا نائب قرار دیا ہے تو اس تصور حیات
جو نصب العین فطری طور پر پیدا ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیے اس تک آپ کی
عقل خود بہ خود پہنچ جائے گی۔ ایک نائب کا بہ حیثیت نائب ہونے کے اس کے
سو اور کیا نصب العین ہونا چاہیے کہ وہ جس کا نائب ہے اس کی رضا اور
خوشنودی حاصل کرے اور اس کی نظر میں ایک اچھا، وفادار اور فرض شناس
نائب قرار پائے؟ پس اسلام کے مطابق انبان کا نصب العین صرف رضاۓ اللہ
کا حصول ہے۔ یہ وہ نصب العین ہے جو اس تصور حیات سے خود عقل اور فطرت
پیدا کرتے ہے۔ قرآن مجید کے ارشادات کا مطالعہ کرنے سے آپ کو معلوم ہوا
کہ طرح طرح سے اسی ایک مقصد کو ذہن نشین کرانے اور قلب و روح میں بنا
دینے کی گوشش کی گئی ہے۔ اور اس کے سوا دوسرے ہر مطبع نظر کو پورے
زور کے ساتھ رد کیا گیا ہے۔ فرمایا کہ

فَإِنْ صَلَّيْتُ وَنَذَلَّتِ وَهَنَّمَتِي وَمَهَانَتِي يَنْوَرِبُ الْغَلَمَيْنِ لَا تَسْرِيْلَدَ لَهُ وَبِذَلِكَ أُمِّنْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ

(لاتے پیغمبر) کہ دو! کہ میری نماز اور میری عبادت اور میرا جینا اور میرا مناسب کچھ افہ
کے اسی ہے جو تمام جیبانوں کا رب ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ مجھے اسی کا
حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے اس کے آگے سر جھکانے والا ہوں۔ (الانعام ۱۹۲-۱۹۳)

سورہ فتح میں مسلمانوں کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے کہ یہ لوگ ہیں
جن کی دوستی اور دشمنی اور جن کا رکوع و سجود سب کچھ اللہ کے لئے ہے۔

سورہ محمد (صلیع) میں کافروں کے اعمال خائیں ہونے کی وجہ یہ بنائی گئی
ہے کہ وہ خدا کے لئے کچھ نہیں کرتے بلکہ دوسری اغراض کے لئے عمل کرکے
خدا کی ناخوشی مول ابیتے ہیں۔ سورہ حج میں ایسی عبادت کو جو دنیوی فوائد
کی خاطر ہو قطعاً بے کار اور موجب نامرادی قرار دیا گیا ہے۔ چنان چہ ارشاد ہوا:

اور لوگوں میں سے ایک وہ ہے جو اللہ کی عبادت اکھڑے
دل سے کرتا ہے۔ اگر اس کو کوئی فائدہ پہنچ گیا تو اس سے
طمین ہو گیا اور اگر آزمائش کا وقت آگیا تو الٹا پھر گیا۔ ابسا

اسلام کا تصور زندگی

۱۳۵

شیخوں دنیا اور آخرت دونوں میں نامراد ہوا۔ اور یہی صریح گھانا ہے۔
 (العج، رکوع ۲۰)

اس تمام تعلیم کو رسول اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مکیانہ جملے میں یوں ادا کیا ہے کہ "الله صرف وہی عمل قبول کرتا ہے جو خالصتنا اس کے لیے کیا جائے اور جس سے شخص اسی کی رضا جوئی مقصود ہو۔" یہی ہے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ انسان کی زندگی کا اصل نصب العین رضاۓ اللہی کا حصول ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اسلامی نصب العین میں وہ کون سی خصوصیات میں جو اسے بہترین نصب العین بناتی ہیں۔

اسلامی نصب العین کی خصوصیات

۱) اولاً: رضاۓ اللہی کا حصول ایک ایسا نصب العین ہے جو طبیعی اور عقلی مقام کو ہم آہنگ کرتا ہے۔ اسلامی نظریہ کائنات کے مطابق کائنات کی ہر شے ملوعاً و کرہاً خدا ہی کی تابع فرمان ہے اور اسی کے بنائے ہونے قوانین کے مطابق مرکٹ کرتی ہے۔ اس عالم گیر، ناقابل تغیر اور ناأشنا نے استثنائی قانون میں تمام کائنات کی طرح خود انسان بھی جکڑا ہوا ہے۔ اس کی طبیعت و فطرت بھی اسی خدا کی مطیع و فرمانبردار ہے۔ اب انسان کے لیے بہ حیثیت ایک عقلی وجود کے صرف اتنی کسر رہ جاتی ہے کہ وہ اپنے اس طبیعی نصب العین کا شعور بھی حاصل کر لے اور عقل و فکر کے ساتھ اس کو سمجھ کر اپنے ارادوں اور اپنی نیتوں اور اپنی سعی و عمل کا رخ بھی اسی طرف پہنچ دے۔ اس صورت میں اس کا عقل نصب العین اس کے اور تمام موجودات کے طبیعی نصب العین سے ہم آہنگ ہو جائے گا اور جہاں ہستی کے سارے لشکر اور نظام وجود کے سب کل پرزاے اس مقدمہ تک پہنچنے میں اس کا ساتھ دیں گے۔ وہ عقلی مرتبہ کے لعاظ سے اس عظیم الشان قافلے کا سالار ہو گا۔

۲) دوسراً: جب انسان کا مقصد رضاۓ اللہی کا حصول قرار پاتا ہے تو ہر عمل اسی کی خاطر انجام دیا جاتا ہے اور اس طرح پوری زندگی میں مرکزیت اور بک رنگ پیدا ہوتی ہے۔ پھر چون کہ ہر فرد کا نصب العین اسی ایک خدا کی خوشیوں کی ہے، اس لیے معاشری زندگی میں بھی مرکزیت اور یکسوں پیدا ہوتی

ہے۔ چنان چہ اسلامی نظام زندگی میں جو کچھ بھی ہے، خواہ وہ نیت و اعتقاد کے قبیل سے ہو یا ہرستق و عبادت کے قبیل سے، یا دنیوی معاملات میں ہے ہر کیف اس کا رخ اسی مرکز کی جانب ہمرا ہوا ہے۔ گو یا ایک مکمل و متوال نظام شمسی ہے جس میں کسی قسم کا تضاد یا بے ترتیبی نہیں۔

^(۳) تیسرا، جس طرح یہ نصب العین ایک فرد کا نصب العین بن مکا ہے اسی طرح ایک جماعت، ایک قوم، بلکہ نوع بشری کا نصب العین ہے بن سکتا ہے۔ اس میں سرے سے نفسانیت اور انفرادی یا اجتماعی خود غرض کا وہ عنصر ہی موجود نہیں ہے جس کی طبیعی خاصیت یہ ہے کہ انسان کو نسلوں اور قوموں میں اور ہر افراد و اشخاص میں تقسیم کرتا ہے اور ان کے اندر ایک دوسرے کے خلاف مقابلے و مزاحمت اور بغض و حسد کے چلبان ابھارتا ہے۔ بر عکس اس کے نصب العین انسان کو اس ہستی کی طرف متوجہ کرتا ہے جس کے ساتھ تمام نوع بشری، بلکہ تمام کائنات کا تعلق پکشان ہے اور جس کی طرف متوجہ ہو جانے کے بعد ہر جہت اور ہر حیثیت سے انسان مقامد میں ایسا اتھاد و اشتراک پیدا ہو جاتا ہے کہ لوگوں میں مقابلہ مسابقت تو درکثار تعاون اور موالات، اخوت اور بھائی چارہ کی روح پیدا ہو جاتی ہے۔

^(۴) چوتھے، اس نصب العین کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ دنیا میں انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے انسان کے جتنے مقامد ہو سکتے ہیں وہ اس کے حصول کے ساتھ ساتھ حاصل ہو جانے ہیں، بغیر امن کے کہ انسان انہیں بالذات مقصود بنائے۔ قرآن مجید ایک ایک کر کے ان سب چیزوں کو گنتا ہے جو رضاۓ اللہ کے حصول کے ساتھ لازماً حاصل ہوئے ہیں۔

دنیوی زندگی میں انسان سب سے زیادہ جس چیز کا خواہش مند ہوتا ہے وہ امن و سکون، راحت اورطمینان قلب ہے۔ قرآن کہتا ہے ”خدا کی طرز رجوع کرو اور اس کی خوشنودی کے طالب ہو جاؤ، یہ چیز تم کو آپ سے اپنے جانے کی۔ سورہ رعد میں ہے کہ ”اگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کی باد ہی دلوں کو اطمینان نہیں ہوتا ہے۔“

دوسری چیز جو انسان دنیا میں حاصل کرنا چاہتا ہے وہ خوشحالی ہے یعنی ایسی زندگی جو بہترانی اور پرگنڈہ خاطری سے خالی ہو۔ قرآن کہتا ہے

اسلام کا تصور زندگی

۱

۱۳۶

”خدا ہر ایمان لانے اور اس کے غضب سے بچنے اور اس کی خاطر پرہیز کاری اور نیکو کاری اختیار کرنے سے یہ چیز بھی باحسن وجوہ حاصل ہوتی ہے۔“ تاریخ گواہ ہے کہ بنی اسرائیل ہوں یا دور اول کے مسلمان یا کوئی اور قوم، جب کبھی انبوں نے ایمان کے ساتھ نیک اعمال کیتے دنیوی نعمتوں کے دروازے ان پر بند نہ رہے۔

تیسرا چیز حکومت و فرماد روانی اور غلبہ و سربلندی ہے جو انسان کو بڑی مطلوب و مرغوب ہے۔ قرآن کریم میں تم خدا کے ہو جاؤ ہے مناسع خود تمہارے قدموں میں آ رہے گی۔

”جو کوئی اللہ اور اس کے رسول اور ایمان لانے والوں کا دوست ہو گیا (وہ اللہ کی جماعت میں شامل ہو دیا) اور اللہ کی جماعت ہی غالب ہونے والی ہے۔“ (المائدۃ - ۸)

تاریخ گواہ ہے کہ دنیوی نعمتوں کے ساتھ ساتھ سیاسی غلبہ اور سربلندی بھی ان قوموں کو یقیناً عطا کی گئی جو ایمان کے ساتھ عمل صالح کر کے حزب اللہ میں شامل ہو گئیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ دوسروں نے جتنی چیزوں مقصود سمجھیں اسلام نے ان کی طرف توجہ بھی نہیں دی۔ بلکہ اس چیز کو مطلوب و مقصود قرار دیا جس کے حصول سے یہ سب چیزوں خود بعد خود حاصل ہو جاتی ہیں اور ہوئیں۔ دوسرے جن چیزوں کو اپنا نصب العین قرار دیتے ہیں مسلمان کی نگاہ میں وہ اس قابل ہی نہیں کہ وہ ان کی طلب میں اپنے قلب کو ایک امعنے کے لیے بھی الجھنے دے۔ اس کے پیش نظر تو ایک ایسا نصب العین ہے جو ان سب سے اور جہان ہستی کی ہر چیز سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جب اس بلند ترین مقصود کو پہنچ جائے گا تو اس کے تحت جتنی چیزوں ہیں وہ اس کو اپ سے آپ حاصل ہو جائیں گی۔ بالکل اسی طرح جس طرح عمارت کی سب سے اونچی منزل پر پہنچنے والا بیج کی تمام منازل کو اپنے قدموں کے نیچے پاتا ہے۔

مزید مطالعہ کے لیے

مولانا ابوالحسن علی ندوی، مذہب اور تمدن۔ ادارہ نشریات اسلام، رحیم یار خاں۔
مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی۔ اسلامیک پلیکیٹریٹ، لاہور۔

مظہر الدین صدیقی، مذہب کا انقلابی تصور۔ لاہور۔

۱ اسلامی نظریہ حیات کی بنیادی خصوصیات*

نظریہ حیات سے مراد ایک ایسا مکمل خابطہ ہے جو زندگی کے میں فکر و عمل کی رہنمائی کا کام کرسکے۔ مذاہب عالم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر و بیشتر مذاہب (اپنی موجودہ شکل میں) انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی نہیں ہیں۔ ان میں سے اکثر صرف انفرادی زندگی کے معاملات میں کوئی خابطہ فراہم کرتے ہیں اور یا تو اجتماعی زندگی سے علیحدگی اور بے تعلقی پر ابھارتے ہیں (مثلاً بدھ مت) یا پھر انسان کو صرف اخلاقی ہدایات دے کر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ اجتماعی زندگی میں جہاں سے چائے ہدایات حاصل کرے یا محض اپنے نفس کا پیرو ہو کر رہ جائے۔

(1) عملاً دیکھئے تو پہلی صورت ناممکن العمل ہے۔ تھوڑے بہت لوگ تو ہر زمانے میں مردم بے زاری اور گوشہ نشینی پر آمادہ ہو کر جنکلوں اور پہاڑوں میں تپسیا کے لیے نکل سکتے ہیں، لیکن آج تک انسانی تاریخ میں یہ کبھی نہیں ہوا کہ سب لوگ آبادیاں چھوڑ کر جنگل آباد کر لیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسا کرنا مناسب بھی نہ ہوگا۔ اگر آج سارے انسان جنکلوں میں ریاست کرنے ہوئے تو شاید انسان اور حیوان کا فرق ہی مٹ جاتا۔ انسانی تمدنیب و تمدن، ایجادات، مصنوعات اور مسلسل تسویہ کائنات، یہ سب انسان کی اجتماعی زندگی کا نتیجہ ہیں۔

(2) دوسری صورت اس سے بھی زیادہ خطرناک نتائج کی حامل ہے۔ اگر انسان کو محض شخصی زندگی کے لیے خابطہ حیات دیا جائے تو اسے اجتماعی زندگی

* یہ باب مرتب نے اس کتاب کے لیے خاص طور سے لکھا ہے۔

کے لئے خابطہ، حیات کہیں اور اسے حاصل کرنا ہوگا یا اپنی قوت فکر پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔ جس کے معنی یہ ہونے کہ ہدایت و رہنمائی کے ایک نہیں دوسرا چشمے قرار پائیں گے۔ اور یہ عین ممکن ہے کہ دونوں دو مختلف سمتوں میں رہنمائی کرتے ہوں۔ بلکہ حقیقت یہی ہے کہ جب بھی انسان نے دو یا زیادہ ساختے سے ہدایت حاصل کی ہے زندگی تناقضانہ تضاد کا شکار ہو گئی ہے اور اجتماعی فساد اور بکار رونما ہوا ہے۔

درحقیقت انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بہ تقسیم جو متعدد مذاہب میں ملتی ہے نہ صرف غلط ہے بلکہ انسانی نفسیات سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔
انسان زندگی ایک اکائی اور ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ دو مختلف ساختے سے ہدایت حاصل کرنے کی کوشش ایسی ہی ہے جیسے کوئی انسان بہ یک وقت دو کشتیوں میں سوار ہو کر مفر کرنے کی کوشش کرے۔

یہ بات مخصوص فرضی یا نظری نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دور میں یہ انسان کا سب سے بڑا سسئله ہے کہ بہ ظاہر اس کے پاس کوئی جامع نظریہ حیات موجود نہیں ہے۔ یہ سسئله یوں تو پوری دنیا کا ہے لیکن سب سے زیادہ شدت کے ساتھ مغربی ممالک میں محسوس کیا جا رہا ہے۔ عیسائیت افراد کی شخصی زندگی کے دائیرے سے باہر کوئی رہنمائی فراہم نہیں کرتی، جس نا نتیجہ یہ ہے کہ معیشت، سیاست اور تمدن کے سائل میں عیسائی ممالک کے باشندوں کو اپنی رہنمائی کے لئے دوسرے ذرائع کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ مغرب کے بیشتر ممالک نے اپنی معاشری زندگی میں سرمایہ داری کے مسلک کو اپنا لیا ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرے اور اس طرح سماج میں عزت حاصل کر لے۔ اس کے برخلاف عیسائی مذہب یہ کہتا ہے کہ ”دولت مند کا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ اونٹ کا سوفی کے ناکے سے نکل جانا۔“

صرف مغرب ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں انسانی سماج میں کم و بیش اسی قسم کے تضاد موجود ہیں۔ یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ اس تضاد کا کوئی عمل نتیجہ نہیں نکلتا۔ جدید ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ مغربی دنیا میں جنون اور دوسرے ذہنی امراض کی کثرت کا سب سے بڑا سبب وہ تضاد ہے جو مغربی معاشرے میں نمایاں طور پر موجود ہے۔ اب اگر کوئی جامع اور

مکمل نظریہ، حیات موجود ہو تو وہ زندگی کے تمام شعبوں کو اپنے تعت لے کر اور ان کے تضاد رفع کر کے ان میں عم آہنگ پیدا کر سکتا ہے۔

اشراکیت کو بھلی نظر میں ایک حد تک جامع نظام حیات کہا جا سکتا ہے، لیکن نہ وہ انسالیت کو روحانی تسکین دے سکتی ہے اور نہ دنیوی نقطہ نظر ہی سے انسانی زندگی میں سکون و سرت کی ضامن بن سکتی ہے۔ زمانے کے تفاہموں کا جواب بس اسلام دے سکتا ہے۔

هم اس باب میں اسلامی نظریہ، حیات کی خصوصیات بیان کرنے کی کوشش کریں گے۔

اسلامی نظریہ، حیات کی خصوصیات

① الہامی نظام حیات

اسلامی نظریہ، حیات کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک ایسا نظام حیات پیش کرتا ہے جو شخص عقل، انسانی کی کوششوں کا نتیجہ نہیں بلکہ رہنمائی ہدایت پر مبنی ہے۔ اس اعتبار سے یہ کمپیونزم، نازی ازم وغیرہ سے مختلف ہے، کیون کہ یہ سارے نظام ہائے زندگی انسانی فکر کے نتائج ہیں۔ ان میں سے بعض انسانی سائل کے حل کرنے کی یقیناً بڑی مخلصانہ کوششوں ہیں، لیکن انسان ذہن اس درجہ احوال و ظروف کی قیود میں گرفتار ہے کہ ماضی یا مستقبل کے لئے اپنے ماحول سے بلند تر ہو کر سوچ ہی نہیں سکتا۔ انسانی ذہن کی اسی کمزوری نہیں رکھتے۔ ان کے بخلاف اسلام کسی انسان کے ذہن کی تخلیق نہیں بلکہ اسی خالق کی طرف سے آیا ہوا نظام حیات ہے جس نے زمین و آسمان اور خود انسان کو پیدا کیا ہے اور جو ماضی، حال اور مستقبل سے بہ خوبی واقف ہے۔

یہ کائنات کوئی اتفاق حادثہ نہیں بلکہ اس کا ایک خالق ہے جس نے انسان کو یہاں اپنا نائب بنایا کر رہا ہے۔ اس نے جہاں انسان کی مادی اور جسمانی ضروریات کی تکمیل کا سامان کیا ہے وہیں اس کی روحانی، اخلاقی اور تعلیمی ضروریات کی تکمیل کا بھی پورا خیال رکھا ہے۔ اسی مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے بار بار انبیاء و رسول بھیجے کہ وہ انبیاء ہدایت کی روشنی میں انسانوں کو صحیح راستہ دکھانیں۔ قرآن میں اس کو اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا احسان

اسلامی نظریہ، حیات کی بنیادی خصوصیات کہا گا ہے:

101

لوجوں تک پہنچائیں اور دوسری طرف بد کے وہ خود ان تعلیمات کو اپنی زندگی میں اپنا کر لو جوں کے سامنے اس کا نمونہ ایش کروں۔ اسی لئے اسلامی نظام حیات کے اولین مأخذ دو ہیں ایک قرآن اور دوسرا سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ قرآن ہمارے ہاس نتاب کی شکل میں موجود ہے اور سنت کو ہم قرآن، تواتر، احادیث، اور عمل صحابہ کے ذریعے سے معلوم کرتے ہیں۔

اور ممتاز کر دیتی ہے۔ اس نظام میں کسی کے لئے اپنی طرف سے کسی بات کے بڑھانے گھٹانے کی کنجانش نہیں۔ اس کے تمام بنیادی اصول غیر تبدل ہیں، اگر ساری دنیا کے مسلمان مل کر بھی ان اصولوں میں کوئی تغیر کرنا چاہیں تو نہیں کو سکتے۔ لہذا اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اسلام وہ کچھ ہے جو مسلمان کرنے ہیں، تو یہ بالکل غلط بات ہے۔ اگر ساری دنیا کے مسلمان مل کر بھی کوئی ایسا کام کروں جس کا جواز قرآن یا سنت سے نہ ملتا ہو، تو وہ عمل، اسلامی نہ ہوگا۔

الہامی عدایت کا دعویٰ تو تمام مذاہب کرتے ہیں لیکن موجودہ دور
میں اسلام کے سوا کسی الہامی مذہب کی تعلیمات محفوظ نہیں، کچھ تو اس وجہ
سے کہ وہ مذاہب اس زمانے کے ہیں جب تعریر کے ذریعے چیزیں محفوظ نہ ہو سکتی

توائز سے مراد یہ ہے کہ ہر زمانے میں اور ہر جگہ اتنے زیادہ لوگ کبھی بٹ کو بیان کریں جن کے متعلق عقلناً اور عادتاً یہ گمان کرنا ممکن نہ ہو کہ انہوں نے جہوڑ پر اتفاق کر لیا ہوا کا اور وہ بات آن کی آنکھوں دیکھئی یا کانوں سنی ہو۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی امت کا وہ عمل متواتر ہے جو حضور اکرم صل اللہ علیہ وسلم سے شروع ہوا اور آج تک مسلمان اس پر عامل ہیں، گویا وہ سنت جسے امت نے اپنے مسلل اور غیر منقطع عمل میں محفوظ کر لیا۔ اسلامی نظام زندگی کا ایک معتمدہ حصہ توائز ہی کے ذریعے سے ہم تک پہنچتا ہے۔ اور اس ذریعے سے ملنے والی ہدایت ہو پہلوے معتبر ہے۔

اسلامی فلسفہ، حیات

۱۵۴

تھیں۔ اور کچھ اس وجہ سے کہ بعد میں ان مذاہب کے پیروں نے ان میں
لبے شمار تبدیلیاں کر دیں اور اپنی من مانی چیزیں داخل کر دیں۔ ان میں سے کوئی
مذہب اپنی اصل شکل میں محفوظ نہیں، اس بنا پر در حقیقت اسلام موجودہ دنیا
کا واحد الہامی مذہب ہے۔

۲. ایک مکمل ضابطہ زندگی

اس سے پہلے ہم اس بات پر اچھی طرح بعث کرچکے ہیں کہ اسلام کے علاوہ
اکثر نظام ہائے زندگی انتہائی نامکمل اور تشنہ ہیں اور ہر ہی انسان زندگی کا
احاطہ نہیں کرتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انہیں نظام ہائے زندگی یا نظریہ ہائے
حیات کہنا درست نہیں۔ 'نظریہ حیات' اور 'نظام زندگی' کے نام کا مستحق
صرف اسلام ہے، لیکن ہر حال کسی دوسرے بہتر لفظ کی عدم موجودگی میں ہم
انہیں نظریہ ہائے حیات ہی کے نام سے پکارتے ہیں۔

ان سارے نظریہ ہائے حیات کے مقابلے میں اسلام کی سب سے نمایاں اور
امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ زندگی کا نہایت منظم ضابطہ ہے۔ حیات انسان
کا کوئی کوشہ خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، قومی ہو یا بین الاقوامی، معاشی
ہو یا سیاسی، معاشری ہو یا قانونی، اسلام کی هدایات سے محروم نہیں رہا۔ اکثر
اوقات یہ غلط فہمی پہیلانی جاتی ہے کہ مذہب انسان کا شخصی اور انفرادی
معاملہ ہے۔ دوسرے مذاہب کے بارے میں تو یہ بات صحیح ہو سکتی ہے لیکن اسلام
ان معنوں میں مذہب نہیں۔ قرآن میں اس کے لیے 'دین'، ق اصطلاح استعمال کی
گئی ہے جس کے معنی ہیں مکمل ضابطہ، حدایت اور اس اعتبار سے اسلام دو مخفف
نمایاں روزہ تک محدود تر دینا صحیح نہیں۔ اس بات کو اچھی طرح نہ سمجھنے کا
نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بہت سے اچھے بھلے لوگ جو نمایاں روزہ کے پابند ہیں اپنی
زندگی کے دوسرے شعبوں میں اسلام کے نمایاں دو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ قرآن
نے کہا ہے:

لَا يَأْتِيَ الَّذِينَ أَنْوَاهُنَّ لِنَفْلُونَ فِي النِّعَمَ كَافِةً وَلَا يَأْتِيَنَّ بِهِمُوا خَطُوبُ النَّبِيِّنَ

اے اہل ایمان، اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ
اور شیطان کے نقش قدم بر نہ چلو (البقرہ - ۲۰۸)
اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک مسلمان کی زندگی کا ہر رخ خدا کی صرضی کے
طبق ستعین ہوتا ہے اور وہ اپنی زندگی کے ہر دائیرے میں، اپنے سارے افعال و اعمال

لہیں۔ اور اسیں وہ ہے کہ یہ ہی ان مذاہب کے نتیجے میں ہے
کہ مسلمانوں کو دین اپنی میں ملی جوئی داخل کر دیں۔ اسے یہ ہدف کرنے
میں بھاری تدبیریں اور اپنی ملی جوئی داخل کر دیں۔ اسے یہ ہدف کرنے
مذاہب اپنی اصل نسل میں محفوظ رہیں، اسی بنا پر در حقیقت اسلام موجود ہے
کا واحد الہاں مذہب ہے۔

② ایک مکمل فایلہ زندگی

اس سے بھی ہم اس بات پر اچھی طرح بعد کو جگئے ہیں کہ اسلام کے مطابق
اکثر نظام ہائے زندگی انتہائی نامکمل اور نئے ہیں اور یہی انسانی زندگی کا
املاکہ نہیں کرتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انسانی نظام ہائے زندگی یا نظریہ ہائے
حیات کہنا درست نہیں۔ 'نظریہ' حیات اور 'نظام زندگی' کے قلم کا منہج
صرف اسلام ہے، لیکن ہر حال کسی دوسرے بہتر لفظ کی عدم موجودگی میں ہم
انہیں نظریہ ہائے حیات ہی کے نام سے نکالتے ہیں۔

ان سارے نظریہ ہائے حیات کے مطالعے میں اسلام کی سب سے ناجاہد اور
اسنیازی خصوصیت ہے ہے کہ یہ زندگی کا نہایت منظم فایلہ ہے۔ حیات انسان
کا کوئی کوشہ خواہ و اغراقی ہو یا اجتماعی، قومی ہو یا بین الاقوامی، معنوی
ہو یا سیاسی، معاشری ہو یا قانونی، اسلام کی ہدایات سے محروم نہیں رہا۔ اکثر
اوقات یہ خلط فہمی پھیلانے جاتی ہے کہ مذہب انسان کا شخصی اور اغراقی
معاملہ ہے۔ دوسرے مذاہب کے بارے میں تو یہ بات صحیح ہو سکتی ہے لیکن اسلام
ان معنوں میں مذہب نہیں۔ قرآن میں اس کے لیے 'دین' تی اصطلاح استعمال کی
گئی ہے جس کے معنی ہیں مکمل فایلہ ہدایات اور اس اخبار سے اسلام تو خدا
نماز روزہ نگ محدود کر دینا صحیح نہیں۔ اس بات کو اچھی طرح نہ سمجھیے کہ
زندگی کے دوسرے شعبوں میں اسلام کے نماز تو کوئی اعتماد نہیں دیتے۔ قرآن
نے کہا ہے :

لَئِنَّمَا الْمُنْتَهَىٰ إِنَّمَا الْمُنْتَهَىٰ فِي مِنْلَامَةٍ كَلَّا تَنْعَمُوا أَخْطَرُهُ فِي نِعَمٍ

اے اہل ایمان، اسلام میں بوری طرح داخل ہو جلو

اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو (البقرہ۔ ۲۰۸۔)

اس کے معنی ہے ہیں کہ ایک سلطان کی زندگی کا هر رخ خدا کی سرفی کے
طابق متعین ہونا ہے اور وہ اپنی زندگی کے ہر دائرے میں، اپنے سارے افعال و اعمال

پی اور انہے کل معاملات و تعلقات میں خدا کی ہدایت کی ہبڑی کرنے والا ہوتا ہے۔ اس کی خلاف ورزی کو شیطان کی ہبڑی فوار دیا گیا ہے اس لیے نہ بیطان ابتدأ خدا کا پرستار تھا لیکن جب اسے ایک ایسا حکم دیا گیا جو اس کے نفس ہر گروہ گذرا (یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو مسجدہ کونا) تو اس نے انکار کر دیا اور گمراہی کا شکار ہوا۔

۲) ایمان اور نفس کی اصلاح

اسلامی نظریہ، حیات کی تیسرا خصوصیت ایمان ہے، ایمان خدا ہر، بنیاد ہے۔

در حقیقت انسان انہے شعور ہی کی بنا پر جمادات و نباتات اور حیوانات سے سعیز ہے، درختوں کے نشو و ارتقا کا ایک راستہ منعین ہے اور وہ اس سے سُرِسوُ بھی نہیں ہٹ سکتے، دریاؤں کے بہنے کا ایک قانون منعین ہے اور وہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے۔ حیوانات انہی جیلتوں کے تابع ہیں، لیکن ان سب کے برخلاف انسان کو شعور اور ارادہ کی دولت سے نوازا کیا ہے۔

اسلامی نظریہ، حیات انسان کے اس شعور اور آزادی کے اعتراف پر مبنی ہے۔ اس کا نقطہ آغاز ایمان ہے۔ ایمان سے مراد فکر و نظر اور دل و دماغ کی تبدیلی ہے تاکہ انسان کا زاویہ نگاہ اور سوچنے کا انداز بدل جائے اور وہ اپنی ہبڑی زندگی کو خدا کی اطاعت کے ساتھ میں ڈھالنے کے لیے سرگرم ہو جائے۔

خدا کی ہدایت سے ہٹ کر جتنے بھی فلسفے وضع کئے گئے ہیں ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی میں محض خارج کی تبدیلی سے انقلاب لانا چاہتے ہیں اور انسان کے اندروں سے تعریض نہیں کرتے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے فساد خون کا تو علاج نہ کیا جائے اور بھوڑے بھنسیوں پر بھائے لکا لکا کر مرض دلو کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کے برخلاف اسلام بنیاد کی تعمیر پر زیادہ زور دیتا ہے۔ وہ دل و دماغ سے غیر اللہ کی عقیدت و محبت ختم کر کے ایمان کو خدا کے لیے خالص کر لیتا ہے اور بھر جب ایمان ہیدا ہو جاتا ہے اور سوچنے کا انداز اور فکر و نظر کے زاویے بدل جاتے ہیں تو انسان کی ہبڑی شخصیت بدل جاتی ہے۔

بھی وجہ ہے کہ تاریخ، عالم میں سب سے بڑا انقلاب وہ تھا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ایمان کی بنیاد پر برباد ہوا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو ایک نیا ایمان دیا تھا اور پھر یہ ایمان ہی کی انقلابی قوت تھی جس نے زندگی کے ہر شعبے کی مانعیت بدل کر رکھ دی۔ کسی جیرو و استبداد کی ضرورت باق نہ رہی، ہر انسان خود اپنا نگران بن گیا۔ خلوت ہو یا جلوت، دن ہو یا رات، ہر انسان خود اپنا محاسب ہو گیا۔ اسی ایمان کا کرشمہ تھا کہ ہمیں ایک انسان کہتا ہے ”یا رسول اللہ، میں زنا کا مرتب ہوا ہوں۔ مجھے پر حد جاری کیجئے۔“ پہ اسی ایمان کا ثمرہ تھا کہ ایک شخص کو کسری کا تاج ملتا ہے اور وہ اسے گدڑی میں چھپا کر لاتا ہے اور بیت المال میں جمع کرا دیتا ہے۔ اور یہ بھی اسی ایمان ہی کا معجزہ تھا کہ جب امتناع شراب کا حکم کانوں میں ہمچنان ہے تو اسی عرب قوم کے افراد جن کی گھٹشی میں شراب پڑی ہوئی تھی، فوراً شراب پہینک دینے ہیں اور مدینے کی نالیوں میں شراب اس طرح ہہنے لکتی ہے جیسے خارجی ماحول اور تہذیب و تمدن کے نظام ہی کو نہیں بدلنا بلکہ دلوں میں خدا، رسول اور آخرت پر ایمان جا گزیں کر کے دل کو بدلتا ہے تاکہ انسان کی پوری زندگی بدل جائے اور خود اپنے اندر کے تقاضے کے تحت انسان ایک نئی دنیا تعمیر کرے۔

۲- دین و دنیا کی وحدت

اسلامی نظریہ، حیات کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس نے دین و دنیا کی اس مصنوعی علیحدگی کو ختم کر دیا جو مختلف مذاہب میں رائج ہے۔ اکثر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ خدائی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان دنیوی علاقوں سے کنارہ کشی اختیار کرے۔ اکثر مذاہب میں ترکِ دنیا کی تعلیم ملتی ہے۔ لیکن اسلام میں ترکِ دنیا کی بڑی شدت سے مخالفت کی گئی ہے۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہے:

الاسلام من ترك الدنيا كونى مقام نبھي۔ ✓
La Riba'ah fi al-islam

اسلامی نظریہ حیات کی بنیادی خصوصیات

۱۵۵

نہ صرف یہ کہ اسلام میں ترک دنیا کی مساحت ہے بلکہ ان اعمال کو جنہیں عام طور پر دنیاوی اور مادی سمجھا جاتا ہے، مثلاً اکتساب رزق اور فکر کے "جو شخص والدین کے لئے محنت کرتا ہے وہ اللہ کی راہ میں کام کرتا ہے اور جو اہل و عیال کے لئے محنت کرتا ہے وہ بھی اللہ کے لئے کام کرتا ہے اور جو اپنی ذات کو فقر و فاقہ سے بچانے کے لئے کام کرتا ہے وہ بھی اللہ کی راہ میں کام کرتا ہے۔" جو کام اللہ کی مرضی کے مطابق اور اس کی راہ میں میں عبادت ہیں، ان میں مصروف ہونا باعث اجر اور ان سے غفلت برنا پاٹھ عذاب ہے۔

اپنی دنیاوی بہتری سے غفلت برنا اور یہ سمجھنا کہ اس طرح انسان اپنی آخرت سنوار رہا ہے، غلط ہے۔ جن مذاہب نے یہ تعلیم دی ہے ان کے بارے میں صحیح کہا گیا ہے کہ وہ مذاہب عوام کی افیون ہیں۔ اسلام نے اس کے برخلاف حکم دیا ہے کہ

وَلَا تَنْسِ نَوْيِيدَ مِنَ الدُّنْيَا

(اور دنیا سے اپنا حصہ لینا نہ بھولو)
(القصص - ۲۰)

اسلام یہ بتاتا ہے کہ دنیوی زندگی اور آخری زندگی دونوں کی اصلاح ضروری ہے، ان میں سے کسی کو بھی ترک نہیں کیا جاسکتا اور ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اسی لئے مسلمانوں کو جو دعا سکھانی کرنی ہے وہ یہ ہے کہ

رَبَّكَ الْأَنْجَافُ لِلَّذِنَاءَ سَبَقُوا فِي الْأَخْرَى وَسَنَّةٌ وَقَاتَ عَذَابَ النَّارِ

اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بہلانی عطا فرم اور
آخرت میں بھی بہلانی عطا فرم اور ہمیں آگ کے
عذاب سے بچا۔ (البقرہ - ۲۰۱)

اسلام نے جو عمدہ کیا نظام زندگی پیش کیا ہے وہ انسان کی دنیاوی فلاں کا بھی اتنا ہی ضامن ہے جتنا آخری فلاں کا۔ اگر انسان اس دنیاوی زندگی کو

الہامی عدالت کے تحت گذارے تو دنیاوی زندگی کا یہ سنوار آخری زندگی کے سنوار د راستہ ثابت ہوگا۔

(۵) انفرادیت یا اجتماعیت

اسلام کی ابک اور اہم امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اجتماعیت اور انفرادیت کے درمیان بڑا توازن قائم رکھتا ہے۔ وہ ہر انسان کو فردآ فردآ ذمہ دار نہیں کر خدا کے سامنے مسئول بناتا ہے، ان کے بنيادی حقوق کی ضمانت دیتا ہے، ان کی شخصیت کے نشوونما کے موقع فراہم کرتا ہے اور اس خیال کی شدت سے مخالفت کرتا ہے کہ افراد کی شخصیت، اجتماعیت یا ریاست میں گم ہو جائی چاہئے۔

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَلَ ذَرْقَ حَيْدُرِيَّةٍ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَلَ ذَرْقَ شَرْأَيْرَةٍ

بس جس نے ذرہ بھر بھلانی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا
اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔
(الزلزال۔ ۸۔ ۲۸۶)

لَهَا مَا أَسْبَتَ وَعَلَيْهَا مَا كَسَبَتْ

اس کے لمحے (فائدہ مند) وہ ہے جو
اس نے کیا ہے اور وہ (اسی گناہ
کا بوجہ) برداشت کرے گا جس کا
خود اکتساب کیا ہوا (البقرہ۔ ۲۸۶)

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اسلام، افراد میں اجتماعی ذمہ داری کا احساس پیدا کرتا ہے، افراد کو ریاست اور سماج کی شکل میں منظم کرتا ہے اور ان کو حکم دیتا ہے کہ وہ معاشرے کی بھلانی کے لمحے کام کریں۔ رہبانیت یا معاشرے سے الگ تھلک رہنے کو اسلام نے بہت نہیں کیا۔ نماز کے لمحے حکم دیا گیا ہے کہ با جماعت ہوتا کہ مسلمانوں میں سماجی تنظیم (لیپلین) پیدا ہو سکے۔ مالداروں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ زکوٰۃ ادا کریں اور قرآن میں مسلمانوں کی ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ ان کی دولت میں فراً اور مساکین کا بھی حصہ ہوتا ہے (۱۹:۶۱)۔ مسلمانوں ہر فریضہ جہاد عائد کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ضرورت ہٹنے ہر افراد سے اسلام اور اسلامی ریاست کے تحفظ کے لمحے جان کی قربانی بھی طلب کی جاسکتی ہے۔

کلم راع و کلم مسئول عن رعیته تم میں ہے ہر ایک چروائی (کی مانند ہے) اور ہر ایک یہ اس کے گلے کے بارے میں بوجہ گبھہ ہوگ۔

ایک اور حدیث میں ارشاد ہوا کہ "مل جل کر رہو، ایک دوسرے سے بت کشو، دوسروں کے لئے آسانیاں پیدا کرو، مشکلات پیدا نہ کرو۔" ایک اور حدیث میں تبدید کی گئی کہ "و مسلمان نہیں جو اپنا تو پیش بھر لے، لیکن ان کا ہڑوئی بھوکا رہ جائے۔"

مختصرًا اسلام نہ تو فود کو نظر انداز کرتا ہے اور نہ ساج کو، وہ ان دونوں میں توازن اور تناسب قائم کر کے ہر ایک کو اس کا حق دلواتا ہے۔

۶ مکمل توازن

اوپر کے صفحات میں اسلامی نظریہ حیات کی جن خصوصیات کا ہم نے ذکر کیا ہے ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس نظریے کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کے درمیان ایک حسین توازن ہابا جاتا ہے۔ تاریخ کے طالب علم اس بات سے واقف ہیں کہ دنیا میں مفکر، فلسفی اور مصلح تو ہزاروں لاکووں ہوئے ہیں لیکن ان کی تعلیمات میں بک رخا ہن ہے۔ کسی نے روحانی پہلو پر زور دیا ہے تو مادی پہلو کو نظر انداز کر دیا اور کسی نے مادی پہلو پر توجہ صرف کی ہے تو اخلاقی پہلو کو چھوڑ دیا۔ کسی نے معاشیات کو زندگی کی اساس قرار دیا ہے اور کسی نے نفسیات اور جس کو۔ کسی نے دنیا کے ترک کی تعلیم دی ہے اور کسی نے دنیا میں کہو جانے کی۔ غرض انسان جس چیز میں سب سے زیادہ ناکام رہا ہے وہ حقیقی توازن کا قیام ہے۔

نظری حیثیت سے اگر غور کیا جائے تو توازن کا سئنه ہے بھی بڑا نازک اور پیچیدہ۔ انسان میں اتنی جبلتیں اور محركات کا فرما ہیں اور وہ ایک دوسرے سے اس طرح متصادم اور متناقض ہیں کہ وہ ان کے درمیان حقیقی توازن قائم نہیں کر سکتا۔ وحی کی ضرورت خصوصیت سے اس لیے ہے کہ اس کے ذریعہ وہ محدود معلوم ہو جاتی ہیں جن کی بنا پر زندگی کے تمام شعبوں اور اس کے متضاد مطالبوں کے درمیان توازن اور توافق قائم ہو سکتا ہے۔

الله تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

لَقَدْ أَنْذَلْنَا عِبْرَانِيَّا بِالْبَيْتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَمُومَ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِتَقْوِيمَ النَّاسِ بِالْقِسْطِ.

ہم نے اپنے رول واضح نشایاں دے کر بھیجے۔ اور ان کے ساتھ
کتاب (قانون حیات) اور میزان (عدل) نازل کیا تاکہ لوگ
انصار پر قائم رہیں۔ (المدید - ۲۵)

"قط" در اصل انصاف اور توازن کو کہتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ
انسانی معاشرے میں عدل و توازن صرف الہامی ہدایت ہی کے ذریعے سے قائم ہو سکتا
ہے۔ اسلام نے دین اور دنیا کے درمیان توازن قائم کیا ہے اور کسی ایک کو
بھی نظر انداز نہیں کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "میں تو سوتا بھی ہوں اور نماز بھی
پڑھتا ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، عائل زندگی بھی گزارتا
ہوں، پس اللہ سے ڈرو۔ تمہارے نفس کا تم ہر حق ہے، تمہاری آنکھوں کا تم ہر
حق ہے، تمہارے اہل و عیال کا تم ہر حق ہے، تمہارے مهمان کا تم ہر
حق ہے۔ ہر حق اس کے حق دار کو ادا کرو (میری ہدایت یہ ہے کہ) روزہ
بھی رکھو، افطار بھی کرو، نماز بھی پڑھا کرو اور سویا بھی کرو۔"

اس طرح اسلام نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے درمیان حسین ترین توازن
قائم کیا اور ایک طرف فرد کی شخصیت کے نشو و ارتقا کا ہورا سامان کیا تو
دوسری طرف اسے اجتماعی ذمہ داری کے ایک نظام میں منظم کر دیا، زندگی کے
سارے شعبوں کے متعلق مفصل ہدایات دے کر ان تمام شعبوں اور گوشوں کے
درمیان اعتدال اور توازن قائم کر دیا۔ اسلام نے وسائل کے استعمال میں کنجدوسی
اور اسراف دونوں کی سانست کر کے معاشی زندگی میں اعتدال کی روشنی کی۔
اور پوری زندگی کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت دی کہ

خبر الامور اوسطها

هر ایک کام میں اوسط اور درمیانی درجہ
بہت ہی اچھا ہے۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مزید فرمایا کہ اعتدال نبوت کا ایک حصہ ہے۔ یہ امتیاز
صرف اسلامی نظریے کو حاصل ہے کہ اس نے زندگی کے تقاضوں کو ہورا کیا اور ان
میں اعتدال اور توازن قائم کیا تاکہ انسان زندگی اسی تمام وسعتوں کے ساتھ
ترق کر سکے اور کہیں بھی اس میں یک رخاپن اور بے اعتدالی نہ پیدا ہو۔

اسلام ان مذاہب میں سے ہے جن میں صنیعات کا سیرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اس کی تعلیمات سادہ اور قابل عمل ہیں۔ توحید، رسالت اور زندگی بہدیت اس کے بنیادی عقائد ہیں اور عقل و وجود دوں ان کی تائید میں ہیں۔ اسلام میں پیشہ ور ہادریوں کا کوئی گروہ نہیں ہے، اس کی رسوم و عبادات اس درجہ سادہ اور قابل فهم ہیں کہ انہیں ہر شخص سرانجام دے سکتا ہے۔ ہدا اور اس کے بندے کے درمیان کسی واسطے کی ضرورت نہیں ہے، ہر شخص خدا کی کتاب سے براہ راست استفادہ کر کے یہ جان سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے کتنے ہاتھوں کا مطالبہ کیا ہے۔

اسلام اندھی بھری اطاعت کا مطالبہ نہیں کرتا۔ قرآن میں لوگوں کو بار بار اس بات پر ابھارا گیا ہے کہ وہ تفکر اور تعقل کی قوتون کو استعمال کریں۔ مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ خدا سے دعا کریں "رب زدنی علمًا" (اللہ، میرا علم وسیع کو)۔ قرآن میں کہا گیا ہے کہ "وَ لَوْكَ جُو عُقْلَ سے كام نہیں لیتے جانوروں سے بدتر ہیں" (۲۳: ۹)۔ آنحضرت صلعم نے حصول علم کی بڑی تاکید کی ہے۔ مثلاً آپ نے فرمایا کہ "ہر مسلمان پر حصول علم فرض ہے" اور یہ کہ "جو شخص حصول علم کی خاطر گھر سے نکلتا ہے خدا کی راہ میں چلتا ہے۔" انسی تعلیمات کا نتیجہ تھا کہ عرب جو حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل جاہل اور وحشی تھے، دیکھتے ہی دیکھتے عام اور تہذیب کے علم بردار بن گئے۔ ان علوم میں بے شمار وہ ہیں جو محض کتاب اللہ کے رہین منت ہیں، مثال کے طور پر قرآن کی تفسیر کے ساتھ ساتھ علم لفت اور بلاغت اور اعجاز القرآن پیدا ہوا۔ قرآن میں جن مقامات کا ذکر ہوا ہے ان کی تفہیش کے مسلسلے میں علم بغرافیہ کو ترق ہوئی۔ قرآن میں بے شمار تاریخی واقعات کا ذکر ہے، جن کی تحقیق کی وجہ سے علم تاریخ کا چرچا ہوا۔ اسی طرح منطق، بلاغت، فقہ وغیرہ کے علوم کو بڑی ترق ہوئی۔ غرض: دیکھتے ہی دیکھتے مسلمانوں نے قرآن سے فیض حاصل کرتے ہوئے علوم و فنون کی تاریخ میں ایک نیا باب کھول دیا اور سب سے بڑھ کر دنیا کو استقرائی طریقے سے روشناس کیا، یہی وجہ ہے کہ اس دور میں جسے یورپ کی تاریخ میں تاریک دور کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے علم و تہذیب

کی شعین صرف مسلمانوں کی وجہ سے روشن رہیں ۔^۱

۸۔ ثبات اور تغیر

اسلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ثبات اور تغیر کے درمیان کامل توازن قائم کیا گیا ہے۔ انسانوں نے آج تک بے شمار فلسفے وضع کئے ہیں لیکن کوئی فلسفہ بھی ایسا نظام فکر و عمل پیش نہ کر سکا جو ایسے اصول معاشرہ پیش کرے جو دائی اور ابدی ہوں اور دوسری طرف انسانی معاشرے کی بدلتی ہوئی ضروریات کو بھی پورا کرنے ہوں۔ انسان کے لیے محض اپنی فکر اور تعبیر کی بنا پر ایسے اصول پیش کرنا ممکن بھی نہیں؛ زبان و مکان کی جو معیوروں انسان کو لاحق ہیں ان کی بنا پر وہ اس کے لیے نااہل ہے۔ یہ اسلامی نظریہ حیات کی خصوصیت ہے کہ جہاں وہ ایک طرف زندگی کے ابدی اصول پیش کرتا ہے وہی انسان معاشرے میں جو فطری تغیرات آتے رہتے ہیں ان سے پیش آمد سائل کا حل بھی فراہم کر دیتا ہے۔

قرآن اور سنت کے دیے ہوئے اصول ابدی ہیں، پوری انسانیت بھی متنہ طور پر ان میں کوئی تبدلی کونا چاہے تر نہیں کر سکتی اس لیے کہ یہ ہدایت خالق کی طرف سے ہے:

لَا تَبُدِّلُ لِكَلْمَاتِ اللَّهِ

اَللّٰهُ کی باتوں میں تبدیل نہیں ہوتی۔ (یونس : ۶۳)

وَلَنْ يَمْدُدُ لَكُلْمَاتَ اللَّهِ تَبَدِّيلًا

تم خدا کی سنت میں تبدیل نہ پاوے۔ (الاحزاب : ۶۲)

یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظریہ "حیات ابدی صداقت کا حامل ہے اور ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی بدلتی ہوئی ضروریات کا کیسے ساتھ دے؟ اس کا جواب مختصر یہ ہے:

(۱) اسلام نے وہ بنیادی اور اساسی اصول دیے ہیں جو ہر زمانے کے انسانی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ مطابق ہیں لہذا جب تک خود نہیں۔ اس دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ کچھ ضوابط کے ماتحت ہے اور

۱۔ ملاحظہ ہو، رابرٹ بریفائل کی کتاب *The Making of Humanity* - اس کتاب کا ترجمہ مجلس ترقی ادب لاہور نے "تشکیل انسانیت" کے نام سے شائع کیا ہے۔

نہ بیوں کے عروج و زوال اور ماہ و سال کی آمد و رفت کے باوجود حیات انسان کی بنیادی حقیقتیں ایک ہی ہیں۔ ان میں کوئی تبدیل نہیں ہو رہی ہے اور چون کہ اسلام انہی بنیادی اصولوں کے مطابق ہے لہذا اس کے قوانین میں کسی تبدیلی کا موال پیدا نہیں ہوتا۔

(ب) لیکن یہ اصول صرف انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بنیادیں فراهم کرنے ہیں اور آن اساسی اداروں کو قائم کرنے ہیں جن پر زمان و مکان کے تغیرات کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ رہیں وہ چیزیں جن کا تعلق وقت، موسم اور مقامی حالات وغیرہ سے ہے ان سے یہ تعریض نہیں کرتے، اور ہر زمانے کے لوگوں کو شریعت کی مجموعی تعلیمات کی روشنی میں تفصیلات طے کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ مثلاً کے طور پر اسلام نے لباس میں سپر کا تعین کر دیا ہے، کفار کے لباس سے کھلی مشابہت کی مساعت کر دی ہے، اسراف سے منع کیا ہے اور چند دیگر حدود مقرر کر دی ہیں۔ اب ان حدود کی روشنی میں ہر زمانے اور ہر ملک کے لوگ حسب پسند لباس اختیار کر سکتے ہیں۔ اسی طرح معاشرت، معیشت اور سیاست میں بھی بنیادی اصول اور اساسی ادارے قائم کرنے کے بعد شریعت مسلمانوں کو آزاد چھوڑ دیتی ہے کہ پیش آنے والے سائل کو اسلام کی مجموعی ہدایت کی روشنی میں اپنے اجتہاد سے طے کریں۔

(ج) اسلامی نظریہ، حیات کی اصل دلچسپی انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے ہے۔ قرآن انسان کی عواید کے لیے آیا ہے، طبیعتیات و کیمیا کے سائل بیان کرنے کے لیے نہیں آیا۔ بھی وجہ ہے کہ اسلامی نظریہ، حیات علوم طبیعی کے سائل سے تعریض نہیں کرتا اور انہیں انسان کے تجربے اور مشاہدے پر چھوڑ دیتا ہے۔ جہاں کہیں اس قسم کا کوئی ذکر ہوا ہے وہ تذکیر اور موعظت کے لیے ہے نہ کہ کسی طبیعی اصول کو فی نفسه بیان کرنے کے لیے۔ اسلامی نظریہ، حیات کے اس طرز فکر نے مذہب اور سائنس کے درمیان اس قسم کے تصادم کے اسکانات ہمیشہ کے لیے ختم کر دیے ہیں جو یورپ میں رونما ہوا تھا۔

مندرجہ بالا بحث سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام میں ثبات اور تغیر کے تقاضوں کو کس منابت اور خوبی سے پورا کیا گیا ہے، اور اسی بنا پر یہ نظریہ، حیات صردا بام سے بالاتر ہے۔

۹۔ اصلاحی اور انقلابی تعریک

اسلامی نظریہ، حیات مغض ایک نظری اور فلسفیانہ نظام نہیں ہے جو اسلام قبول کرنے والوں کے صرف ذہنوں میں رہے بلکہ ایک اصلاحی اور انقلابی تعریک بھی ہے جس کا مطالبہ یہ ہے کہ اسے دنیا میں رائج کیا جانے اور غلبہ اور اقتدار خدا کے دین کو حاصل ہو:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولًا إِلَيْهِمْ وَمَنْ يُعَظِّمُهُ عَلَى الْأَرْضِ فَإِنَّهُ مُكْفِرٌ كَمَا كَفَرُوا

وہی (یاک ذات) تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اسے تمام دیگر ادیان پر غلبہ عطا کرے خواہ یہ شرکیں کو (کتنا می) ناگوار کیوں نہ گذرے۔ (الصف ۹۰)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے مغض ایک پیغام پیش کر دیا ہے
ہر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نظام کو قائم کرنے کے لیے، جس کے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم)
داعی تھے، مسلمانوں کو ایک اجتماعی زندگی میں منظم کیا، خود ان کی زندگیوں میں
یہ دین قائم کیا اور ان ہر یہ فرضیہ عابد کیا کہ پوری دنیا میں اس دین کو
قائم کریں۔ امت مسلمہ کا یہی فرضیہ ہے جسے قرآن نے امر بالمعروف و نهى
عن المنکر (نیکیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا) کے نام سے موسوم کیا ہے:

كُنْتُ خَيْرَ أُنْبَيَةٍ أَخْرَجْتُ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَايُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ

جتنی امتیں (یعنی قومیں) لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو کہ
تباک کام کرنے کا حکم دیتے ہو اور بڑے کاموں سے بخ کرنے ہو اور افہم ہو
ایمان رکھتے ہو۔ (آل عمران - ۱۱۰)

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی نظریہ، حیات اپنے قیام کے لیے ایک نظام
بھی ترتیب دیتا ہے اور اس طرح ایک ایسی اجتماعی ہیئت قائم کرتا ہے جو ایک
طرف اس کے سماجی پروگرام کی تنقید کرے اور دوسری طرف پوری انسانیت کے
سامنے اس کی دعوت کو پیش کرے۔ اسلامی تعریک ایک تبلیغی اور تعلیمی
ادارہ ہے اور جو ریاست اور نظم یہ قائم کرتا ہے وہ بھی اصلاح معلم اور داعی
الی الحق کے فرائض انعام دیتا ہے۔

اس طرح اسلام مغض ایک مذہب نہیں بلکہ ایک اصلاحی اور انقلابی
تعریک ہے جو نیکیوں کو قائم کرنے اور بدی کو روکنے کی جدوجہد کرتی ہے
اور خدا کی زین پر سے ظلم، ناجائز انتفاع، جبر و تشدد اور فحاشی و گمراہی کو

باکد ملکن حیات کو اچھائیوں سے بھر دیتی ہے اور ایک ایسا نظام قائم کرنے
میں جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے المفاظ میں، زمین اور خزانے آگلے دبئی
اور آسمان اپنی برکتیں بوسانے لکھتا ہے۔

هزیلہ مطالعے کے لیے

علاء محمد اقبال، حرف الbal - لاہور۔

مولانا سید سلیمان ندوی، خطبات مدرس۔ دارالصنفین، اعظم گڑھ۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، انسانی دنیا ہر مسلمانوں کے ہروج و زوال کا انر۔
مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ۔

خوشیدہ احمد (مرتب)، چراغ راہ، "نظریہ پاکستان نہب" (حصہ اول)۔ مکتبہ چراغ راہ،
یوسف منزل، ہرمزجی روڈ، کراچی۔

Muhammad Asad, Islam at the Crossroad, Chapters I and II.



N

اسلام کے بنیادی عقائد

* انسان کے تمام افعال، اعمال اور حرکات کا محور اس کے خیالات ہیں۔ بھی اس کو بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ یہ عام خیالات درحقیقت اس کے چند بخشنہ غیر متزلزل اور غیر مشکوک اصولی خیالات پر مبنی ہوتے ہیں۔ انہی اصولی خیالات کو 'عقائد' کہتے ہیں۔ یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے اور اس کے دائرة حیات کا ہر خط اسی پر جا کر ختم ہوتا ہے۔ ہمارے تمام افعال اور حرکات ہمارے ارادے کے تابع ہیں۔ ہمارے ارادے کے محرک ہمارے خیالات اور جذبات ہیں، اور ہمارے خیالات اور جذبات پر ہمارے اندروفی عقائد حکومت کرنے ہیں۔ عام بول چال میں انہی چیزوں کی تعبیر ہم "دل" یا "قلب" کے الفاظ سے کرتے ہیں۔ اسلام کے علم نے بتایا کہ انسان کے تمام اعضا میں اس کا دل ہی نیکی اور بدی کا گھر ہے۔ فرمایا:

انسان کے بدن میں گوشت کا ایک نکڑا ہے
جو اگر درست ہے تو تمام بدن درست ہے اور
اگر وہ بگڑ گیا تو تمام بدن بگڑ گیا۔ داد!

الاوان في الجسد مضغة اذا صاحت
صلح الجسد كله و اذا فسدت فسد
الجسد كله الا وهي القلب (بخاري)
و نکڑا دل ہے۔

ہمارے اعمال کا ہر محرک، ہمارے اسی دل کا ارادہ اور نیت ہے۔ اسی بیان کی طاقت سے اس میں کا ہر پرزو چلتا اور حرکت کرتا ہے اسی لیے

* یہ حصہ مولانا سید سلیمان ندوی رحوم کی کتاب "سیرت النبی"، جلد چہارم، سے مانوذ ہے (مرتب)

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :
بپا اکدم میں الاعمال بالنیات (بخاری)

تمام کاموں کا مدار نیت پر ہے ۔

ایسا بات کو دوسرے الفاظ میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس طرح فرمایا :

هر شخص کے کام کا ثمر وہی ہے جس کی وہ نیت کرے ، تو جس کی
ہجرت کی غرض دنیا کا حصول یا کسی عورت سے نکاح کرنا ہے تو اس
کی هجرت اسی کے لیے ہے جس کے لیے اس نے هجرت کی (یعنی اس
کے نواب حاصل نہ ہوگا) ۔

(بخاری)

اج کل علم نفسیات نے اس مسئلے کو بداہتا ثابت کر دیا ہے کہ
انسان کی عمل اصلاح کے لیے اس کی قلبی اور دماغی اصلاح مقدم ہے اور انسان
کے دل اور ارادے پر کوف چیز حکمران ہے تو وہ اس کا عقیدہ ہے ۔ صحیح اور
صالح عمل کے لیے ضروری یہ ہے کہ چند صحیح اصول و مقدمات کا ہم اس طرح
نہوں کریں کہ وہ دل کا خیر مشکوک یقین اور غیر متزلزل عقیدہ بن جائیں اور
اسی صحیح یقین اور مستحکم عقیدے کے تحت ہم تمام کام انجام دیں ۔

جس طرح اقلیدمن کی کوفی مکمل چند اصول موضعہ اور اصول متعارفہ کے
ماںے بغیر نہیں بن سکتی ، اور نہ ثابت ہو سکتی ہے ، اسی طرح انسان کا کوفی
عمل صحیح اور درست نہیں ہو سکتا جب تک اس کے لیے بھی چند مبادی اور چند
امول موضعہ عدم پہلے سے تسلیم نہ کریں ۔

بہ ظاہر عقل ہمارے ہر کام کی رہنمای نظر آئی ہے ۔ لیکن ہماری عقل بھی
آزاد نہیں ، وہ ہمارے دلی یقین ، ذہنی رجحانات اور اندروفن جذبات کی زنجروں میں
بکڑی ہوئی ہے ۔ اس لیے اس پابھے زنجیر عقل کے ذریعے ہم اپنے دلی خیالات ،
ذہنی رجحانات اور اندروفن جذبات پر قابو نہیں پاسکتے ۔ اگر پاسکتے ہیں تو انہے
صحیح دلی یقینیات اور چند مضبوط دماغی و ذہنی تصورات کے ذریعے ۔ یہی وجہ
ہے کہ قرآن پاک نے ایمان کا ذکر ہمیشہ 'عمل' صالح ' کے ذکر سے پہلے
لazmi طور پر کیا ہے اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کے قابل نہیں سمجھا
ہے کیون کہ ایمان کے عدم سے دل کے ارادے اور خصوصاً اس مخلصانہ ارادے کا

بھی عدم ہو جاتا ہے جس پر حسن عمل کا دار و مدار ہے ۔

قرآن پاک نے ان لوگوں کے کاموں کی مثال جو ایمان سے معروف ہیں اور ان کا
راکھے دی ہے جس کو ہوا کے جھونکے ازا ازا کرنا کر دیتے ہیں اور ان کا

کوئی وجود نہیں رہتا۔ اس طرح اس شخص کے کام بھی جو ایمان سے محروم ہے،
بے بنیاد اور بے اصل ہیں:

**مَثُلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرِبِّهِمْ أَعْنَالُهُمْ كَرِمَةٌ إِلَتَّهُدُتْ بِهِ النَّجْمُونَ يَوْمَ هُمْ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ
ذَلِكَ هُوَ الظَّلَلُ الْبَعِيدُ@**

جنہوں نے اپنے پروار دگار کا انکار کیا ان کے کاموں کی مثال را کہہ کر ہے جس پر
آنہی والی دن زور کی ہوا چل۔ وہ اپنے کاموں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔
یہی سب سے بڑی گمراہی ہے۔ (ابراهیم - ۱۸)

الغرض ایمان کے بغیر عمل کی بنیاد کسی بلند اور صحیح تخیل پر قائم نہیں
ہو سکتی۔ اسی لیے ریا، نمائش اور خود غرضی کے کاموں کو کوئی عزت نہیں
دی جا سکتی۔ وہ کام جو گو بہ ظاہر نیک ہوں لیکن نیک کرنے والی کام سے
اصلی مقصد نام و نمود پیدا کرنا ہو تو اخلاق نقطہ نظر سے تمام دنیا ان کو
بے وقت اور ہیچ سمجھتی ہے۔

اسلام میں عقیدہ کا مقام

پس ایمان ہمارے تمام اعمال کی اساس ہے، جس کے بغیر ہر عمل بے بنیاد
ہے اور ہماری سیرابی کا اصل سرچشمہ ہے جس کے فقدان سے ہمارے کاموں کی
حقیقت سراب سے زیادہ نہیں رہتی کیوں کہ وہ دیکھنے میں تو کام کے معلوم ہونے
عین مگر روحانی اثر و فائدہ سے خالی اور بے نتیجہ ہونے ہیں۔ خدا کے وجود کا
اقرار اور اس کی رضامندی کا حصول، ہمارے اعمال کی غرض و غایات ہیں۔ یہ
نہ ہو تو ہمارے تمام کام بے نظام اور بے مقصد ہو کر رہ جائیں۔ وہ ہمارے دل کا
نور ہے۔ وہ نہ ہو تہ پوری زندگی تیرہ و تاریک ہو جائے اور ہمارے تمام کاموں
کی بنیاد ریا، نمائش، جاہ پسندی، خود غرضی اور شہرت طلبی وغیرہ کے دلی جذبات
اور پست حرکات کے سرا کچھ اور نہ رہ جائے۔

تورات میں عقیدوں کا ذکر ہے۔ مگر ایمان کی حقیقت اور اس کی اہمیت کی
تعلیم سے وہ خالی ہے۔ انجیل میں ایمان کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ مگر اخلاق
کی سچائی، اعمال کی راستی اور دل کے اخلاص کے لیے نہیں، بلکہ معجزوں اور
کرامتوں کے ظاہر کرنے کے لیے اور خوارق عادت پر قدرت اور اختیار پانے کے لیے۔
اس نے برخلاف فلسفہ یونان کے بہت سے پیروؤں اور ہندوستان کے بہت سے

اسلام کے بنیادی عقائد

۱۶۷

بہبوب نے مخصوص ذہنی جولانی، مراقبہ، تصور، دھیان اور علم کو انسان کی نیجات کا ذریعہ قرار دیا اور اخلاق و عمل سے کوئی تعریض نہیں کیا۔ عیسائیوں، زرتشتیوں اور برهمنوں نے عقائد کو وسعت دی اور ان کی ایسی تفعیل کی کہ وہ بتاتا ہا خیالی فلسفہ بن گئے جس سے تصور عملیت پر غالب آگیا اور انسانوں کے قوانین عمل سرد ہو گئے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے علم و عمل، تصور و فعل، مذہب اور عملیت کو ایک دوسرے کا نتیجہ اور باہم ناگزیر قرار دیا۔ مگر اصلی قرار دیا جو دل کی اصلاح اور عمل کی بنیاد، اخلاق و عبادات کی اساس قرار ہا سکے۔ عقائد کے فلسفیانہ الجھاؤ اور تصورات و نظریات کی تشریح و تفصیل کر کے عملیت کو برباد نہیں کیا، چند سیدھے سادے اصول، جو تمام ذہنی سچائیوں اور واقعی حقیقتوں کا جوہر اور خلاصہ ہیں، ان کا نام عقیدہ، اور ان پر یقین کرنے کا نام ایمان رکھا۔

اسلامی عقائد

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے صریح الفاظ میں عقائد کے پانچ اصول تلقین کئے۔ خدا پر ایمان، خدا کے فرشتوں پر ایمان، خدا کے رسولوں پر ایمان، خدا کی کتابوں پر ایمان اور اعمال کی جزا اور سزا کے دن پر ایمان۔ یہ تمام وہ حقائق ہیں جن پر دل سے یقین کرنا اور زبان سے اقرار کرنا ضروری ہے۔ ان کے بغیر خالص عمل کا وجود نہیں ہو سکتا۔

(۱) اللہ تعالیٰ پر ایمان کہ، وہ اس دنیا کا تنہا خالق و مالک ہے اور ہر ظاہر و باطن سے آگاہ ہے تاکہ وعی عمارے کاموں کا قبلہ اور مقصد قرار ہا سکے اور اسی کی رنما جوئی اور اسی کی مرضی کی تعمیل ہمارے اعمال کی تنہا غرض و عایت ہو اور ہم جلوٹ ہی میں نہیں، خلوٹ میں بھی گناہوں اور برائیوں سے بچ سکیں۔ اور نیکی کو اس لیے اختیار کریں اور برائی سے اس لیے بچیں کہ بھی ہمارے حالی کا حدم نے اور یہی اس کی مرضی ہے؛ اس طرح ہمارے اعمال ناہاک اغراض اور ناجائز خواہشوں سے ہاک و صاف ہو کر خالص ہو سکیں اور جس طرح ہمارے جسمانی اعضاء گناہوں سے ہاک ہوں، ہمارا دل بھی ناہاک

خیالات اور ہوا و ہوس کی آمیزش سے ہاک ہو، اور اس کے احکام اور اس کے پیغام کی سچائی پر دل سے ابسا یقین ہو کہ ہمارے ناپاک جذبات، ہمارے غلط استدلالات اور ہماری گمراہ خواہشات بھی اس یقین میں شک اور تذبذب ہیدا نہ کرسکیں۔

(۲) خدا کے رسولوں پر ایمان لانا ضروری ہے کہ خدا کے ان احکام اور ہدایات اور اس کی صفات کا علم ان ہی کے واسطے سے انسانوں کو پہنچا ہے۔ اگر ان کی صفات، سچائی اور راست بازی کو کوئی تسلیم نہ کرے تو ہیغام ربیانی اور احکام الہی کی صفات اور سچائی بھی مشکوک و مشتبہ ہو جائے گی اور انسانوں کے سامنے نیک اور معصومیت کا کوئی ایسا نمونہ موجود نہ رہے کا جو انسانوں کے قوانینے عملی کی تحریک کا باعث بن سکے۔ پھر اچھے اور صحیح اور غلط کاموں کے درمیان ہماری عقل کے سوا، جو ہمارے جذبات کی حکوم ہے، کوئی اور چیز ہمارے سامنے ہماری رہنمائی کے لیے نہیں ہوگی۔

(۳) خدا کے فرشتوں پر بھی ایمان لانا واجب ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولوں کے درمیان قاصد اور سفیر ہیں، مادیت اور روحانیت کے مابین واسطہ ہیں، مخلوقات کو قانون الہی کے مطابق چلاتے ہیں، اور ہمارے اعمال و افعال کے ایک ایک حرف کو ہر دم اور ہر لمحہ نقل کرنے جاتے ہیں تاکہ ہم کو اچھا یا برا بدله مل سکے۔

(۴) خدا کے احکام و ہدایات جو رسولوں کے ذریعے انسانوں کو پہنچائے گئے ان کو دور دزار سلکوں اور آئندہ نسلوں تک ہمجنانے کے لیے ضروری ہوا کہ وہ تحریری شکلوں یعنی کتابوں اور صحیفوں میں یا لفظ و آواز سے مرکب ہو کر ہمارے سینوں میں محفوظ رہیں۔ اس لیے خدا کی کتابوں اور صحیفوں کی صفات پر اور جو کچھ ان میں ہے اس کی سچائی پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ورنہ رسولوں کے اور خدا کے احکام اور ہدایتوں کو جانتے کا کوئی ذریعہ نہ رہے اور ہمارے لیے نیک و بدی کی تمیز کا کوئی ایسا معیار باقی نہ رہے جس پر تمام ادنیٰ و اعلیٰ، جاہل و عالم، بادشاہ اور رعایا سب متفق ہو سکیں۔

(۵) اعمال کی باز پرسی جو ادھی کا خطرو نہ ہو، اور اس کے مطابق جزا و سزا کا خیال نہ ہو تو دنیاوی قوانین کے باوجود دنیا میں انسانیت سراپا درندگی اور بھیگیت بن جائے۔ بھی وہ عقیدہ ہے جو انسانوں کو جلوٹ و خلوٹ میں

اسلام کے بنیادی عقائد

۱۶۹

ان کی ذمہ داری محسوس کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ روز جزا اور یوم آخرت ایمان رکھنے بغير انسانیت کی صلاح و فلاح ناممکن ہے۔ اسی ایسے محمد رسول اللہ ﷺ کی تلقین اور تبلیغ پر مشتمل ہے۔ بلکہ سکی وحی کا بیشتر

بھی پانچ باتیں اسلام کے ایمانیات کے اصلی عناصر ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ پر، ان کے تمام رسولوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے فرشتوں پر اور روز جزا پر ایمان لانا۔

بنیادی ایمانیات — عقل کی کسوٹی پر

اوہر کے صفحات میں جن پانچ بنیادی عقائد کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب امور غیب کی قبیل سے ہیں اور عالم آب و سکل سے ساواڑا۔ اس لیے یہ مذہبی و روحانی ایمانیات ہیں۔ لیکن ان کی خصوصیت یہ ہے کہ اسلام نے ان ہر اپنے روحانی نظام ہی کی نہیں بلکہ اخلاق و سیاسی اور تمدنی نظام کی بنیاد بھی رکھنی ہے۔ اس نے دین و دنیا دونوں کو ملا کر ایک ایسا نظام وضع کیا ہے جس کے تحت انسانی زندگی کے تمام شعبے حرکت کرتے ہیں۔ اس نظام کو اپنے قیام و بقا اور اپنے تصرفات کے لیے جتنی طاقت کی ضرورت ہے وہ سب انسی پانچوں ایمانیات یہ حاصل ہوتی ہے۔ یہ اس کے ایسے قوت کا ایک لا متناہی سرچشمہ ہیں جس کی رسید کبھی بند نہیں ہوتی۔

اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ جن ایمانیات سے اتنا بڑا کام لیا گیا ہے وہ عملی حدیثت سے کیا پایہ رکھتے ہیں؟ اور ان میں ایک عمدہ گیر اور ترق پذیر نظام کے لیے اساس اور منبع قوت بننے کی صلاحیت کہاں تک موجود ہے؟

اس سوال کی تحقیق میں قدم آگئے بڑھانے سے بہلے ہم کو یہ بات ذہن نشین کر لہنی چاہیے کہ اسلام ایک ایسی تہذیب کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے جو صحیع ممنون میں انسانی تہذیب ہو۔ یعنی اس کا تعلق کسی خاص ملک یا نسل کے لوگوں سے نہ ہو، نہ کوئی مخصوص رنگ رکھنے والی یا مخصوص زبان بولنے والی قوم اس کے ساتھ اختصاص رکھتی ہو، بلکہ تمام نوع انسانی کی فلاج اس کا

^۹ یہ حصہ مولانا مودودی کی کتاب "امالی ثہذیب اور اس کے اصول و مبادی" سے مانعوذ ہے۔ (مرتب)

معنود ہو، اور اس کے زیر اثر ایک ایسا نظام اجتماعی قائم ہو سکے جس میں ہر اس چیز کو پروان چڑھا بانا جائے جو انسان کے لیے بہ حیثیت انسان ہونے کے خیر و صلاح ہے اور ہر اس چیز کو مٹایا جائے جو اس کے لیے ہر اور فساد ہے۔ ایک ایسی خالص انسانی تہذیب کی بنیاد ان ایمانیات پر نہیں رکھی جا سکتی جو عین عالم، آب و گل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ مادیات اور محسوسات دو حال سے خالی نہیں ہیں۔ یا تو وہ ایسے ہیں جن کے ساتھ تمام انسانوں کا تعلق یکسان ہے، مثلاً سورج، چاند، زمین، ہوا، روشنی وغیرہ، یا ایسے ہیں جن کے ساتھ تمام انسانوں کا تعلق یکسان نہیں ہے، مثلاً وطن، نسل، رنگ، زبان وغیرہ۔ پہلی قسم کی چیزوں میں تو 'ایمانیات' بنتے کی صلاحیت ہی نہیں ہے کیونکہ ان کے نفس وجود پر ایمان لانا تو محض بے معنی ہے اور ان پر اس حیثیت سے ایمان لانا کہ وہ انسان کی صلاح میں کوئی اختیاری تاثیر رکھتے ہیں از روئے علم و عقل غلط ہے۔ علاوه بریں ان پر کسی حیثیت سے بھی ایمان لانے کا کوئی نفع انسان کی روحانی، اخلاقی اور عملی زندگی میں مترتب نہیں ہوتا۔ رہیں دوسری قسم کی چیزوں کیونکہ وہ بنائے تفرقی و تقسیم ہیں نہ کہ بنائے جمع و تالہف۔ لہذا یہ قطعاً ناگزیر ہے کہ اس قسم کی تہذیب کی بنیاد ایسے ایمانیات پر رکھی جائے جو مادیت و محسوسات سے ماؤرا^۲ ہوں۔

لیکن ان کا محض مادیات و محسوسات سے ماؤرا^۳ ہونا ہی کافی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ضرورت ہے کہ ان میں چند اور خصوصیات بھی پائی جائیں:

(۱) وہ خرافات اور اوہام نہ ہوں بلکہ ایسے امور ہوں جن کی تصدیق ہر عقل سلیم مائنل ہو سکتی ہو۔

(۲) وہ دور از کار باتیں نہ ہوں بلکہ ہماری زندگی سے ان کا گھبرا تعلق ہو۔

(۳) ان میں ایسی معنوی قوت ہو جس سے تہذیب کا نظام انسان کے قوانین فکر و عمل پر تسلط قائم کرنے میں پوری طرح مدد حاصل کرسکے۔ اس لحاظ سے جب ہم اسلام کے ایمانیات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان تینوں آزمائشوں میں پورے اترتے ہیں۔

اولاً، اسلام نے خدا، ملائکہ، وحی، رسالت، اور بوم آخر کا جو تصور پیش کیا ہے اس میں کوئی استحالہ^۴ نہیں ہے جس کا صحیح ہونا غیر ممکن

اسلام کے بنیادی عقائد

۱۴۱

ہو، نہ کوئی ایسی بات ہے جس کو ماننے سے عقل سالم انکار کریں ہو۔ اس میں بھی نہیں کہ محض عقل ان کا احاطہ نہیں کر سکتی لیکن ہمارے اہل علم و حکمت نے اب تک جتنے معدادات و مفارقات کی تصدیق کی ہے ان سب کا یہی حال ہے۔ توانائی حیات، جذب و کشش، نشو و ارتقا ایسے ہی دوسرے امور کی تصدیق ہم نے اس بنا پر نہیں کی ہے کہ ہم ان حقیقتوں کو پوری طرح سمجھو چکے ہیں، بلکہ اس بنا پر کی ہے کہ ہم نے جن مختلف قسم کے مخصوص آثار کا شاهدہ کیا ہے ان کی توجیہ و تعلیل کے لیے ہمارے نزدیک ان امور کا موجود ہونا ضروری ہے اور ظواہر اشیا کے باطنی نظام کے متعلق جو نظریات ہم نے قائم کیے ہیں وہ ان امور کے موجود ہونے کا انتظام کرتے ہیں۔ پس اسلام جن معدادات پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے ان کی تصدیق کے لیے بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ ہماری عقل ان کی حقیقتوں کو پوری طرح سمجھ لے اور ان کا احاطہ کر لے بلکہ اس کے لیے عقلی طور پر صرف اتنا سمجھو لینا کافی ہے کہ کائنات اور انسان کے متعلق جو نظریہ اسلام نے پیش کیا ہے، وہ خلافِ عقل نہیں ہے، اس کا صحیح ہونا اغلب ہے اور وہ ان پانچوں امور کے وجود کا مقتضی ہے جو اسلام نے ایمانیات کے طور پر پیش کئے ہیں۔

اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ (۱) کائنات کا نظم ایک قادر مطلق ہستی کا قائم کیا ہوا ہے اور وہی اس کو چلا رہی ہے۔ (۲) اس قادر مطلق ہستی کے مانع ہے شمار دوسری ہستیاں ہیں جو اس وسیع کائنات کی تدبیر میں اس کے احکام کو نافذ کر رہی ہیں۔ (۳) انسان کے وجود میں اس کے خالق نے خیر و شر دونوں کے میلانات رکھے ہیں۔ دانائی اور نادانی، علم و جہل دونوں کا اس کے اندر اجتماع ہے۔ غلط اور صحیح دونوں طرح کے راستوں پر وہ چل سکتا ہے۔ ان مستضاد قوتوں اور مخالف میلانات میں سے جس کا غلبہ ہوتا ہے، اس کی پیروی کرنے لگتا ہے۔ (۴) اس تنازع خیر و شر میں خیر کی قوتوں کو مدد پہنچانے اور انسان کو سیدھی راہ دکھانے کے لیے اس کے خالق نے خود بنی نوع انسان ہی میں سے چند بہتر ادمیوں کا انتخاب کیا ہے اور ان کو علم صحیح عطا کر کے لوگوں کی ہدایت پر مامور کیا۔ (۵) انسان کوئی غیر ذمہ دار اور غیر سٹول ہستی نہیں ہے۔ وہ اپنے تمام اختیاری اعمال کے لیے اپنے خالق کے سامنے جواب دے ہے۔ ایک دن اس کو ذرہ ذرہ کا حساب دینا ہوگا۔ اور اپنے اعمال کے اجرے یا برے نتائج دیکھنے ہوں گے۔

بے نظریہ خدا، ملانکہ، وحی، رسالت، یوم آخر، پانچوں امور کے وجود کا مقتضی ہے۔ اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو عقلًا محال ہو۔ نہ اس کی کسی چیز کو وہمیات و خرافات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ برعکس اس کے مام پر جس قدر زیادہ غور کرنے ہیں اسی قدر اس کی تصدیق کی جانب ہمارا سیلوں بڑھتا جاتا ہے۔

خدا کی حقیقت خواہ ہماری سمجھہ میں نہ آئے مگر اس کا وجود تسلیم کر کر بغیر چارہ نہیں۔ یہ ایک ایسی ضرورت ہے جس کے بغیر کائنات کا معنہ کسی طرح حل نہیں ہوتا۔

ملانکہ کے وجود کی دلیل ہے متعین نہیں کرسکتے مگر ان کے نفس و وجود میں شک کی گنجائش نہیں ہے۔ تمام اہل علم و حکمت نے ان کی ہستی کو کسی نہ کسی طور پر تسلیم کیا ہے، اگرچہ وہ ان کو اس نام سے یاد نہیں کرنے جس سے قرآن انہیں سوسم کرتا ہے۔

قیامت کا آنا اور ایک نہ ایک دن دنیا کے نظام کا درہم برم ہو جانا عقل فیاسات کی رو سے اغلب بلکہ قریب بہ یقین ہے۔

انسان کا اپنے خدا کے آگے جواب دہونا اور اس کا اپنے اعمال کے لیے مستوجب جزا و سزا ہونا خواہ کسی قطعی دلیل سے ثابت نہ کیا جاسکے، مگر عقل سليم اس حد تک تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ انسان کی موت اور موت کے بعد کی حالت کے متعلق جتنے نظریے قائم کئے گئے ہیں ان میں سب سے بہتر، نتیجہ خیز اور اقرب الی القياس نظریہ وہی ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔

رہا وحی اور رسالت کا مسئلہ تو یہ ظاہر ہے کہ اس کا کوئی مادی ثبوت نہیں پیش کیا جاسکتا۔ مگر جن کتابوں کو وہیں کیا گیا ہے ان کے معانی، اور جن لوگوں کو خدا کا رسول کہا گیا ہے ان کی سیرتوں پر غور کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ نوع انسان کے افکار و اعمال پر ان کے برابر گہرے، وسیع، پاندار اور مفید اثرات کسی اور نہ نہیں ڈالے۔ یہ بات اس امر کا یقین کرنے کے لیے کافی ہے کہ ان میں کوئی غیر معمولی بات ضرور نہیں جو نہ انسانی تصنیفات کو نصیب ہے اور نہ عام انسانی لیذروں کو۔

اسلام کے بنیادی عقائد

۱۶۳

اس بیان سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کے ایمانیات عقل کے خلاف نہیں ہیں۔ عقل کے پاس ان کی تکذیب کے لیے کسی قسم کا مادہ نہیں ہے۔ ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ علمی اور عقلی ارتقا کے کسی مرتبے پر پہنچ کر انسان ان کو رد کر دینے پر مجبور ہو جائے بلکہ اس کے بر عکس عقل ان کی اغلبیت کا حکم لگاتی ہے۔

ثانیاً، غیبیات میں سے بیشتر امور ایسے ہیں جن کی حیثیت محض علمی ہے، یعنی ان سے ہماری عملی زندگی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً اپٹر، ہیولی، صورت مطلقہ، مادہ، فطرت اور قانون عات و معلول، اور ایسے ہی بیسیوں علمی مسلمات یا مفروضات ہیں کہ ان کے ماننے یا نہ ماننے کا ہماری زندگی کے معاملات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن اسلام نے جن امور غیب پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے وہ ایسے نہیں ہیں۔ ان کی حیثیت محض علمی ہی نہیں ہے بلکہ ہماری اخلاقی اور عملی زندگی سے ان کا گہرا تعلق بھی ہے۔ ان کی تصدیق کو اصل الاصول قرار دینے کی وجہ یہی ہے کہ وہ محض علمی صداقتیں نہیں ہیں بلکہ ان کا صحیح علم اور ان پر کامل ایمان ہمارے نفسانی اوصاف و خصائص پر، ہمارے شخصی اعمال پر اور ہمارے اجتماعی معاملات پر شدت کے ساتھ اثر انداز ہوتا ہے۔

ثانیاً، اسلام کے نظام تہذیب کو مختلف عقلی اور علمی مراتب رکھنے والی وسیع انسانی آبادیوں پر ان کی زندگی کے مخفی اور جزوی سے جزوی شعبوں تک میں اپنی حکومت قابیم کرنے اور اپنی گرفت مجبوب رکھنے کے لیے جس قوت کی ضرورت ہے وہ صرف ان ہی ایمانیات سے حاصل ہو سکتی ہے جن کی تصدیق کا اسلام نے مطالبه کیا ہے۔ یہ یقین کہ ایک سیع و بصیر، قادر و غالب اور روف و رحیم خدا ہمارے اوپر حکمران ہے، اس کے بے شمار لشکر ہر جگہ ہر آن موجود ہیں، پیغمبر اسی کا بھیجا ہوا ہے، جو احکام اس نے ہم کو دیے ہیں وہ اس نے خود نہیں گھڑے ہیں بلکہ سب کے سب خدا کی طرف سے ہیں اور اپنی اطاعت یا سرکشی کا اچھا یا ہرا نتیجہ ہم کو ضرور دیکھنا پڑے گا، اپنے اندر وہ زبردست اور ہمہ گیر طاقت رکھتا ہے جو اس کے سوا کسی اور ذریعے سے حاصل نہیں کی جا سکتی۔ مادی طاقتیں صرف جسم کو جکڑ سکتی ہیں، تربیت اور تعلیم کے اخلاقی اثرات انسانی نماشرے کے صرف اعلیٰ طبقوں تک پہنچ سکتے ہیں، قانون صرف وہاں

کام کر سکتا ہے جہاں اس کے کارندوں کی بہنچ ہو۔ مگر یہ وہ قوت ہے جو دل اور روح پر قبضہ کر رکھے، عوام اور خواص، جاہل اور عالم، دانشمند اور بے دانش سبھی کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ جنگل کی تمہائیوں اور رات کی تاریکیوں تک میں اپنا کام کرتی ہے۔ جہاں گناہ سے روکنے والا، اس پر ملامت کرنے والا حتیٰ کے اس بیو دیکھنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا، وہاں خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا بقین، یہ غیر کی دی ہوئی تعلیم کے بروجع ہونے کا بقین، قیامت کی باز پرس کا بقین، وہ کام کرتا ہے جو نہ کوئی بولیں کا سپاہی کر سکتا ہے، نہ عدالت کا حاکم، نہ برووفیسر کی تعلیم۔ پھر جس طرح اس بقین نے معمودہ ارضی پر پہلے ہوئے ہے شجر، مختلف و متضاد انسانی عناصر کو جمع کیا، ان کو ملا کر ایک قوم بنایا، ان کے تخیلات، اعمال اور اطوار میں غایت درجہ کی یک جمہتی پیدا کی، ان کے اندر اختلاف ثغر و احوال کے باوجود ایک تہذیب پہلائی اور ان میں ایک اعلیٰ مقصد کے لئے فدا کاری کی والباجانہ روح پہونکی، اس کی مثال کہیں ڈھونڈئے نہیں مل سکتی۔

بہاں تک جو کچھ ثابت کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کی اصطلاح میں ایمان سے مراد اللہ، ملائکہ، کتب، رسول اور یوم آخر پر ایمان لانا ہے، پھر عقلی تنقید کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام جس قسم کی تہذیب قائم کرنا چاہتا ہے اس کے لیے صرف یہی امور ایمانیات بن سکتے ہیں اور ان ہی ایمانیات کی اس کو ضرورت ہے۔ نیز یہ کہ ان ہی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو عقلی و علمی ترقی کا ساتھ نہ دے سکتی ہو۔

اب تک کی بحث یہ جزو چند امور غیر مشتبہ طور پر ثابت ہوئے ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) ایمان، نظام اسلام کا سنگ بنیاد ہے، اسی پر اس نظام کی عمارت قابیم کی گئی ہے۔ اور کفر و اسلام کا امتیاز صرف ایمان و عدم ایمان کے بنیادی فرق پر مبنی ہے۔

(۲) انسان سے اسلام کا پہلا مطالبہ یہ ہے کہ وہ ایمان لائے۔ اسی مطالبے کو قبول نہ رئے والا دائرہ اسلام میں داخل ہے، اور تمام اخلاقی احکام اور مدنی قوانین اسی کے نئے ہیں۔ اور جو اس مطالبہ کو رد کرے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے، سر سے۔ نوٹ: اخلاقی حکم متعلق ہوتا ہے اور نہ کوئی مدنی قانون۔

(۲) اسلام کے نزدیک ایمان ہی عمل کی جڑ ہے۔ صرف وہی عمل اس کی نتائج میں قدر و قیمت اور وزن رکھتا ہے جو ایمان کی بنیاد پر ہو اور جہاں ہر یہی سے یہ بنیاد ہی موجود نہ ہو وہاں تمام اعمال بے اصل اور بے وزن ہیں۔

اسلامی تہذیب کے قیام میں ”ایمانیات“ کا حصہ

اسلامی تہذیب کا سنگ بنیاد حیات دنیا کا یہ تصور ہے کہ انسان کی حیثیت اس ”کرہ“ خاکی میں عام موجودات کی سی نسبیت ہے، بلکہ وہ خداوند عالم کی طرف سے بہاں خلیفہ بنائ کر اتنا را گیا ہے۔ اس تصور سے بہ طور ایک عقل نتیجہ کے انسان کی زندگی کا یہ نصب العین قرار پایا کہ وہ اپنے خالق اور اپنے آٹا کی خوشنودی حاصل کرے۔ اور اس نصب العین کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہو گیا کہ

اوہ، وہ خدا کی صحیح معرفت حاصل کرے۔

ثانیاً، وہ صرف خدا کو اُمر اور ناہی، حاکم اور مطاع سمجھی اور اپنے انتیار کو احکام خداوندی کے تابع کر دے۔

ثالثاً، وہ ان طریقوں کو معلوم کرے جن سے خدا کی خوشنودی حاصل ہو سکتی ہے، اور جب وہ طریقے معلوم ہو جائیں تو انہی کے مطابق زندگی بسر کرے۔

رابعاً، وہ خدا کی خوشنودی کے ثمرات اور اس کی ناخوشی کے نتائج سے واقف ہو، تاکہ حیات دنیا کے نامکمل نتائج سے دھوکا نہ کھائے۔

وہ ہانچ عقیدے جن کی تفصیل آپ کو اوپر معلوم ہو چکی ہے، اسی ضرورت کو پورا کرنے ہیں۔

خدا کی ذات و صفات کے متعلق جو کچھ فران میں بیان کیا گیا ہے وہ اس لیے ہے کہ انسان کو اس ہستی کی صحیح معرفت حاصل ہو جس کی طرف سے وہ خلیفہ بنائ کر زمین ہر بھیجا گیا ہے اور جس کی خوشنودی حاصل کرنا اس کی زندگی کا نصب العین ہے۔ ملائکہ کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ اس لیے ہے کہ انسان کائنات کی کارکن طاقتوں میں سے کسی کو کارفرا نہ سمجھو

* یہ حصہ بھی ”اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی“ ہر سے منسوز ہے۔ (مرتب)

بیشتر، اور کار فرمائی میں خدا کے سوا کسی کو شریک نہ قرار دے۔ اس علم صحیح کے بعد خدا پر ایمان لانے کے معنی بہ ہیں کہ جس طرح تمام کائنات بہ اور خود انسانی زندگی کے شر انتیاری شعبے میں بھی خدا کی حکومت ہے، اسی طرح انسان اپنی زندگی کے انتیاری شعبے میں بھی خدا کی حکومت تسلیم کرے گا، ہر معاملے میں خدا کو قانون عطا فرمانے والا اور اپنے آپ کو صرف منع قانون سمجھے اور اپنے اختیارات کو ان حدود کے اندر محدود کر دے جو خدا نے مقرر کئے ہیں۔ بھی ایمان اپنے اندر وہ قوت رکھتا ہے جو انسان کو خدا کی فرمائی روانی کے آئے بہ رضا و رغبت سے تسلیم خم کر دینے کے لیے آمادہ کر رکھے ہے۔ اس سے مرد ہونے کے اندر ایک خاص نوعیت کا ضمیر پیدا ہوتا ہے۔ اور ایک خاص قسم کی سیرت بتتی ہے جو قانون اور حدود کا مجبوراً نہیں بلکہ رضا کارانہ اتباع کرنے کے لیے ضروری ہے۔

رسالت اور کتاب کا عقیدہ تیسری ضرورت کو ہوا کرتا ہے۔ انسی دنوں کے ذریعے سے انسان کو ان قوانین اور ان طریقوں کا تفصیلی علم ہوتا ہے جن کو خدا نے انسان کے لیے مقرر کیا ہے اور ان حدود کی شناخت میسر ہوتی ہے جن سے خدا نے انسان کے اختیارات کو محدود فرمایا ہے۔ رسول کی تعلیم کو خدا کی تعلیم اور اس کی پیش کی ہوئی کتاب کو خدا کی کتاب سمجھنا ہی ایمان بالرسالت اور ایمان بالکتاب ہے، اور اس ایمان ہی سے انسان میں یہ قابلیت پیدا ہوتی ہے کہ بقun و اذعان کے ساتھ ان قوانین اور طریقوں اور حدود کی پابندی کرے جو خدا نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنی کتاب کے واسطے سے اس کو بتائے ہیں۔

آخری ضرورت کو پورا کرنے کے لیے معاد کا علم ہے۔ اس سے انسان کی نظر اتنی تیز ہوئی ہے کہ وہ ظاہر حیات دنیا کے ہیچھے ایک دوسرے عالم کو دیکھنے لگتا ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا کی خوش حالی و بدحالی، اور سُنْفَت و مضرت، خدا کی خوشنودی و ناخوشی کا معیار نہیں ہے اور خدا کی جانب سے اعمال کی جزا و سزا اسی دنیا میں ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ آخری فیصلہ ایک دوسرے عالم میں ہونے والا ہے۔ بھی فیصلہ معتبر ہے۔ اور اس فیصلے سب کامبی کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ اس دنیا میں خدا کے قانون کی صحیح بیروی تھوڑے اس کے مقرر کئے ہوئے حدود کی ہوئی پابندی کی جائے۔ اسی

اسلام کے بنیادی عقائد

۱۶۶

عینکے پر جزم و یقین کا نام ایمان بالیوم الآخر ہے اور ایمان باہم کے بعد یہ دوسری زبردست قوت ہے جو انسان کو قوانین اسلامی کے اتباع پر ابھارنے میں تہذیب اسلامی کے لیے انسان کو ذہنی اعتبار سے مستعد کرنے میں اس اعتقد کا بڑا حصہ ہے ۔

اس بیان سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ اساسی اعتقادات انہی خطوط پر تہذیب کی تاسیس و تشکیل کرتے ہیں جو حیات دنیا کے اس مخصوص تصور پر اس نصب العین نے کھیچ دیے تھے ۔ ایسی تہذیب کے لیے علاً جس اساسی تہذیب کی ضرورت ہے وہ انسی پانچ امور پر مشتمل ہو سکتا ہے ۔ ان کے سوا کسی دوسرے اعتقاد میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ اس مخصوص طرز کی تہذیب کے لیے اساس بن سکے ۔ کوئی دوسرा عقیدہ اس خاص تصورِ حیات اور نصب العین کے مانہ مناسب نہیں رکھتا ۔

اسلامی تہذیب کی خصوصیات

ایمانیات کی جو تفصیلات اوپر بیان ہوئی ہیں ان پر نظر ڈالنے سے اس تہذیب کا ہوا خاکہ ہمارے سامنے آ جاتا ہے جس کی تاسیس ان کے ذریعے سے ہے ۔ اس خاکے کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں:

(۱) اس تہذیب کا نظام ایک سلطنت کا سا نظام ہے ۔ اس میں خدا کی حیثیت عام مذہبی تصور کے لحاظ سے مخفی ایک 'معبد' کی سی نیبی ہے بلکہ دنیوی سور کے لحاظ سے وہی حاکم مطلق بھی ہے، وہ دراصل اس سلطنت کا شہنشاہ ہے، رسول اس کا نائندہ ہے، قرآن اس کی کتاب ائین ہے؛ اور ہر وہ شخص جو اس کی شہنشاہی کو تسلیم کر کے اس کے نمایندے کی اطاعت اور اس کی کتاب ائین کا اتباع کرنا قبول کرے اس سلطنت کی رعیت ہے؛ مسلمان ہونے کے معنی ہیں کہ اس شہنشاہ نے نمایندے اور اپنی کتاب کے ذریعے سے جو قوانین مقرر کر دیے ان کو بے چون و چرا تسلیم کیا جائے، خواہ ان کی علت و مصلحت سمجھ بیں ائے یا نہ ائے ۔ جو شخص خدا کا یہ اختیار مطلق اور اس کے قانون کا شخصی اجتماعی ارا ہے بالآخر ہونا تسلیم نہیں کرتا اور اس کے فرمان کو ماننے یا نہ ماننے کا حق اپنے لیجے محفوظ رکھتا ہے، اس کے لیے سلطنت میں تعطاً کوئی کنجائش نہیں ہے ۔

(۲) چون کہ اس تہذیب کا اصل مقصد انسان کو آخری کامیابی (بعنی آخری دن کے فصلے میں خداوند عالم کی خوشنودی سے سرفراز ہونے) کے لئے تیار کرنا شے اور اس کامیابی کا حصول اس کے نزدیک موجودہ زندگی میں انسان کے صحیح عمل ہر موقع، ہے اس لئے بہ تہذیب انسان سے مطالبه کری ہے کہ اپنی زندگی کے تمام معاملات میں خدا کے بنائے ہوئے طریقوں کی ہیروی کرے اور اپنی آزادی عمل کو شربعت الہی کی قیود سے مقید کر دے۔ اس طرح یہ تہذیب دین اور دنیا دونوں کی جاییں ہے۔ بہ ایک ایسا وسیع نظام ہے جو انسان کے انکار و خیالات، اس کے شغف کردار و اخلاق، اس کے انفرادی عمل، اس کے خانگی معاملات، اس کی معاشرہ اس کے تمدن، اس کی سیاست سب پر حاوی ہے۔

(۳) یہ تہذیب کوئی قومی یا نسلی تہذیب نہیں ہے، بلکہ صحیح عینہ میں انسانی تہذیب ہے۔ یہ انسان کو بہ حیثیت انسان خطاب کری ہے اور ہر اس شخص کو اپنے دائرنے میں لے لئی ہے جو توحید، رسالت، کتاب اور یوم آخر پر ایمان لائے۔ اس طرح اس تہذیب نے ایک ایسی توبیت بنائی ہے جس میں بلا امتیاز رنگ و خصل و زبان ہر انسان داخل ہو سکتا ہے، جس کے اندر تمام روئے زمین پر پھیل جانے کی استعداد موجود ہے اور جو تمام بھی آدم کو ایک نظم ملت میں بیوستہ کوڈبئے اور ان سب کو ایک تہذیب کا بتیج نہادیتی کی صلاحیت رکھتی ہے۔

(۴) ہمہ گیری اور آفاتیت کے ساتھ اس تہذیب کی نمایاں خصوصیت اس کا زبردست نفوذ اور اس کا وہ طاقت نور اثر ہے جس سے وہ اپنے متبعین کو شغمی و اجتماعی حیثیت سے اپنے آئین کا پابند بناتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ قوانین بنانے اور حدود مقرر کرنے سے پہلے قوانین کا اتباع اور حدود کی پابندی کرانے کا بندوبست کری ہے۔ حکم دینے سے پہلے وہ اس کا انتظام کری ہے کہ اس کا حکم نفذ ہو۔ سب سے پہلے وہ انسان سے خدا کی فرمان روانی تسلیم کرائے۔ پھر اس کو یقین دلاتی ہے کہ رسول اور کتاب کے ذریعے سے جو احکام دیے گئے ہیں وہ خدا کے احکام ہیں اور آن کی اطاعت عین خدا کی اطاعت ہے۔ پھر وہ اس کے نفس میں ایک ایسی ہولیں مقرر کر دیتی ہے جو ہر وقت اور ہر حال میں اس کو احکام کی اطاعت کے لیے ابھاری ہے۔ خلاف درزی پر سرزنش کری ہے ادا عذاب یوم عظیم کا خوف دلاتی رہتی ہے۔ اس طرح جب وہ اس قوت نافذہ کو

ہو شخص کے نفس و ضمیر میں مستمکن کر کے اپنے ہبروقد میں بہ صلاحیت پیدا ہو دینی ہے کہ وہ خود اپنی دلی رغبت سے قوانین کا اتباع اور حدود کی پابندی اور اخلاقی حسنے سے متعلق ہونے کے لیے آمادہ ہوں، تب وہ ان کے سامنے اپنے نوابین پیش کرنی ہے ان کے لیے زندگی بسر کرنے کے طریقے وضع کرنے ہے اور انہی معالج کے لیے ان سے سخت سے سخت قربانیوں کا مطابہ کرنی ہے۔ بہ ایسا طریقہ ہے کہ امن سے زیادہ حکیمانہ طریقہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اس طریقے سے اسلامی تہذیب کو جو زبردست نفوذ و اثر حاصل ہوا ہے وہ کسی دوسری تہذیب کو نعیب نہیں ہوا۔

(۵) دنیوی نقطہ نظر سے بہ تہذیب ایک مجمع اجتماعی نظام قائم کرنا اور ایک صالح اور پاکیزہ سوسائٹی کو وجود میں لانا چاہتی ہے مگر ایسی سوسائٹی کا وجود میں اُنا ممکن نہیں ہے جب تک کہ اس کے افراد اخلاق فاضلہ و مفاتیح حسنے سے منصف نہ ہوں۔ اس غرض کے لیے ضروری ہے کہ افراد کے نقص کا تذکیرہ کیا جائے تاکہ وہ مغرب اور منتشر افکار کی آمادگاہ نہ رہیں۔ مجمع اور پاکیزہ ذہنیت ان کے اندر راسخ کی جائے تاکہ ان میں ایک ایسی مفہومیت پیدا ہو سکے جس سے اعمال صالحہ کا صدور بالطبع ہونے لگے۔ اسلام نے اپنی تہذیب میں اس قاعدے کی پوری رعایت ملحوظ رکھی ہے۔ افراد کی تربیت کے لیے وہ سب سے بہلے ان میں ایمان کو راسخ کرتا ہے جو ایک اعلیٰ درجے کی مفہومیت پیدا کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ بھی ایمان ہے جس کے ذریعے سے وہ افراد میں صداقت، همت، نیک نفسی، احتساب، حق پسندی، فیض نفس، تنظیم، نیاضی، وسعت نظر، خود داری، انکسار و فروتنی، فراخ حوصلگ، بلند ہمتی، ایثار و قربانی، فرض شناسی، صبر و استقامت، شجاعت و بصالت، تفاسیت و استفنا، اطاعت امر اور اتباع قانون کے عمدہ اوصاف پیدا کرتا ہے، اور ان کو اس قابل بناتا ہے کہ ان کے اجتماع سے ایک بہترین سوسائٹی وجود میں آئے۔

(۶) اس تہذیب کے ایمانیات میں ایک طرف وہ تمام قوتیں موجود ہیں جو انسان کے اندر اخلاقی حسنے و ملکات فاضلہ پیدا کرنے والی اور ان کی بروزش اور حفاظت کرنے والی ہیں۔ دوسری طرف انہی ایمانیات میں یہ قوت بھی ہے کہ وہ انسان کو دنیوی ترقی کے لیے ابھارتے ہیں اور اس کو اس قابل بناتے ہیں کہ دنیا کے اسباب و وسائل کو بہترین طریقے پر برئے اور ان تمام قوتیں کو اعتدال

کے ساتھ استعمال کرے جو خدا نے اسے عطا کی ہیں۔ پھر یہی ایمانیات اس میں وہ عمدہ اوصاف بھی پیدا کرنے ہیں جو دنیا میں حقیقی ترق کے لئے ضروری ہیں۔ آن میں انسان کی عملی قوتوں کو منظم کرنے اور تنظیم کے ساتھ حرکت دینے کی زبردست طاقت موجود ہے اور اس کے ساتھ آن میں یہ طاقت بھی ہے کہ اس حرکت کو حد سے تجاوز نہ کرنے دے اور ان راستوں سے منحرف نہ ہونے دے جن سے ہٹ جانا تباہی کا موجب ہوتا ہے۔ اس طرح یہ ایمانیات اپنے اندر و خوبیاں مع شنی زاید رکھتے ہیں جو دوسرے مذہبی اور دینوی ایمانیات میں جدا جدا پائی جاتی ہیں اور ان تمام خرابیوں سے پاک ہیں جو مختلف مذہبی اور دینوی ایمانیات میں موجود ہیں۔

یہ اس تمہیب کا ایک مجمل خاکہ ہے جو اسلام قائم کرتا ہے۔ اگر ہم تشبیہ کے پیرائے میں اس کو ایک عمارت تسلیم کرلیں تو یہ ایک ایسی عمارت ہے جس کو مستحکم کرنے کے لئے نہایت گہری نیو کھودی گئی، ہر چہانز چھانٹ کر پختہ سے پختہ اینٹیں مسیاہی گئیں اور ان کو پکھلانے ہونے سیسے سے ہیوستہ کر دیا گیا ہے، ہر عمارت اس شان کے ساتھ بنائی گئی کہ بلندی میں آسمان تک آئندی چلی جائے اور وسعت میں آفاق پر پھیلتی جائے، مگر اس وسعت و رفت کے باوجود اس کے ارکان میں ذرا تزلزل واقع نہ ہو اور اس کی دیواریں اور اس کے ستون چنان کی سی مضبوطی کے ساتھ قائم رہیں۔ اس عمارت کے دروازے اور روشن دان اس طرز کے اور اس خوبی سے بنائے گئے ہیں کہ باہر کی روشنی اور صاف ہوا کو بے خوبی داخل ہونے دیتے ہیں مگر گرد و غبار اور خس و خاشک اور باد و باران کو داخل ہونے سے روک دیتے ہیں۔ یہ تمام خوبیاں جو اس عمارت میں پیدا ہوئی ہیں ایک ہی چیز کی بدولت ہیں اور وہ ایمان ہے۔ وہی اس کی بنیادیں استوار کرتا ہے وہی ردی اور ناکارہ مواد کو چھانٹ کر عمدہ مواد اخذ کرتا ہے۔ وہی مواد خام کو پکا کر پختہ اینٹیں تیار کرتا ہے۔ وہی ان اینٹوں کو پیوستہ کر کے ایک بنیان مخصوص بناتا ہے۔ اسی پر عمارت کی وسعت و رفت اور مستحکم کا انعصار بیرونی مفسدات سے اس کی حفاظت بھی کرتا ہے، مضبوط بھی کرتا ہے، داخل ہونے کا موقع بھی دیتا ہے۔ پس ایمان اس عمارت کی جان ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو اس کا قائم رہنا کیسا وجود میں آنا ہی محال ہے۔ اور اگر یہ ضعیف ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ عمارت کی بنیادی کمزور، اس کی آینٹیں بودی

اک چونا خراب ، اس کے ارکان متزلزل ہیں ، اس کے اجزاء میں ہو سکی نہیں ، اس میں بخوبی اور بلند ہونے کی صلاحیت نہیں ، اس میں ہیروئن بفدادات دو رکھنے اور اپنی ہا دیزکی و لطافت کو محفوظ رکھنے کی قوت نہیں ۔

غرض ، ایمان کا عدم ، اسلام کا عدم ہے ، ایمان کا ضعف ، اس کا ضعف ہے ، اور ایمان کی نبوت اس کی قوت ۔ پھر چون کہ اسلام محض ایک مذہب ہے نہیں بلکہ اخلاق ، نہذب ، معاشرت ، تمدن ، سیاست سب کچھ ہے اس لئے ایمان کی حیثیت اس نظام میں صرف مذہبی عقیدے کی نہیں ہے ۔ بلکہ اسی پر افراد کے اخلاق اور ان کی بیان کا بھی انحصار ہے ۔ وہی ان کے معاملات کی درستی کا ذمہ دار ہے ۔ وہی ان کو جوڑ کر ایک قوم بھی بناتا ہے ۔ وہی ان کی قومیت اور آن کی تہذیب کی ملاظت بھی کرتا ہے ۔ وہی آن کے تمدن ، آن کی معاشرت اور آن کی سیاست کا باہم تبادلہ بھی ہے ۔ اور اس کے بغیر اسلام نہ صرف ایک 'مذہب' کی حیثیت ہے قابو نہیں ہو سکتا ، بلکہ بہ حیثیت ایک تہذیب و تمدن اور نظام سیاسی کے بھی قابو نہیں ہو سکتا ۔ ایمان فرعیف ہو تو یہ محض مذہبی عقیدے کا ضعف نہیں ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کے اخلاق خراب ہو جائیں ، ان کی بیانیں کمزور ہو جائیں ، ان کے معاملات بکڑ جائیں ، ان کی معاشرت اور ان کے تمدن کا نظام درہم برہم ہو جائے ، ان کے درمیان قومیت کا رشتہ نوث جائے ، اور وہ ایک آزاد اور باہمت اور طاقتور قوم کی حیثیت سے زندہ نہ رہ سکیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں ایمان غیر پر اسلام و کفر کا مدار رکھا گیا ہے ۔ وہی نظام اسلامی میں داخل ہونے کی اولین شرط ہے ۔ سب سے پہلے انسان کے سامنے ایمان ہی پیش کیا جاتا ہے ۔ اگر اس نے ایمان دو قبول کر لیا تو اس مسلمہ میں داخل ہو گیا ، مسلمانوں کی معاشرت ، تمدن ، سیاست سب میں برابر کا شریک ہو گیا ، اور تمام احکام ، حدود اور قوانین اس سے متعلق ہو گئے ۔ لیکن ، اگر اس نے ایمان کو قبول نہیں کیا تو وہ دائیرہ اسلامی میں کسی حیثیت سے داخل نہیں ہو سکتا ، اسلام کا کوئی حکم اور قانون اس پر نافذ نہ ہو گا ، اور مسلمانوں کی جماعت میں وہ کسی طرح شریک نہ ہو سکے گا ، کیوں کہ اس نظام میں اس کی نسبت قطعاً حال ہے اس کے قوانین و حدود کی پابندی وہ کر ہی نہیں سکتا ۔

مزید مطالعے کے لئے

مولانا سید سلیمان ندوی، **مہرتو النبی** (جلد چہارم) - دارالمحنتین، اعظم گردان

مولانا مودودی، **رسالہ دینیات**، (باب چہارم) - اسلامک پبلیکیشنز لمبٹل، لاہور

مولانا مودودی، **اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی** (باب سوم)

اسلامک پبلیکیشنز لمبٹل، لاہور -

مولانا منظور احمد نصانی، **دین و شریعت** - مکتبہ الفرقان، لکھنؤ

مولانا منظور احمد نصانی، **قرآن کا کہنا ہے؟** مکتبہ الفرقان، لکھنؤ

صلی قطب شہید، **جادہ و منزل** - اسلامک پبلیکیشنز لمبٹل، لاہور



نحو حیلہ

جو شخص بھی دنیا کے مختلف الہامی مذاہب اور بالخصوص اسلام کا مطالعہ کرے گا اسے اس بات کا اندازہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ ان مذاہب نے اپنی تعلیمات میں سب سے زیادہ اہمیت جس چیز کو دی ہے وہ اللہ پر ایمان لانا ہے۔ جو شخص کفر کی حالت کو چھوڑ کر مسلمان ہونا چاہتا ہے، اسے سب سے پہلے کلمہ "شہادت اذا کرنا پڑتا ہے، اور اسی کلمے کی بنا پر وہ شخص ملت کفر سے کٹ کر ملت اسلام میں داخل ہو جاتا ہے۔ اگر یہ شخص اللہ پر ایمان کے مقابلے ہوا کرے کا تو آخرت کے اعتبار سے "اجرو ثواب کا مستحق اور بہ صورت دیگر عذاب کا مستوجب ہوگا۔ اسلام کے نزدیک محض اس افرا ریا ایمان سے انسان کی دنیوی اور آخری زندگی یک سر بدل جائے ہے۔

بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محض ایک ما بعدالطبعی ہستی کے وجود با عدم وجود کے افرا ریا سے انسانوں میں اتنا بڑا فرق نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن، اگر ہم ہے نگاہ خائز اس مسئلے کا مطالعہ کریں۔ جیسا کہ ہم اس باب میں کہیں گے۔ تو ہمیں محسوس ہوگا کہ اس افرا و انکار کے بڑے اہم نتائج نکلتے ہیں۔ بہ نتائج فکری بھی ہیں اور عملی بھی، انفرادی بھی ہیں اور اجتماعی بھی۔ اس لئے وجود باری تعالیٰ اور توحید کے مسئلے کو محض ایک علمی اور کلاسی مسئلہ سمجھنا، جس کا تعلق محض فلاسفہ اور متکلمین کی موشاگفیوں سے ہو، درست نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان و کائنات کے باہمی تعلق کے بارے میں ہر شخص کو ایک نقطہ نظر رکھنا پڑتا ہے۔ ضروری نہیں کہ بہ نقطہ نظر صحیح سمجھ کر ہی اختوار دیا گیا ہو، بلکہ (جیسا کہ اکثریت کا، قاعدہ ہے)

بلا سچے سمجھئی بھی ایک نقطہ نظر رکھا جا سکتا ہے اور یہ انسان اور معاشرے دونوں پر انداز ہوتا ہے۔ اسلام چون کہ افراد کی اصلاح کا آغاز بالکل بنیاد سے کرتا ہے اس لیے وہ اس بات کو پیش نظر رکھتا ہے کہ عمل صالحت ہمیشہ اپنے ہر زور دیا جائے۔ بنیاد اکر صحیح نہ ہو تو دیوار بیڑھی اور زمزور رکھی اور ”تا شوا“ میں روڈ دیوار لج ” کا نقہ ہوا۔ ایسی دیوار میں اکر نہ ٹھانگی حسن ہے بھی تو وہ بے ذار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نیک اعمال اکر صحیح خواہد اور صحیح نیت کے ساتھ نہ ہوں تو خدا کے بہانے بے معنی ہیں۔

*اسلام کے پورے اعتقادی اور عملی نظام میں بہلی اور بنیادی چیز ایمان
یا شہ ہے۔ باقی جتنے اعتقادات و ایمانیات ہیں سب اسی ایک اصل کے تکمیلی فروع ہیں اور جتنے اخلاق احکام اور تمدنی قوانین ہیں سب اسی مرکز سے قوت حاصل کرتے ہیں۔ بہان جو کچھ بھی ہے اس کا مصدر اور مرجع خدا کی ذات ہے۔ ملانکہ پر اس لیے ایمان ہے کہ وہ خدا کے ملانکہ ہیں۔ کتابوں پر اس لیے ایمان ہے کہ خدا کی نازل کی ہوئی ہیں۔ رسولوں پر اس لیے ایمان ہے کہ وہ خدا کے ہیچھے ہوئے ہیں۔ یوم آخر پر اس لیے ایمان ہے کہ وہ خدا کے انصاف کا دن ہے۔ فرانص اس لیے فرانص ہیں کہ خدا نے ان کو مقرر کیا ہے۔ حقوق اس لیے حقوق ہیں کہ وہ خدا کے حکم پر مبنی ہیں۔ اوصار کی فرمان برداری اور نواہی سے اجتناب خواہ عقیدہ نہ یا عمل، اس کی بنا صرف ایمان بالله پر قائم ہے۔ اس ایک چیز کو الک کرنے پڑھے، پھر نہ ملانکہ کوئی چیز ہیں نہ یوم آخر، نہ رسول اتباع کے مستحق نہیں ہیں، نہ ان کی لانی ہوئی کتابیں، نہ فرانص و طاعات میں کوئی معنویت باقی رہ جاتی ہے نہ حقوق و فرانص میں، نہ اوصار و نواہی کسی قوت و نفاذ کے حامل رہتے ہیں اور نہ ضوابط و قوانین۔ اس ایک مرکز کے ہٹتے ہی یہ سارا کاسارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے بلکہ سرتے سے اسلام ہی کسی چیز کا نام نہیں رہتا۔

یہ عقیدہ جو اس عظیم الشان فکری و عملی نظام میں مرکز اور منبع قوت کا کام دے رہا ہے، محض اسی قدر نہیں ہے کہ ”الله تعالیٰ موجود ہے“ بلکہ وہ اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی صفات کا ایک مکمل اور صحیح تصور (جس حد تک انسان اس حصے کا بیشتر مواد اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، ہے مانعوذ ہے۔
 (مرتب)

ان کا تصور ممکن ہے) رکھتا ہے، اور ان ہی صفات کے تصور سے وہ قوت حاصل ہونے چاہیے جو انسان کی تمام فکری اور عملی قوتوں پر خیط اور حکمران ہو جاتی ہے۔ بخشنہ سی، باری کا اثبات وہ چیز نہیں ہے جسے اسلام کی اسیازی خصوصیت لہا جاسکتا ہو۔ دوسری ملتوں نے یوں کسی نہ دسی خورست باری تعالیٰ کے بعد کا اثبات دیا ہے۔ البته جس چیز نے اسلام دونام مذاہب و ادیان سے سماز کر دیا ہے وہ یہی ہے کہ اس نے صفات باری د صحیح علم بخشنا ہے، اور بد ای علم کو ایمان بلکہ اصل ایمان بنادر اس سے تزکیہ، نفس، اصلاح اخلاقی نظم اعمال، نشر خیر و منع شر، اور بناء تمدن کا اتنا بڑا کام لیا ہے جو دنیا کے کئی مذہب و ملت نے نہیں لیا۔

ایمان بالله کی مجمل صورت، جس کے اثوار باللسان اور تصدیق بالقلب کو نخل اسلام کی بھلی اور لازمی شرط قرار دیا گیا ہے، کلمہ "لا الله الا الله" ہے، یعنی دل سے اس امر کی تصدیق اور زبان سے اس امر کا اعتراف کہ "الله" بہ جز اس ابی هنسی کے اور کوئی نہیں ہے جس کا نام اللہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا طلب ہے کہ "اللوهیت" کو عالم وجود کی جملہ اشیا سے سلب کر کے میں ایک ذات کے لیے ثابت کیا جائے اور ان تمام جذبات، تخیلات، اعتقادات اور عبادات و طاعات کو جو "اللوهیت" کے لیے مخصوص ہیں، اسی ایک ذات سے متعلق کر دیا جائے۔ اس مجمل للہ کے اجزاء ترددی ہیں ہیں:

— ایک، اللوہیت کا تصور۔

— دوسرے، تمام اشیا سے اس کی نفی۔

— تیسرا، صرف اللہ کے لیے اس کا اثبات۔

قرآن مجید میں خدا کی ذات و صفات کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے، وہ سب انہی تینوں امور کی تفصیل ہے۔

اولاً، اس نے 'الوہیت' کا ایک ایسا مکمل اور صحیح تصور پیش کیا ہے جو دنیا کی کسی کتاب اور کسی مذہب میں ہم کو نہیں ملتا۔ اس میں شک نہیں کہ تمام قوموں اور ملتوں میں یہ تصور کسی نہ کسی طور پر موجود ہے، لیکن ہر جگہ غلط یا نامکمل ہے۔ کہیں 'اللوہیت' نام ہے مگر ادالت اور واجبیت کا، کہیں اس سے مبدئیت مرادی گئی ہے، نہیں اس

کو قوت اور طاقت کا ہم معنی سمجھا گیا ہے، کہیں وہ محض خوف اور ہبہ
کی چیز ہے، لہبیں وہ صرف محبت کا مرتع ہے، کہیں اس کا مفہوم محض رفع
 حاجات اور اجابت دعوات ہے، پھر کہیں وہ قابل تجزیہ و تقسیم ہے، کہیں اس
کو تجزیہ^۱ اور تشبیہ^۲ اور تناسل^۳ سے آلوودہ کیا گیا ہے۔ کہیں وہ انسانوں پر
متکن ہے اور کہیں وہ انسانی بھیں بدل کر زمین پر آتی آئی ہے، ان تمام غلط
یا ناقص تصورات کی تصحیح اور تکمیل جس کتاب نے کی ہے وہ صرف قرآن ہے۔
اسی کتاب نے آلوہیت^۴ کی نعديں و تمجید کی ہے۔ اسی نے بنایا ہے کہ اللہ صرف
وہی عوستکنا ہے جو نے نیاز، مدد^۵ اور قیوم^۶ ہو، جو عیشہ سے ہو اور عیشہ
رہے۔ جو قادر مطلق اور حاکم علی الاطلاق ہو۔ جس کا علم سب پر محیط، جس کی
رحمت سب پر وسیع، جس کی طاقت سب پر غالب ہو، جس کی حکمت میں کوئی
نقص نہ ہو، جس کے عدل میں ظلم کا شانہ تک نہ ہو، جو زندگی بخشنے اور
وسائل حیات سہیا کرنے والا ہو، جو نفع و ضرر کی ساری قوتیں کا مالک ہو، اس
کی بخشش اور نگہبانی کے سب محتاج ہوں، اسی کی طرف تمام مخلوقات کی یا زگشت
ہو، وہی سب کا حساب لینے والا ہو اور اسی کو جزا اور سزا کا اختیار ہو۔ پھر
یہ آلوہیت کی صفات نہ تجزیہ و تقسیم کے قابل ہیں نہ ایک وقت میں بہت سے
'اللہ' ہوں اور وہ ان صفات یا ان کے ایک ایک حصہ سے منصف ہوں، نہ یہ
وقتی اور زمانی ہیں کہ ایک 'اللہ' کبھی تو ان سے منصف ہو اور کبھی نہ ہو،
نہ یہ قابل انتقال ہیں کہ آج ایک 'اللہ' میں پائی جائیں اور کل دوسرے میں۔

آلوہیت کا یہ کامل اور صحیح تصور پیش کرنے کے بعد قرآن اپنے انتہائی
زور بیان کے ساتھ ثابت درتا ہے کہ کائنات کی جتنی اشیا اور جتنی قوتیں ہیں ان میں
سے کسی بونی یہ مفہوم راست نہیں آتا۔ تمام موجودات عالم محتاج ہیں، سفر
ہیں، مخلوق ہیں، نافع و ضار ہونا تو درکثار خود اپنی ذات سے ضرر کو دفع کرنے پر
 قادر نہیں ہیں۔ ان کے افعال اور ان کی تاثیرات کا سرچشمہ ان کی اپنی ذات میں

- ۱ یعنی یہ سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ بھی هماری (مدی ایڈ کی) طرح ایک جسم رکھتا ہے۔
- ۲ یعنی اللہ تعالیٰ کو کسی مادی شے سے تشبیہ دی جائے۔
- ۳ یعنی اللہ تعالیٰ بھی انسان و حیوان کے طرح صاحب نسل اور صاحب ولاد ہے۔
- ۴ ذلت بزری تعالیٰ - تصور اللہ ہونا۔
- ۵ یعنی نیز: یہ پرواء: بلند مرتبہ: (وہ جس کے طرف بہت بالشان کاموند میں رجوع کیا جائے۔
- ۶ بہت بڑا قیوم ہونے والا۔ یعنی مثل نہ منے والا۔

نہیں ہے بلکہ وہ سب کی اور اسے بیوی وجود، قوت فعل، اور قوت تسلیم
کرنے میں۔ لہذا انسان کی کبوتری سے ایسی نہیں جو آنونس ہے۔ اس سے
امال کرنے اور اس کو ہماری بیزار مندوں میں سے اسی ایک حصہ
اپنے اندر رکھی ہو اور جس کو ہماری بیزار مندوں میں سے اسی ایک حصہ
کا ہے حق پہنچتا ہو۔

اس نفی کے بعد وہ ایک ذائقے نے "آنونس، فنا بینت" کرتا ہے
جس کا نام "الله" ہے اور انسان سے مقابلہ کرتا ہے کہ سب کو جھوڑ کر
لئی ہو ایمان لاو، اسی کے آگے جپکو، اسی کی عضم دلو، اسی سے محبت
کرو، اسی سے خوف نزو، اسی سے اسید رنہیو، جو لچھے مانکو اسی سے
مانکو، ہر حال میں اسی پر توکل کرو اور عیشہ یاد رکھو کہ ایک دن اس کے
ہاتھ جانا ہے، اس کو حساب دینا ہے، اور تمہارا اچھا یا برا انجام اسی کے
بعلہ ہو سمجھرے۔

اُنہوں صفحات میں توحید کی حقیقت اور اس کے انقلابی پیغام کے بارے میں
ملئی اور عملی بحث کی جائے گی اور اس مسئلے "اسلام جو نظری طرز استدلال
اختیار کرتا ہے اسے پیش دیا جائے" میں بوسونع فوجی طرح تنقیح کے لئے
مندرجہ ذیل چیزوں کو سمجھنا ہوگا:

۱۔ زندگانی اتفاق حادثہ نہیں ہے لکھ اس کا لونی خالقی
اور حالم ہے۔

۲۔ بے خالق اور حالم ایک اور صرف ایک ہے اور اسی کی حکمرانی
اس کائنات میں غیر عرف دُر فرمائے۔

۳۔ توحید کے نظریے کے تعت خدا کا دلکش ایک مکمل تصور واضح ہوتا
ہے اور اسلام کے ہورے نظام فکر و عمل کی بنیاد اسی توحید
کے تصور پر ہے۔

۴۔ توحید کے انہات انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کیا
مرتب ہوتے ہیں اور اس نظریے کے تعت کیا انسان اور کیسا
معاشرہ وجود میں آتا ہے۔

اُنہوں صفحات میں انسیں مباحثت سے بحث کی گئی ہے۔

وجود باری تعالیٰ *

سب سے بہلا سوال جس سے ہیں سابقہ در پیش ہے وجود باری تعالیٰ کا
ہے۔ فلاسفہ اور اہل سائنس نے اس پر بہت کچھ لکھا ہے اور خصوصیت سے بھی
دو تین سو سال میں تو موافق اور مخالف دلائل کا ایک طومار لگ گیا ہے، لیکن
حقیقت یہ ہے کہ اہل فلسفہ کی ساری موشگافیاں انسان کی کوف و اوضع (رهنمای)
کرنے میں قطعاً ناکام رہی ہیں۔ بقول اکبر

فلسفی کو بعث کے اندر خدا ملتا نہیں
دُور کو سلужہ رہا ہے اور سیرا ملتا نہیں

اس بحث میں اہل سائنس نے وجہ اور بھی تیکمے انداز سے شرکت کی۔
انہاروں اور انیسویں صدی کے مادبہ، ہرست سائنسدان اس دعوے کے ساتھ مددان
میں اترے کہ خدا کا کوئی وجود نہیں۔ لاپائیں نے نظام شمسی پر اپنی
کتاب میں خدا کا نام تک نہ لیا اور جب نہولین نے اس سے تعجب سے بوجھا
کہ آخر کیا وجہ ہے کہ میں تمہاری کتاب میں خدا کا ذکر نہیں ہاتا ہوں،
تو اس نے شاہ فرانس سے کہا ”حضور والا ہمیں اس کی کوف ضرورت نہیں۔“
وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ لے کچھ اور بڑھتی گئی اور بالآخر انیسویں
صدی میں یہ کہا جانے لگا کہ سائنس نے خدا کے تصور کو ختم کر دیا ہے اور
کائنات کی ایک ایسی توجیہ کر دی ہے جو میں کسی مذہب اعلیٰ اور خالق کل کی
ضرورت باق نہیں ہے۔ لیکن یہ ایک خام خیالی تھی اور حالات نے جلد ہی بتا دیا
کہ انسان بہت سی آراء قائم کرنے میں بڑا جلا باز ہے!

وجود باری تعالیٰ کے موضوع پر کسی بحث سے بہلے یہ سمجھ لینا چاہیے
کہ خدا کا وجود حقیقی اور مادی نہیں ہے بلکہ مابعد الطبیعی ہے۔ عام طور
پر کسی چیز کے وجود کو جاننے کے لئے ہمارے پاس جو ذرائع و وسائل ہیں
ہو جو اس ہیں۔ سائنس اپنا علم انہی جو اس کے ذریعہ حاصل کر رکھے ہیں لیکن
جو چیزیں ان سے ماؤڑا ہیں، یعنی طبیعی کے بجائے مابعد الطبیعی ہیں، ان کو
جاننے کے لئے جو اس ناکافی ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں جو اس مجبور اور لاچار

* یہ حصہ مرتب کے قلم سے ہے اور اس کتاب کے لئے خاص طور پر لکھا گیا ہے۔ (منہ)

ہی اور اس کے حقائق کو جائز کر لیتے حواس ہمارے معین و مددگار نہیں ہو سکتے۔
بھی وجہ ہے کہ خدا کے معاملے میں اس طرح کے دلائل طلب کرنا جو حسی
دینا ہے متعلق ہوں با جو اس کے معیار کے مطابق ہوں ایک غیر عقلی اور
بھی سائنسیک مطالبه ہے۔

مادیت پرست سائنسدان جس غلطی کا شکار ہوئے وہ یہ تھی کہ انہوں نے
ہود سائنس کی حدود کو نہ سمجھا اور اس زعم میں مبتلا ہو گئے کہ سائنس
زندگی کے ہر عقدے کو حل کرسکتی ہے۔ جس طرح خشک کی سواری پانی پر
پے کار ہو جاتی ہے اسی طرح طبیعی دنیا کا مطالعہ کرنے والی سائنس مابعد طبیعی
حقائق کا ادراک نہیں کرسکتی۔ سائنس اپنے مخصوص دائیرے میں بڑی مفید
خدمت انجام دے رہی ہے لیکن اس کے نام پر کسی ایسی دنیا کی بات پیش
کرنا جو حواس کے دائیرے سے باہر ہے اور جس کے متعلق وہ کوئی علم نہیں رکھتی
ایک غیر سائنسیک بات ہے۔ اور ایسے دعوے کی کوئی وقت نہیں ہو سکتی۔
سائنس کی صورت یہ ہے کہ

۱۔ اس کا دائیرہ کار حسی اور طبیعی دنیا تک محدود ہے۔ اس سے باہر
کے بارے میں وہ خاموش ہے اور کچھ نہیں کہہ سکتی۔

۲۔ طبیعی دنیا میں بھی سائنس کا مطالعہ جزوی ہے کٹلی نہیں۔ وہ
ایک خاص پہلو یا جزو کا مطالعہ کرتی ہے پوری حقیقت کا ادراک
نہیں کرسکتی۔

۳۔ اس کا طریق مطالعے، مشاهدے اور تجربے پر مبنی ہے اور ایک
خاص طریق عمل کے ذریعے سے اس کی حاصل شدہ معلومات سے
قوانین، نظریات اور طبیعی نظام کے بارے میں تصورات قائم کیتے
جاتے ہیں۔ یہ ساری معلومات ظنی ہوتی ہیں، انہیں درجہ یقین
حاصل نہیں ہوتا۔ ابتدائی درجہ میں نسبتاً یقین کا عنصر سب سے
زیادہ ہوتا ہے اور جوں جوں نظریات اور تعبیرات کا حصہ بڑھتا
جاتا ہے ظن و تخمین کا عنصر بھی بڑھتا جاتا ہے۔ بھی وجہ ہے
کہ اکثر ایک دور کے سائنسی تصورات دوسرے دور کے سائنسی
تصورات کی تکذیب کر دیتے ہیں اور سر جیمس جینز کے بہ قول
سائنس کا دریا اٹھ رخ پر بہنے لگتا ہے۔

۲ سائنس کے مختلف شعبوں کے حاصل کردہ نتائج ایک دوسرے سے متصادم بھی ہوتے ہیں، اکثر ابسا ہوا ہے کہ فزکس اگر ایک سمت میں رہ نہیں کریں تو بیالوجی ایک دوسری سمت میں اور سائیکلوجی ایک تیسری سمت میں۔ اس لیے کسی ایک کو سائنس کہنا اور دوسرے کو نظر انداز کر دینا غیر حقیقت پسندانہ ہرویہ ہے۔

ان وجہ کی بنا پر بہ کہنا کہ سائنس خدا کے وجود کی نفی کریں ہے، ایک بے سروپا اور غیر عقلی دعویٰ ہے۔ بہ سوال ہی سائنس کے دائرہ کارے باہر ہے۔ وہ اس کے بارے میں بہ جز خاموشی کے اور کوئی موقف اختیار نہیں کرسکتی۔ فرانسیسی سائنس دان پروفیسر لیتر نے سچ کہا ہے کہ

”کائنات کے آغاز و انجام تک مشاہدے کی رسانی نہیں ہے۔ اس لیے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ کسی ازلی یا ابدی وجود کا انکار کریں۔ جس طرح ہمارا کام بہ بھی نہیں ہے کہ ہم اس کو ثابت کریں۔ ہمارا کام نفی و اثبات دونوں سے الگ ہے۔“

یہ تو ہے فطری صورت، لیکن اگر خود سائنسی فکر کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی میں پرانی سائنسی مادیت کے خلاف ایک شدید رد عمل رونما ہوا ہے اور سائنس کا نیا رجحان مذہب اور خدا کے وجود کے خلاف ہونے کے بجائے اسی سمت میں اشارہ کر رہا ہے۔ عکس ریز کی دریافت سے سائنس میں جو نیا فلسفیانہ رجحان شروع ہوا ہے اور نظریہ اخافیت اور نظریہ کوائم کے زیر سایہ جس نے ہپورش پائی ہے، وہ سائنس کو مذہب کے حقائق سے دور لے جانے کے بجائے ان سے قریب تر لے آیا ہے۔ عام فضائی بہ تبدیلی بڑی فکر انگیز ہے۔ ڈاکٹر لی کامست ڈونوی نے تو اپنی کتاب تقدیر انسانیت اس دعوے کے ساتھ پیش کی ہے کہ

”اگر ہم سائنس کے جمع شدہ سرمایہ کا تنقیدی مطالعہ کریں اور اس سے منطقی اور عقلی نتائج مستتبط کریں تو یہ نتائج لازمی طور پر ہمیں خدا تک لے آتے ہیں۔“

پروفیسر سولیون نے جوئی کے سائنس دانوں کے انکار کا جو نجومی پیش کیا ہے وہ یہ ہے:

و، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نئی دنیا کے سائنس میں مذہبی نقطہ نظر بھی اتنی ہی حجت و مدداقت کا حامل ہے جتنا سائنسی نقطہ نظر۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ماس نئی سائنسی دنیا کے سب سے بڑے نلاق (یعنی البرٹ آئنسٹائن) کی نظر میں تو مذہبی فکر ہی سائنسی نقطہ نظر کا مآخذ اور رہبر ہے۔^۱

اور ہر فیض جوڈ بہان تک کہہ گیا ہے کہ

”سر جیمس جینز اور سر ارٹو اینڈ نکسن کی کتب ہمیں بتاتی ہیں کہ بیسویں صدی کی فزکس نے طبعی دنیا کے بارے میں ایسیوں صدی کے تصورات میں انقلاب برپا کر دیا ہے اور یہ انقلاب مذہب سے مصالحت اور دوست داری کی سمت میں ہے۔ آج سائنس اور مذہب سے کائنات کی حقیقت کے بارے میں ایک ہی طرح کی بات کہہ رہے ہیں۔ گو اپنے نتائج تک پہنچنے کے لیے دونوں کے طریقہ تحقیق و مطالعہ جدا جدا ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج سائنس نے خدا کے تصور کا اثبات کر دیا ہے۔^۲“

جدید سائنسی فکر کے یہ رجحانات صحت مند ہیں اور ہوا کے نئے رخ کا پتہ دیتے ہیں۔ جہاں تک خالص سائنسی فکر طریقہ کا سوال ہے وہ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے حقائق کی اس نئی دنیا کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا جس کا تعلق مابعدالطبیعتیات سے ہے۔ کیوں کہ خدا کے وجود کا ادراک حواس کے ذریعے نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس کے باوجود عقل سلایم کی رہنمائی کے لیے انس و آفاق میں بے شمار شواہد موجود ہیں اور خود سائنس کی فراهم کردہ معلومات میں لا تعداد نشانیاں موجود ہیں جو ایک مذہب اور صاحب امر ہستی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو دیکھنے والی آنکھ اور سوچنے والا دماغ رکھتا ہو اس کائنات کے حقائق کو دیکھ کر بے اختیار پکار لیتا ہے کہ یہ کارخانہ رنگ و بو ایک حکیم اور دانا خالق اور فرمان روا کے بغیر نہ وجود میں اسکتا تھا اور نہ قائم رہ سکتا ہے۔ زمین سے لے کر آسمان تک ساری کائنات ایک مکمل نظام ہے اور یہ ہورا نظام ایک زبردست قانون کے تحت چل رہا ہے جس میں ہر طرف ایک ہمہ گیر اقتدار، ایک بے عیب حکمت، ایک بے خطأ علم کے آثار نظر آتے ہیں۔ یہ آثار اس بات پر دلالت

۱۔ ملاحظہ ہولند کا اخبار، دی آبزرور (The Observer)، ۱۳ اپریل ۱۹۳۰۔

۲۔ ملاحظہ موجود کی کتاب (God and Evil)، صفحہ ۱۴۰۔

کرتے ہیں کہ اس نظام کا ابک فرمان روا ہے۔ نظم کا تصور ایک ناظم کے بغیر، قانون کا تصور ایک حکمران کے بغیر، حکمت کا تصور ایک حکیم کے بغیر، علم کا تصور ایک عالم کے بغیر، اور سب سے بڑھ کر خلق کا تصور ایک خالق کے بغیر آخر کس طرح آ سکتا ہے۔ یہ کائنات ایک منصوبہ کے تحت کام کر رہی ہے۔ کیا یہ منصوبہ ایک منصوبہ کار کے بغیر ہی جاری و ساری ہو گیا ہے؟ اس کائنات میں کمال درجے کا حسن و توازن ہے۔ یہ حسن و توازن ایک منظم کے بغیر کیسے ممکن ہے؟ اس میں ایک ہمہ گیر اخلاق قانون کا فرما ہے جو خیر کو قائم رکھتا اور شر کو ختم کرتا ہے۔ یہ اخلاق انتخاب ایک صاحب ارادہ ہستی کے بغیر کیسے ممکن ہے؟ یہ کائنات ایک سلسلہ، مربوط اور معنی خیز کتاب کے مانند ہے۔ کیا اس کتاب کا کوئی مصنف نہیں؟ مسئلہ آرٹھر کینٹ نے مسچ کیا ہے:

"انسانی دساغ ان عظیم سوالات کو حل کرنے کے لیے ایک حقیر سا آئے ہے۔ ہمیں اس کی مجبوریوں کا اعتراف کر لینا چاہیے۔ لیکن ہر بھی یہ ہمہ وقت اس امر کا ادراک کر رہا ہے کہ کائنات کی ہر چیز کس قدر منظم اور مربوط ہے اور فطرت کی نت نئی ایجادات کیسی حیران کن ہیں۔ ہر سوت میں ایک مقصد کا فرما ہے۔ خواہ ہم عاسی ہوں۔ یا سائنسدان، ہمیں کائنات کے لیے ایک حاکم اعلیٰ کو ماننا پڑے کا۔ جو نام چاہے اس کو دے دو اور جو شکل چاہے اس کی تجویز کر دو مگر اس کو ماننے سے مفر نہیں۔"

اسی طرح اگر ہم اس کائنات کے آغاز ہر غور کریں تو ہمیں محسوس ہو گا کہ اس کے لیے کسی خالق کی موجودگی ضروری ہے۔ علت و معلول کا سلسلہ جہاں تک بھی چلا جائے، ایک نقطہ، آغاز یقیناً ماننا پڑے کا۔ اس سلسلے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں۔ ایک وہ جو خدا کو نہ ماننے والے کہتے ہیں، یعنی یہ کہ آغاز مادے سے ہوا، دوسرا وہ جو خدا کے ماننے والے کہتے ہیں۔ یعنی کہ آغاز ایک ذی شعور اور صاحب ارادہ ہستی سے ہوا۔ ان دونوں کے دلائل کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں مفروضے ہیں، کوئی تجربیاتی یا مشاهداتی دلیل کسی ایک کے حق میں نہیں پیش کی جاتی۔ البتہ جو بات خدا کے وجود کے حق میں کسی بھی بات کے حق میں نہیں پیش کی جاتی۔ البتہ جو بات خدا

۱۔ سر آرٹھر کینٹ، "I believe", صفحہ ۱۵۵۔

اول بادہ شعور سے محروم ہے۔ سوال یہ ہے کہ شعور سے ایک محروم چیز۔
بھی مادہ۔ ایک صاحب شعور کو کیسے جنم دے سکتا ہے؟ اس لئے کہ
یہود مجرد مادے سے بہت بلند ہے۔ لیکن، اگر خدا کو، جو خود صاحب شعور
ہے، تسلیم کر لیا جائے تو یہ مشکل رفع ہو جائے۔ اس طرح مادے کو نفعہ آغاز
ہان کرو گئنات کے تمام حقائق کی توجیہ نہیں کی جاسکتی لیکن انک بال اختصار و صاحب
ارادہ ہستی کو مبدأ ماننے کے بعد کوئی الجھن باق نہیں رہتی اور تم مسائل
اب ہے آپ حل ہو جاتے ہیں۔

بیزید براؤں، اگر ہم خدا کے وجود کو تسلیم نہ کریں اور گئنات کے
بیدا مادے کو قرار دیں تو انسانی اور حیوانی وجود کی تشريع بڑی مشکل نظر
آئی ہے۔ سرسری طور پر بڑی آسانی سے کہا جاسکتا ہے کہ مختلف اجزاء انک
تاب سے ملے اور یوں موجود میں اگئے، با دوسرے اجزا کسی اور تناسب
میں ملے اور حیوان یا انسان وجود میں اگئے، لیکن جدید سائنسی توقیوں کی
بنا پر ایسے 'اتفاقات' کو ماننا بڑا مشکل ہو گیا ہے۔ اس سامنے میں ڈاکٹر
فرنک ایلن کا کہنا ہے:

"پروٹین جو تم ذی حیات خلیوں کے اجزاء لازم کی حیثیت رکھتے
ہیں، پانچ عناصر۔ کاربن، ہائڈروجن، نائٹروجن، اکسیجن، اور
گندھک۔ پر مشتمل ہیں۔ ایک پروٹینی سالمہ ان عناصر کے چالیس
ہزار جوہروں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ گئنات میں ۹۲ کیمیائی عناصر
بالکل منتشر اور یہ ترتیب بکھرے ہوئے ہیں۔ اب اس امر کا امکن
کس حد تک ہے کہ ان ۹۲ عناصر کے یہ ترتیب ذہیر میں سے
نکل کر یہ پانچوں عناصر اس طرح باہم ملیں کہ ایک پروٹینی سالمہ
آپ سے آپ وجود میں آجائے؟ مادے کی وہ مقدار جس سے سلسل
ہلانے سے اتفاقاً یہ نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے اور وہ مدت جس
کے اندر اس کام کی تکمیل ممکن ہو، حساب لڈا کر معلوم کی
جاسکتی ہے۔"

"سوئزرلینڈ کے ایک حساب دان چارلس ایجوین گائی نے اس کا
حساب لگایا ہے اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ اس طرح کے کسی اتفاق
واقعہ کا امکان 10^{110} کے مقابلے میں صرف ایک درجہ ہو سکتا
ہے۔ صرف ایک پروٹینی سالمہ کو اتفاقاً وجود میں آنے کے لئے اس کے

۱۰ 10^{110} کا مطلب یہ ہے کہ 10^{10} کو 10^{10} ہی سے 10^{10} مرتبہ ضرب دیا جائے، گویا اس کے
سامنے 10^{10} صفر رکھ کر دیکھ لیجئے، اس کے مقابلے میں ایک امکان اس بات کا
ہو کہ ایک پروٹینی سالمہ خود بہ خود وجود میں آجائے۔

بوری کائنات کے موجودہ مادے سے کروڑوں گنا زیادہ مادہ مطلوب ہوا گا جسے یکجا کر کے ہلا با جانے اور اس عمل سے کوف نتیجہ برآمد ہونے کا امکان ۲۲۲ سال کے بعد پیدا ہوا ۔

'پروٹین' امینو ترشوں کے لمحے سلسلوں سے وجود میں آتے ہیں اس میں سب سے زیادہ اہمیت اس طریقے کی ہے جس سے یہ سلسلے ملیں ۔ اگر یہ غلط شکل میں یکجا ہو جائیں تو زندگی کی بقا کا ذریعہ بنتے کے بجائے مسلک زہر بن جاتے دیں ۔ پروفیسر جے۔ بی۔ لیڈز نے حساب لگایا ہے کہ ایک مادہ سے پروٹین کے سلسلے کو ۱۰۸ طریقوں سے یکجا کیا جاسکتا ہے ۔ یہ کسی طرح عقل میں آنے والی بات نہیں ہے کہ ایک پروٹینی سامنے کو وجود میں لانے کے لئے اتنے بہت سے بعد از امکان اتفاقات بہ یک وقت صادر ہو جائیں ۔ ۱۱۱

در حقیقت یہ اکمل مثال نہیں، بلکہ نباتات و حیوانات کا مطالعہ کرنے ہوئے ہم اس قسم کی بے شمار مثالوں سے واسطہ پڑتا ہے ۔ اس سلسلے میں ہم ارتقائی حیاتیات سے متعلق ایک مثال پر اکتفا کریں گے ۔

نظریہ ارتقا کی رو سے حیات کی زیادہ ترقی یافته شکیں درحقیقت کم ترقی یافته شکیں سے ظہور پذیر ہوئی ہیں ۔ چارلس ڈارون کے نظریے کے مطابق یہ ارتقا محض میکانیکی قوتون کی بنا پر ہوا ہے ۔ لیکن بعد کے ماہرین حیاتیات نے محسوس کیا کہ محض میکانیکی قوتیں ارتقا کی تحریک نہیں کر سکتیں ۔ مثال کے طور پر آنکھ کے ارتقا کا سئلہ لجھے ۔ اگر آنکھ کے عدسے کی ایک سطح میں اتفاقاً کوئی سعومی سی تبدیلی بھی ہو جائے (جس کے بغیر آنکھ کا ارضا ممکن نہیں ہے) تو اس کے ساتھ ہی ساتھ دوسری سطح میں بھی بہ یک وقت ایک مخصوص تبدیلی ہونی جاہے ۔ اس دوسری سطح میں تبدیلی لکھوکھا شکوں میں ہو سکتی ہے جس میں سے صرف ایک مخصوص تبدیلی کی ضرورت ہے ورنہ بینائی میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا؛ ان دونوں سطحوں میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ قریبیہ کی شکل را عدسے کے مرکز کے فاصلے میں تبدیلی ہونی چاہیے ۔ اور یہ سب تبدیلیاں بہ یک وقت ہونی چاہیے ورنہ بینائی بہتر نہ ہوگی ۔

حیاتیات کا مطالعہ کرنے والے کو اس قسم کی بے شمار مثالوں سے سابقہ

J. C. Monsing, *The Evidence of God in an Expanding Universe*,

ترجمہ از عبدالحمید صدیقی ۔

۱۔ PP. 27-36
۲۔ یہ مثال آر نلہ لن (Arnold Lunn) کے مقدمہ کتاب 'Is Evolution Proved?' میں ہے ۔

گنجی ۵ ۔

ایسا ہے جہاں محسوس ہوتا ہے کہ سب کچھ اندھے اتفاقات سے نہیں بلکہ
دوسرے سمجھے منصوبے کے پیش نظر ہوا ہے۔

نظریہ ارتقا ابتداءً دو سائنسدانوں نے پیش کیا تھا۔ ایک چارلس ڈارون اور
دوسرا الفرڈ رسل ولاس۔ ایکن بعد میں الفرڈ رسل ولاس نے اپنی کتاب شائع
ہی اور نظریہ ارتقا کا سردا ڈارون کے سر بندھا، ایکن ڈارون کے نظریات کے
عکس ولاس کا کہنا تھا کہ محض فطری قوتوں کے ذریعے انسانی وجود کی تشریح
نہیں کی جاسکتی۔ اس کا خیال یہ تھا کہ "حیاتیاتی دنیا میں کم از کم تین
ایک مقامات آتے ہیں جہاں کسی نئی قوت یا علت کی مداخلات لازمی ہوئی ہے۔
ایک وہ وقت جب کہ پہلے جان دار خلیے کی تشكیل ہوئی، دوسرا وہ مقام جہاں
یہ حیوانات اور نباتاتی زندگی جدا ہوئی، اور تیسرا وہ وقت جب انسان عالم وجود
ہیں آباد۔" یہ بات کہنے سے ولاس کا مقصد بھی بھی یہی ہے کہ کم از کم تین
ایک نہیں مقامات آتے ہیں جہاں بات کو اتفاقات کا سسارا لے کر نہیں ثالا جاسکتا
اور کسی بلند ترقوت کے وجود کو ماننا پڑتا ہے۔

ارتقائے کائنات کے مسئلے پر جتنا غور کیا جائے ایک خالق اور رب کی
ضرورت کا احساس اتنا ہی شدید ہوتا جاتا ہے۔ نظریہ ارتقا سے معلوم ہوتا ہے
یہ اس کائنات میں زندگی کے ظہور سے قبل یہ شمار غیر معمولی اور ہمہ گیر
تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ زمین نے ایک خاص ہیئت اختیار کی، ہوا اور پانی کی ایک
محضوں شکل قابیم ہوئی۔ موسم کا نظام اور ٹپریجہ زندگی کے قیام اور بقا کے ائے
سازگار ہوئے۔ ان گنت تبدیلیوں کے بعد یہ زمین انسان کا مستقر بننے کے ائے
تیار ہوئی اور پھر زندگی کا ظہور ہوا۔ سوال یہ کہ اتنی منظم، مرتب اور
منضبط تبدیلیاں آپ سے آپ کیسے واقع ہو سکتی ہیں؟ ہر چیز ایک دوسرے
سے پیوست ہو اور تم تبدیلیوں کے تعاون و توافق سے زندگی کے آئندہ مراحل ملئے
ہونے کے لائق بنیں۔ کیا ایک ہمہ گیر حکمت کے بغیر یہ سب مناسب تبدیلیاں
واقع ہو سکتی ہیں؟ کیا عقل اسے ماننے کے لیے تیار ہے کہ یہ سب محض ایک
حادثہ اور اتفاق کی بنا پر ہو گیا۔ اگر اس کا نام 'حادثہ' اور 'اتفاق' ہے تو
بہر لغت میں ان الفاظ کے معنی تبدیل کرنے ہوں گے!

کیا کبھی ابسا 'اتفاق'، بھی واقع ہوا ہے کہ حروف کو ایک ٹیکے میں
ڈال کر ہلا کیا ہو اور جب ان کو دوبارہ زمین پر ڈالا گیا ہو تو ان سے ایک

مربوط عبارت بن گئی ہو؟ کہا کہی ابسا 'حدانہ' ہوی ہمچ آبا ہے کہ غالباً
با اقبال کی کسی غزل کے الفاظ الٹ بلٹ کر کسی جاہل کو دیئے گئے ہوں اور
وہ الفاظ کو آگے پیچھے رکھ کر ترتیب دے اور غالب با اقبال کی غزل نکل آئے،
حالان کہ حروف، الفاظ، ترکیبیں، استعارے سب وہی ہوں؟ اگر اس طرح ایک
شعر نہیں بن سکتا تو بہ ہوئی کائنات اور جو کچھ اس میں ہے کس طرح بن سکتے
ہیں؟ بے شک

صُنْعَ الْوَالِيَّ أَنْفَقَ كُلَّ شَيْءٍ

امَّا اللَّهُ ذَرَ صَنْتَ هَذِهِ جِنَّةَ هَرَ شَيْءٍ
کر مقصوب (نظم پر) بنایا۔ (نمل - ۸۸)

وَحَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ؛ فَقَدْرَ ذَنْقَدِيَّ

خدا نے ہر چیز کو پیدا کی، پھر اس
کا ایک الہادہ معین کیا۔ (فرقہ - ۲)

حیات و کائنات کی ان جنم منائیں تھیں بات واقع ہو جاتی ہے کہ سائنسی
تعاریفات اور عقل سليم دونوں اس بات پر منفق ہیں کہ ہم اس دنیا کو محض
اتفاقات کی نتیجہ قرار نہیں دے سکتے۔ اس کی ہر شے زبان حال سے پکار رہی ہے
کہ کسی صاحب حکمت اور ذی اختیار ہستی نے اسے وجود بخشنا ہے۔ وہی اس کی
خالق ہے اور وہی اس کی حاکم اور فرمان روا ہے۔

وجود باری پر قرآن کا استدلال*

وَحَىٰ مُحَمَّدٰى کا سب سے پہلا دعویٰ یہ ہے کہ اس ایک قادر مطلق،
خالق عالم اور صانع کائنات ہستی کا اعتراف انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ مسلمان
سے مسلمان اور وحشی سے وحشی قوم میں بھی اس اشرف کا سراغ ملتا ہے۔ آثار قدیمه
کی تحقیقات نے سیکڑوں مردہ اور گھمیدم قوموں کی تاریخ کا سراغ لگایا، جس میں
سامانِ تمدن، اعلیٰ خیالات اور علوم کی لاکوں کمی محسوس ہوتی ہو، مگر
مذہبی عقیدت اور نسبی خدا کے اشرف کی کمی بالکل نظر نہیں آتی۔ آنکی
عمراًتوں کے سببم کہنندروں میں جو جیز سب سے بہلے متی ہے وہ کسی معد
کی حیاز دیواری ہوتی ہے۔ آج بھی دنیا کے مختلف گوشوں میں جو بالکل وحشی
• ب حصہ مولاز سے مسلمان ندوی کی کتب سیرت النبی جلد چہارم میں مانعوذ۔ (مرتب)

مُلْكٍ مِّنْ وَهُنَّ كُسْبَىٰ نَهْ كُسْبَىٰ شَكْلٍ مِّنْ عَالَمٍ كَخَالِقٍ اُورَكَانَاتٍ كَعَوْنَىٰ كَتَخْيِيلٍ هِيَ بَهْرَهُ وَرَهْيَنَ - غَرْضٌ، جَمَاعَتٌ انسَانٌ كَكُوفٍ حَصَهُ، زَمِينٌ كَمَانٍ، مَوْلَىٰ كَوْشَهُ، زَمَانٌ كَكُوفٍ عَهْدٌ اسْ تَخْيِيلٍ سَهْ خَالِيٰ نَهْيَنَ مَلَتا - اسْ سَهْ ظَاهِرٌ هُونَا هِيَ كَهْ اعْتَرَافٌ بَهْيَ انسَانٌ كَفَطْرِي تَصْوِيرَاتٍ اُورَ وَجْدَانِي جَذَبَاتٍ مِّنْ دَاخِلٍ هِيَ، اسْ لَيْسَ وَهِيَ مُحَمَّدِي نَعْسَنَ كَوْ فَطَرَتٍ سَهْ تَعْبِيرٍ كَيَا هِيَ:

الْأَنْوَشُوكَ قَاطِنُوكَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ
الْأَنْوَشُوكَ لَيَعْلَمُونَ

اپٰنے سب مُرْفٰ سے پھیر کر، دین کی طرف کر، یہ خدا کو وہ فطرت سے جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کی۔ خدا کی خلقت میں تبدیل نہیں، بھی سیدھا اور نہیک دین ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں۔ (روم۔ ۳۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

كُل مولود يولد على الفطرة مُر بجه فطرت بريدا هونا ہے۔

اسی لئے خدا کا اعتراف روز ازل کا وہ عہد و پیمان ہے جو خالق و مخلوق کے درمیان ہوا تھا۔ اور یہ اسی عہد و پیمان کا احساس ہے جو انسان کی رُسگ و پی میں سراہت کئی ہوئے ہے کہ ہزار انکار کے بعد بھی کسی نہ کسی رنگ میں وہ اعتراف نہیں ہو جاتا ہے۔

انسان کی یہ جذبہ فطرت کبھی کبھی خارجی اثرات سے دب جاتا ہے۔ وہی مُحَمَّدِی نے بار بار انسان کے اسی دبے ہوئے جذبہ کو ابھارا ہے۔ اور اسی زبرخانہ لستر آسی کو ہوا دی ہے اور انسان تو اس کا بھولا ہوا وعدہ باد دلا یا ہے۔ وہ انسانوں سے بوجھتی ہے:

أَلَيْ أَنْوَشُوكَ قَاطِنُوكَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ

کیا آسانوں اور زمین کے پیدا کرنے
والے خدا میں شک ہے؟ (ابراهیم۔ ۱۰)

ایک اور مقام پر اس نے کہا:

أَمْ خَلَقُوا مِنْ غَلِيْثَنِي؛ أَمْ فَهُمْ أَغْلَفُونَ؛ أَمْ خَلَقُوا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بَلْ أَلْيُونُقُونَ؛
کیا وہ آپ ہی آپ بن گئے یا وہی اپنے خالق ہیں یہ انہیں نہیں لیجے آسانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے (یہ کوئی بات نہیں) بلکہ ان کو یقین نہیں ہے۔

(طور۔ ۲۵۔ ۳۶)

دنیا اور کائنات جس میں انسان بھی شامل ہے، اور جو اپنی عقل اور

فهم کی بنا پر سب سے بالاتر ہے، بہ مر حال موجود ہے، اور اس کے اس وجود

میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کسی کے بن ہنائے؟ آپ سے آپ بن گئی ہے، یا خود اس نے انہے آپ کو بنایا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں باطل ہیں۔ نہ آپ سے آپ کوئی چیز بن سکتی ہے اور نہ کوئی مفعول اپنا فاعل آپ ہو سکتا ہے، اگر کوئی یہ وقوف ہے تو کہ کہ نہ مادہ، نہ دراہنا بچہ پیدا کرنے میں تو اس سے اوجھا جانے کا دہ سلسلہ تولد و نسل کا آغاز کیوں کر ہوا اور اولین نہ مادہ کا اور مادہ تخلیق و روح کا خالق کون ہے؟

یہ کوئی گون عالم، یہ رنگ رنگ کائنات، یہ تاروں یہاں آسمان، یہ بوقلمون زمین، یہ سورج، یہ چاند، یہ درخت، یہ سمندر، یہ پہاڑ، لا دھوں جان دار اور بے جان اشیا، یہ علل و مہاب کا تسلیل، یہ تغیر و انقلاب کا نظام، یہ کائنات کا نظم، اور اس کے ذرہ ذرہ کا قاعدہ و قانون، انسان کے اندر ہر قوی اور ان کی باہمی ترتیب، موت و حیات کے اسرار، خواص و قوی کے رسم، انسان کی خیالی بلند ہروازی، اور عملی عجز و درماندگی، یہ تمام باتیں ایک خالق و ممانع کے اعتراف ہر مجبور کرنی ہیں۔ یہ نیل گون آسمان کی چھٹ، یہ زمین نا-بزرگ زار فرش، اور ایک ہی حرکت سے شب و روز کا انقلاب ایک خالق کی کا ہتھ دیتا ہے:

لَّهُ فِي خَلْقِ الشَّمْوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِنَّاتِ لَيَكُونُ لِأَحَدٍ إِلَّا لَهُ
آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے بدلتے میں
عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں (آل عمران، ۱۹۰)

شب و روز کا نور و ظلمت، یہ سورج اور یہ چاند کی روشنی، ان کی بزرگ، زومار، اور باقاعدہ طلوع و غروب اس کی دلیل ہے کہ اس اہل ایام ہر دن سوارث جس کے ہاتھ میں اس کا سیاہ و سبید ہے۔

وَمِنْ أَيْمَانِ الْيَنِيلِ وَالنَّهَارِ وَالشَّمْسِ وَالْقَمَرِ

اور اس کی نشانیوں میں سے رات دن اور سورج اور چاند ہیں۔ (فصل۔ ۲۷)

آسمان و زمین کی عجیب و غریب خلقت کے ساتھ خود انسان کی اہنی برداشت کی خالیہ کتنی عجیب ہے:

لَنْ فِي الْأَرْضِ وَلَا تُنْفَخُ الْمَوْتَىٰ فَوْقَ الْأَرْضِ وَمَا يَهْدُ مِنْ ذَكَرٍ إِلَّا لِلْهُمَّ لَذِقْنَاهُ

بے شک آسمانوں میں اور زمین میں ایمان والوں کے لئے نشانیاں ہیں اور خود
زمارے اور ان حیوانات کے پیدا کرنے میں، جن کو زمین میں پہلا رکھا
یقین کرنے والوں کے لئے دلیل ہیں۔ (الباجیۃ - ۲۰۳)

سورہ انعام میں نباتات اور ان کی نیز نکلوں کو اپنی هستیوں کی دلیل میں
پیش کیا۔ یہ کتنے اچھے کی بات ہے کہ ایک ہی زمین ہے جس میں سے وہ
اگنے ہیں، ایک ہی ہائی ہے جس سے وہ سینچے جاتے ہیں، ایک ہی ہوا
ہے جس میں وہ سانس لیتے ہیں، مگر کتنے رنگ بونگ کے بھول بھول، میوے
اور درخت لکتے ہیں، جن میں سے ہر ایک کا رنگ، ہر ایک کا مزہ، ہر ایک
کی ہنسی، ہر ایک کا قد و قامت، ہر ایک کے خواص اور فائدے، دوسرے سے
بالکل الگ ہوتے ہیں۔

سورہ روم میں ۶۸ میٹر سے انسان کی بیدائش کو، ہر اس میں عورت
مرد کے جوڑے ہونے کو، اور ان کے درمیان مہر و محبت کے جذبات کے
ظہور کو اپنی هستی کی دلیل بنایا ہے۔ ہر اپنی قدرت کے دوسرے عجائب
کو، جو انسان سے زمین تک پہنچتے ہیں، ایک ایک کر کے پیش کیا ہے، اول تو
خود انسانوں کی بیدائش، ہر ان میں عورت مرد ہونا اور ان کے درمیان جذبات
کی لہر، ہر مختلف قوموں کی بولیوں، شہروں اور رنگوں کو دیکھو دہ
ایک ایک سے الگ ہے، ہر انسانوں کے اندر کے امہل دو دیکھو، ایک
نیند ہی کی حدیث پر غور کرو، یہی تمہاری آنکھیں نہول دینے کے لئے
کافی ہے۔

سورہ لہان میں انسانوں کے، کسی نظر نہ آئے والے سہارے کے بغیر دھڑے
ہونے اور زمین کے اپنی جگہ ہر نہیں رہے ہونے کا ذکر ہے، یہ نظر نہ آئے والا
سہارا، قوت کشش ہی سہی، لیکن وہ بھی تو اسی کے اسرار میں سے ہے۔
اس کے بعد ایک جامد اور بے حیات مردہ زمین کے اندر سے ہانی برستے کے ساتھ
انواع و اقسام کی زندگی کے نمونوں کا آبہر آنا کرتا حیرت انگیز ہے، یہ بھی
اسی کا درسمہ ہے۔

سورہ سعده میں انسان کی بیدائش کا منی سے آغاز، ہر قطرہ آب (نطفہ)
کے ذریعہ توالد و تناسل، ہر اس کے سلسلہ جسم کا بن جانا، ہر اس منی کے

مردہ قالب میں دفعتاً کہیں ہے زندگی آجانا اور اس میں روح بھیک جانا اور اس میں علم و حواس کے حیرت انکیز آلات کا ہدا ہو جانا ان سب کو اپنی صفر میں پیش کیا ہے۔

مردہ زمین کے اندر کیا کیا قوتیں ودیعت ہیں، اور خود انسانوں کے جسم و جان میں عجائبات کا کتنا خزانہ رکھا ہے، لیکن کوئی صاحب نظر نہیں دیکھتا۔ انسان کی زندگی، اس کے اندر وہ جذبات، حواس، ذہنی قویٰ اور دماغی حرکات، ان میں سے ہر شے معہ ہے:

وَفِي الْأَرْضِ يَتَعَالَى الْمُؤْمِنُونَ وَفِي الْقَمَاطِكُوْنَ أَفَلَا تَعْرِفُونَ؟

اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے، نشانیاں اور خود تھماری جانوں کے اندر، کیا تم ہیں، اور خود نظر نہیں کرنے؟ (ذاریات ۲۱۰۲۰)

جانوروں کے جسموں کے الدر جو عجیب و غریب نظام ہے، وہ بھی لمحوں کے قابل ہے۔ ایک ہی گہاں ہہوں کی غذا ان کے بیٹ میں جاتی ہے، بھر اسی کا کچھ حصہ لید اور کوپر، کچھ خون اور کچھ دودھ بن جاتا ہے۔ اور اسی لید اور کوپر کے باعترائے کے راستوں اور سرخ خون کی رگوں کے درمیان سے خالص سپید شیرین دودھ کی دھاروں کا نکلنا کتنا عجیب ہے!

ایک ہی قسم کے ہیں۔ اگر ان دو ایک طرح سے نہماں نو تمہاری ہوں اور دوست کو بزمائتے ہیں، اور دوسری طرح نہماں (بعنی مسیات ہنالہ استعمال ہدو) تو اس کو ضائع کر دیتے ہیں۔

زمین اور زمین ہر کی مخلوقات کو چھوڑ دی، انسان کی طرف نظر آنہا، سورج کا روسن چراغ اور چاند کی خوش نہ قندیل کتنی عجیب ہے، بھر سورج دو دیکھو دہ سال کے بارہ بیسینوں میں آہن کے بارہ برج طے کر کے کس طرح زمین میں مختلف موسموں اور زمانوں کو نایاب ہرنا ہے۔

ان میں چند چیزوں تک اس تی قدرت کے عجائبات خود نہیں، بلکہ عرب سے اپنی خلقت، اپنی حکم روش، اور اپنے قانون فطرت سے اس کی کوامی دیتی ہے:

صُنْهَ اللَّوَالَّذِي أَنْفَقَ كُلَّ شَيْءٍ

اسِ اللہ کی صفت ہے جس نے ہر شے کو
مضبوط (نظام پر) بنایا۔ (الململ - ۸۸)

اس کی صفت ہر قسم کے عیب سے باک ہے۔ اس میں ... حکم نظم و نسق
بی بندش نظر آتی ہے۔

إِنَّهُ لِمَنِ يَرَى فِي خَلْقِ الرَّحْمَنِ مِنْ تَفْوِيتٍ فَلَا يَرْجُو الْبَعْرَهَلْ تَرَى مِنْ فُطُورٍ فَلَا يَرْجُو الْبَعْرَكَرَزَنْ يَنْقُلُبُ إِلَيْكَ
الْبَعْرَخَلِيْسَنَا هُوَ حَيْدَرٌ

نبھے سہر والی خدا کی بناوٹ میں کوف بے برابری نظر آتی ہے؟ پھر نگاہ کر کیا کوف
نگار دکھانی پڑنا ہے، پھر دھرا کر دوبارہ نظر کر۔ تیری نگاہ، رد ہو کر نہ کر نبھے
نک پلت آئے (مگر کوئی نفس نہ پاسکے گی)۔ (السلک - ۲)

اس قسم کی اور سینکڑوں آیتیں ہیں جن کا ذکر ہی مسئلہ ہے، ان آیتوں
میں تین قسم کے دلائل ہیں،

۱۔ قدرت کے عجائب اور نیزگیان، اور ہر ان کا ایک قانون کے
ماتحت ہونا۔

۲۔ عالم کا نظم و نسق اور اس کا مرتب سلسلہ۔

۳۔ کائنات اور سلسلہ عالم کی ہر گزی میں یہ انتہا مباحثتوں،
حکمتوں اور فائدوں کا ہونا۔

ان مقدمات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کے یہ عجائب اور
اس کے یہ نظم علل و اسباب، خود ہے خود بخ و اسماق سے نہیں بن کر بلکہ
لئی حکیم و دانا اور قادر مطلق مانع نے اپنی قدرت اور ارادہ سے ان کو بنایا ہے۔

توحید کے دلائل *

اس سے ہمیں ہم دیکھو چکے ہیں لہ غفل و وجدان اس بات پر بخی ہیں لہ
اس کائنات کی تخلیق نے ایسی ذی سعور اور صاحب اخبار عستی کی ضرورت ہے۔

* یہ حصہ ولاد امین احسن اصلحی کی کتاب "حقیقت توحید" سے ماحوذ ہے۔ لیکن
مسنون کی موجودہ مرتب کتاب کی قابل کردہ ہے۔ (مرتب)

اب ہم یہ دیکھیں سچ کہ عقل کی رو سے اس کائنات کا وجود و بقا مغض
ایک ہستی کو رہیں ملت ہے۔ عقلی طور پر ابک سے زیادہ خالق و مالک ہستیں
کا وجود ناممکن نہیں ہے۔

اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہر اجتماعی نظام اس بات کا
تفاضلا کرنا ہے کہ حاکمیت غیر منقسم ہو۔ ہم اپنی اجتماعی زندگی میں کسی
سیاسی تنظیم کا تصور اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک حاکمیت کو کسی
ایک خاص مرکز میں مرکز نہ کریں۔ تمام سیاسی تنظیمات میں جمهوریت و
نظام ہے جس نے حاکمیت کو ایک وسیع دائیرے میں ہٹالنے کی کوشش کی ہے،
ناہم اس میں بھی ایک نقطہ لازماً تسلیم کرنا پڑتا ہے جہاں اس کی ہوئی ہوں
حاکمیت سے بھی اور مجتمع ہوئی ہے۔ اگر اس انہوں تو اس کا نراج کے طوفان
میں منتشر ہو جانا لازمی ہے۔ بہر حال بہ امر بالکل قطعی ہے کہ حاکمیت کی
 تقسیم کے ساتھ کسی اجتماعی تنظیم کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اب ذرا سوچیں
کہ یہ دنیا اتنے بے شمار اجزا ہر مشتمل ہونے کے باوجود نہ صرف قائم ہے بلکہ
ہورنے استحکام کے ساتھ قائم ہے، اس میں مختلف قوتوں کا تصادم بھی ہے، اضداد
کی آونیزیں بھی ہیں، خیر و شر کے معروکے بھی ہیں، لیکن دنیا کی کشتمی ہے کہ
ان موجود کے تلاطم کے اندر سے بچتی سنبھالتی اور کترائی ہوئی چلی جا رہی ہے۔
ان اضداد کے باوجود دنیا کی بقا مغض اس بنا پر ہے کہ اس دنیا میں کثی حکمران
نہیں بلکہ صرف ایک حکمران ہے، جس کا اختیار سب سے ہالاتر ہے اور وہ ان سب
کو سنبھالنے ہونے ہے۔

ایک اور اہم ہبلو اس کائنات کے مختلف 'جزا کا باہمی تواافق اور ان کی
باہمی سازگاری ہے، اسی طرح کی موافقت اور سازگاری جیسی کہ زوجین میں نظر
آئی ہے۔ عورت اور مرد اپنی خصوصیات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل
مختلف ہیں لیکن اس کے باوجود اگر عورت نہ ہو تو مرد کی قابلیتوں اور قوتوں
کا بڑا حصہ بالکل بے معنی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر مرد کو معدوم فرض
کرایا جائے تو عورت کی خصوصیات و صفات کی سرے سے توجیہ ہی ناممکن
ہو جانے کی۔ نہیں کہی حال اس کائنات کے تمام اجزاء مختلف ہے۔ زین و آہان،
شب و روز، نرمی و سردی، نور و ظلمت، حرارت و برودت سب زوجین کا سا اخلاف
اور سب انہی ۵ سا شدید اتصال رکھتے ہیں۔

توافق کا یہ ملتو صرف خدین ہی میں نہیں۔ بلکہ اس کائنات کے نظام پر
ببور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایک ہمہ گیر توافق اور سازکاری ہے،
هر چیز اپنی ہستی کی بقا اور اپنے وجود کی نشوونما کے لئے اس بات کی محتاج ہے،
یہ بہ ہمرا کارخانہ اس کے لئے سرگرم کار رہے۔ گیہوں کا ایک بودا وجود میں
اکد اس وقت تک اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کائنات کے تمام
عناد اس کی پرورش و نگهداری میں اپنا اپنا حصہ پورا نہ کریں؛ زمین اس کے
لئے گھوارہ مہیا کرے، ابر اس کے لئے رطوبت فراہم کرے، سورج اس کو گرم
رکھے، شبیم اس کو ٹھنڈک پہنچانے، ہوانیں اس کو لوریاں دین اور جب یہ
سب کچھ ایک نظم و ضبط کے ساتھ مکمل ہولے تب گیہوں کا ایک دانہ کھیت
یہ خرمن تک پہنچتا ہے۔ بھی حال دنیا کی ایک ایک چیز کا ہے۔

جو انسان اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ زمین و آسمان اس توافق و
ہم آنکھ کے ساتھ اس کی خدمت میں سرگرم ہیں، زمین اس کے لئے بستر کی
طرح بچھی ہوئی ہے اور آسمان شامیانہ بن کر اس پر تنا ہوا ہے، بہر آسمان سے
ہائی بستا ہے اور زمین اس سے اپنے اہل ہیدا کرتی ہے اور وہ بہل انسان کے لئے
لذت اور بقائے زندگی کا وسیلہ بنتے ہیں، وہ انسان یہ کیسے تصور کر سکتا ہے کہ
آسمان کے دیوتا الگ ہیں اور زمین کے دیوتا الگ ہیں، بارش کوئی لاتا ہے اور
بہل کوئی ہیدا کرتا ہے؟ ان اضداد اور عناصر مختلفہ کی یہ سازکاری تو اسی وقت
ممکن ہے جب ان سب دو ایک ہی کارفروں اور مدبر، قوت، حکمت و رحمت کے
ساتھ ایک خاص مقصد کے لئے تصرف میں لائے۔

قرآن اس عالم کی ہمہ گیر ہم آنکھ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بادلوں سے
ہائی بستا ہے، اس سے زمین لہلہا الٹتی ہے۔ اس کی نباتات کو چوپانے چڑتے
ہیں۔ اس سے ان کے اندر دودھ بنتا ہے۔ پھر الائشون اور خون کے اندر سے مفید
دودھ کی دهاربین نکلتی ہیں اور یہ دودھ پنے والوں کے لئے نہایت لذیذ اور قوت
بخشن غذا کا کام دیتا ہے۔ پھر اس بارش کے پرورش کی ہوئے انگور اور کوچور
کے بہلوں سے انسان اپنی لذت اور ضرورت کی طرح طرح کی چیزوں ہیدا کر لیتا ہے۔
بھور شہد کی مکھیاں ہیں جو بہاریوں کی بلندیوں پر، درختوں پر، انگور کی ٹکڑیوں
میں اپنے جوہتے بنایتی ہیں۔ بھول بھول کا رس چوس چوس کر اس کو جمع کری
ہے اس کے نیکے میں بخلاف اور بڑے بخی بخیاف۔ انسان اس کو بہتا ہے،

اس سے لذت بھی حاصل کرتا ہے اور بہاریوں میں شفا بھی ۔ ان مناظر کو جو بھی دیدہ، عبرت سے دیکھئے گا کس طرح باور کر سکتا ہے کہ یہ دنیا اور اس کے یہ تمام حیرت انکیز مناظر بالکل ایک اتفاقِ حادثے کے طور پر ظہور میں آگئے ہیں؟ یا یہ یہ ہے آسمان و زمین اور ان کے مختلف جلوے، مختلف دیوتاؤں کی کارفرماںیوں کے کوششیں؟ جو دنیا انترے بعد اجرا کی کشاکشوں کے اندر بھی توازن و سازگاری کے انترے ہم لو رکھتی ہے وہ نہ تو اتفاقِ حادثہ ہو سکتی ہے اور نہ مختلف ارادوں کی رزم نہ ہو سکتی ہے ۔ ظاہر یہی نکاہیں صرف موجودوں کے تلاطم کو دیکھتی ہیں، موجودوں کے اندر کے صدف اور صدف کے اندر پرورش ہانے والے گھر تک ان کی رسائی نہیں ہوئی ۔ اور بھی وہ حقیقت ہے جن کی طرف قرآن مجید بار بار توجہ دلاتا ہے ۔ یہ اس کائنات کے صرف اضداد کو نہ دیکھو بلکہ ان صالح ننان کو دیکھو جو ان اضداد کی کشاکش کے اندر ہیدا ہو رہے ہیں ۔ اور اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ ایک ہی حکیم ہاته اس کائنات پر متصرف ہے ۔

کھاری رافی کے ایک سمندر اور شیریں رافی کے ایک دریا میں کتنا کھلا عواضیاد ہے ۔ تاہم دیکھو، یہ دونوں کس طرح ایک مشترک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں ۔ کس طرح ان دونوں سے انسان اپنے ایسے غذا کا ذخیرہ حاصل کر لیتا ہے ۔ کس طرح یہ جہاز رافی اور تجارت کے نہایت آسان ذرائع فراہم کرنے ہیں ۔

بیور شب کی ظلم اور دن کے نور پر خور کرو، دونوں اپنی صفات، خصوصیات میں کس اور ایک دوسرے کی خلاف واقع ہونے ہیں لیکن ایک دوسرے کی خلاف ہونے کے باوجود، بوزی ہم آہنگی اور سازگاری کے ساتھ، ایک داہمی طرح اس کائنات کی پرورش اور اس کے اندر بننے والے حیوانوں، انسانوں اور نباتات کی خدمت میں سرگرم ہیں ۔ سورج دن میں طلوع ہوتا ہے، اور گریں اور دھوپ کا سرچشمہ ہے ۔ چاند شب میں نمودار ہوتا ہے اور روشنی اور خنکی کا منبع ہے ۔ یہ ظاہر دونوں ایک دوسرے سے کم قدر مختلف ہیں لیکن دیکھئے ہو کہ اس دنیا کا ایک ایک وجود ان سے مستعین ہو رہا ہے اور یہ انسان کو بالواسطہ اور بلا واسطہ فیضِ رسانی پر ماورہ ہیں ۔ کیا یہ سب کچھ اتفاق ہے؟ کیا یہ نظم، یہ ضابطہ کی پابندی، یہ سازگاری، یہ فیضِ رسانی سب کچھ اپ سے آپ ہو رہی ہے؟ ان مشاعرات کے باوجود جو لوگ دنیا کے

انقلاب حدوث پر اصرار کرتے ہیں ان کا دہ اصرار مخفی، نہ ماننے کی خواہش
بڑی ہے۔ علم و تحقیق سے اس ذہنیت کو کچھ سروکار نہیں ہے۔
بہر جو چیز ہری نظر کو متوجہ کرتی ہے وہ اس کائنات کا حسن و جمال

ہے جو اس کے ہر گوشے میں جلوہ آ رہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیا کی کوئی چیز بھی سادہ، بے رنگ نہیں ہے۔ آسمان سے لے کر زمین تک کوئی اسما
بیہ نہیں ہے جہاں سے انسان غافل اور بے ہر روز سکرے۔ ہر جنکہ اس کے دل
دلزرب مناظر، بے حجاب جلوے، اور شیرین نعمے موجود ہیں، اور ساتھ ہی^ج
انہ کے اندر حسن کا نہایت کھرا احمد۔ اس ودعت کر دیا گیا ہے۔ اس وجہ سے
جب وہ انہے ارد گرد حسن و جمال کے یہ ابو قلمون جلوے دیکھتا ہے تو دلعتا
اس کے اندر ان کے صانع کے متعلق سوال پیدا ہو جاتا ہے، کیوں کہ وہ یہ تصور
کرنے سے بالکل قادر ہے کہ اتنی دلزربیوں سے یہ معمور دنیا خود بہ خود
 وجود میں آکتی۔ اگر اس کے دل و دماغ پر پردا نہ پڑا ہو تو وہ بے اختیار
بکار آنہا ہے:

فَتَبَّاعَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْأَلْفِينَ

بڑا ہی خیر و برکت والا ہے اللہ جو تمام
صناعوں سے بڑھ کر ہے۔ (المومنون۔ ۱۴)

یعنی صرف اس بات کا احساس نہیں ہوتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق
ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر بہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ خالق ہم تین خالق
ہے۔ یکسر خیر و برکت ہے، اس نے جو چیز بنائی ہے وہ کمال قدرت، کمال صنعت،
اور کمال خیر و برکت کا کامل نمونہ ہے:

الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ

جس نے جو چیز ہٹانی خوب بنائی (السجدہ۔ ۷)

ظاہر ہے کہ دنیا اپنی بقا کے لیے ان نام رنگ حسن آرائیوں کی محتاج
نہ تھی۔ یہ ممکن تھا کہ یہ زمین ہوئی ایکن اس میں یہ باع و چمن، یہ
نشیب و فراز، یہ وادی و کوہسار نہ ہوتے۔ ممکن تھا یہ فضا ہوئی ایکن اس
پی نسیم کے جھونکے اور چڑیوں کے چھپے نہ ہوتے، ممکن تھا یہ آسمان

ہوتا مگر ستاروں کی یہ بزم آرائیاں، شفق کی جلوہ کاریاں اور قوس و قزح کی زندگی رنگیاں نہ ہوتیں۔ لیکن اس نہیں ہوا بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ دنیا ان تمام جلووں سے معور ہے۔ سوال یہ ہے کہ ابسا کیوں ہے؟ قرآن کہنا ہے کہ یہ اس لیے ہے کہ انسان کے باطن کو بیدار کرے اور اس میں یہ بصیرت پیدا ہو کہ اسی حسین و جمیل دنبا بغیر کسی خالق کے وجود میں نہیں اُسکی اور وہ خالق صرف خالق ہی نہیں ہے بلکہ کمال قدرت، کمال صنعت و حکمت، اور کمال خبر و برکت کی تمام صفات سے متصف ہے۔

لہ زندگی جلوے، جسما کہ اوپر گذر جکا ہے، صرف ایک علتِ العلّل کی شہادت نہیں دیتے، جسما کہ ہمارے تکلمیں کہتے ہیں، بلکہ ایک اسرائیلی خالق کی شہادت دیتے ہیں جو تمام صفات جمال و کمال سے متصف ہے کیونکہ ہم صرف یہی نہیں دیکھتے کہ یہ دنیا بنی ہے بلکہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جو جیز اپنی ہے، خوب اپنی ہے جس سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ کامل ہے، حکیم ہے، قادر ہے، عالم ہے، مہربان ہے، کردم ہے۔ اس نے ہمیں جیسا تسلیم کیا ہے کہ دنیا نہیں کر دیا ہے بلکہ بہترین ساخت ہے، بہترین قوی اور قابلیتوں اور نہایات اعلیٰ فطرت کے ساتھ بیدا کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ صرف خالق نہیں ہے بلکہ کمال خلق اور کمال قدرت ہے۔ صرف بخشنا نہیں ہے بلکہ سکرم و بخشنش اور رحمت و عناءت کے ساتھ بخشنا ہے۔ صرف زندہ رکونا نہیں ہے بلکہ اس طرح بالتنا ہے جو کمال روایت و پروردگاری کی شان ہے۔

یہ وہ نتیجہ ہے جو اس کائنات کے اجزا کے حسن و جمال کے مشاهدہ ہے ہمارے سامنے آتا ہے۔ لیکن جب ہم ان اجزا کے انفرادی وجود سے گذرا کرانے سے ترکیب ہانی ہوئی اس حسین و جمیل وحدت یعنی اس مجموعی دنیا کے حسن و جمال کو دیکھتے ہیں تو ہم بر ایک اور حقیقت روشن ہوتے ہیں، وہ یہ کہ اس کائنات کا خالق و مدبر ایک ہی ہے کوئی اور اس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ یہ کائنات آسمان سے لے کر زمین تک سچی سجائی بزم ہے جس کی ہر جیز اپنی جگہ سے مجموعہ کے حسن و جمال میں اضافہ کر رہی ہے۔ جس طرح ہم ایک حسین متناسب الاعضا اور خوب صورت چیز کو دیکھتے ہیں تو لازماً اس سے اس نتیجہ ہو ہے

کہ یہ ایک ہی خوش ذوق اور کار فرما ہاتھ کی کار بگری کا کریمہ ہے۔
اگر اس کے مختلف اعضا و اجزاء کی تشکیل، مختلف ارادوں کی ماتحت عمل، میں
آن تو یہ تناسب اور یہ حسن و جہاں اس میں دیدا نہ ہو سکتا۔ اسی طرح اس
مجبوی دنیا کے حسن و جہاں کا جو شخص مشاہدہ کرتا ہے وہ لازماً اس نتیجہ پر
ہنگتا ہے کہ صرف ایک ہی کی پسند اور ایک ہی کا ارادہ ہے جو ان تمام رنگ رنگیوں
کے اندر کار فرما ہے۔ اگر مختلف پسندیں اور مختلف ارادے اس میں کار فرما ہوتے
تو اولاد تو اس کا قیام ہی ناممکن تھا اور اگر اس کا قیام فرض بھی کراہی جائے
تو یہ ایک آرائیہ بزم کی جگہ ایک مال کو دام بلکہ کسی کیاڑی کی دوکان کی
یکل میں ہوئی اور ایک حسین وحدت کی جگہ دم اس کو نبات ہوا۔ انک صورت
بھی دیکھتے جہاں ہر چیز بے قرنہ، بے ربط اور بے جوڑ ہوئی کیوں کہ مختلف
ارادوں اور مذاقوں کے تصادم کے ساتھ تناسب کا وجود موال ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ سب کچھ اپ سے آپ ہو رہا ہے یا اس کے
بیچھے ایک مدبر ہستی ہے جو ان اجزاء، مختلف کے اندر توافق و سازگاری پیدا
کرنی اور اس کو بروان چڑھاتی ہے؟ اگر یہ فرض بھی کراہی جائے کہ دنیا ایک
اتفاق واقعہ ہے، آپ سے آپ وجود میں آگئی ہے اور اس کے مختلف اجزاء کا ارتقا
بھی آپ سے آپ ہو رہا ہے تو کیا اس کے اجزاء، مختلف کے اندر توافق و سازگاری
کا پیدا ہو جانا بھی ایک امر اتفاق ہے؟ کیا اس کا جہاں اور حسین بھی ہے
ایک حداثہ ہیں؟ کیا نتائج کی یکسانی اور نظام کی وحدت بھی بلا منصوبہ ہیں؟
کیا عقل انسانی اس قسم کے حیرت انگیز اتفاقات کو ایک لمحے کے لیے بھی
تسلیم کر سکتی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ صورت حال اس امر کا نہایت قوی ثبوت ہے کہ
اس کائنات کے بیچھے ایک حکیم و قوی ارادہ ہے جو اس کو وجود میں لایا ہے
اور وہ اپنے علم و حکمت اور بلا شرکت غیرے مکمل اختیارات کی وجہ سے مختلف
اجزا میں ربط و اتصال پیدا کرتا ہے۔ اگر آسمان و زمین میں اس کی قوت میں
کوئی شریک ہوتا یا بہت سے ارادوں اور ذہنوں کی کار فرمائی ہوئی تو کائنات
میں توافق و تناسب ہرگز نہ ہوتا۔

اسلام کا تصور خدا *

مختلف اقوام و مذاہب نے خدا کو جن جن صفات کے ساتھ پیش کیا ہے ان کے تصور نے ان مذاہب کے پیروؤں کی سیرت و کردار پر بڑا اثر ڈالا ہے۔ خدا کا ایک تصور انسان کو ڈوبوک اور بزدل بنادیتا ہے، دوسرا ظالم اور سنگدل۔ ایک تصور انسان کو کشمکش حیات سے مفرور کر کے پہاڑوں اور جنگلوں میں جا ڈالتا ہے، دوسرا اسے ناج رنگ کے جلسوں میں بٹھا دیتا ہے۔ اسی طرح ایک تصور خدا انسان کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ آگ، ہان، بہار، جنگل جیسی اشیا کے سامنے گھٹنے نیک دے اور دوسرا اسے خلیفہ اللہ بنادیکر عناصر کی تسعیر پر مابور کرتا ہے۔ ذیل میں ہم دیکھیں گے کہ اسلام نے خدا کا کیا تصور پیش کیا ہے۔

بہت سے جدید معاشروں میں خدا کا تصور یہ رہا ہے کہ اگرچہ وہ آخری اقتدار کا مالک ہے لیکن اسے اپنے بندوں کی زندگی اور ان کے سائل سے کوئی خاص دلچسپی نہیں، اس نے محض تخلیق کا ایک کھیل رچا رکھا ہے اور اس سے اسی طرح لطف اندوز ہو رہا ہے جیسے کوئی بجہ پہلیجڑی چھوڑ کر مزا لیتا ہے۔ زندگی اور موت، صحت و بیماری، قحط و خوش حالی، مسرت و نکبت اس کی قدرت کے تماشے ہیں جن سے اس کی مخلوق کو واسطہ ہوتا ہے لیکن اس کی تقدیر کا دریا اپنے بہاؤ کی رو میں مگن ہے، نہ اس کی فکر کہ کون ڈوبتا ہے، نہ اس سے واسطہ کہ کون بچتا ہے، خدا کو نہ ہمارے دکھ دود سے واسطہ ہے نہ ہمارے خیر و شر سے، وہ ہمارے آنسوؤں اور تبسموں سے بے پرواہ اور ہمارے خیر و شر سے بے نیاز ہے۔

خدا کے بارے میں یہ تصورات انسان کے ناقص شعور کے مظہر ہیں۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ہوری مخلوق اور خصوصاً انسان زندگی کی فلاح و بہبود سے براہ راست دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ محض موجودات کا خالق اور تقدیر ساز ہی نہیں، ہادی و رہنا بھی ہے:

* یہ حصہ جذاب نعیم صدیقی صاحب کے ایک مقالے "ہمارا تصور خدا" میں مأخوذه ہے۔ ملاحظہ ہو فکر و نظر از نعیم صدیقی۔ (مرتب)

الَّذِي خَلَقَ فَتَوْيَى وَالَّذِي قَدَرَ فَهَذَى

(رب تو وہی ہے) جس نے (مر شے کر) پیدا کیا پھر (اس کو) درست بنایا اور جس نے ایک اندازہ بنایا (تجویز کیا) پھر ہدایت عطا فرمائی (الا علی - ۳-۲)

اس نے انسان کو جب حیات ارضی کے لئے میدان میں آنا را تو اسے المیان ہی دلا دیا کہ تم کو اندر ہیرے میں نہیں چھوڑا جا رہا ہے، تمہاری رہنمائی کی جانے گی :

فَلَمَّا يَأْتِكُمْ مِّيقَنٌ هُدًى فَمَنْ تَبَّهُ هُدًى أَفَلَا خَرَفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَعْلَمُونَ

پھر جب میری طرف سے کوئی ہدایت (دین و شریعت) آئے تو سو شخص میری اس ہدایت کی پیروی کرے گا تو اپنے لوگوں کو ذہ تو کچھ خوف و اندیشہ ہوگا اور نہ ایسے لوگ غمگین ہوں گے۔ (البقرہ - ۲۸)

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ خدا اپنے بندوں کی روزمرہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ایک ایک معاملے سے اتنا گھبرا اور قریبی واسطہ رکھتا ہے کہ انہیں چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی ٹوکنا ہے، مختلف سرگرمیوں کے بھلے اور ہرے ہبلو نہایاں کرتا ہے، قدم قدم ہر ہدایت دبتا ہے۔ وہ کہیں عدل، احسان اور اقربا سے محبت کی نصیحت کرتا ہے، کہیں نناق اور بزدلی اور مناد ہوتی ہے روکنا ہے۔ کہیں وہ مرد و زن کو گھر کی پاکیزہ فضا کو قابیم رکھنے کا سبق دلتا ہے، کہیں رضاعت اور سیراث کے معاملات میں ان کو ہریشانیوں سے نکالتا ہے۔ کہیں آداب مجلس سکھاتا ہے۔ کہیں حدود و تعزیرات اور قوانین منین کرتا ہے۔ الغرض ذکر کے درد میں وہ ساتھی اور مشکلات میں شفیق ترین اساتھ ہے۔ وہ اپنے بندوں کو کبھی بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔ ایسے خدا کو ماننے سے جو اعتقاد، بقین اور پختہ شعور حاصل ہوتا ہے وہ کہیں اور نہیں ملتا۔

بے خدا سب کچھ جانتے اور دیکھنے والا ہے۔ کوئی آڑ نہیں جو بچ بیں حائل ہو، کوئی مخالفتہ نہیں جس کا وہ شکار ہو جانے، وہ دلوں کے ہمید الراہیوں کے ہر کوشے سے واقف ہے۔ وہ ماضی، حال اور مستقبل کا ہورا علم رکھتا ہے، ہر وہ صاحب قوت ہی ہے، جس ہر صفت و نقاہت کا خلبه نہیں ہوتا، جسے کام کا ہو جو دوسروں ہر بانٹنے کی کوئی مجبوری درہیں نہیں ہے الوجاہی ذمہ داریوں میں کسی دوسرے کے مشورے ہا تعاون کا محتاج نہیں ا

بے خدا صرف صاحب قوت ہی نہیں، اپنے بندوں کا رفیق و دم ساز اور
ولی و کارساز بھی ہے:

ذَلِكَ يَأْنَتُ لِلَّهِ مَوْلَى الَّذِينَ آمَنُوا

بے اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کا
کارساز ہے۔ (محمد - ۱۱)

رفیق بھی ایسا رفیق نہیں جو وقت ہڑے اور ہاتھ نہ آئے۔ بلکہ ہکا ساتھی، ہر مر
لمعے کا ساتھی، ارے اور بھلے کا ساتھی:

وَقُومٌ مَعْلَفُ لِيَنَ مَا لَقَتُمْ

تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے
ساتھ ہے۔ (الحدید - ۲)

ایسا ساتھی جو کٹھن گھڑیوں میں ہمت بندھاتا ہے۔ جب بندوں کو کوئی چرکہ
لکھا ہے تو فوراً مر ہم تسلیم نہیں ہاں موجود ہوتا ہے۔ اپنے قصر رحمت کا باب قبول
کھوں دیتا ہے کہ ناساز کار حالات کی آندرہیوں میں مجھے پکارو میں تمہاری فربادیں
ستنا ہوں اور ان ہر مناسب کارروائی کرتا ہوں:

أَدْعُوكُمْ أَسْتَجِيبُ لَحُكْمِكُمْ

مجھے پکارو (دعا کرو) میں تمہاری
(دعا کرو) قبول کروں گا۔
(المومن - ۶۰)

وہ دلوں کو اطمینان دلاتا ہے کہ جب تم کرب کی گھڑیوں میں مجھے ہے تو
ہو کر پکارتے ہو تو میں مصیبت کی گھٹاؤں کو چھانٹ دیتا ہوں:

أَكُنْ بِيُجِيبِ الْمُضطَرِ إِذَا دَعَاهُ وَأَكُنْ لَكُنْتُ السَّؤَةَ

وہ کون ہستی ہے کہ جب بی قرار آدمی
اس کو پکارتا ہے تو اس کی ستی ہے۔ اور
اس کی مصیبت کو دور کرتا ہے۔
(النل - ۶۲)

بے وہ خدا ہے جو قیہار و جبار بن کر اپنے تخت ہر براجان نہیں ہوتا
بلکہ اپنے بندوں کے سروں ہر شفت کا ہاتھ پھیرتا ہے، ان کے جلتے ہوئے
سینوں کو تسلیم کی لہنڈک پہنچاتا ہے، ان کی ڈھارس بندھاتا ہے، اس کا تصور
اتنی بڑی طاقت ہے کہ انسان۔ اگر اس نے اسے فی الواقع اپنے اندر جذب
کر لیا ہو تو۔ رضاۓ الہی ہر نکاح جما کر اپنی زندگی کو داؤں ہر رکھ سکتا ہے۔

"اُردو کے نیچے چر سکنا ہے، اپنے تیس کھال کوہینونے والے تصانیوں کے حوالے
کر سکنا ہے، بہانسی کے تعقتوں پر کھڑا ہو سکنا ہے، کوڑوں کی بارش میں
نات قدم رہ سکنا ہے، اور کیا نبیں کر سکتا۔ ایکن بہ سب اس بات اور منحصر
کہ انسان اس تصور کو حقیقتاً جذب کر لے ।"

توحید کے الرات انفرادی اور اجتماعی زندگی ہو۔*

توحید مجرد ایک علمی حقیقت ہی نہیں بلکہ ایک نہایت اہم عمل
ہیت ہی ہے۔ انسانی زندگی خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، توحید کے تصور
بک سر بدل کر رہ جات ہے۔ ان اثرات میں سے چند کی طرف ہم بہان اشارہ
کریں گے۔

انسانی زندگی ہر اس کا سب سے نایاب انویہ ہوتا ہے کہ یہ عقیدہ انسان کو
ازادی و حریت کا وہ بلند مقام بخشنا ہے جس کا وہ اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت
ہے ستحق ہے۔ تمام کائنات انسان کے لئے ہوئے ہوئے ہیں ایکن جب تک انسان توحید
ہے آئنا نبیں ہوتا اس وقت تک اس کی دنائی اور رذالت کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ
دنیا کی حیرت سے حیر چیزوں ہے ڈرتا اور کاپتا ہے۔ جو چیزیں اس کی تابع داری
اور اطاعت کے لئے پیدا ہوئے ہیں وہ خود ان کی تابع داری اور اطاعت کرتا ہے۔
انہی ہی جسمی انسانوں کو اپنا رب اور آقا بناتا ہے، علماءوں کی طرح ان کے آگے
بھکتا ہے بہان نک کہ زندوں سے گذر کر مُردوں سے بھی اپنی درخواستیں اور
الجائز پیش کرتا ہے اور بالآخر ہر چیز کے انتہا اور ہر اونچی درخت کو اپنا معبد
بنالینا ہے اور اپنے ہر ف اور اپنی عزت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اس کے برعکس
مُنبہ توحید انسان میں انتبا درجے کی خود داری اور عزت نفس پیدا کر دیتا ہے۔
اس اور اعتقاد رکھنے والا جانتا ہے کہ صرف ایک خدا تمام طاقتوں کا مالک ہے۔
اس کے سوا کوئی نفع نہیں، اور اپنے ایک خدا کا مالک ہے۔
کوئی صاحب اختیار اور ہا اثر نہیں۔ یہ علم اور یقین اس کو خدا کے سوا تمام
لتوں سے بے نیاز اور بے خوف کر دیتا ہے۔ اس کی گردن کسی مخلوق کے سامنے
نہیں جھکتی، اس کا ہاتھ کسی کے آگے نہیں بھیلتا، اس کے دل میں کسی کی بزرگی
کا سکھ نہیں بیٹھتا۔ یہ صفات سوانی عقیدہ توحید کے اور کسی عقیدے سے پیدا

* حصہ بھی مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی کتاب "حقیقت توحید" سے مانعوذ ہے۔
(مرتب)

نہیں ہو سکتیں۔ شرک اور کفر کی لازمی خصوصیات بہ ہیں کہ انسان مخلوقات کے آگے جھکئے، ان کو نفع و نقصان کا مالک سمجھئے، ان سے خوف کھائے اور ان ہی سے امیدیں وابستہ رکھئے۔

اسن قام خود داری اور عزت نفس کے ساتھ یہ عقیدہ انسان میں تواضع اور انکسار ہمیں پیدا کرتا ہے۔ اس کا قائل کبھی مغرور اور متکبر نہیں ہو سکتا اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ اس کے ہاتھ جو کچھ ہے خدا کا دیا ہوا ہے اور خدا جس طرح دینے اور قادر ہے اسی طرح چھوٹے اپنے اور بڑے قادر ہے۔ اس کے مقابلے میں العاد کا عقیدہ رکھنے والے کسی انسان کو کوئی دنیوی کمال حاصل ہوتا ہے تو، مسلکی ہو جاتا ہے کہ اس کمال کو محض اپنی قابلیت کا نتیجہ سمجھنا ہے۔

یہ عقیدہ رکھنے والا کبھی تنگ نظر نہیں ہو سکتا، وہ اب سے خدا کا قائل ہوتا ہے جو زمین و آسمان کا خالق، مشرق و مغرب کا مالک اور قائم جہاں کا پالنے والا ہے۔ اس ایمان کے بعد ساری کائنات کی کوئی چیز اسے خیر نظر نہیں آتی۔ وہ سب کو اپنی ذات کی طرح ایک ہی مالک کی ملکیت اور ایک بادشاہ کی (عبد) سمجھتا ہے۔ اس کی ہمدردی، محبت اور خدمت کسی دائرے کی پابند نہیں رہتی۔ اس کی نظر وسی ہی غیر محدود ہو جاتی ہے جیسی خود خدا تعالیٰ کی بادشاہی غیر محدود ہے۔ یہ بات کسی ایسے شخص کو حاصل نہیں ہو سکتی جو وہ بتے چھوٹے چھوٹے خداوں کا قائل ہو۔

اسی طرح عقیدہ توحید اور ایمان لانے والا یہ سمجھے لیتا ہے کہ نفس کی پاکیزگی اور نیک عمل کے سوا اس کے لئے نجات اور فلاح کا کوئی ذریعہ نہیں کیوں کہ وہ ایک ایسے خدا ہر یقین رکھتا ہے جو ہے نیاز ہے، کسی سے کوئی رشتہ نہیں رکھتا، بے لانگ عدل کرنے والا ہے اور کسی کو اس کی خدائی میں کوئی دخل نہیں۔ اس کے مقابلے میں کفار و مشرکین ہمیشہ جہوٹی توقعات اور زندگی پسر کرتے ہیں، ان میں کوئی یہ سمجھتا ہے کہ خدا کا ہیتا ہمارے لئے کفارہ بن گیا، کوئی اپنے کو خدا کا چہہ تا سمجھتا ہے، کوئی اپنے بزرگوں اور مغربوں میں تو کسی کو گماہی میں ہنسایے رکھتے ہیں۔ اس طرح کے اعتقادات انسان کو گمراہی میں ہنسایے رکھتے ہیں۔

اس عقیدے کا حامل کسی حال میں مایوس اور شکستہ دل نہیں ہوتا۔ ایک ایسے خدا ہر ایمان رکھتا ہے جو زمین اور آسمان کے قام خزانوں کا مالک ہے

جس کا فضل و کرم ہے جد و حساب ہے، جس کی قوتیں ہے ہمیاں ہیں۔ یہ اب ان اس کے دل کو خیر معمول تسلیکن اختلاشتے ہے، اس کو اطمینان سے بھر دیتا ہے اور ہمیشہ امیدوں سے لبریز رکھتا ہے، چاہے وہ دنیا کے سارے دروازوں سے نہ کرا دیا جائے۔ سارے اسباب کا رشتہ نوٹ جانے اور وسائل، ذرائع ایک ایک سوکے اس کا ساتھ چھوڑ دیں ہر یہی ایک خدا کا سہارا کسی حال میں اس کا ہانہ نہیں چھوڑتا اور اسی کے بل ہوتے ہو وہ نئی امیدوں کے ساتھ کوشش ہر کوشش کھیے چلا جاتا ہے۔ اس کے برعکس کفار و مشرکین کے دل چھوٹے ہوتے ہیں، ان کا بھروسہ بحدود طاقتون ہر ہوتا ہے، اس لئے مشکلات میں بہت جلد سایوسی ان کو گھیر لیتی ہے اور اکثر اپسی حالت میں وہ خود کشی تک کر گذرتے ہیں۔^۱

عقیدہ توحید انسان میں قناعت اور ہے نیازی کی شان پیدا کر دیتا ہے۔ حرص و ہوس اور رشک و حسد کے رکیک جذبات اس کے دل سے نکال دیتا ہے۔ کامیابی حاصل کرنے کے ناجائز اور ذلیل طریقے اختیار کرنے کا خیال تک اس کے ذہن میں نہیں آتا، وہ سمجھتا ہے کہ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے، جس کو چاہے زیادہ دے جس کو چاہے کم دے۔ عزت اور طاقت، ناموری اور حکومت سب کوہ خدا کے اختیار میں ہے۔ اگر وہ دینا چاہے تو دنیا کی کوف قوت اسے روک نہیں سکتی اور نہ دینا چاہے تو کوئی طاقت دلوا نہیں سکتی۔ اس کے مقابلے میں مشرکین اور کفار اپنی کامیابی اور ناکامی کو اپنی کوششوں اور دنیوی طاقتون کی مخالفت یا مدد ہر سوقوف سمجھتے ہیں، اسی لئے ان ہر حرص و ہوس کا غلبہ رہتا ہے۔ کامیابی حاصل کرنے کے لیے رشتہ، خوبیاد اور سازش اور ہر قسم کے بدترین ذرائع اختیار کرنے میں انہیں باک نہیں ہوتا۔

یہ عقیدہ انسان میں عزم و حوصلہ اور صبر و توکل کی زبردست طاقت پیدا کر دیتا ہے۔ صبر و توکل کے ہے معنی نہیں ہیں کہ مومن کوشش اور سعی کو چھوڑ دیتا ہے اور ہاتھ پاؤں توڑ کر اپنے جاتا ہے بلکہ وہ جانتا ہے کہ اپنے مقاصد کے لیے سعی ^{بِیْہمَ اللہُ کی خوشندی} کا سبب ہے۔ وہ جب دنیا میں ہڑے کام انجام دینے کے لیے انتہا ہے تو اس کے دل میں ہے یقین ہوتا ہے کہ میری ہشت^۲

۱۔ مورخین مثلاً فلپ کے۔ حتیٰ نے اس بات کی طرف خاص طور پر شانہ کیا ہے کہ مسلمان اس حیثیت سے تاریخ میں منماز ہیں کہ ان میں خود کشی کی وارداتیں بالکل شاذ ہیں۔ (مرتب)

زمین و انسان کے بادشاہ کی قوت ہے۔ ایسی قوت جس کا مقابلہ کرنا نہیں کرسکتا۔ یہ خیال انسان کو ہماری سی مضبوطی عطا کرتا ہے اور دنیا کی ساری مشکلات اور ساری مصیبیتیں اور مختلف طاقتیں مل کر بھی اس کو اس کے عزم سے نہیں ہٹا سکتیں۔

ہر یہ اعتقاد انسان کو بہادر بنا دیتا ہے۔ انسان کو بزدل بنانے والی در اصل دو چیزوں ہوتی ہیں، ایک تو جان و مال اور بھوون کی محبت اور دوسرے یہ خیال کہ خدا کے سوا کوئی اور مارنے پا جلانے کی طاقت رکھتا ہے اور یہ کہ انسان اپنی تدبیر سے موت کو نال سکتا ہے۔ توحید کا عقیدہ ان چیزوں کو دل سے نکال دیتا ہے۔ ہمیں چیز تو اس لیے نکل جاتی ہے کہ اس کا قائل اپنی جان و مال اور ہر چیز کا مالک خدا ہی کو سمجھتا ہے اور اس کی خوشنودی کے لیے سب کوہ قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ زمیں دوسری چیز تو وہ اس وجہ سے باق نہیں رہتی کہ توحید کا عقیدہ رکھنے والے کے نزدیک جان لینے کی قدرت کسی انسان یا حیوان یا توبہ یا تلوار میں نہیں، اس کا اختیار صرف خدا کو ہے اور اس نے موت کا جو وقت مقرر کر دیا ہے اس سے ہمیں دنیا کی تمام قوتیں مل کر بھی چاہیں تو نہیں کی جان نہیں لے سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ ہر ایمان رکھنے والے سے زیادہ بہادر کوئی نہیں ہوتا اس کے مقابلے میں تلواروں کی باڑی اور گولیوں کی بوچھاڑ اور گولوں کی بارش اور فوجوں کی یورش سب ناکام رہ جاتی ہیں اور جب وہ خدا کی راہ میں لڑنے کے لیے بڑھتا ہے تو اپنے سے دس گنی طاقت کا بھی منہ بھیر دیتا ہے۔

توحید کا عقیدہ انسان کو خدا کے قانون کا پابند بناتا ہے۔ اس عقیدے کا ماننے والا جانتا ہے کہ خدا ہر چیزیں اور کوئی چیز سے باخبر ہے، ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے، اگر ہم رات کے اندر ہیرے میں اور تنہائی کے گوشے میں بھی کوئی گناہ کریں تو خدا کو اس کا علم ہو جاتا ہے۔ اگر ہمارے دلوں کی گھرائی میں بھی کوئی ہرا ارادہ ہیدا ہو تو خدا تک اس کی خبر پہنچ جاتی ہے، ہم سب سے چھپا سکتے ہیں مگر خدا سے نہیں چھپا سکتے، سب سے بھاگی سکتے ہیں مگر خدا سے فرار مسکن نہیں، سب کی ہکڑ سے بچ سکتے ہیں مگر خدا کی گرفت سے نہیں نکل سکتے۔ یہ یقین جتنا مضبوط ہوگا اتنا ہی زیادہ انسان اپنے خدا کے احکام کا مطیع ہوگا، جس چیز کو خدا نے حرام کیا ہے وہ اس کے پاس بھی نہ ہٹکے گا، جس چیز کا

مکم دبا ہے اس کو انتہائی اور تاریخی میں بھی بجا لائے گا کبون کہ
ایک اپنے ایسی ہوائیں لکھے جو کسی حال میں اس کا پیچھا نہیں
ہوں اور اس کو اپنے عدالت کا کھشکال کا رہتا ہے جس کے وارثت سے
کبھی بھاگ ہی نہیں سکتا۔ بھی وجہ ہے کہ مسلم ہونے کے لئے سب سے
اول سب سے ضروری شرط "لا اله الا الله، بر ایمان لانا شے۔ مسلم کے معنی
لماج فرمان ہودار بندے کے ہیں اور خدا کا فرمان ہودار ہونا اس وقت تک ممکن
ہیں جب تک کہ انسان اس بات پر یقین نہ لائے کہ اللہ کے سوا کوئی اللہ نہیں۔

نوحید اور اجتماعی زندگی

غیرہ تو حید کا اجتماعی زندگی ہر ہی کھرا انہر ہوتا ہے۔ انسانی معاشرت
نہیں کامل عدل اور صحیح مساوات ہر قابیم ہے اور کامل عدل اور صحیح
مساوات وحدت اللہ اور وحدت آدم کے بغیر ناممکن ہے۔ دنیا کی موجودہ اہتری
از بناہی کا اصلی سبب یہ ہے کہ جس رفتار سے دنیا میں سائنس نے ترقی کی ہے
اور رفتار سے انسان کے شعور نے ترقی نہیں کی۔ سائنس کی ترقیوں کے تو بہ عالم
کہ انسان نے ساری جغرافیائی حد پنڈیاں تزویز ڈالیں اپنی ایجادوں اور مشینوں
کے زلے سے اس وسیع زمین کو ایک مکان کے معنی کی طرح مختصر کر دیا،
بل وسائل کی انسانیوں نے اخبار و افکار کی نشر و انشاعت انتہائی سهل کر دی۔
بکن اس سب کے باوجود انسان ذہن کی تنقی کا حال یہ ہے کہ دنیا اب تک
لوہ پرستی اور وطن پرستی سے نجات حاصل نہیں کر سکی۔ وطن پرستی کے معنی
ہیں کہ انسان ہر حال میں اپنے وطن کا ساتھ دے، خواہ وہ حق ہر ہو یا
نہ ہو۔ یہ قوم پرستی اپنی درحقیقت شرک کی ایک فرم ہے اسی قوم پرستی نے
لکھتے نصف صدی میں تاریخ انسانی کی ہولناک ترین جنگوں کو جنم دیا اور
ایسا انسانیت کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اسی خطرے کے پیش نظر دنیا
کے سوچنے سمجھنے والے لوگ عالمی ریاست کی حمایت کرتے ہیں لیکن ظاہر ہے
کہ یہ ماری کوشیوں اس وقت تک ہے کارہیں جب تک انسانیت وحدت اللہ اور
وحدت آدم پر اشتراک نہیں کریں۔

۴) ذہن میں رٹ کے وطن پرستی اور حب الوطنی دو بلکل مختلف چیزیں ہیں۔ حب الوطنی
ایک فطری جلبہ ہے لیکن وطن پرستی کے معنی یہ ہیں کہ انسان حق و ناخن کا معبار
خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر عرض اپنے وطن کر بنالی۔ یہ شرک کی ایک شکل ہے
اور اسلام اس کی بھی اسی طرح بیخ کنی کرنا شے جس طرح شرک کی باقی قسم شکلوں
کو۔ (مرتب)

اس وقت اقوام میں افرانفری کا عالم یہ ہے کہ نہ ان میں خدا مشترک شہریت جدا ہے، اس کے معتقدات اور اخلاق جدا ہیں۔ اور غرقوم اس علیحدگی کو نہ صرف فایم رکھنا چاہتی ہے بلکہ اس کو بالجبر مسلط بھی کرنا چاہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک دماغوں میں یہ گرہ موجود ہے ان قوموں میں انعام کے لیے کوئی مشترک رشتہ موجود نہیں۔ مشترک رشتہ صرف ایک ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ سب ایک ہی خدا کو مانیں، اسی کے اتارے ہونے قانون نہ سب اپنے نئے شریعت بنائیں اور ایک ہی آدم کے مشترک گھرانے کا اپنے اپنے فرد سمجھیں۔ اس اساس پر بلاشبہ ایک عالم گیر سیاسی تنظیم کی عمارت قائم ہو سکتی ہے اور دنیا کی موجودہ مصیبتوں کا خاتمه ہو سکتا ہے۔ اس کے سوا جنہیں تدبیریں بھی اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کی جائیں گی وہ رشتے میں ایک الگ گرہ کا اضافہ کریں گی اور کسی مشکل کو حل نہیں کر سکیں گی۔

مزید مطالعے کے لیے

مولانا سید سلیمان فدوی ، میرت النبی (جلد چہارم ، ابواب بر توحید)

دارالمحنتین ، اعظم گزہ ۔

مولانا ابوالکلام آزاد ، ترجمان القرآن (جلد اول ، تفسیر سورۃ الفاتحہ ۔ یا

ام الکتاب باب ۳ - ۴ ، اور مقالہ بر ' قرآن اور صفات النبی کا نصور ') ۔

شیخ غلام علی اینٹ سنز ، لاہور ۔

مولانا ابوالکلام آزاد ، غیار خاطر (مکتبہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۲۲) ۔ کتاب گھر ، افوار کلی ، لاہور ۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی ، (باب سوم ، فصل سوم) ۔ اسلامک پبلیکیشنز لمبٹ ، لاہور ۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ، رسالہ دینیات (باب چہارم) ۔ اسلامک پبلیکیشنز لمبٹ ، لاہور ۔

مولانا امین احسن اصلاحی ، حقیقت شرک ۔ مکتبہ جماعت اسلامی ، لاہور ۔

مولانا امین احسن اصلاحی ، حقیقت توحید ۔ مکتبہ جماعت اسلامی ، لاہور ۔

شبل نعمانی ، الكلام (صفحہ ۲۰ تا ۶) ۔ نقیس اکینی ، کراچی ۔

مولانا مناظر احسن گیلانی ، الدین الفیم (صفحہ ۶ تا ۱۵۰) نقیس اکینی ، کراچی ۔

سچ ، عبد العزیز ساویس مصری (درجم انسخار احمد بلخی) ، اسلام اور فطرت ۔

مضامین متعلقة توحید ۔ عباسی کتب خانہ ، کراچی ۔

رہنمائی

انیا کی ضرورت *

انسان کو انیا^۱ کی کیا ضرورت ہے؟ رسولوں کا سلسلہ کبیوں قایم کیا گیا؟ ان پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے؟ ان مسائل ہر غور کرنے کے لئے مجبہ ہلمے یہ دیکھنا ہڑے کا کہ انسان کو اپنی زندگی، بین فلاخ کبیوں کر حاصل ہو سکتی ہے اوز وہ صحیح کامیابی کبیوں کر حاصل کر سکتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ دنیا کی کامیابی زیادہ عربہ وابم رہنے والی نہیں ہے، ہڑی کامیابی یہ ہے کہ انسان کو آخرت میں، جو باقی رعنے والی ہے، کامیابی نصیب ہو۔ اللہ تعالیٰ کی مرغی یہ ہے کہ انسان دونوں خالیہ میں کامیابی حاصل کرنے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے مقاصد کا تعین صحیح طور پر کرے اور آس کے حصول کے لئے صحیح راہ عمل تلاش کرے۔ اس کے لئے اسے ہدایت کی ضرورت ہے تاکہ وہ بے معلوم کر سکے کہ فاتح کس عقیدے اور کس طریقے میں ہے۔

اسلام نے اس دو گونہ کامیابی کے حصول کا جو طریقہ بتایا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت ہے اس لئے کہ ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنی ہے اور اس کی اطاعت کے ذریعے سے اس ہدایت سے ہورا فائزہ آنہایا جا سکتا ہے۔

* حصہ مولانا صدر الدین اصلاحی کی کتاب "اسلام ایک نظر میں" سے ماخوذ ہے۔ (مرتب)

الله کی بندگی اور اطاعت کا نام آتے ہی فطری طور پر اللہ کے احکام اور مرضیات کا سوال سامنے آ کھڑا ہوتا ہے کیوں کہ اطاعت احکام ہی کی ہوتی ہے اور احکام کے بغیر اس کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ان لیے ایک انسان جوں ہی انہیں اور دکار کا بندہ اور اطاعت گزار ہن کر رہنے کا فیصلہ کرے گا وہ لا محالہ یہ جانتا چاہے کہ اس کے مالک کے وہ احکام کیا ہیں جن کی اسے اطاعت کرنی ہے، اس کا مالک کن ہاتون کو ہسند کرتا ہے اور کن ہاتون کو ناہسند کرتا ہے؟ اس کا وفادار نہیرنے کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے اور اس کی نافرمانی سے محفوظ رہنے کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے؟ یہ ساری ہاتیں جانے بغیر اطاعت اللہ کی راہ میں پہلا قدم بھی نہیں اٹھایا جا سکتا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام و مرضیات کے جانے کا ذریعہ کیا ہے؟ انسان یہ کیسے معلوم کر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں فلاں ہاتون کے کرنے کا حکم دیا ہے اور فلاں فلاں کاموں سے روکا ہے؟

اس کے جواب میں جن چیزوں کا نام لہا جا سکتا ہے ان میں سے ایک تو ہر شخص کی انہی عقل ہے۔ لیکن انسان کے لیے یہ طور خود یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ اس کی زندگی کے اور اس کائنات کے بنیادی حقائق کیا ہیں؟ اس کے خالق و اور دکار میں کیا صفات ہائی جاتی ہیں؟ انسانوں سے ان صفات کے تقاضے کیا ہیں؟ اور ہمارے لیے اس کے احکام کیا ہیں؟ غرض کہ اس مسلسلے میں عقل کی نارسانی بالکل مسلم و ثابت ہے۔^۱

دوسری چیز انسان کا وجود اور اس کی قلبی قوت ہے۔ لیکن اس قوت کا معاملہ ابھی کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ ریاضت نفس کی کوئی بڑی سے بڑی کوشش بھی یہاں کوئی نارکردگی نہیں دکھانا سکتی کیوں کہ انسان انہی باطن کو مانجھ کر چاہے کیسا ہی اُئینہ کیوں نہ بنالے، اس میں اللہ تعالیٰ کے احکام و مرضیات کا عکس اپ سے اپ ہرگز نہیں دکھانی دے سکتا۔ اُئینے میں کسی چیز کا عکس بڑنے کے لیے بھی تباہ کافی نہیں ہے کہ اُئینہ صاف اور چمکدار ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ چیز کھلی شکل میں اس کے سامنے اور قریب موجود ہو۔ اس لیے اللہ تعالیٰ جب تک خود ہی انہی احکام کا تعین کر کے انہیں وجود میں نہ لانے اور وجود میں لا کر قلب انسانی کے سامنے

۱۔ اس موضوع پر باب ایک میں مفصل گفتگو درج ہے۔ (مرتب)

نہ رکھ دے، لاکھ صاف اور چمک دار ہونے کے باوجود بھی اس کے اندر ان کی
بہاب نہیں ہٹ سکتی۔

تبیری چیز مختلف افراد کے الگ الگ تفکر کے بجائے اجتماعی غور و ذکر
ہے۔ لیکن جس طرح هزاروں اور لاکھوں اندھے مل کر ایک آنکھوں والے شخص
کی بیشیت حاصل نہیں کر سکتے اسی طرح افراد انسانی کی کوئی بڑی سے بڑی تعداد
بھی احکام الہی کے دریافت کر لینے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ آخر بہت سے
افراد کا مجموعہ بھی تو ایسے ہی لوگوں سے مل کر بنا ہوا جن میں کوئی ایک
فرد بھی ایسا نہ ہوا جو اپنی عقل سے احکام الہی معلوم کر لینے کا خواب بھی
دبکھ سکے۔ اس لیے یہ ذریعہ بھی اتنا ہی ناکام ذریعہ ہے جتنا کہ بہلا۔

اس طرح ہم نے دیکھا کہ ان تینوں ذرائع میں سے کوئی ایک بھی ایسا
نہیں جو انسان کی یہ ضرورت پوری کر سکے۔

بلاشبہ بہت سے کام ایسے ہیں جن کا برا یا بہلا ہونا ہمیں خود ہے خود
یہ موس ہو جاتا ہے اور ان کی براوی یا بہلانی کا فیصلہ ہم اپنی عقل یا اپنی فطرت
با اپنے وجودان سے کر سکتے ہیں۔ اور یہ ایک مسلمه حقیقت ہے کہ هدایت الہی
بھی ہرے اور بھلے کاموں کے تعین ہی کا دوسرا نام ہے۔ لیکن بعض اتنی سی بات
ہے یہ خیال کر بیٹھنا صحیح نہ ہوا کہ انسان ہے طور خود اللہ تعالیٰ کے سارے
احکام اور منصیبات کا اندازہ لکا سکتا ہے۔ کیوں کہ کچھ کاموں کے ہرے یا بھلے
ہونے کا علم و اندازہ تمام کاموں کے ہارے میں علم و اندازے کا قائم مقام کسی
طرح نہیں بن سکتا۔ ذرا اپنی دنیا کو دیکھیے۔ آخر وہ کتنی قدروں کے ہارے
میں متفق ہے؟ کتنے کام ہیں جن کے بھلے ہونے اور اور کتنے کام ہیں جن کے
ہرے ہونے پر ہوری نوع انسانی متفق ہے؟ بڑی رعایت کے بعد بھی آپ ایسے
کاموں اور ایسی قدروں کی کوئی قابل لحاظ تعداد نہیں گناہ سکتے جن کی بہلانی اور
براوی ہر تمام لوگوں کا اتفاق ہو اور جن تھوڑی سی باتوں پر اتفاق ہوا کا تفصیلات
میں یہ اتفاق بھی قائم نہیں رہے گا۔ چند باتوں کے ہرے یا بھلے ہونے کا فیصلہ
اگر نوع انسانی کر بھی سکتی ہے تو یہ خیر و شر کے ہورے مسئلے کو حل کر سکتے
کی قابلیت کی سند نہیں ہو سکتی۔ بلاشبہ یہ نہ کہا جائے گا کہ دیجے کی روشنی،
روشنی ہی نہیں ہے لیکن یہ ضرور کہنا ہڑے گا کہ ہوری دنیا کو منور کرنے کے
لئے سورج کی ضرورت ہے اور ثمثماتا ہوا دھا سورج کی جگہ نہیں لے سکتا۔

غرض اس معاملے میں انسان قوتون کی بے بسی ایک مانع عوائق ہے جس نے خلاف نہ عقل کو کہ سکتی ہے نہ تعبیرہ و مساعدة زبان کھول سکتا ہے۔ اس صورت حال کا مطالبہ واضح طور پر یہی تھا کہ اس معاملے میں انسان کو ہٹنکنے کے لیے چھوڑنے کے بجائے اس کی اوپر نہ رہنمائی کی جائی کہوں کہ اس کی اپنی نکری اور وجہانی قوتون میں اگر یہ صلاحیت نہ تھی آنہ وہ اللہ تعالیٰ کی مرضیات معلوم کر لیتیں۔ حالانکہ انسان کو اس بات کی ضرورت اتنی ہی نہیں جانتی خدا اور ہانی کی تو اب اس کی اس ضرورت کے ہوڑی ہونے کی شکل اس کے سوا اور کوئی رہ ہی نہیں جاتی کہ اس کا اللہ کی طرف سے کوئی خارجی انتظام ہو۔

ایک طرف تو یہ صورت حال اور انسان کی سب سے بڑی بنیادی ضرورت نہیں۔ دوسری طرف اللہ کی رحمت نہیں، اس کی رحمت نہیں، اس کا عدل نہیں، اس کی حکمت نہیں اور ان میں سے ہر ایک صفت کا مطالبہ نہیں کہ انسان کو یوں بے بسی کے اندھیرے میں نہ چھوڑا جائے۔ بلکہ اس کی مدد کی جائے، اس کو وہ احکام مان ملک بتا دیجے جائیں جن کے جانے بغیر وہ بندگی اور اطاعت کی راہ اختیار کر میں نہیں سکتا۔ ایسی حالت میں مسکن ہی نہ تھا کہ اللہ رب العالمین اپنے احکام و مرضیات کو انسانوں تک ہمچنانکے لیے کوئی خارجی اہتمام نہ کرتا اور اس سلسلے میں ایک دن کی بھی تاخیر روا رکھی جاتی، اور نسل انسانی کی ابتداء کے ساتھ ہی ساتھ اس اہتمام کی بھی ابتداء نہ ہو جاتی۔ جس ہروردگار نے انسان کی ملادی ضروریات کا اتنا بڑا انتظام کر رکھا تھا، اس کی شان ہروردگاری سے بالکل بعید تھا کہ وہ اس کی اخلاق، ذہنی اور سماجی ضرورتوں کی طرف توجہ نہ فرماتا۔ جس آفانے انسان ہو اپنی مرسی کی راہ چلتے کی ذمہ داری ڈالی تھی اس کی رحمت اور اس کا انتہا یہ کیسے گوارہ کرتا کہ وہ اسے اس راہ سے باخبر کرنے کا ضروری انتظام نہ کرے۔ چنانچہ اس نے یہ انتظام کیا۔ اور یہی وہ اکٹلماں سے جسے دین کی اصطلاح میں 'رسالت' کہا جاتا ہے اور جس واسطے سے یہ انتظام ہوتا ہے اسے "رسول" کہتے ہیں۔

جہاں یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ رسالت کے بغیر انسان اللہ تعالیٰ کے احکام ہے واقف نہیں ہو سکتا وہاں اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے ہے، مون اور سلم ہترے کے لیے رسالت ہر ایمان لانا انتہائی ضروری ہے، نہیک اسی طرح جس طرح انکھوں کی ہتلی میں ہینان ضروری ہوتی ہے۔

کہ جو چیز کسی منزل تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہو جب تک اسے اپنا
ایسا جانے منزل تک پہنچنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ خود کیجھ تو معلوم ہوا کہ رسالت کی عملی اہمیت اس سے
اونھی ہے۔ نہ صرف یہ کہ اس کے بغیر اللہ کے احکام کو نہیں جانا جا سکتا
لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے بغیر خود اللہ اور آخرت کو بھی نہیں جانا جا سکتا۔
یہاں کی وہ ذریعہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت اور آخرت کی صحیح علم
لیکرنا ہے۔ اس لیے رسالت کے بغیر اللہ اور آخرت پر ایمان بھی، جیسا کہ
نہیں لایا جاسکتا۔

انبیاء کی خصوصیات*

اس سے ۴۴۷ 'انبیاء' کی ضرورت، کے تحت ہم دیکھ چکے ہیں کہ انسانوں
کو جیسے ہوا اور پانی کی ضرورت ہے ویسے ہی الہامی ہدایت اور انبیاء کی تعلیم
کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں سب سے پہلے جس انسان
(حضرت آدم علیہ السلام) کو بھیجا اسے منصب نبوت سے برداشت کیا۔ حضرت آدم
علیہ السلام نے اپنی اولاد تک خدا کے تمام فرمان پہنچائے، اور ان کی اولاد نے
ان اپنیوں ہوتوں تک ان ہدایات کو منتقل کیا۔ ایک جو انسان نسل بھیلتی
اور دور دراز کے علاقوں میں آباد ہوئی کی اس تعلیم کے نوش مدھم پڑتے
گئے، یہاں تک کہ بہت سے لوگوں نے ان تعلیمات کو فراموش کر دیا۔
ان جگہوں پر اللہ تعالیٰ نے دوسرے انبیاء بھیجے تاکہ انسانوں کی ہدایت اور
رہنمائی کا کام سرانجام دیں۔ یہ بغیر مختلف زبانوں اور مختلف علاقوں میں آئے۔
ان میں چند مثلاً حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق،
حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے نام سے ہم اچھی طرح مانوس ہیں۔
لیکن ان کے علاوہ بھی ہزارہا انبیاء اُتے۔ ایک اندازہ کے مطابق تمام انبیاء کی
نعداد تقریباً ایک لاکھ چوایس ہزار ہے۔

* یہ حصہ مندرجہ ذیل کتب کے اقتباسات سے مرتب کیا گیا ہے۔

- | | |
|------------------|------------------------|
| سید سلیمان ندوی | : سیرۃ النبی جلد چہارم |
| ڈاکٹر آصف قدوانی | : مقالات سیرت |
| صدر الدین اصلاحی | : اسلام ایک نظر میں |

قرآن کریم میں انبیا کی جو خصوصیات بیان کی گئیں ہیں ان میں سے قائل
خصوصیات ذمہ داری درج ہی جاتی ہیں۔

۱۔ بشریت: اگرچہ انبیائے کرام علیہم السلام باطن اور معنوں
میں عام انسانوں سے بہت بلند تھے لیکن اس کے باوجود وہ سب انسان ہی تھے
نہ وہ فرشتوں کے کروہ سے تھے اور نہ جنوں سے۔ اسلام کے نزدیک
عقیدہ بھی خلط ہے کہ خدا یا اس کا بیٹا یا اس کا کوئی اوتار انسانی شکل ہے
اکر الہامی ہدایت پہنچائے۔ دراصل انبیا میں الوہیت کا ادنیٰ سائبہ بھی
تسلیم کر ائمے کے بعد توحید و نبوت کی حیثیت مشتبہ ہو جاتی ہیں۔ خدا کی
یکتا کا تصور مجروم ہوتا ہے اور انبیا کی بعثت کا اصل مقصد ہی فوت ہو جانا
ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نبی نے ہمیشہ اس بات کا اعلان کیا کہ:

إِنَّا لَنَا بِئْرَهُ مِنْكُمْ

میں تمہاری طرح کا ایک انسان ہوں۔ (الکھف۔ ۱۱۰)

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ ابسا اوقات انبیا بر یہ اعتراض بھی ہوا کہ یہ
کیسے ممکن ہے کہ ابسا شخص جو ہماری طرح کھاتا ہیتا اور دیگر انسان
ضروریات رکھتا ہے نبوت کے منصب پر فائز ہو جائے۔ لیکن ان کے اعتراضات کے
باوجود انبیاء کرام نے کبھی یہ نہیں کہا، نہیں، ہم تو بشر نبیں ہیں اس
سے بلند تر کچھ چیز ہیں، ان کا متوفہ جواب تھا:

إِنَّمَا هُنَّ إِلَّا بَشَرٌ مِّنْكُمْ

بلاشبہ ہم تمہاری میں طرح انسان ہیں۔
(خابراہیم۔ ۱۱)

خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی یہی اعتراض ہوا۔ لوگوں نے
کہا کہ اگر خدا کو کوئی ہیغامبر بھی جنا ہی تھا تو وہ ہمارے ہی جیسے انسان
کے بجائے کسی فرشتبے کو کیوں نہ بھیجتا۔ قرآن نے اس کا جواب دیا کہ

”اگر اس زمین پر فرشتبے ہی چلتے پھرتے اور آباد ہوتے تو ضرور ہم
ان پر انسان سے فرشتبے ہی کو رسول بناؤ کر بھیجتے“ (ہبی اسرائیل: ۹۵)

یہ در حقیقت بڑا ہی حکیمانہ جواب ہے۔ اس لیے کہ (جیسا کہ ہم آئے
دیکھیں گے) ہیغمبروں کا کام محض یہ نہیں ہے کہ نعمذ بالله ڈاکھے کی طرف

اللہ کی کتاب ہمہ نہجا دین بلکہ ان کے کاموں میں سے ابک بھی یہ بھی ہے کہ اپنی زندگی کو ہدایات الہی کا مظہر بنا کے دکھا دین اور دنیا کے سامنے مثال اور نمونہ بن کر پیش ہوں - اب اگر فرشتوں یا کسی اور مخلوق کو ہفمبر بنانکر بھیجا جاتا تو اگرچہ وہ خدا کا ایquam ہمہ نہجا دیتے لیکن فرشته ہونے ہوئے آخر و ان احکام ہو کیسے عمل کر ہائے جن کا تعلق خاص بشری جذبات و داعیات اور مخصوص انسانی مسائل سے ہے اور جب وہ شریعت کے ابک بڑے حجم سے وہ عمل ہی نہ کر ہائے تو اپنے اپرونوں کے لئے اپنی نمونہ کیسے ثابت ہونے - بزید برآن فرشتوں یا دیگر غیر انسانی مخلوقات کی مثال انسانوں کے کام کی ہی نہیں ہو سکتی اس لئے کہ انسان اپنادا اسی کی کرسکنا ہے جو قوت و اختیار کے اعتبار سے اسی جیسا ہو - مختلف العجس مخلوق ہمیں مروعوب تو کرسکتی ہے لیکن ہمارے لئے نمونہ نہیں بن سکتی -

۲۔ وہیت : وہیت کے معنی یہ ہیں کہ رسالت کوئی اكتسابی شے نہیں جو محنت اور تلاش و جستجو سے مل جائے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی عطا ہے اور اسی شخص کو ملتی ہے جسے وہ صرحت فرماتا ہے - اس کے ملنے میں انسان کوشش اور ارادے کا کوئی دخل نہیں ہوتا -

اکثر ہفمبروں کے حالات میں ہمیں یہ ملتا ہے کہ آغاز وحی سے ۶۷۸ ہلے وہ ابک عمر میں تک عبادت و مراقبہ میں مشغول رہے - مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام نورا کے ملنے سے ۱۰۰ چالیس روز تک روزے کی حالت میں کوہ طور پر رہے - حضرت مسیح علیہ السلام ایک سنسان جنگل میں چالیس روز نک عبادت میں مشغول رہے - اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میمنون خار حرا میں عزلت گزیں رہے - اس طرح کی عبادت و ریاضت نفس میں وحی کے قبول کرنے کی استعداد پیدا کر دینی ہے - لیکن اس کے باوجود نبوت کا منصب اكتساب نہیں جو محنت و کوشش سے حاصل ہو جائے بلکہ جس طرح خدا تعالیٰ نے انسانوں میں مختلف کمالات عطا کیے ہیں لیکن ان کے بالفعل حصول کے لئے جد و جہد کوئی ہٹکی ہے اسی طرح انبیا میں نبوت بالقوہ موجود ہوتے ہیں ابتدہ قبول وحی کے لئے استعداد حاصل کرنے کے لئے انبیا کو بھی تیاری کریں ہٹکی ہے - اسی سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اگر کوئی دوسرا شخص اسی قسم کی عبادت و ریاضت خواہ کتنی ہی کیوں نہ کرے، چون کہ بالقوہ نبوت کی صلاحیت سے معروف ہے

لہذا نبوت حاصل نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس منصب و ذمہ داری کے لیے افراد کا انتخاب خود کیا۔ اس انتخاب ربانی کو قرآن کی زبان میں 'اصطفاً' کہتے ہیں۔ اصطفا کے معنی ہیں بہت سی چیزوں میں سے بہترین چیز کو چن لینا۔ یہ لفظ خود بتاتا ہے کہ رسالت کے لیے انتخاب ایسے ہی افراد کا ہوا تھا جو خدا کے نزدیک انہی صلاحیتوں اور قوتوں کے اعتبار سے اس عظیم مقصد کے لیے موزوں ترین تھے۔ چنانچہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین نے اپ کے نبی بنائے جانے پر اعتراض کیا اور اتنے لیے بھی بوادر کے استحقاق کی باتیں کیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اللَّهُ أَعْلَمُ حِينَ يَحْمِلُ بِسْلَقَةً

اَفَ زِيَادَهُ بَهْرَ جَانِتَهُ كَمْ اَسَ اپنی
پیغمبری کس کے سپرد کرنی چاہیے ۔
(الانعام - ۱۲۵)

۳ - تعلیمات من جانب الله: ہیغمبر، دین اور شریعت کے نام اور جو کچھ

انسانوں کے سامنے پیش کرتے ہیں وہ سب اللہ کی جانب سے ہوتا ہے۔ وہ ہدایت ربانی کے تابع ہوتے ہیں، نہ خود ان کی کوئی مرضی ہوتی ہے اور نہ ذاتی ارادہ۔ وہ وہی کرتے اور کہتے ہیں جس کا انہیں خدا کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے:

فَمَلَأَتْرَقَتْ مِنَ الْهَمَىٰ فَإِنْ هُوَ إِلَّا ذِي لَذْتِهِ

وہ اپنی خواہش نفسانی سے کلام
نہیں کرتا بلکہ وہ کہتا ہے جو
خدا کی طرف سے کہا جاتا ہے۔
(النجم - ۴)

نبی کی ساری تعلیمات کے الله ہی کے جانب سے ہونے کا مطلب بہت وسیع ہے۔ اس کی دونوں یتیمیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام متعین لفظوں میں خود براہ راست یا فرشتے کے ذریعے نبی کو سکھا دیے ہوں، دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو خصوصی حکمت اور نور نبوت اس کو عطا ہوئے ہیں ان کے ذریعے سے اس نے خود مزید احکام نکالے ہوں، یہ دونوں قسم کی تعلیمات بلا واسطہ یا بالواسطہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوئے ہیں۔

وَمَا أَنْتُ كُلُّهُ الرَّسُولُ قَدْ دُوَّهُ وَمَا تَنْهَى كُلُّهُ عَنْهُ فَإِنْتَ هُوَ

(یعنی) جو کچھ (سکم) رسول تجویں دے اسے مان لو
اور جس (پیز) سے وہ منع کر دے اسے اس سے ذک حاوز
(الحشر - ۲۴)

۳۔ عصمت: نبی مقصوم ہوتا ہے۔ اس سے نہ فکر و اجتہاد کی غلطیاں
ہوئی ہیں نہ اخلاق و اعمال کی لغزشیں۔ نفس اور شیطان کی دواندرازوں سے
ہوئے گذبات، اخلاق و افکار اور اعمال سبھی پاک ہوتے ہیں۔ لیکن اس
کے وجہ پر نہیں کہ اس میں غلط کام کرنے کی قابلیت ہی نہیں ہوئی۔ اس کے
برخلاف حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کی طرح انبیاء علماء والسلام کے اندر بھی پہ
قابلیت طبعی طور پر لازماً موجود ہوئی ہے، لیکن اس قابلیت کو بروائے ذر آنے
پر کامیابی نہیں ہو پاپ۔ جس کی وجہ پر کہ نبی کی فکر و بصیرت بھی پہ
حد درجہ کامل ہوئی ہے اور اس کی اخلاقی قوت بھی۔ ایک طرف تو وہ احکام
اللهی کا منشا سمجھنے اور ان سے اپنے اجتہاد کے ذریعے سے مزید احکام نکال اپنے
کی بہترین صلاحیتیں رکھتا ہے۔ دوسری طرف اسے اپنے نفس پر پورا پورا قابو
حاصل ہوتا ہے اور اس کی اخلاقی حس، اس کا خوف خدا اور اس کا اندیشه، آخرت
اس درجہ ترقی بافتہ ہوتے ہیں کہ گناہ کے محکمات سر اٹھا ہی نہیں پاتے۔
اسی کے ساتھ ساتھ ان پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی نگرانی رہتی ہے اور یہی
نگران انہیں فکر و اجتہاد کی غلطیوں اور اخلاق و عمل کی کوئی ناکامیوں
پر بھائی رکھتی ہے۔ اور اس طرح اس کا ہر قول حق اور ہر عمل صحیح و صواب
ہوتا ہے اور پوری زندگی ایک صاف اور روشن آئندہ کی، اتنند ہوتی ہے
جسے خالق کائنات نے انسانوں کے لئے اسوہ (مثالی نمونہ) مقرر فرمایا ہے اور جس
کی اتباع میں نجات ہے۔

درحققت نبی کا مقصوم ہونا اس مقصد کے لئے بالکل ناگزیر تھا جس کے
لئے رسالت دے سائلہ قائم کیا گیا ہے۔ اسکی ایسا آدمی جس کے متعلق یہ اندیشه
ہو کہ وہ جھوٹ بول سکتا ہے، اخبارات کر سکتا ہے یا نسب ایجاد کیسے
ہے، با منشاءہ اللہ کی غلط ترجمانی کر سکتا ہے، آخر دوسروں کا اعتماد کیسے
حاصل کر سکتا ہے۔ لوگ کیسے یقین کریں کہ وہ فلاں حکم دیتے ہوئے سچ بول
رہا ہے۔ با خدا کے نام اور جو ہدایات دے رہا ہے وہ سب کی سبب فی الواقع خدا کی

طرف ہے ہیں۔ اور اس نے اپنی طرف سے کوئی کمی و بیشی نہیں کی۔ پھر ایسا شاعر جس کا دامن غلطیوں یا گناہوں سے الودہ ہو، لوگوں کے لیے اعلیٰ تربیت اور قابل تقلید نمونہ (اسوہ حسنہ) کیسے بن سکتا ہے؟ نبی کو چوں کہ اللہ تعالیٰ نے احکام النبی کی کامل اطاعت کا اعلیٰ تربیت نمونہ بننا کر بھیجا تھا ابھذا ان کے دامن کو گناہ کی الودگی سے پاک رکھنا تاکہ لوگ بلا خوف و خطر ان کی زندگی کے ہر ہملوکی پر روی کرسکیں۔

یاد رہے کہ نبی نہ صرف یہ کہ معصوم ہوتا ہے بلکہ فی الحقيقة معصوم صرف نبی ہی ہوتا ہے۔ فکر و اجتہاد کی غلطیوں اور سیرت و کردار کی لغزشوں سے ہاک ہونا صرف اللہ کے انہی خاص بندوں کا حصہ ہے۔ دوسرے لوگ خواہ فہم و بصیرت اور نیک و تقویٰ کی کتنی ہی بلند چوٹیوں پر کیوں نہ پہنچ جائیں لیکن معصوم عن الخطأ نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ بزرگوں کی زندگیاں قابل تقلید ضرور ہیں لیکن ان کے اعمال دین میں حجت بالذات نہیں ہیں اور نہ تنقید سے بالاتر ہیں۔ اس کے مقابلہ میں انبیا کی زندگیاں سند و حجت کی بناء تنقید سے بالاتر ہیں۔

هر قوم کے لیے نبی

ان موئی موئی باتوں کے علاوہ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ انبیا ہر قوم میں بھیجے گئے ہیں:

وَلِنْ تُرْثِقَنَ أَفَلَمْ يَرَوْا إِلَيْهَا لِلْأَخْلَاقِ فِيهَا لَذِيْرَوْا

کوئی بھی ایسی قوم نہیں جس میں کوئی ڈرانے والا (رسول) نہ آیا ہو۔ (فاطر ۲۲)

اس کی وجہ ظاہر ہے۔ تمام انسان برابر ہیں اور سب ایک ہی مقصد کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ اللہ کی بندگی سبھی کا فریضہ ہے اور آخرت میں اس فرض کے متعلق ہر ایک سے چھوٹا کچھ ہوگی۔ پھر ایسا کیوں ہوتا کہ کچھ لوگوں میں تو اللہ نبی بھیجنا اور باقی لوگوں کو ان سے محروم رکھتا حالانکہ وہ خالق و مالک سب ہے۔

ان تمام انبیا کو ماننا ہر مسلمان کا فرض ہے، اور نہ صرف ماننا بلکہ ان کا احترام کرنا بھی ضروری ہے۔ بدفہختی سے اکثر مذاہب اس سلسلے میں اپنے ہزاروں کی تنگ نظری کا شکار ہو گئے ہیں۔ بہودیوں بر انبیاء بنی اسرائیل کے

رسالت

۲۲۶

لاؤ کسی اور نبی کا اقرار فرض نہیں رہا، هندو نام غیر هندو انسانوں کو "ابجوہ" اور پنڈال سے جوہ کر دیں ہے تو ہمیں هندو رہ سکتے ہیں۔ مسیحی حلقوں میں پیغمبر اسلام کی بھروسہ کر تو ہمیں حقوق ہے، غرض کہ نام طور پر ابک مذہب کے مانے والے اپنے ایسا نہیں کر سکتے، ان پر تمام انبیا کی تعظیم فرض ہے۔

منصب رسالت^۱

نبیا علیہم السلام کے منصب اور ان کے درجے کے بارے میں اچھی خاصیت نہیں رہی ہے اور بعض حلقوں میں اب ہی ہیں۔ ایک طرف تو یہ خیال ہے کہ انبیا درجہ بشریت سے بلند، فرشتے یا خدا ہوتے ہیں، یا کم از کم نہان میں تھوڑے بہت شریک ہوتے ہیں۔ حالانکہ انبیاء کرام نے خود یہیں، اس کی نزدیک کی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا:

وَلَا أَقُولُ لَكُمْ يَعْنِي خَزَانِي الْمُؤْلُودُ لَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ إِنِّي مَلَكٌ

میں تم سے یہ فہیں کہتا ہوں کہ میرے قبضے میں خدا کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کا عالم رکھتا ہوں اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ (ہود۔ ۳۱)

اسی طرح بعض انبیا کو ان کی قوموں نے خدا کا بیٹا بنا لیا۔ حالانکہ انہوں نے بھی اعلان کر دیا تھا:

إِنِّي عَمَدْتُ اللَّهَ تَشْفِيقَ الْكِتَابَ وَجَعَلْتُنِي يَهْيَا

میں اللہ کا بنہے ہوں، اللہ تعالیٰ نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا
۴۔ (مریم۔ ۳۰)

انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر کہ بھولی امتوں نے اپنے انبیا کی نظمی و تکریم میں غلوٰ کرنے کرتے انہیں خدائی کے متین تک ہمہجا دیا، لہ بات کا بڑا خیال رکھا کہ کوئی شخص اپ کی ابسی بے جا تعظیم نہ کرے مگر سے فتنہ پیدا ہو۔ نئی بار اوگوں نے آپ کو نسجه کرنے کی اجازت چاہی لیکن آپ نے سخنی سے روک دیا، اور بار بار خدا کے سامنے اپنی بندگی اور ہماری کا اعلان کیا۔

^۱ حصہ "پیرت النبی" جلد چہارم از "ولانا سید سلیمان ندوی اور ترجمان القرآن کا" "منصب رسالت ندوی" از مولانا سید ابوالاملہ وردودی کی اقتباسات میں مرتب کیا گیا ہے۔ (رتب)

ایک طرف تو انبیا کے مرتباے بین اس درجہ خلو کیا گیا کہ انہیں خداوند نے ہنہادیا گیا - دوسری طرف ایک گروہ نے رسالت کے درجے کو اس قدر کم سمجھ کر رسول کی حیثیت ایک ڈاکیہ یا نامہ بردار سے زیادہ نہ رہی - انہوں نے کہا شروع کر دیا کہ نبی کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اللہ کی کتاب انہوں تک پہنچادے اور بس - لیکن اگر رسولوں کا کام اتفا ہی ہوتا تو خدا یہ کم دوسروں سے بھی لے سکتا تھا - آخر اس کے لیے یہ کیا مشکل تھا کہ لوگوں کی لکھائی کتابیں نازل کر دیتا یا فرشتوں کے ذریعے کتب بھیج دیتا - ایک چون کہ شہادت حق کا کام بڑا وسیع ہے لہذا اللہ تعالیٰ نے انبیا و رسول بھی ان انبیا کی ذمہ داریاں اور ان کے مناصب کیا تھے ، اس سلسلے میں ہم قرآن رہنمائی حاصل کر دیں گے کہ اس نے انبیا کی کیا حیثیت بیان کی ہے -

۱ - قابل اطاعت : قرآن کی رو سے نبی کی مکمل اطاعت اور بجز ضروری ہوئی ہے اور ابسا سمجھنا شرط ایمان ہے - دین و شریعت کے دائرے میں نبی جو کچھ بھی کہتا ہے ایک مومن کا فرض ہے کہ اس کی تعمیل میں چون وہاں نہ کرے اور مصلحت خواہ اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے ہے ہر صورت پر رکھیں کہ وہ خیر ہی خیر ہے اور سراپا حق ہے - اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا يُطَاعَهُ لَذُنْلَذُنِ

مم فی جس رسول کو بھی بھیجا اسی لیے
بھیجا کہ اذن خداوندی کے مطابق اس
کی اطاعت کی جائے - (الناء - ۱۴)

بھر یہ اطاعت بھی صرف ظاہر کی حد تک نہیں ہو چاہیے ، بلکہ دل کی رضا کے ساتھ ہوئی چاہیے ، نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے حق اطاعت کا نہ کرو
کرنے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

فَلَا وَرَبَّ لِأَنْتُمْ مُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُونَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ لَوْلَا يَهْدُدُو فِيَنْتَهُمْ حَرْجًا وَمَا فَرَضَنَا

پس نہیں ، اے نبی ! تمہارا رب گواہ ہے کہ یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے
جب تک وہ آپس کے تمام معاملات میں تمہیں حکم نہ بنائیں اور پھر تمہارے
فیصلے پر بلا کسی دل تک کے آمادگی کے ساتھ سر تسلیم خم نہ کر دیں -
(الناء - ۱۵)

اور یہ بات عمل کے مطابق یہی ہے اس لئے کہ اگر انسان کے لئے اللہ تعالیٰ
کے احکام دو جانبیں نہ واحد ذریعہ نہیں ہے تو فیس کی کامل اطاعت اور ہدودی کے
بیان کی اطاعت اور بندگی کی کوئی شکل رہ ہی نہیں جائی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر
نبی نے اپنی دعوت کے ساتھ یہ مطالبه کیا:

فَالْقُوَّةُ لِلَّهِ وَأَطِيعُونِي

اللہ سے ذرور اور میری اطاعت کرو۔ (الشرا' - ۱۳۱)

اس دعوت سے اس حقیقت کا اظہار مطلوب ہے کہ نعمتی اور بندگی کی راہ
میں رسول کی اطاعت ہی سے معلوم ہو سکتی ہے اور صرف رسول علی ہے سکتا ہے
کہ خدا کے احکام دیا گیا، اور ان احکام کو اس طرح عمل کیا جانا چاہیے۔
یہی وجہ ہے کہ قرآن میں بار بار لطیفو اللہ (اللہ کی اطاعت کرو) کے ساتھ ساتھ
اطیعوالرسول (رسول کی اطاعت کرو) کا بھی حکم آیا ہے۔ نبی دین و شریعت کے
دائیے میں جو کچھ کہتا ہے وہ سب کا سب اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔
ہے حقیقت نبی کی حیثیت کو اور بھی اہم بنا دیتی ہے دیوں کہ ایسی صورت میں
نبی کی اطاعت نبی کی اطاعت نہیں رہ جائی بلکہ خدا کی اطاعت بن جائی ہے، جیسا
کہ فرمایا بھی گیا:

مَنْ يُطِّلِعُ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ

جس نے رسول کی اطاعت کر اس نے خدا کی اطاعت کر۔ (الناء - ۸۰)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ نبی کا ایک بڑا اہم منصب "مطاع" کا ہے۔
وہ ایک ایسی ہستی ہے جس کی کامل اطاعت کی جان چاہیے، ایسی اطاعت جس
میں نہ کوئی قید و شرط عنہ نہ ہوں یعنی دلی۔ جو شخص نبی کا مقام اس سے
نیچے سمجھتا ہے وہ صحیح معنوں میں نبی ہر ایمان ہی نہیں رکھتا اور بالکل نہیں
جانتا کہ نبوت کسے کہتے ہیں۔

۲ - شارح کتاب اللہ : اللہ تعالیٰ کی شریعت چون کہ ہدیثہ رہنے
کے لئے ہے لہذا کتاب اللہ میں زیادہ تر زور اصول و مبادی ہر دیا گیا ہے اور اللہ
کے ایغماں کے ذریعے کام کیا گیا ہے کہ وہ ان کی تشریع و یقینیت کریں،

-وره' نعل میں ارشاد کیا گیا ہے کہ :

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْنَا الْذِي لَمْ يُجِّعِنَ بِكُلِّ أَيْمَانٍ مَا نَزَّلَ اللَّهُ هُنْف

اور ہم نے یہ ذکر (قرآن) تپاری طرف
اس لیے دزل کیا ہے تاکہ لوگوں کے
لیے تم اس مددیت کو واضح کر دو، جو
ان کے طرف اشاری گئی ہے۔ (آیت - ۴۲)

یہ بات ظاہر ہے کہ تشریع و توضیح خود کتاب کے الفاظ پڑھ کر من
دینے سے نہیں حقوق بلکہ تشریع کرنے والا اس کے الفاظ سے زائد بھی کوہہ کہتا
ہے تاکہ سنتے والا کتاب کا مطلب ہوری طرح سمجھ جانے۔ اسی طرح اکثر کتاب
میں کسی عمل مسئلے کا ذکر ہو تو بسا اوقات شارح کو عمل مظاہرے کے
ذریعے سے مطلب سمجھانا ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم اس سے ۶۷۸ ملے ایمان کوچک
ہیں انہیا معمصوم ہوتے ہیں، اسی بنا پر ان کی یہ تشریع و تعبیر خطا سے بالآخر
اور عقیلہ کے لیے حجت ہے۔ اس کے برخلاف دوسرے لوگ قرآن کی تشریع اور
اس سے احکام اخذ کرنے کا جو کام کریں گے ضروری نہیں کہ وہ صحیح ہی ہو،
وہ حجت نہیں ہوا۔

۳ - معلم و مریب : انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرنے ہونے
قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ :

لَعْذَمَنَ إِنَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِرْقَمْ سُوَلَّا مِنْ أَقْرَبِهِمْ يَتَلَوَّ عَلَيْهِمْ أَنْتِهِمْ وَإِرْكَنْهُمْ وَيَعْلَمُهُمْ
الْكِتَابُ وَالْحِكْمَةُ،

بلاز نہد اے تم ایسا نئے مسلم۔ نوں پر احسان فرم یا ہے کہ خود انہی میں سے ایک
رسول۔ بعمروت کیا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کرستتا ہے، ان کا ترکیہ کرتا
ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے۔ (آل عمران - ۱۶۲)

اور دیکھ متعدد مقامات ہر اس مفہوم کی آیات وارد ہوئیں! ان ساری آیات میں
جو باب رک نظر آئی ہے وہ یہ ہے دہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول دو صرف قرآن
کی آیات سے دینے کے لئے نہیں بھیجا تھا بلکہ اس کے ساتھ بعثت کے تین اور
مقاصد تھے۔

- لوگوں دو اپ (صلی اللہ علیہ وسلم) "کتاب" کی تعلیم دیں -
- (۱) اس کتاب کے منشا کے مطابق کام کرنے کی حکمت سکھائیں -
 - (۲) افراد کا بھی اور ان کی اجتماعی ہست کا بھی تزکیہ کریں
 - (۳) یمنی اپنی تربیت سے ان کی انفرادی اور اجتماعی خرابیوں کو دور رکھیں اور ان کے اندر اچھے اوصاف اور بہتر نظام اجتماعی کو نشوونما دیں -

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اللہ پڑھ کر سانے کے علاوہ نبی کے جو فرائض ہیں ان میں کتاب و حکمت کی تعلیم بھی ہے - اور جب بہ نہام آپ کے فرائض نبوت میں تھے تو یہ بات بدیہی تھے کہ اسی تعلیم کو پیغمبر انہی ہستیت حاصل ہوئی اور اس کی تعمیل امت مسلمہ کے لئے فرض ہوئی - آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اسی زبانی تعلیم اور عمل مظاہرے کو صحابہ اور تابعین کے انہی روایات اور عمل کے ذریعے محفوظ رکھا اور وہ "احادیث و سنن" کے نام سے مرسوم ہوا -

۲۔ پیشوا اور نمونہ" تقلید: اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو امام و پیشوا اور رہنمای بنا کیے ہے یعنی نبوت اور وحی سے سرفراز ہونے کے بعد ان کی ذات بجم ہدایت و رہنمائی اور امامت و پیشوائی کے لئے خاص ہو جاتی ہے - ان کی رہنمائی اور امامت میں مبہوت ہونے ہیں، اس کے سامنے ہدایت و کرامیت سے بھائیں، وہ جس امامت میں مبہوت ہونے ہیں، جن کی رہنمائی نے دو چراغ و کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ) روشن ہونے ہیں جن کی رہنمائی مل کر ایک ہوتی ہے - سورہ آل عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

لَلَّٰهُمَّ شَهِدْنَا اللَّهَ كَالْمُعْنَىٰ تَعْبُدُهُمْ لَهُ وَيَنْهَا لَكُمْ ذُنُوبُكُمْ وَلَلَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ وَ قُلْ أَلْوَاعِ اللَّهُ وَالرَّسُولُ لَكُمْ إِنَّمَا تَنْهَاكُمْ تُلْوَانُكُمْ اللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ

ای نبی کہو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھئے ہو تو میری پرروی کرو، افہ تم سے محبت رکھئے گا اور تمہارے گناہوں کو بخشن دتے گا اور اللہ غفور و رحيم ہے۔ کہو کہ اطاعت کرو اللہ کی اور رول کی پھر اگر وہ منہ موذنے ہیں تو وہ کافروں کو پسند نہیں کرنا۔ (آیات : ۲۱ - ۲۲)

اس طرح سورہ احزاب میں کہا گیا ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أَنْوَةٌ هَبَّتْ لَهُنَّ كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْأَلْيَهُ

تمہارے لیے افہ کے رسول میں بہترین نمونہ تقلید موجود ہے۔ مر اس شخص کے لئے جو افہ اور برم آخر کے امید رکھتا ہے۔ (آیات : ۲۱ - ۲۲)

ان دونوں آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے (رسول) کو ہیشوا مقرر کیا تھا اور ان کی پیروی اور تعلیم کو مسلمانوں کے لیے لازم قرار دیا ہے۔ یہ آیات اسی بات کی طرف واضح رہنمائی کرتی ہیں جو اپنے (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے آخری خطبوں میں سے ایک میں حجۃ الوداع کے موقع پر کہی تھی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا تھا:

انی تارک فیکم النقلین کتاب اللہ
میں تم میں دو چیزیں چھوڑتے جا رہا
ہوں، اللہ کی کتاب اور اپنی سنت (یعنی
عملی زندگی)۔

و سنتی

جو مسلمان آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خوب مبارک میں تھے ان کے تو سامنے ہی آپ کی زندگی تھی لیکن آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے بعد ہمیں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی سنت کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے اور قرآن کریم کے بعد ہماری ہدایت کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے۔

۵۔ شارع اور قانون ساز: سورہ اعراف میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا

ذ در ذرنے ہونے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

**لَا أَرْفَمْ مَا هِيَ مَعْرُوفٌ وَلَا يَنْهَا مَعْنَى الْمُنْكَرِ وَلَيُؤْمِنُ لَهُمُ الظَّاهِرَةُ وَلَيُعْلَمُ عَلَيْهِمُ الْحَتَّىٰ وَلَيَعْلَمُ عَنْهُمْ إِغْرِافُ
وَالْأَغْلَلُ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ**

وہ ان کو معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے اور ان کے لئے پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ان پر فاپاک چیزوں حرام کرنا ہے اور ان پر سے وہ بوجہ اور بندھن (غیر الہی قوانین) افار دیتا ہے جو ان پر چڑھتے ہوئے تھے۔ اعراف (آیت۔ ۱۵۵)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سورہ می اختیارات عطا کیتی ہیں۔ اللہ کی طرف سے امر و نہیں اور تعالیل و تعریف صرف وہی نہیں ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے بلکہ جو کچھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حلال و حرام قرار دیا ہے اور جس چیز کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے یا جس سے منع کیا ہے وہ ہی اس کے دلیل ہونے اختیارات سے ہے اس لئے وہ ہمیں قانون خداوندی کا حصہ ہے۔ یہی بات سورہ حشر میں بڑی صراحة سے ارشاد ہوئی ہے :

وَمَا أَشْكَلْنَا الرَّبِيعَ وَمَا مَنَّكُلْنَا عَنْهُ فَإِنَّهُمْ لَهُوَ وَأَنْقُوا اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ شَمِدِيْدُ الْمَقَابِ

جو کچھ رسول نہیں دتے اسے لے لو اور جس سے نفع کر دے، اس سے رک جاؤ، اور اللہ ہے ذرہ، بزرگ ہے اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ (الحضر آیت۔ ۷۰)

۶۔ قاضی اور حکم : قرآن میں یہ شمار جگبون ہر اس امر کی تصریح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قاضی و حنکم مقرر دیا ہے۔

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ يَعْصِي بِعْثَلَةَ بَيْنَ أَشْأَسِ الْأَرْضِ لِتَنذِيرَهُ

اے آپ، ہم نے تو ساری طرف حقوق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے کہ لوگوں کے درمیان قسم فصلیٰ کرو جیسا کہ اللہ تعالیٰ ہم دکھائے۔ (الناء ۱۰۵)

مومنین کی صفات میں سے ایک صفت یہ بنافی ڈی ہے ۔ لہ جب رسول کے فیصلے کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا (سمعتنا واطعنا)۔ اسی طرح ایک اور جگہ بیان کیا گیا ہے کہ مومنین کی شان یہ ہے کہ جب اللہ کا رسول کسی معاملے میں انہیں کوئی حکم دے دے تو وہ اسے بسرو چشم تسلیم کر لیتے ہیں اور ان کے دل میں فیصلے کے خلاف ذرا بھی تنک نہیں ہوتے۔

انبیا کے کوناں کوں مناصب میں سے یہ صرف چند تھے جن کا ذکر اور کیا گیا۔ قرآن میں ان کے علاوہ بنا پا گیا ہے کہ انبیا ہادی (رهنمای)، نذیر (ذرانے والے)، داعی (خدا کی طرف دعوت دینے والے)، مبشر (خوش خبری سنانے والے)، مبلغ (خدا کے احکام ہمچانے والے)، مزک (برائیوں سے باک کرنے والے)، سراج منیر (روشن چراغ) بھی تھے۔

بہاں اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ انبیا علیہم السلام عام رہنماؤں سے کوئی مشابہت نہیں رکھتے۔ اگرچہ عام رہنماؤں میں ہمیں معلم بھی مل جاتے ہیں، حاکم بھی، قانون ساز بھی اور جج بھی لیکن ان لوگوں کی رہنمائی اور انبیا کی رہنمائی میں سب سے بڑا فرق یہ ہوتا ہے کہ عام رہنمایا یا تو خود ساختہ ہوتے ہیں یا عوام کے بنائے ہوئے۔ اس کے برخلاف انبیا کو لیلدری کا نہ کوئی شوق ہوتا ہے اور نہ وہ عوام الناس کے منتخب کرده ہوتے ہیں۔ وہ اپنے جملہ مناصب کے ساتھ خدا کے مقرر کردہ ہوتے ہیں۔ اور ان کی بہ جملہ حیثیتیں حاصل، قاضی، شارع وغیرہ سب خدا کی طرف سے ہوئی ہیں۔ اپنی اس حیثیت کی وجہ سے وہ دوستی بات اپنے دل سے کھٹر درنہیں کرنے۔ صرف وہی کچھ لکھنے ہیں جس کا خدا نے انہیں حکم دیا ہو۔ وہ خدا کے فرمان میں تبدیلی یا اضافہ بھی نہیں درسکرے۔ خرض یہ ہے کہ ان کی ہوزی زندگی اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ اصولوں کے ماتحت ہوتی ہے۔ علیہم الصلاہ والسلام۔

رسالت محمدی

لرشتہ صفحات کے مطالعے سے یہ جذیقث آپ ہر روشن ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لئے جو نظام بنایا ہے وہ یہ ہے کہ مختلف قوموں کے پاس اللہ کے رسول و میں الہی لے کر آئے اور انہوں نے اپنی زندگی اور اسوہ حسنہ سے آن تعلیمات کے عملی ہہلو کو روشن کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہی ہے کہ اس نے انسان کو اول روز ہی سے نبیوں کی رہنمائی سے سرفراز فرمایا ہے۔ بہلا انسان نبی تھا اور اس طرح تاریخ انسانی کا آغاز ہدایت اور روشنی میں ہوا، ظلمات اور تاریکی میں نہیں۔ ہر یہ روشن سلسلہ برابر جاری رہا اور ہر دور اور ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں کے ذریعے سے اپنی ہدایت انسانوں تک پہنچانا رہا۔ اس سلسلے کی آخری کڑی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ زمانہ چھٹی صدی عیسوی کا ہے۔ جب تمام دنیا اور تمام انسانی قوموں کے لیے ایک ہی غیر یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب کی سر زمین میں پیدا کیا گیا اور ان کو اسلام کی ہوری تعلیم اور مکمل قانون دے کر اس خدمت ہر ماسور کیا گیا کہ اسے سارے جہاں میں پھیلا دیں۔

* دنیا کا جغرافیہ انہا در دیکھو، تم ایک ہی نظر میں محسوس کر لو گے کہ تمام جہاں کی ہیغمبری کے لیے روئے زمین ہر عرب ہے زیادہ موزوں مہام اور دوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ ملک ابشتیا اور افریقہ کے عین وسط میں واقع ہے اور یورپ بھی یہاں سے قریب ہے، خصوصاً اس زمانے میں یورپ کی متعدد قومیں زیادہ تر یورپ کے جنوبی حصے میں آباد تھیں اور یہ حصہ عرب سے اتنا ہی قریب ہے جتنا ہاکستان ہے۔

ہر اس زمانے کی تاریخ پڑھو، تم کو معلوم ہو گا کہ اس نبوت کے لئے اس زمانہ میں عرب قوم سے زیادہ موزوں کوئی قوم نہ تھی۔ دوسری بڑی بڑی قومیں اپنا اپنا زور دلھا کر گویا ہے دم ہو چکی تھیں اور عربی قوم تازہ دم تھی۔ تمدن کی ترقی سے دوسری قوموں کی عادتیں بگڑ گئی تھیں اور عربی قوم میں اس وقت کوئی ایسا تمدن نہیں تھا جو اس کو آرام طلب اور عیش پسند اور رذیل بنا دیتا۔ چھٹی صدی عیسوی کے عرب اس زمانہ کی متعدد قوموں

* یہ حصہ مولانا مودودی صاحب کی کتاب "رسالہ دینیات" سے ماخوذ ہے۔ (مرتب)

جس اپنے اثرات سے بالکل باک تھے۔ ان میں وہ تمام انسانی خواہیں موجود تھیں جو ایک ایسی قوم میں ہو سکتی ہیں جس کو زوال ہذیر تمدن کی ہوانہ لکھی ہو۔ وہ بہادر تھے، بے خوف تھے، فیاض تھے، عہد کے پابند تھے، آزاد خیال اور آزادی کو ہسند کرنے والے تھے، کسی قوم کے علام نہ تھے، اپنی عزت ہر جان دے دینا آن کے لیے آسان تھا، نہایت سادہ زندگی بسر کرنے تھے اور بین و مشریق سے بیکانہ تھے۔ اس میں شک نہیں کہ ان میں بہت سی برائیاں ہیں نہیں، مگر یہ برائیاں اسی لیے تھیں کہ ڈھانی ہزار برس سے آن کے ہاں کوئی پیغمبر نہ آپا تھا، نہ کوئی ایسا رہنما اپنا ہوا تھا جو آن کے اخلاق درست کرتا اور انہیں تہذیب سکھاتا، صدیوں تک ریاست پاکستان میں آزادی کی زندگی بسر کرنے کے سبب ان میں جہالت ہائل گئی تھی۔ اور وہ اپنی جہالت میں اس قدر سخت ہو گئے تھے کہ ان کو اُدھی اپنانا کسی معمولی اُدھی کے میں کام نہ تھا، لیکن اسی کے ساتھ ان میں بہ قابلیت ضرور موجود تھی کہ اگر کوئی زار دست انسان اُن کی اصلاح کر دے اور اس کی تعلیم کے اثر سے وہ کسی اعلیٰ درجہ کے مقصد کو لے کر اپنے کھڑے ہوں تو دنیا کو زیر و زار کر ڈالیں۔ پیغمبر عالم کی تعلیم کو ہمیلانے کے لیے ایسی ہی جوان اور طاقت ور قوم کی ضرورت تھی۔

اس کے بعد عرب زبان کو دیکھو۔ اس زبان کی واقفیت اور اس کے علم و ادب کے سطامیں سے تم کو معلوم ہو گا کہ بلند خیالات کو ادا کرنے اور خدائی علم کی نہایت نازک اور باریک باتیں بیان کرنے اور دلوں میں اثر پیدا کرنے کے لیے اس سے زیادہ موزوں کوئی زبان نہیں ہے۔ اس زبان کے مختصر جملوں میں اٹے اٹے مضامین ادا ہو جاتے ہیں۔ اور آن میں ایسا زور ہوتا ہے کہ دلوں میں تیر و نشتر کی طرح اثر کرتے ہیں۔ ایسی شیرینی ہوتی ہے کہ کانون میں اس اڑتا معلوم ہوتا ہے۔ ایسا نعمہ ہوتا ہے کہ اُدھی بے اختیار جھومنے لکتا ہے۔ قرآن جیسی کتاب کے لیے ایسی ہی زبان کی ضرورت تھی۔

اس اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی حکمت تھی کہ اس نے تمام جہان کی ایضاعیت کے لیے عرب کے مقام دو منتخب کیا۔ جس ذات مبارک کو اس کام کے لیے ہسند کیا گیا وہ بھی عدیم العمال تھی۔

نبوت محمدی کا عقل ثبوت

ایک هزار چار سو برس ہے دنیا میں نہ تار برق تھی، نہ نیلینوں
تھے، نہ ربل تھی، نہ چہارپہ خانے تھے، نہ اخبار اور رسائی شائع ہونے تھے،
نہ کتابیں چھپتی تھیں، نہ سفر اور سیاحت کی وہ آسانیاں تھیں جو آج کل ہاں
جائی ہیں۔ ایک ملک سے دوسرے ملک تک جانے میں مہینوں کی مسافت طے
کرنی پڑتی تھی۔ ان حالات میں دنیا کے درمیان عرب کا ملک سب سے الگ تھا
پڑا ہوا تھا۔ اس کے ارد گرد، ایران، روم اور مصر کے ملک تھے جن میں
کچھ علوم و فنون کا چرچا تھا مگر ریت کے بڑے بڑے سمندروں نے عرب
کو ان سے جدا کر رکھا تھا۔ عرب سوداگر اونٹوں پر مہینوں کی راہ طے کر کے
ان ملکوں میں تجارت کے لئے جانے تھے۔ مگر یہ تعلق صرف مال کی خرید و فروخت
کی حد تک تھا۔ خود عرب میں کوئی اعلیٰ درجہ کا تمدن نہ تھا، نہ کوئی
مدرسہ تھا، نہ کوئی کتب خانہ، نہ لوگوں میں تعلیم کا چرچا تھا، تمام
ملک میں گنتی کے چند لوگ تھے جن کو کچھ لکھنا پڑتا آتا تھا۔ مگر
وہ بھی اتنا نہیں کہ اس زمانے کے علوم و فنون سے آشنا ہوتے۔ وہاں کوئی
باقاعدہ حکومت بھی نہ تھی، کوئی قانون بھی نہ تھا۔ هر قبیلہ اپنی جگہ خود
اختیار تھا، آزادی کے ساتھ لوث مار ہوتی تھی، آئے دن خون ریز لڑائیاں ہوتیں
رہتی تھیں، اُدمی کی جان کوئی قیمت ہی نہ رکھتی تھی، جس کا جس اور
ہنس چلتا آئے مار ڈالتا اور اس کے مال ہر قبضہ کر لیتا۔ اخلاق اور تہذیب کی
اُن کو ہوا بھی نہ لگتی تھی۔ بدکاری اور شراب خوری اور جوئے بازی کا بازار
کرم تھا۔ لوگ ایک دوسرے کے سامنے ہے تکلف بڑھنے ہو جاتے تھے، عورتیں
تک خانہ کعبہ میں ننگی ہو کر طواف کرتی تھیں، حرام و حلال کی کوئی
تمیز نہ تھی، عربوں کی آزادی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ کوئی شخص کسی
قاعده، کسی قانون، کسی ضابطے کی پابندی کے لئے تیار نہ تھا، نہ کسی حاکم
کی اطاعت قبول کر سکتا تھا۔ اس ہر جمالت کی یہ کیفیت کہ ساری قوم پتھر
کے بتوں کو پوچتی تھی۔ راستہ چلتے میں کوئی اچھا سا چکنا پتھر مل جاتا تھا
اسی کو سامنے رکھ کر پرستش کر لیتے تھے، یعنی جو گردنیں کسی کے سامنے
نہ جھکتی تھیں وہ پتھروں کے سامنے جھک جاتی تھیں، اور یہ سمجھا جاتا تھا
کہ یہ پتھر اُن کی حاجت روانی کریں گے۔

اپنی قوم اور اپسے حالات میں ایک شخص اپنا ہوتا ہے، لہنہن ہی میں
اور دادا کا ساپہ سر سے آنہ جاتا ہے۔ اس لئے اس کنی گذری حالت
ہو نہیت مل سکتی تھی، وہ بھی اس کو نہیں ملتی، ہوش سبھاٹا ہے تو
لکون کے ساتھ بکریاں چرانے لکتا ہے، جوان ہوتا ہے تو سوداگری
لک جاتا ہے۔ انہنا اپنہنا، ملنا جانا سب انہی عربوں کے ساتھ ہے
ہی کی حالت اپنی بیان ہو چکی ہے۔ تعلیم کا نام تک نہیں حتیٰ کہ پڑھنا
نہیں آتا، مگر اس کے باوجود اس کی عادتیں، اس کے اخلاق، اس کے
بلان سب سے جدا ہیں۔ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا، کسی سے بد کلامی
نہیں کرتا۔ اس کی زبان میں سختی کے بجائے شیرینی ہے اور وہ بھی اپسی کہ
لوگ اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ وہ کسی کا اپک اپسے بھی ناجائز
ملنے سے نہیں لیتا۔ اس کی ایمان داری کا حال یہ ہے کہ لوگ انہے قیمتی
جان کی طرح کرتا ہے اور ساری قوم اس کی دیانت ہر بھروسہ کرنی ہے
اور اسے "امین" کے نام سے ہمارا ہے۔ اس کی شرم و حیا کا یہ حال ہے کہ
ہوش سبھالنے کے بعد کسی نے اس کو برهنہ نہیں دیکھا۔ اس کی شائستگی
کا یہ حال ہے کہ بد تمیز اور گندے لوگوں میں ہنسے اور رہنے کے باوجود
بربد نہیزی اور گندگی سے نفرت کرتا ہے، اور اس کے ہر کام میں صفائی
اور منہماں ہائی جاتی ہے۔ اس کے خیالات اتنے ہاکیزہ ہیں کہ اپنی قوم
کو لوٹ مار اور خون ریزی کرنے دیکھ کر اس کا دل دکھتا ہے اور وہ لڑائیوں
کے موقع ہر صلح و صفائی کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ دل ایسا نرم ہے
کہ ہر ایک کے دکھ درد میں شریک ہوتا ہے، بتیوں اور ہوازوں کی مدد کرتا ہے،
لوگوں کو کھانا کھلاتا ہے، مسافروں کی میزبانی کرتا ہے، کسی کو اس
سے دکھ نہیں ہہنچتا اور خود دوسروں کی خاطر دکھ آنہاتا ہے۔ ہر عقل ایسی
سمجھے کہ بت پرستوں کی اس قوم میں وہ کر بھی وہ بتیوں سے نفرت کرتا ہے،
کبھی کسی مخلوق کے آگے سر نہیں جھکاتا، اس کے ضمیر سے خود بہ خود آواز
آن ہے کہ زمین و آسمان میں جتنی چیزیں نظر آئی ہیں ان میں کوئی ہوجنے کے
لائق نہیں۔ اس کا دل اپ سے کہتا ہے کہ خدا تو ایک ہی ہو سکتا ہے اور
ایک ہی ہے، اس جاہل قوم میں یہ شخص ایسا ممتاز نظر آتا ہے گویا پتھروں کے
لہبیں ایک ہیرا چمک رہا ہے یا گھٹا ٹوب انڈھیرے میں ایک شمع روشن ہو۔

چالیس برس کے قریب اس قدر پاک صاف اور اعلیٰ درجے کی شریفانہ زندگی بسر کرنے کے بعد یہ شخص اس تاریخی سے جو اس کے چاروں طرف پہنچ ہوئی تھی گھبرا انہا ہے۔ جواالت، بد اخلاقی، بد کرداری، بد نظمی، اور شرک و بت ہرمٹی کا یہ ہولناک سمندر جو اس کو گھیرے ہوئے تھا، اس سے وہ نکل جانا چاہتا ہے۔ کیوں کہ بہاں کوئی چیز یہی اس کی طبیعت کے مناسِر نہیں۔ آخر وہ آبادی سے دور ایک بھاؤ کے خار میں جا جا کر تنهائی اور سکون کے عالم میں کئی کئی دن گذارنے لگتا ہے۔ فاقعے کر کر کے اپنی روح اور انہی بد و دماغ کو اور زیادہ پاک صاف کرتا ہے، سوچتا ہے، غور و فکر کرتا ہے اور کوئی روشنی ڈھونڈتا ہے، جس سے وہ اس چاروں طرف پہنچی ہوئی تاریخی کو دور کر دے۔ ایسی طاقت حاصل کرنا چاہتا ہے جس سے وہ اس بگڑی ہوئی دنیا کو توڑ چھوڑ کر پھر سے سنوار دے۔

پھر اس حالت میں ایک عظیم الشان تغیر رونما ہوتا ہے۔ یکا یک اُر کے دل میں وہ روشنی آجائی ہے جس کو اس کی فطرت مانگ رہی تھی۔ اچانک اس کے اندر وہ طاقت پھر جاپ ہے جس کا ظہور اس سے ہملے کبھی نہ ہوا تھا۔ وہ خار کی تنهائی سے نکل آتا ہے۔ اپنی قوم کے پاس آتا ہے، کہتا ہے کہ ہن کسی کام کے نہیں، انہیں چھوڑ دو۔ یہ زمین و آسمان، یہ چاند، یہ سورج، یہ تارے، زمین و آسمان کی یہ ساری قوتیں ایک خدا کی مخلوق ہیں۔ وہی تمہارا ہیدا کرنے والا ہے، وہی رزق دینے والا ہے، وہی مارنے والا، وہی جلانے والا ہے۔ سب کو چھوڑ کر اسی کو ہوجو۔ سب کو چھوڑ کر اسی سے اپنی حاجتیں طلب کرو۔ یہ چوری، یہ لوث مار، یہ شراب خوری، یہ جوا، یہ بد کاریاں، جو تم کرنے ہو، سب گناہ ہیں۔ انہیں چھوڑ دو خدا انہیں پسند نہیں کرتا۔ سچ بولو، انصاف کرو، نہ کسی کی جان لو نہ کسی کا مال چھینو، جو کچھ لو حق کے ساتھ لو، جو کچھ دو حق کے ساتھ دو۔ تم سب انسان ہو، انسان اور انسان سب برابر ہیں۔ بزرگ اور شرافت انسان کی نسل اور نسب میں نہیں، رنگ روپ اور مال و دولت میں نہیں۔ خدا پرستی، نیکی اور ہاکیزگی میں ہے۔ جو شخص خدا سے ڈرتا ہے اور نیک اور پاک ہے وہ ہی اعلیٰ درجے کا انسان ہے اور جو ایسا نہیں وہ کچھ بھی نہیں۔ مرنے کے بعد تم سب کو اپنے خدا کے پاس حاضر ہونا ہے۔ اس عادل حقیقی کے ہاتھ نہ کوئی سفارش کام آئے گی، نہ رشوت چلے گی، نہ کسی کا نسب پوچھا جائے گا۔ وہاں صرف ایمان اور

لکھی بہلی میں ان میں سے کچھ نہ ہوگا وہ نامہ اد دوزخ میں ڈالا جائے گا اور
بماہل قوم نے اس نیک انسان دو صرف اس قصور میں ستانا شروع کیا۔ ۲۳۹

۴۰، ابھی باتوں کو بڑا کیوں کرتا ہے، جو باپ دادا کے وقت سے ہوئے جلی
اہمی میں اور ان باتوں کی تعلیم کر دیوں دیتا ہے جو بزرگوں کے طریقے کے خلاف
ہیں۔ اسی قصور پر انہوں نے اسے کالیاں دیں، پتھر مارے، اس کے لئے جینا
پھکل کر دیا، اس کے قس کی سازشیں کیں، ایک دن دو دن نہیں اکٹھیے تیرہ برس
تک سخت سے سخت ظالم توزیعے، یہاں تک کہ اسے وطن چھوڑنے پر مجبور
کر دیا اور پھر وطن سے نکال کر بھی دم نہ لبا۔ جہاں اس نے بناء لی توہی وہاں
کتنی برس بہاس کو ڈریشان کرتے رہے۔ ۴۱

۴۲، یہ سب تکلیفیں اس عظیم المرتبہ انسان نے کس لئے انہائیں؟ صرف اس ایسے
کو اپنی قوم کو سیدھا راستہ بتانا چاہتا تھا۔ اس کی قوم اسے بادشاہی
تھی کے لئے تیار تھی، دولت کے ذہیر اس کے قدر، وہ پوڑانی پر آمادہ تھی
پہلے کہ وہ اس تعلیم سے باز آجائے۔ مگر اس نے سب چیزوں کو نہ کرا دیا
اور انہی بات ہر قائم رہا۔ کیا اس سے پڑھ کر نیک دلی اور صداقت تمہارے
ذمہ میں اسکتی ہے کہ کوئی شخص انہی کبھی فائدے کی خاطر نہیں محض
نفریوں کے بھلے کی خاطر تکلیفیں انہیں؟ وہی لوگ جن کے فائدے کے لئے وہ
کوشش کر رہا ہے، اس کو پتھر مارتے ہیں اور وہ ان کے بیٹے دھانے خیر کرتا
ہے۔ انسان تو کیا فرشتے یہی اس نیک پر قربان ہو جائیں۔

۴۳، ہر دیکھو، جب یہ شخص اپنے غار سے یہ تعلیم لے دی تکلا ٹو اس میں
کتنا بڑا انقلاب ہو گیا۔ اب جو دلام وہ سنا رہا تھا، وہ ایسا فصیح و بلطف
نہا کہ کسی نے نہ اس سے پہلے ایسا کلام کہا اور نہ اس کے بعد کوئی کہ سکا۔
عرب والوں کو اپنی شاعری، اپنی خطابت، اپنی فصاحت پر بڑا ناز تھا۔
اس نے عربوں سے دہا دہا تم ایک ہی سورت اس دلام کے مانند بنا لاف مگر
سہ کی گردیں عاجزی سے جھک گئیں۔ حد یہ کہ خود اس شخص کی عام
الہ چال اور تقریر کی زبان بھی ایسی بلند پایہ نہ تھی جتنا اس خاص کلام کی
نہیں، چنان چہ آج بھی جب ہم اس کی دوسری تقریروں کا مقابلہ اس کلام سے
کرنے ہیں تو دونوں میں نہایاں فرق محسوس ہونا ہے۔

۴۴، اس آن پڑھ صورا نہیں انسان نے حکمت اور دانائی کی ایسی باتیں کہنا
کہ نہ اس سے پہلے اسی اندان نے نہیں تھیں، نہ اس کے بعد آج

تک کوئی کہہ سکا۔ نہ چالیس برس کی عمر سے ۲۴۷ تک خود اس کی زبان سے
کبھی منی گئی تھیں۔

اس آئشی نے اخلاق، معاشرت، معیشت، سیاست، اور انسانی زندگی کے
تمام معاملات کے متعلق اپسے قانون بنائے کہ بڑے بڑے عالم اور عاقل بوسلا
کے غور و خوض اور ساری عمر کے تجربات کے بعد بہ مشکل ان کی حکمتیوں کو
سمجھ سکتے ہیں، اور دنیا کے تجربات جتنے بڑھتے جاتے ہیں، ان کی حکمتیں
اور زیادہ کوہلتی جاتی ہیں۔ تدوہ سو برس سے زیادہ مدت گذر چکی ہے، مگر اس
بھی اس کے بنائے ہوئے قانون میں کسی تبدیلی کی ضرورت نظر نہیں آئی۔
دنیا کے قانون ہزاروں مرتبہ بنے اور بگڑے۔ ہر آزمائش میں ناکام ہوئے اور
ہر بار ان میں ترمیم کرنی پڑی مگر اس صحرانشین آئشی نے تن تنہا بغیر کسی
دوسرے انسان کی مدد کے جو قانون بنادیے، ان کی کوئی ایک دفعہ بھی اس
نہیں جو اپنی جگہ سے ہٹائی جا سکتی ہو۔

اس نے تیس برس کی مدت میں اپنے اخلاق، اپنی نیک، اپنی شرافت اور
اپنی اعلیٰ تعلیم کے زور سے اپنے دشمنوں کو دوست بنایا، اپنے مخالفوں کو
موافق بنایا، بڑی بڑی طاقتیں اس کے مقابلے میں آئیں اور آخر کار شکست کھا کر
اس کے قدموں پر آ رہیں۔ اس نے جب فتح پائی تو کسی دشمن سے بدله نہ لیا
کسی پر سختی نہ کی، جنہوں نے اس کے حقیقی چچا کو قتل کیا تھا اور اس کا
کامیاب نکال کر چبا گئے تھے، ان کو بھی فتح پا کر اس نے معاف کر دیا،
جنہوں نے اس کو ہتھ مارے تھے، اس کو وطن سے نکلا تھا، ان کو فتح
پا کر اس نے اعخش دیا۔ اس نے کبھی کسی سے دخانہ نہ کی، عہد کر کے کبھی
نہ تواڑا، جنگ میں بھی کسی از زیادت نہ کی، اس کے سخت ہے مخت دشمن
بھی کبھی اس ہر کسی گناہ یا ظلم کا الزام نہ رکھ سکے، یہی نیکی نہیں جس
نے بالآخر تمام عرب کا دل موہ لیا۔ پھر اس نے اپنی تعلیم و ہدایت سے عربوں
کو، جن کا حال اوپر بیان ہو چکا ہے، وحشت اور جہالت سے نکال کر اعلیٰ
درجے کی بہذب قوم بنادیا۔ جو عرب کسی قانون کی پابندی پر تیار نہ تھے،
ان کو اس نے ایسا پابند قانون کر دیا کہ دنیا کی تاریخ میں کوئی قوم اسی
پابند قانون نظر نہیں آتی۔ جو عرب کسی کی اطاعت پر آمادہ نہ تھے، اس نے
ان کو ایک عظیم الشان سلطنت کا تابع بنادیا۔ جن لوگوں کو اخلاق کی ہوا
تک نہ لگ تھی ان کے اخلاق ایسے ہاکیزہ بنادیے کہ آج ان کے حالات ہڑہ کر

دنیا دنگ رہ جاتی ہے۔ جو عرب اس وقت دنیا کی قوموں میں سب سے زیادہ ہے نہ، اس تنہا انسان کے اثر سے تینیس اوس کے اندر بکابک اپسے زبردست ہو گئے، انہوں نے ایران، روم اور مصر کی عظیم الشان سلطنتوں کے تغیرے الٹ دیے، دنیا کو تمدن، تہذیب، اخلاق اور انسانیت کا سبق دیا اور اسلام کی ایک تعلیم اور ایک شریعت کو لے کر ابشا، افریقہ اور یورپ کے دور دراز گوشوں تک پہنچے چلے گئے۔

بہ تو وہ اثرات ہیں جو عرب قوم ہو ہوئے۔ اس سے زیادہ حیرت انگلز اثرات اس آسمی کی تعلیم سے تمام دنیا ہو ہوئے۔ اس نے ساری دنیا کے خیالات، عادات اور قوانین میں انقلاب ہیدا کر دیا۔ ان کو چھوڑو جنمیوں نے اس کو اپنا رہنا ہی مان لیا ہے۔ مگر حیرت بہ ہے کہ جنمیوں نے اس کی ہدروی سے انکار کیا، جو اس کے مخالف ہیں، اس کے دشمن ہیں، وہ بھی اس کے اثرات سے نہ بچ سکے۔ دنیا توحید کا سبق بھول گئی تھی، اس نے بہ سبق پھر سے یاد دلا پا اور اتنے زور کے ساتھ اس کا صور پھونکا کہ اُج ات پرستوں اور شرکوں کے مذہب بھی توحید کا دعویٰ کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اس نے اخلاق کی ایسی زبردست تعلیم دی کہ اس کے بنائے ہوئے اصول تمام دنیا کے اخلاقیات میں ہدایل گئے اور ہدایتے ہلے جا رہے ہیں۔ اس نے قانون اور سیاست اور تہذیب و معاشرت کے جو اصول بنائے وہ ایسے ہکے اور سچے اصول تھے کہ مخالفوں نے بھی چکے چیکے ان کی خوشنہ چینی شروع کر دی اور اُج تک کھے جا رہے ہیں۔

جیسا کہ اوہر بتایا جا چکا ہے، بہ شخص ایک جاہل قوم اور ایک نہایت تاریک ملک میں ہیدا ہوا تھا۔ چالیس اوس کی عمر تک گلفہ بان اور سوداگری کے سوا اس نے کوئی کام نہ کیا تھا۔ کسی قسم کی تعلیم و تربیت اس نے نہ ہائی تھی۔ مگر غور کرو چالیس پرہیز کی عمر کو پھرپھرنے کے بعد کہاں سے اس کے اندر بیا بک اتنے کمالات جمع ہو گئے؟ کہاں سے اس کے ہاس ایسا عام آگیا؟ کہاں سے اس میں بہ طاقت ہیدا ہو گئی؟ ایک اکلا انسان ہے، ایک ہی وقت میں سپہ سالار بھی ہے، ایک اعماقی درجے کا جج بھی ہے، ایک زبردست فتنہ بھی ہے، ایک بے مثل فلاسفہ بھی ہے، ایک لا جواب مصلح اخلاق و تمدن الہی ہے، ایک حیرت انگلیز ماهر سیاست بھی ہے۔ پھر اتنی معروفیتوں کے باوجود لا راتوں کو گھنٹوں اپنے خدا کی عبادت بھی کرتا ہے، اپنی ادویوں اور بھوؤں کے حقوق بھی ادا کرتا ہے، خریبوں اور مصیبیت زدود کی خدمت بھی کرتا ہے،

ابک ہڑے ماک کی بادشاہی مل جانے پر بھی وہ خود فقیر کی سی زندگی بسر کرتا ہے،
بوریے پر سوتا ہے، مونا جھوٹا ہوتا ہے، غریبوں کی سی غذا کھاتا ہے، بلکہ کبھی
فاقع کی بھی نوبت آ جاتی ہے۔

یہ حیرت انگیز کمالات دکھا کر اگر وہ کہتا کہ میں انسان ہو
بالآخر ہستی ہوں تب بھی کوئی اس کے دعوے کی تردید نہ کر سکتا تھا۔ مگر
اس نے یہ نہیں کہا کہ یہ سب میرے اپنے کمالات ہیں، اس نے ہمیشہ یہیں
کہا کہ میرے پاس کچھ بھی اپنا نہیں ہے، سب کچھ خدا کا ہے اور خدا کی طرف
تھے۔ میں نے جو کلام پیش کیا ہے، جس کی نظر لانے سے سب انسان
عاجز ہیں، یہ میرا کلام نہیں ہے، نہ میرے دماغ کی قابلیت کا نتیجہ ہے،
یہ خدا کا کلام ہے اور اس کی ساری تعریف خدا کے لیے ہے۔ میرے جتنے کام
ہیں یہ بھی میری اپنی قابلیت سے نہیں ہیں، محض خدا کی ہدایت سے ہیں۔
آدھر سے جو کچھ اشارہ ہوتا ہے وہی کرتا ہوں اور کہتا ہوں۔ اپسے سچے
انسان کو خدا کا پیغمبر کیسے نہ مانا جائے؟ اس کے کمالات اپسے ہیں کہ
تمام دنیا میں ابتدا سے لے کر اُج تک ایک انسان بھی اس کے مانند نہیں ملتا۔
مگر اس کی سچائی اپسی ہے کہ وہ ان کمالات ہر فخر نہیں کرتا، ان کو اپنی
ذات سے منسوب نہیں کرنا چاہتا، بلکہ جس نے یہ سب کچھ دیا ہے، صاف مان
اُسی کا حوالہ دیتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ہم اس کی تصدیق نہ کریں؟ جب
وہ خود اپنی خوبیوں کے متعلق کہتا ہے کہ یہ خدا کی دی ہوئی ہیں، تو ہم
کیوں کہیں کہ نہیں یہ سب تیرے اپنے دماغ کی پیداوار ہیں؟ جھوٹا آدمی
تو دوسروں کی خوبیوں کو بھی اپنی طرف منسوب کرنے کی کوشش کرتا ہے،
مگر یہ شفعت ان خوبیوں کو بھی اپنی طرف منسوب نہیں کرتا جنہیں وہ آسانی
کے ساتھ اپنی خوبیاں کہہ سکتا تھا، جن کے حاصل ہونے کا ذریعہ کسی کو
علوم ہی نہیں ہو سکتا تھا، جن کی بنا پر اگر وہ انسان سے بالآخر ہونے کی
بھی دعویٰ کرتا تو کوئی اس کی تردید نہ کر سکتا تھا، پھر بتاؤ کہ اس سے
زیادہ سچا انسان کون ہوگا۔

یہ ہیں ہمارے سرکار، تمام جہاں کے ایغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔
ان کی پیغمبری کی دلیل خود ان کی سچائی ہے۔ ان کے عظیم الشان کارنالیے،
ان کے اخلاق، ان کی ہاک زندگی کے واقعات، سب تاریخوں سے ثابت ہیں۔

جو شخص صاف دل سے حق پسندی اور انصاف کے ساتھ ان کو ہڑھ کا اس کا
دل خود گواہی دے کا کہ وہ ضرور خدا کے ہبغمبر ہیں ۔ وہ للام جوانبou نے
ہٹا دیا وہ یہی قرآن ہے جسے ہم ہڑھتے ہیں ۔ اس نے نظیر کتاب دو جو شخص
بھی سمجھ کر کھلے دل سے ہڑھ کا ، اس کو اقرار کرنا ہڑھنے کا کہ وہ ضرور
بڑا کتاب ہے ، کوئی انسان ایسی کتاب تصنیف نہیں کر سکتا ۔

ختم نبوت *

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف یہ کہ خدا کے سچے نبی ہیں بلکہ
آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے آخری نبی بھی ہیں ۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے
ماہیوں دین کی تکمیل ہو گئی ، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شریعت نے پہلے کی
تمام شریعتوں کو منسوخ کر دیا اور اب قیامت تک آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی
لائی ہوئی ہدایات انسانیت کے ابتدی مشعل راہ ہوئی اور کوئی دوسرا نبی نہیں آئے گا ۔
قرآن پاک میں اس کا صوبع بیان اس آیت میں دیا گیا ہے :

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَهْدِي قِرْنَةً فِي هَذَا الْكَوْنِ وَلَكِنْ رَسُولَ اللَّوَّهِ وَخَاتَمُ النَّبِيِّنَ وَكَانَ اللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمًا

(لوگو) حمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کی
رسول اور خاتم النبیین ہیں ۔ اللہ ہر چیز کا علم رکھتے والا ہے ۔
(الاحزاب ۲۰)

خاتم النبیین کے معنی سلامہ نبوت کو ختم کرنے والے کے ہیں ۔ یعنی
بہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آئے والا نہیں ہے ۔ عربی
لفت اور معاورے کی رو سے "ختم" کے معنی مہر لگانے ، بند کرنے ، آخر تک
پہنچ جانے اور کسی کام کو ہو را کر کے فارغ ہو جانے لے گئے ہیں ۔ مثلاً

ختم العمل کے معنی ہیں فرغ من العمل ، "کام یہ فارغ ہو گیا ۔"

ختم الاناء کے معنی ہیں "برتن کا منہ بند کر دیا اور اس پر سہر لگادی دی
تا کہ کوئی چیز اس میں سے نہیں اور نہ کچھ اس کے اندر داخل ہو ۔"

ختم الكتاب کے معنی ہیں "خط بند کر کے اس پر سہر لگادی تا کہ خط
محفوظ ہو جائے ۔"

بیہار سے باقی حصہ مولانا مودودی صاحب کے رسالہ "ختم نبوت" ہے ماخوذ ہے ۔
(مرتب)

ختم الشیئ، بلغ آخره، "کسی چیز کو ختم کرنے کا مطلب ہے اس کے آخر تک پہنچ جانا۔" اسی معنی میں ختم قرآن بولتے ہیں اور اسی معنی میں سورتوں کی آخری آیات کو خواتیم کہا جاتا ہے۔

خاتم القوم آخر ہم: "خاتم القوم سے مراد ہے قبلے کا آخری ادمی۔"

اسی بنا پر تمام اہل لفت اور اہل تفسیر نے بالاتفاق خاتم النبیین کے معنی آخر النبیین کے لیے ہیں۔ عربی لفت و محاورے کی رو سے خاتم کے معنی ڈاک خانے کی سہر کے نہیں ہیں جسے لگا کر خطوط جاری کیجئے جاتے ہیں۔ بلکہ اس سے مراد وہ سہر ہے جو لفافی پر اس لیے لکائی جاتی ہے کہ نہ اس کے اندر سے کوئی چیز باہر نکلے نہ باہر کی کوئی چیز اندر جائے۔

اس لفظ کا جو مفہوم ہم نے اوپر بیان کیا ہے اسی کی تائید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریعات کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر چند صحیح ترین احادیث ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

۱ - اُنی اسرائیل کی قیادت انہیا کیا کرتے تھے۔ جبکہ کوئی نبی مرجاتا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا۔ مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا بلکہ خلفا ہوں گے۔^۱

۲ - نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میری اور مجھ سے ۶۰۰ گزرے ہوئے انبیا کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے ایک عمارت بنائی اور خوب حسین و جمیل بنائی۔ مگر ایک ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑی ہوئی تھی۔ لوگ اس عمارت کے گرد ہوتے اور اس کی خوبی ہر اظہار حیرت کرتے تھے۔ مگر کہتے تھے کہ اس جگہ اینٹ کیوں نہ رکھی گئی؟ تو وہ اینٹ میں ہوں اور ہیں خاتم النبیین ہوں (یعنی میرے آتے بر نبوت کی عمارت مکمل ہو چکی ہے، اب کوئی جگہ باق نہیں ہے جسے پہنچ کرنے کے لیے کوئی نبی آئے)۔

۳ - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رسالت اور نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ میرے بعد اب نہ کوئی رسول ہے اور نہ نبی۔^۲

۱ ملاحظہ ہو لسان العرب، قاموس اور اقرب الموارد۔

۲ بخاری، کتاب المناقب، باب ماذکر عن بستی اسرائیل۔

۳ قریلی، مسند احمد۔

۶۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے بعد کوئی نبی نہیں اور میری امت کے بعد کوئی امت (یعنی کسی نے آئے والے نبی کی امت) نہیں۔ ۴۳۵

بے احادیث بہ ثارت صحابہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں کہرت محدثین نے ان کو بہت سی قوی سندوں سے نقل کیا ہے۔ ان کے مطالم ہے ماف معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف واقع ہو چکے طریقوں سے مختلف الفاظ میں اس امر کی تصریح فرمائی ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) آخری نبی ہیں، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد کوئی نبی نہیں آئے، نبوت کا سلسلہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ختم ہو چکا ہے، اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد جو لوگ ہمیں رسول یا نبی ہونے کا دعویٰ کریں وہ جال و کذاب ہیں۔ قرآن کے الفاظ "خاتم النبیین" کی اس سے زیادہ مستند و معتبر اللہ نظری الثبوت تشریع اور کیا ہو سکتی ہے۔ رسول ہاک کا ارشاد تو بعاجنے ہوئے سند و حجت ہے۔ مگر جب وہ قرآن کی ایک نص کی شرح کر رہا ہو تب نہ ہو اور ہمیں زیادہ قوی حجت بن جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر قرآن کو سمجھئیں والا اور اس کی تفسیر کا حق دار اور کون ہو سکتا ہے کہ وہ ختم نبوت کا کوئی دوسرا مفہوم بیان کرے اور ہم ای تبول کرنا کیا معنی، قابل التفات ہمیں سمجھیں؟

قرآن و سنت کے بعد تیسرے درجے میں اہم ترین حیثیت صحابہ کرام نے اجماع کی ہے۔ بہ بات تمام معتبر تاریخی روایات سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد جن لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا، اور جن لوگوں نے ان کی نبوت تسلیم کی، ان سب کے خلاف صحابہ کرام نے بالاتفاق جنگ کی نہیں۔

اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ مسیلمہ کذاب کا معاملہ قابل ذکر ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا منکر نہ تھا بلکہ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ اے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک نبوت بنایا گیا ہے۔ اس صریح افرا ریات محمدی کے باوجود اسے کافر اور خارج از مات قرار دیا گیا اور اس کے خلاف جنگ کی گئی۔

اس جانب سے کے بعد آئیے اب یہ دیکھیں ۱۰ ختم نبوت کے باب میں غفل کا بعلہ کیا ہے؟ نبوت کوئی ایسی صفت نہیں ہے جو ہر اس شخص میں پیدا

هو جایا کرے جس نے عبادت اور عمل صالح میں ترقی کر کے اپنے آپ کو اعلیٰ اہل بنالیا ہو۔ نہ یہ کوئی اپنا انعام ہے جو کچھ خدمات کے ملے میراث کیا جاتا ہو۔ بلکہ یہ ایک منصب ہے جس پر ایک خاص ضرورت کی حامل اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مقرر کرتا ہے۔ وہ ضرورت جب داعی ہوئی ہوئی شہزاد ایک نبی اس کے ایسے مامور کیا جاتا ہے۔ اور جب ضرورت نہیں ہوئی پاپ نہیں رہتی تو خواہ بخواہ انبیا ہر انبیا نہیں بھیجنے جائے۔

قرآن مجید سے جب ہم یہ معلوم کرے کی کوشش کرتے ہیں کہ نبی کی تصریح کی ضرورت کن کن حالات میں پڑھ آئی ہے تو ہتھ چلتا ہے کہ صرف ہمارے حالتین ایسی ہیں جن میں انبیا مبعوث ہوئے ہیں۔

اول یہ کہ کسی خاص قوم میں نبی بھیجنے کی ضرورت اس لیے ہو کہ اس میں ہمیں کبھی کوئی نبی نہ آیا تھا اور کسی دوسری قوم میں آئے ہوئے نبی کا ہیغام بھی اس تک نہ ہہنج سکتا تھا۔

دوم یہ کہ نبی بھیجنے کی ضرورت اس وجہ سے ہو کہ ہمارے گزرے ہوئے نبی کی تعلیم بہلا دی گئی ہو، یا اس میں تعریف ہو گئی ہو، اور اس کے نتش قدم کی ہدروی کرنا ممکن نہ رہا ہو۔

سوم یہ یہ ہمیں گزرے ہوئے نبی کے ذریعے سے مکمل تعلیم و ہدایت لو گوں کو نہ ملی ہو اور تکمیلِ دین کے لیے مزید انبیا کی ضرورت ہو۔

چہارم یہ کہ ایک نبی کے ساتھ اس کی مدد کے لیے ایک اور نبی کی حاجت ہو۔

اب یہ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی ضرورت بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد باقی نہیں رہی ہے۔

قرآن خود کہ رہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام دنیا کی ہدایات کے لیے مبعث فرمایا گیا ہے، اور دنیا کی تمدنی تاریخ بتا رہی ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کے وقت سے مسلسل ایسے حالات موجود رہے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت سب قوموں کو ہہنج سکتی تھی اور ہر دن اس کے بعد الگ الگ قوموں میں انبیا آئے کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی۔

JOIN ME FOR EASY ACCESS TO BOOKS & NOTES



+92-310-545-450-3



Css Aspirants ebooks & Notes

<https://m.facebook.com/groups/458184410965870>



Css Aspirants Forum

<http://it.me/CssAspirantsForum>

Rules of the group.

*No irrelevant text/pic Islamic pic/videos

*No Smiley No Pm otherwise Removed + Blocked

*Personal text w/o Mutual consent Consider harassment.

Separate Group For Females with verification

The CSS Group does not hold any rights on shared the Books & Notes

I,m not Responsible for Copyrights.

This book/notes downloaded from the internet.

قرآن اس ہر بھی گواہ ہے اور اس کے ساتھ حدیث و سیرت کا ہورا ذخیرہ۔ اس امر کی شہادت دے رہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی مسلم بالکل اپنی صحیح صورت میں محفوظ ہے۔ اس میں مسخ و تعریف کا کوفن عمل نہیں ہوا ہے۔ جو کتاب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) لائے تھے اس میں ابک لفظ اپنی کمی و بیشی آج تک نہیں ہوئی، نہ قیامت تک ہو سکتی ہے۔ جو هدایت آپ نے اپنے قول و عمل سے دی اس کے تمام آثار آج بھی اس طرح ہیں مل جاتی ہیں کہ گویا ہم آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانے میں موجود ہیں۔ اس لیے دوسری ضرورت بھی ختم ہو گئی۔

بھر قرآن مجید یہ بات بھی صاف صاف کرتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے دین کی تکمیل کردی گئی۔ اہذا تکمیل دین کے لیے بھی اب کوئی نبی درکار نہیں رہا۔

اب رہ جاتی ہے چوتھی ضرورت، تو اگر اس کے لیے کوئی نبی درکار ہوتا تو وہ حضور مسلم کے زمانے میں آپ کے ساتھ مقرر کیا جاتا۔ ظاہر ہے کہ جب وہ مقرر نہیں کیا گیا تو یہ وجہ بھی ساقط ہو گئی۔

اب ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ وہ ہانجور وجد کون سی ہے جس سے اپنے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد ابک نبی کی ضرورت ہو؟ اگر اونی کہے کہ فوم بکڑ گئی ہے اس لیے اصلاح کی خاطر ابک نبی کی ضرورت ہے، تو ہم اس سے ہو چھیں گے کہ محض اصلاح کے لیے نبی دنیا میں کب آیا ہے کہ آج صرف اس کم کے لئے وہ آئے؟ نبی تو اس لیے مقرر ہوتا ہے کہ اس پر وہی کی جانے اور وہی کی ضرورت یا تو کوئی نیا پیغام دینے کے لیے ہوئی ہے، یا بعوقاب پیغام کی تکمیل کرنے کے لیے یا اس کو تعریفات سے ہاک کرنے کے لیے۔ وہ آن اور ست محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے محفوظ ہو جانے اور دین کے مکمل ہو جانے کے بعد جب وہی کی سب ممکن ضرورتیں ختم ہو چکی ہیں، تو اب اصلاح کے لیے صرف مصلعین کی حاجت باقی ہے نہ کہ انبیا کی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی بنیادیں*

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی نوعیت کیا ہوئی چاہئے۔ یہ ابک ایسا مسئلہ ہے جس کے حلے میں موجودہ دور میں بہت خلطا فہمیاں

* ۴ حصہ مولانا امین احسن اصلاحی کی کتاب 'ترکیہ نفس' جلد اول سے مانعوذ ہے۔ (مرتب)

اہمیت ہونی ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک اللہ کے رسول کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں جو کتاب اور بکوب الیہ کے درجہ ان ایک دیانت دار فاسد کی ہوتی ہے۔ اپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قرآن ہم نک ہبھنگا دیا اور اس کے بعد آپ کا تعلق ہم سے اور ہمارا تعلق آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ لیکن ہم اس سے ہمیلے دیکھ چکے ہیں کہ یہ تصور صحیح نہیں اس لئے کہ رسول صرف پیغمابر ہی نہیں ہوتا بلکہ معلم، مزکی، قانون ساز اور رہنمای ہمیں ہوتا ہے اور یہ سارے مناصب ایسے خدا ہی کی طرف سے ملنے ہیں۔ دوسرے گروہ کے نزدیک علم کے دو حصے ہیں، علم ظاہر اور علم باطن۔ ان کے نزدیک علم ظاہر یعنی شربعت کا علم (جو ان کے نزدیک کم تر درجے کا علم ہے)، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام لوگوں میں ہبھیلابا لیکن علم باطن یعنی طریقت کا علم صرف چند لوگوں کو دیا اور انہی سے یہ علم سینہ بہ سینہ چلا۔ یہ خیال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کو متروک اور ان سے ہمارے تعلق کو کمزور کرتا ہے، اس لئے کہ انہیں جس علم سے نوازا گیا تھا وہ ہری انسانیت کے لئے ضروری تھا۔ تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مافی کی ایک قابل احترام شخصیت سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ ماحول کے زیر اثر احترام بھی کرتے ہیں لیکن بس اس طرح کہ اکٹھے وقتوں کے ہیں بہ لوگ ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی کہ انسان کی دنیوی اور آخری سعادت کا دار و مدار صرف اس بات ہر ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات کو بلا چون و چرا مان لے۔ ان لوگوں کے نزدیک ”زمانے کے تقاضے“ کچھ اور ہیں، اور زمانہ قدیم کی روشن برآب بھی اصرار کرنا جہالت اور ناریک خیالی سے زیادہ کچھ نہیں۔ چوتھا گروہ ہمارے دوامِ انسان کا ہے جس کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بس ایک اندھی نہری عییدت کا مرجع ہے اور اس عییدت کی تسکین کے لیے میلاد کرنے کے علاوہ ان کی سمجھے میں کچھ نہیں آتا۔

ان امور کے پیش نظر ضروری ہے کہ جن بنیادوں پر قرآن نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمیں اپنا تعلق استوار کرنے کی هدایت کی ہے وہ بنیادین واضح کی جائیں۔ قرآن نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کو چار بنیادوں پر قائم کیا ہے۔ ایمان، اطاعت، اتباع اور محبت۔ ذیل میں ہم ان سب کی ساختہ صور تشریع کریں گے۔

۱۔ ایمان: نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی بہیلی بنیاد ہے۔ ایمان کا مطلب صرف یہ مان لینا ہی نہیں ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کے

بہلے ہیں یا کہ اس ایمان کی اصل روح آپ کی ذات پر سچا اور ہا کا اختیاد ہے ، اس اور اختیاد دہ آپ صادق و امین ہیں ، آپ کے ہر قول و فعل میں گہری ہیں ہے ، جو راہ آپ نے دنیا کے اکرچہ اس میں ظاہراً کتنے ہی خطرات ہے اور ہے ہوں سکر نجات اور فلاح کی حقیقی راہ و می ہے ۔ اس بات پر اختیاد کہ اللہ آری ہے ہوں سکھانے ہیں وہ دانمی اور ابدی ہیں اور انسان ان سے اپنے زندگی کے جو اصول سکھانے ہیں وہ دانمی اور ابدی ہیں اور انسان ان سے اپنے نیاز نہیں ہو سکے ۔ اور سب سے بڑھ کر اس بات پر انساد کہ خدا کی طرف کا طریقہ جو آپ نے بنایا اور سکھایا ہے اس سے بہتر طریقہ کوئی اور کی بہت کا ہو سکتا ۔ جب تک کہ یہ اختیاد اور یقین انسانوں میں پیدا نہ ہو وہ ایمان یہی ہو سکتا ۔ آپنی لذت سے آشنا نہیں ہوتا ۔ اسی وجہ سے حدیث میں کہا گیا ہے :

ذان طلم الایمان من رضی بالله ربنا
کے اپنارب ہونے پر، اسلام کے اپنا دین
ہونے پر اور محمد کے اپنا رسول
ربالاسلام دیناً وبِمُحَمَّدِ رَسُولًا (مسلم)
ہونے پر، طمثیں ہو گیا ۔

اس ایمان کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کے دوسرے علوم و افکار اگر دجوہ قابل لحاظ ہو سکتے ہیں تو صرف اس حد تک ہو سکتے ہیں جس حد تک وہ کتاب و سنت کے مؤید ہوں ۔ اگر دونوں شخص اس حد سے بڑھ کر کسی تکروفلسٹ نہ دو یا کسی وجودان و لشک کو نبی کے علم و عمل پر ترجیح دے با اس کے برابر ہی نہ ہوئے ، یا اس کسوٹی اور جانچی بفیز ہی اس دو تسلیم کرے اور اس کے ساتھ ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کا دعویٰ ہوئی کرے تو اس کا دعوائے ایمان معنی ایک فریب نفس ہے اس لیے کہ اس کا ایمان اس اختیاد سے خالی ہے جو اس ایمان کی اصل روح ہے ۔

۲۔ اطاعت : نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عمارت نعلیٰ کی دوسری بنیاد اطاعت ہے ۔ دنیا میں کوئی بھی نبی یا رسول خفر اس لیے نہیں یہ جا کیا کہ اس کو مان لینے کی حد تک لوگ اس کو نبی اور رسول مان لیں بلکہ اس کے اہمیتے جانے سے اصل شئے جو مقصود رہی ہے وہ ہے کہ اسی کی اطاعت ہی کی جانے اور زندگی کے معاملات میں جو احکام و مددات وہ دے اس کی لئے چون و چرا تعديل کی جانے ۔

اس حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے :

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا يُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ

ہم نے جس رسول کو بھی بھیجا اسی لمحے
بھیجا کہ اذن خداوندی کے مطابق اس
کی اطاعت کی جائے۔ (النـا - ۶۲)

رسول کی اطاعت کے مطالبے کی وجہ یہ ہے کہ خدا کی اطاعت، جو اصل
مقصود ہے، اس کا راستہ ہی یہ ہے کہ اس کے رسول کی اطاعت کی جائے۔ اللہ
اپنے بنندوں سے براہ راست معاملہ نہیں کرتا بلکہ اپنے رسول کے واسطے سے کرتا ہے۔
رسول ہی لوگوں کو اس کی ہدایات اور اس کے احکام سے آکاہ کرتا ہے۔ اس وجہ
سے جو اللہ کی اطاعت کرنا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ رسول کی اطاعت
کرے۔ کیوں کہ رسول کی اطاعت درحقیقت اللہ کی اطاعت ہے۔

مَنْ يَطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اپنے افہم کی
اطاعت کی۔ (النـا۔ ۸۰)

احادیث میں بھی اس حقیقت کو بہت تشریح کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔
مثلاً ایک حدیث میں آیا ہے کہ " جس نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کی
اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمد کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔
اللہ کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی نشان
امسیاز ہیں۔ " (بخاری)

اس اطاعت کے بارے میں بھی قرآن نے بڑے واشکن الفاظ میں کہ دیا ہے
کہ خض ظلائری اطاعت مطلوب نہیں ہے بلکہ ضروری ہے نہ آدمی پورنے خلومن
دل کے ساتھ اطاعت کرے، جو قضیے اور جھکڑے ہیدا ہوں ان کے لیے اللہ کے
رسول کی طرف رجوع کرے اور وہاں سے جو بھی فیصلہ ہو اسے اطمینان اور پوری
رضامندی سے قبول کرے اور دل میں بد گمان اور شکایت نہ رکھے۔

ان احکام کا تعلق صرف آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیات مبارک ہی ہے
درستیان موجود نہیں ہے تو آپ کی سنت آپ کی قائم مقام ہے اور اس کی اطاعت بھی

رسالت

۴۵۱

اصل اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہے۔ اپنی وفات سے ۲۷ؑ تک اب (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس بات کی تشریح درنتے ہوئے فرمایا تھا "میں نے تم میں دو چیزوں کی ذریعیتی ہیں، جب تک تم ان دونوں ہر خوبی سے قابیم رہو گے کما رہا نہ ہوگے، اپک کتاب اللہ اور دوسری سنت رسول ۔ ۔ ۔"

اس تفہیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اب (صلی اللہ علیہ وسلم) کو زندگانی کی اصل حقیقت یہ ہے کہ ہم اس دناب و سنت کی ہمدردی کریں جن کے ذریعے ہے اب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور اس کے احکام میں آکاہ فرمایا ہے۔ اگر شخص زبان سے انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ریاست کا اقرار کیا جاتا رہے اور اطاعت اپنی ہوائے نفس کر، ہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے بالکل خلاف دوسروں کی جاتی رہے تو یہ رسول کو صحیح معنوں میں ماننا نہیں ہو گا۔

۳۔ الیاع : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی تیسرا بنیاد اتباع ہے۔ اتباع کا دائیہ اطاعت سے زیادہ وسیع ہے۔ اطاعت کے دائیے میں تو عموماً وہی باتیں آتی ہیں جن کی حیثیت احکام و واجبات اور اوامر و نواہی ہیں ہولیکن اتباع کے دائیے میں مستحبات اور نوافل بھی آجائے ہیں۔ ہر اطاعت بعض حالات میں خفن ظاہری اور رسمی بھی ہو سکتی ہے۔ ادمی ابک شہنشہ میں اطاعت کرتا ہے لیکن اس کی اطاعت میں اخلاص اور محبت کا جذبہ ذرا بھی شامل نہیں ہوتا، لیکن اتباع میں متبع کے لئے عقیدت و احترام کا جذبہ ہا باسا بھی شرط ہے۔

صحابہ کرام آب (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صرف اطاعت ہی نہیں کرنے تھے بلکہ آب (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اتباع بھی کرنے تھے۔ صرف بھی نہیں کہ آب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کوئی حکم دیا تو اطاعت کر لی بلکہ وہ آب (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ایک ادا کو دیکھتے، اس کو نہ دیکھتے، میں رکھتے اور اس کی تقاضہ کرنے تھے۔ ان میں سے ہر شخص کی دل خواہش ہوئی کہ وہ اپنی زندگی کو زیادہ سے زیادہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ساتھ میں ڈھال دے اور بے اہمیت دسی خارجی دباو کے تحت نہیں بلکہ شخص محبت اور عقیدت کے جذبے سے سرشار ہو در کرنے تھے۔

اتباع رسول میں صحابہ کرام کے اس ذوق و شوق کی وجہ یہ تھی کہ خدا نے خوب اور خوبیت کا درجہ صرف اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں

بلکہ فی الحقيقة اتباع رسول ہے حاصل ہوتا ہے۔ رسول خدا کی معرفت کا مظہر کامل ہوتا ہے اور اس کی ہر ہر ادا معرفت الہی کا نشان ہوئے ہے۔ اسی وجہ سے لوگ خدا سے محبت رکھنے ہیں وہ رسول کی ایک ایک ادا سے محبت رکھنے سے ہے اور اس کے درجے میں، بہان تک کہ خدا کے محبوب بن جانے ہیں۔ اس حقیقت کو قرآن کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے:

لَلَّٰهُمَّ إِنَّمَا مُحَبَّوْنَ اللَّهَ فَالَّذِي عُوْنَىٰ فَمَنْ هُنَّ إِلَّا

ایے نبی ، کہہ دو کہ اگر تم الله سے محبت رکھنے ہو تو میری اتباع کرو ، انہم سے محبت کرے گا۔ (آل عمران ۳۱۰)

۲ - محبت : رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی چوتھی بنیاد اپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ہماری محبت ہے۔ دین میں وہ ایمان یا اطاعت معتبر نہیں جس کی بنیاد محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نہ ہو۔ محبت بھی مخفظ ظاہری اور رسمی قسم کی ، طلب نہیں بلکہ ایسی محبت مظلوب ہے جو تمام محبوتوں پر غالب آجائے جس کے مقابل میں عزیز سے عزیز رشتے اور محبوب سے محبوب تعلقات کی بھی قدر و قیمت نہ رہ جائے ، جس کے لئے دیباکی ہر چیز کو چھوڑا جاسکے لیکن خود اس کو نسی قیمت پر نہ چھوڑا جاسکے۔ قرآن مجید میں اس محبت کا معیار یہ بنا�ا گیا ہے:

لَلَّٰهُمَّ كَانَ أَبَدًا لَّهُ وَأَبَدَ الْكُفَّارُ وَالْمُوَالُونَ أَزْوَاجُهُمْ وَعَيْشُهُمْ كُلُّهُ وَأَمْوَالُ إِنْقَرْفَتْهُمْ هَا وَتِجَارَةُ كُلِّهِنَّ
كَسَادَهَا وَمَنْكِنُ تَرْهُونَهَا أَحَدَ الْكُفَّارِ فِي النَّعْوَ وَرَسُولُهُ وَجَهَادُ فِي سَبِيلِهِ فَرَبَّهُنَا حَافِيٰ يَا لَيْلَهُ لَيْلَهُ

کہہ دو کہ اگر تم ازٹے باب ، تم ارے بھالی ، تم اری بیوہاں ، تم ہارا خانہداں اور مال چوڑم نئے کیا یا ہے اور تجارت جس کے گر جانے کا تمہیں اندیث ہے اور مکافات جو تمہیں پسند ہیں ، تم کو افہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہیں تو انتظار کرو بیہاں تک کہ افہ اپنا فیصلہ صادر کر دے۔ (نوبہ - ۲۶)

اسی حقیقت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے احادیث میں بھی واضح فرمایا ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ ”کسی شخص کا ایمان مستحق نہیں ہو سکتا جب تک وہ معجو کو اپنے باب اپنے اور دوسرے تمام عزیز و اقارب سے عزیز نہ رکھے۔“ اسی طرح ایک اور حدیث میں فرمایا کہ ”ایمان کی حقیقت لذت ہے وہی اُتنا ہو سکتا ہے جس کے نزدیک اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم دوسرا تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہوں۔“

لیکن بیہان یہ بات ذہن میں رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جس کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد وہ جذباق محبت نہیں جو انسان کو بیوی پہلوں سے ہوتے ہے۔ بلکہ وہ عقلی اور اصولی محبت ہے جس کی بنا پر انسان اپنی مزید تربیت چیزوں اور ان اصولوں کو مقدم رکھتا ہے۔ اگر ان اصولوں کی راہ میں ہو، اس کا اپنا نفس مزاحم ہوتا ہے تو اس سے لڑتا ہے، دوسرے مزاحم ہونے ہیں تو ان کا مقابلہ کرتا ہے، بیہان تک کہ بیوی ہر، خاندان، ملک اور قوم ان اصولوں کے مخالف ہو جاتے ہیں تو ان سب کے مطالبات نہ کرا دیتا ہے۔ اس محبت کی اصول نووعیت کو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود ایک حدیث میں واضح فرمادیا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

من احبابِ متى فقد احبني
جس نے میری منت سے محبت کی اس نے مجھے
محبت کی۔ (ترمذی)

ای ی حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی تقاضا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات پر عمل کیا جائے اور اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات پر عمل نہ ہو تو محبت کا دعویٰ کھو کرلا اور نہیں بنیاد ہے۔

مزبد مطالعے کے لیے

مولانا سید سلیمان ندوی، سیہوہ النبی جلد چہارم۔ دارال منتین۔ اعظم گزہ۔
مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اسلام کا نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات۔
امامک پبلیکیشنز لمبینڈ، لاہور۔

بروفیسر محمد علی، دین و دانش۔ امریسر۔
ڈاکٹر آصف حسین قادری، مالاالت سہرت۔ مجلس تحقیقات، نشریات
اسلام، لکھنؤ۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، منت کی آئینی حیثیت۔ امامک پبلیکیشنز
لبیبلہ، لاہور۔

شیخ عبدالعزیز شاویش مصری، اسلام اور لطرت (مسامین متعلقہ ائمہ نبوت)۔
مترجمہ افتخار احمد بلخی، عباسی کتب خانہ کراچی۔

امروء حسنه

اسوہ انبیا *

تاریخ کی دنیا میں اب سے ہزاروں لاکھوں اشخاص نمایاں ہیں جنہوں نے آئے والوں کے لئے اپنی اپنی زندگیاں نمونے کے طور پر بیش کی ہیں۔ ایک طرف شاہان عالم کے باشان و شکوه دربار ہیں۔ ایک طرف سالاروں کے جنگ ہوئے ہیں۔ ایک طرف حکما اور فلاسفروں کا متین گروہ ہے۔ ایک طرف فاتحین عالم کی پر جلال صنیں ہیں۔ ایک طرف شعرا کی بزم رنگیں ہے۔ ایک طرف دولت مندوں اور خزانوں کے مالکوں کی نرم گدیاں اور کھنکھناتی تجویریاں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی زندگی اُدم کے بیٹوں کو اپنی اپنی طرف کھینچتی ہے۔ قرطاجنہ کا ہنپیال، مقدونیہ کا سکندر، روم کا قیصر، ایران کا دارا، بورپ کا نبیوایں، ہر ایک کی زندگی ایک کشش رکھتی ہے۔ سقراط، افلاطون، ارسطو، دبو جانس اور یونان کے دوسرے مشہور فلسفیوں سے لے کر اپندر تک تمام حکما اور فلاسفروں کی زندگیوں میں ابک خاص رنگ نمایاں ہے۔ نمرود، فرعون اور ابو جل و ابو لمب کی دوسری شخصیتیں ہیں۔ فارون کی ایک الگ زندگی ہے۔ غرض دنیا کے اشیع ہر ہزاروں قسم کی زندگیوں کے نمونے ہیں جو بنی اُدم کی عملی زندگی کے لئے سامنے ہیں۔ لیکن دیکھنا بد ہے کہ ان مختلف انسانوں میں سے کس کی زندگی نوع انسان کی سعادت، فلاح اور ہدایت کی خاتم اور کفیل ہے۔ اور اس کے لئے قابل تقلید نمونہ ہے۔

ان لوگوں میں بڑے بڑے قاطع اور سہ سالار ہیں۔ اب سے جنہوں نے اپنی تلوار کی نوک سے دنیا کے نقشے بدل ڈالے ہیں۔ لیکن کیا انسانیت کی فلاح و ہدایت ^۹ بے حصہ مولانا سید سلیمان ندوی کے "خطبہ مدرس" کے پہلے چھ خطبہات کی تلخیصر پر مشتمل ہے۔ (مرتب)

جس کے انہوں نے کوئی نونہ چھوڑا ۔ کیا ان کی تلوار کی کاٹ میدان جنگ سے
امم بڑھ کر انسانی اوہام و خوالات فاسدہ کی بڑیوں کو کاٹ سک؟ انسانوں کے باہمی
برادرانہ تعلقات کی گئی ہوئی ملجمہ سک؟ انسانی معاشرت کا کوئی خاکہ بھی
کر سک؟ ہماری روحانی ما یوسیوں اور ناسیدیوں کا کوئی علاج بتا سک؟ ہمارے
دلوں کی ناہاک اور زنگ کو مٹا سک؟ ہمارے اخلاق اور اعمال کا کوئی نفع
پنا سک؟ دنیا میں بڑے شاعر بھی ہیدا ہوئے ہیں۔ لیکن خیال دنیا کے بے
بینناہ عمل دنیا میں بالکل ہے کار ثابت ہوئے۔ کیوں کہ ان کی شیرین بیانیوں
کے چھے ان کے حسن عمل کا کوئی خوشنا نعمونہ نہ تھا۔ حکما اور فلاسفہ،
جنہوں نے بارہا اپنی عقل رسا سے نظام عالم کے نقشے بدلتے ہیں، انسانیت کے
نظام ہدایت کا کوئی عملی نقشہ اپنے نہ کر سکے۔ اور نہ فرانسیس انسان کی
ملسم کشافی میں کوئی عملی امداد دے سکے۔ اور دنیا کے اشیج و بڑے بڑے
بادشاہ اور حکمران بھی رونما ہوئے ہیں۔ ان کی تلواروں کی دھاکے نے آباد ہوں
یہ تو مجرموں کو روہش کر دیا لیکن تنهائیوں اور خلوت خانوں کے روہش
مجیوں کو وہ باز نہ رکھ سکی۔ انہوں نے بازاروں اور راستوں میں امن و امانت
قاہم کیا لیکن دلوں کی بستی ہی وہ امن و امانت قابض نہ کر سکے۔ انہوں نے ملک
کا نظم و نسق درست کیا لیکن روادوں کی مملکت کا نظم و نسق ان سے درست نہ
ہو سکا۔ بڑے بڑے مفہمن سولن سے لے کر اس وقت تک ہیدا ہوئے ہیں لیکن ان کے
فالوں کی عمر بڑی مختصر رہی۔ دوسرے دور کے حاکموں اور عدالتوں نے خود
ان کو حرف غلط سمجھ کر مٹا دیا۔

غرض، مذہب اور اعتقاد سے ہٹ کر عمل ناریخ کی روشنی میں دیکھیں تو
آپ کو یہ بقین ہو جائے گا کہ ہنی نوع انسان کی حقیقی بھلان، اعمال کی نیک،
اخلاق کی بہتری، دلوں کی صفائی، اور انسان قوی میں اعتدال اور میانہ روی ہیدا
کرنے کی کاپیاپ کوششیں اگر کسی طبقہ انسان نے انجام دی ہیں تو وہ صرف
انیائیں کرام کا طبقہ ہے۔ وہ خدا کے فرمانات ہو کر اس دنیا میں آئے اور دنیا کو
نیک تعلیم اور ہدایت دے کر اپنے بعد بھی لوگوں کے لئے چلتے کا ایک راستہ
ہنا کر چھوڑ گئے۔ جن کی تعلیم و عمل کے سرچشمے سے بادشاہ و رعایا، اسیر و خربہ،
جاہل و عالم سب براہر کا فیض ہا رہے ہیں۔ چنان چہ ہائل بزرگے راجہ اشoka کے
اہم صرف پتھر کی لائنوں ہر کندہ ہیں مگر بدها کا حکم دلوں کی تختہوں پر منفوہ ہے۔
اپنی، هستاہور (دمہل) اور فوج کے راجاوں کے اہم ملٹ چکے ہیں لیکن منوجی

کا دھرم شاستر اپنے تک نالہ اور جاری ہے۔ ہابل کے سب سے ۸۷ ملے قانون ساز بادشاہ، حَمَوْرَابِی کے قانونی دلمعات مدت ہوئی کہ مشی کے ڈھپر میں دفن ہو گئیں، مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیم آج یہی موجود ہے۔ فرعون کی ندائے 'انا ربکم اعلوا، کتنے دن قایم رہی، مگر موسیٰ علیہ السلام کے اعجاز کا آج یہی زمانہ متعارف ہے۔ سولن کے بنائے ہوئے قانون کتنے دن چل سکے؟ مگر توریت کا اسمانی قانون آج یہی انسانوں میں عدل کی ترازو ہے۔ وہ رومن "لا" جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عدالت میں گنہکار نہیں کیا تھا، صدیاں گزریں کہ معدوم ہو چکا مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم و هدایت آج یہی گنہکاروں کو نیک اور مجرموں کو ہاک بنائے میں اسی طرح مصروف ہے۔ مکہ کے ابو جہل، ایران کے کسری، اور روم کے قیصری حکومتیں مٹ گئیں مگر شہنشاہ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمادروائی بدستور نام اور ستم ہے۔

بہ مرحال انسانوں کی عمدہ معاشرت، صحیح تمدن اور اعلیٰ سیوت کی تکمیل اور کائنات کے اندر اس کو اشرف المخلوقات کا مرتبہ حاصل کرانے میں یقیناً قائم طبقات انسان کا حصہ ہے، اور ہم سب ان کے شکر گزار ہیں مگر سب سے زیادہ معنوں میں ان بزرگوں کے ہیں جنہوں نے ہمارے قلب کی دنیا کو آباد کیا، جنہوں نے ہماری حرص و ہوا کی اندرولی چالیں درست کیں، ہماری روحانی بیماریوں کے لیے نسخے تجویز کیے۔ اور اصلاح کے ابیسے نقشے ترتیب دیے جن سے دنیا کے صحیح تمدن اور صحیح معاشرت کی تکمیل ہوئی۔ اخلاق و سیوت انسانیت کا جوهر فرار ہا با، نیک اور بہلانی ایوان عمل کے نقش و نکار ٹھیرے۔ خدا اور بندے کا رشتہ ہا ہم مضبوط ہوا۔ اس طرح اس برگزیدہ اور ہاک طبقہ 'انسان' کے احسانات ہم انسانوں پر سب سے زیادہ ہیں۔ اور اس لیے ہر فرد انسان پر خواہ وہ کسی صنف سے تعلق رکھتا ہو ان کی شکر گزاری کا اظہار واجب ہے۔

عالیٰ گیر اور دالمنی نمونے کی شرالطا اور اسوہ محمدی فلعلم

بہ نفوس قدسیہ (انبیائے کرام) اپنے اپنے وقت پر آئے اور گذر گئے۔ ہر ایک نے اپنے اپنے وقت میں اپنی اپنی قوموں کے سامنے اس زمانے کے مناسب حال اخلاق عالیہ اور صفات کاملہ کا ایک نہ ایک بلند ترین معجزانہ نمونہ پیش کیا اور انسان کی ہٹریج زندگی کے راستے میں روشنی کا ایک ایسا مینار قایم کر دیا جس سے صراحت مستقیم کا پتہ لگ سکے۔ مگر اب ضرورت ایک ایسے رہنماء اور رہبری تھی جو اس سیرے سے لے کر اس سیرے تک ہوئی راہ کو اپنی هدایات اور عملی مثالوں سے روشن کر دے۔

ہمارے ہاتھ میں اپنی عمل زندگی کا وہ مکمل ہدایت نامہ دے دے جس کو
اللہ کردار انسان کی تعلیم و ہدایت کے مطابق ہر سافر کے خطر میز مقصود کا ہے ہالے -
لے کر رہا نما سلسلہ، اندازا کے آخری فود محمد صطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو
بہک وقت شاہد و مبشر، نذیر و داعی اور سراج منیر بنا کر بھیجئے گئے - اب
(صلی اللہ علیہ وسلم) دنیا کے آخری بیفمبر تھے۔ اس لئے ایسی شریعت دے کر بھیجئے
تم جس کی تکمیل کے لئے ہر کسی دوسرے کونہ آنا تھا۔ اب کی تعلیم دائیں وجود
رکھنے والی تھی۔ یعنی قیامت تک اس کو زندہ رہنا تھا اس لئے اب (صلی اللہ علیہ وسلم)
یہ ذات ہاک کو مجموعہ کمال اور دوات بے زوال بنا کر بھیجا گیا۔

لیکن یہ مخفی تھمین و ظلن یا مذہبی عقیدہ نہیں، بلکہ ایک ایسی حقیقت اور
ابروالہ ہے جس کی بنیاد دلائل اور شہادتوں پر قائم ہے۔ اس سیرت یا نمونہ حیات
ہیا جو انسانوں کے لئے ایک مثال کا کام دے، متعدد شرطوں کا ہایا جانا ضروری
ہے۔ ان میں سب سے بھلی اور اہم شرط 'تاریخیت' ہے۔ یعنی ایک کامل انسان
ع جو سوانح اور حالات بیش کریے جائیں، ان کی حیثیت قصوں اور کہانیوں کی
ہو کریں کہ فرضی انسانوں پر انسان زندگی کی بنیاد نہیں ڈالی جاسکتی۔
ضروری ہے کہ اس کامل انسان کی سیرت تاریخی اسناد کے معیار پر ہوئی اترے
ابراہیم جہنم لاپا نہ جا سکے۔

خوارکرو کہ ہر ملک میں، ہر قوم، ہر زبانہ، اور ہر زبان میں کتنے لاکھ
انسان خدا کا بیفہام لے کر آئے ہوں گے۔ ایک اسلامی روابت کے مطابق ایک لاکھ
ہزار بیفمبر آئے مگر آج ان میں تھے کتنوں کے نام ہم جانتے ہیں۔ اور جتنوں
کا نام ہم جانتے ہیں ان کا کیا حال جانتے ہیں۔ دنیا کی تمام قوموں میں سب سے
زیادہ قدیم اور ہرانے ہونے کا دعویٰ ہندوؤں کو ہے۔ کو یہ دعویٰ مشتمل نہیں
لیکن بفور دیکھو کہ ان کے مذہب میں سینکڑوں رہنماؤں کے نام ہیں۔ مگر ان میں
کس کو 'تاریخی' ہونے کی عزت حاصل نہیں ہے۔ بہت سوں کے تو نام کے سوا
کس اور چیز کا ذکر تک نہیں اور انسانوں سے اڑھ کر تاریخ کے میدان میں ان کا
لکڑا ہی نہیں۔ ایران کے ہرانے مجوہ مذہب کا ہانی زرتشت اب ہی لاکھوں
اوسمیل کی عقیدت کا مرکز ہے مگر اس کی تاریخی شخصیت ہوئی قدامت کے ہر دہ میں
کم ہے۔ اور کرن اور ڈارمشٹر جیسے محققین کو زرتشت کی تاریخی شخصیت سے انکار
کرنا ہڑا۔ قدیم ایشیا کا سب سے زیادہ وسیع مذہب ہو دھے جو کبھی ہندوستان،
اور تمام ایشیائی وسطی، افغانستان، ترکستان تک ہوپلا ہوا تھا۔ لیکن

ایک مورخ اور سوانح تکار کے لیے اس میں کوئی روشنی نہیں - چینی مذہب بانی کا حال اس سے بھی زیادہ خیز یقینی ہے - اور چین کے ایک بانی "مذہب کنفیوشن" کی نسبت ہم کو ہودہ جتنی واقفیت ابھی نہیں -

سامسی قوم میں سینکڑوں ہیغمبر آئے لیکن نام کے سوا تاریخ نے ان کا اور کچھ حال نہ جانا - حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت ہود، حضرت مالک، حضرت اسماعیل، حضرت یعقوب، حضرت زکریا، حضرت یعنی علیہم السلام کے حالات اور سیرتوں کے ایک حصے کے علاوہ کیا ہمیں کوئی کچھ بتا سکتا ہے ان کی سیرتوں کے ضروری اجزا تاریخ کی کڑبوں سے ہے ہر حال گم ہیں - حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حال ہم کو تورات سے معلوم ہوتا ہے مگر خود وہ تورات اول تحقیق کے بیانات کے مطابق، جیسا کہ خود مصنفوں انسانیکلوپیڈیا اور زینٹریکل سلیم کرنے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صدھا سال کے بعد عالم دبور میں آئی - حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات انجلیلوں میں درج ہیں - لیکن ان بہت سی انجلیلوں میں سے اج عیسائی دنیا کا بڑا حصہ صرف چار انجلیلوں کو تسلیم کرتا ہے - باق انجلی طفولیت، برنا باس وغیرہ خیز مستند قرار دی جاتی ہیں۔ ان چار انجلیلوں میں سے کسی ایک انجلی کے لکھنے والے نے بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خود نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے کسی سے سُن کر حالات کا یہ مجموعہ لکھا ہوا۔ یقین سے ہے بھی معلوم نہیں - یہ بھی واضح طور سے ثابت نہیں کہ وہ کریم زمانوں میں لکھی گئیں - چنان چہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کی تاریخ حیثیت کتنی کمزور معلوم ہوئی ہے -

کسی انسانی سیرت کے دائمی نمونہ عمل بننے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے صحیفہ "حیات" کے تمام حصے ہماری نکاحوں کے سامنے ہوں، کوئی وائس ہرده، راز اور ناواقفیت کی تاریکی، یہ کم نہ ہو۔ اس معیار پر اگر شارعین ادبی اور بانیان مذاہب کے سوانح اور سیرتوں پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو کہ کم حمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کوئی ہستی اس معیار پر پوری نہیں اتری - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ خاتم الانبیا ہو کر دنیا میں تشریف لائے تھے۔

هزاروں، لاکھوں انبیا علیہم السلام اور مصلحین کے ذمہ میں یہ مذہب تین چار ہی ہستیاں ایسی ہیں جو تاریخی کہیں جا سکتی ہیں لیکن کابلنا کی حیثیت سے ۹۹ بھی ہوئی نہیں۔ مثلاً ابھی دیکھا کہ ہودہ کی تو تاریخی جنت

مشکوک و مشتبہ ہے۔ انبیاء سابقین میں سب سے مشہور زندگی موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہے۔ مگر خود سے دیکھو تو ان کی طویل زندگی میں چند اجزا ہاتھ میں آئے ہیں۔ ہدایت، جوانی میں هجرت، شادی اور بیوی کے واقعات معلوم ہیں۔ ہم چند لڑائیوں کے بعد بڑھائی میں ۱۲۰ کی عمر میں ہے۔ ان واقعات کو جانے دیجئے، یہ تو شخصی حالات ہیں جو ہر شخص کی زندگی میں الگ الگ پہنچاتے ہیں۔ انسان کو اپنی سوائی کے لیے عمل کے لیے جن اجزاء کی ضرورت ہے وہ اخلاق و عادات اور زندگانی کے طور پرداز نہ ہے۔ اور یہی اجزاء حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیغمبرانہ سوانح عمری ہے ملکہ فیض۔ اسلام سے سب سے زیادہ قریب زمانے کے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کم ہیں۔ لیکن انہی کے سوانح سب سے زیادہ کم معلوم ہیں۔ انجیل کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی ۳۳ برس کی تھی لیکن آخری یا ان کے کچھ حالات یعنی چند معجزے، مواضع اور رسول کے علاوہ کچھ بن بوس کے ملکہ ملکہ کے علم نہیں۔

ہم کسی سیرت کے عمل نمونہ بتئے کے لیے تیسری ضروری شرط 'جامعہ' ہے۔ یعنی مختلف طبقات انسانی کو اپنی ہدایت اور روشنی کے لیے جن نمونوں کی ضرورت ہے باہر فرد انسان کو اپنے مختلف تعلقات و روابط اور فرائض و واجبات کو ادا کرئے کہ اپنے جن مثالوں اور نمونوں کی حاجت ہوتی ہے وہ سب اس مثال زندگی میں موجود ہوں۔

اس نقطہ نظر سے بھی دیکھئے تو معلوم ہوا کہ سوانح خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کوئی دوسری شخصیت اس معیار پر ہوئی نہیں اترف۔ مذہب کیا چیز ہے۔ خدا اور بندوں اور خود بندوں کے باہم تعلقات کے بارے میں جو فرائض اور واجبات ہیں ان کو تسلیم کرنا اور ادا کرنا، دوسرے لفظوں میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کا نام ہے۔ اس لیے ہر مذہب کے ہیروئن کا فرض ہے کہ وہ اپنے پیغمبروں اور بانیوں کی سیرتوں میں ان حقوق و فرائض وغیرہ کی تفصیلات تلاش کریں۔ اور ان کے مطابق اپنی زندگی کو ڈالنے کی کوشش کریں۔

اس لحاظ سے ایک طرف تو وہ مذاہب جن میں خدا کا وجود تسلیم ہی نہیں کیا گیا ہے، جیسا کہ ہودہ اور جین مذہب، جن میں خدا، اس کی ذات، مفات اور دیگر حقوقِ الہی کا ہٹه نہیں۔ دوسری طرف وہ مذاہب ہیں جنہوں نے

خدا کو کسی لہ کسی رنگ میں تسلیم کیا ہے۔ ان مذاہب کے ایفیمبروں اور پانیوں کی زندگیوں میں ہی خدا طلبی کے واقعات مفقود ہیں، ہری تواریخ اور جاؤ خدا کی توحید اور اس کے احکام اور قربانی کے شرائط کے علاوہ تواریخ کی پانیوں کتابیں حقوق اللہ کی تفصیل سے خالی ہیں۔ انجیل میں ہی اس ایک مسئلے کے علاوہ کہ خدا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا باپ تھا، ہم کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس دنیاوی زندگی میں اس مقدس باپ اور اپنے میں کیا تعلقات و روابط تھے۔ اب حقوق العباد کو لیجئے، تو اس سے ہی حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا تمام دیگر انبیاء اور بانیان مذاہب کی سیرتیں خالی ہیں۔ بودھ نے اپنے تمام اہل و عیال اور خاندان کو چھوڑ کر جنگل کا راستہ لیا۔ حکومت، اور سلطنت کے بارگران سے سبکدوشی حاصل کی اور نروان یا نیجات حصول کو انسانی زندگی کا آخری مقصد قرار دیا۔ ان حالات میں کیا کوئی انسان یہ سمجھ سکتا ہے کہ اس دنیا کے بسنے والوں کے لیے، جن میں حکومت و رعیت، شاہ و گدا، آقا و نوکر، باپ اپنے، اہمیت ہن اور دوست احباب کے تعلقات ہیں، بودھ کی سیرت کچھ کارآمد ہو سکتی ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی، کا ایک ہی ہہلو، جنگ اور سبھ سالاری کا نہایت واضح ہے ورنہ اس کے علاوہ ان کی سیرت کی پھری کرنے والوں کے لیے دنیاوی حقوق، واجبات، فرائض اور ذمہ داریوں کا کوئی نمونہ موجود نہیں ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اسرو کیوں کر قابل تقلید ہوا جب کہ انہوں نے گھر بار، اہل و عیال، مال و دولت، صلح و جنگ، دوست و دشمن کے تعلقات سے کبھی واسطہ ہی نہ رکھا ہو۔ اس دنیا کے لیے جو اپنی تعلقات سے معمور ہے کیوں کر مثال ہو سکتا ہے۔

معیاری زندگی کا سب سے آخری معیار 'عملیت' ہے، یعنی شارع دین اور بانی مذہب جس تعلیم کو پیش کر رہا ہو خود اس کا ذاتی عمل اس کی مثال اور نمونہ ہو اور خود اس کے عمل نے اس کی تعلیم کو قابل عمل ثابت کیا ہو۔ ورنہ خوش کن سے خوش کن فلسفہ اور دلچسپ سے دلچسپ نظریہ ہر شخص ہر وقت پیش کر سکتا ہے۔ البتہ جو چیز ہر وقت پیش نہیں کی جا سکتی وہ عمل ہے۔ اسی لیے انسان سیرت کے بہتر اور کامل ہونے کی دلیل اس کے نیک اور معصوم اقوال و خیالات اور اخلاق و فلسفیانہ نظریے نہیں بلکہ اس کے اعمال اور کارنائے ہیں۔ اگر یہ معیار قائم نہ کیا جائے تو اچھے اور بے کی تیزی اللہ جائے اور دنیا صرف بات بنائیں والوں کا مسکن ہن کر رہ جائے۔ نیکیاں صرف سلبی ہی ہہلو نہیں رکھتے۔

کے پدیوں اور برائیوں سے بھنے کے لیے اب ہماری کمبوہ میں جا کر اپنے گئے
لکھے زیادہ تر ایجادی اور عمل ہلو وران کا مدار ہوتا ہے، مثلاً خربیوں کی مدد،
کمزوری کی حمایت، حق کوفہ، عفو، کرم، سخاوت، سہمان نوازی، حق کی
نہر کے لیے جوش، جہاد وغیرہ۔ گویا جس سیرت کا عمل حصہ سامنے نہ ہو اس
کو "بیماری زندگی" اور قابل تقلید نمونے کا خطاب نہیں دیا جا سکتا کہ انسان
اپنی کس چیز کی نقل کرے کا؟ اور کس عمل سے سبق حاصل کرے کا؟ ہم
تو نو صلح و جنگ، فقر و دولت، ازدواج و تبعید، تعلقات خداوندی و تعلقات
بیان، حاکمیت و حکومیت، سکون و غضب، جلوت و خلوت، غرض، زندگی کے
ہر ہلو کے متعلق عملی مثال چاہیے۔ دنیا کا ایشتر بلکہ تمام تر حصہ اپنی مشکلات
اور تعلقات میں الجھا ہوا ہے۔ اس لیے لوگوں کو ان کے حل اور بوجہ احسن
انجام دینے کے لیے عمل مثالوں کی ضرورت ہے۔ قول نہیں بلکہ عمل۔ لیکن
کہنا شاعری اور خطاب نہیں بلکہ تاریخی واقعہ ہے کہ اس معیار پر ہی
پیرت محمدی کے سوا کوفہ دوسری سیرت ہوئی نہیں اتر سکتی۔ آئینے اب ان چاروں
بیماروں کے مطابق ۱۰ فتمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ ہر نظر ڈالیں ۱

اسوہِ محمدی کا تاریخی ہلو

اس اس ہر تمام دنیا متفق ہے کہ اسلام نے اپنے ایغمبر کی اور نہ صرف اپنے
پیغمبر کی بلکہ ہر اس چیز اور اس شخص کی جس کا ادنیٰ ساتھی ہے انحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک سے تھا، جس طرح حفاظت کی ہے وہ عالم کے
لئے ماہہ حضرت ہے۔ ان لوگوں کو جو انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال
و افعال اور متعلقات زندگی کی روایت، تحریر اور تدوین کا فرض انعام دیتے تھے،
راویانِ حدیث و روایت، محدثین اور ارباب سیرت کہتے ہیں۔ اس مقدس گروہ میں
معاہد، تابعین، تبع تابعین اور بعد کے چوتھی صدی ہجری تک کے اشخاص داخل
ہیں، جب تمام سرمایہ، روایت تعریبی صورت میں آ کیا تو ان تمام راویوں کے
نام و نشان، تاریخ زندگی، اخلاق و عادات کو بھی قید تعریب میں لا بنا کیا۔ ان کی
تعداد ایک لاکھ کے قریب ہے اور ان سب کے مجموعہ احوال کا نام "اسماء الرجال"
ہے۔ جس کے متعلق مشہور جرمن مستشرق ڈاکٹر اسپرنکر کا قول ہے۔ "نه کوفہ
نوم دنیا میں اپسی گذری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال
کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج ہانج لامکہ اشخاص کا حال
علوم ہو سکتا ہے۔"

یہی وہ لوگ ہیں جن کی روایات آج سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔ ان کی وفات کی تاریخوں پر نظر ڈالیجئے تو معلوم ہو جائے کہ ان ہی وفات کے سال اس قدر متاخر ہیں کہ ان سے فیض انہائے اور ان کی روایتوں کو حفظ اور تدوین کرنے والوں کی تعداد بے شمار ہو گی۔ انسی باتوں کی واقعیت اور آکاہی کا نام اس زمانے میں علم تھا۔ اور وہ دینی اور دنیاوی دونوں عزیزوں کا ذریعہ تھیں۔ اس لیے ہزاروں صحابہ نے جو کچھ دیکھا اور جانا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم "بلغواعنی" (مجہ سے جو کچھ سنو اور دیکھو اس کی اشاعت کرو) یا "فَلِيلِ الشاهدِ الفائزُ" (جو مجھی دیکھے رہے ہیں اور مجھے سے سن رہے ہیں وہ ان کو مطلع کر دیں جو اس سے محروم رہے ہیں) کے مطابق "سب اپنی اپنی اولاد، عزیزوں، دوستوں اور ملنے والوں کو سناۓ اور بتائے رہئے تھے۔ یہی ان کی زندگی کا کام اور یہی ان کے سب و روز کا مشغله تھا۔ اس لیے صحابہ کے بعد فوراً ہی دوسری نوجوان ہود ان معلومات کی حفاظت کے لئے کھڑی ہو گئی۔ ان میں سے ہر ایک کو ہر واقعے کا لفظ لفظ پاد کرنا پڑتا تھا۔ ان کو دھرانا پڑتا تھا۔ اور حرفاً حرفاً عنواظ رکھنا پڑتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں اپنے اقوال اور افعال کی اشاعت کی تا کید کی تھی وہاں یہ بھی تہذیب کر دی تھی لہ "جو کوئی میرے متعلق قصداً کوئی غلط یا جھوٹ ہات ایاں کرے گا، اس کا نہ کانا جہنم ہو گا۔" اس اعلان کا انہی یہ تھا کہ بڑے بڑے صحابہ روایت کرتے وقت کاپنے لکتے تھے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی نے ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات نقل کی تو چہرے کا رنگ بدلتا گئے پھر کہا "حضرت اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی فرمایا تھا یا اس کے قریب قریب فرمایا تھا۔"

عربوں کا حافظہ فطرتاً نہایت قوی تھا۔ وہ سینکڑوں اشعار کے قصیدے زبان پاد رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ فطرت کا قاعدہ یہ ہے کہ جس قوت سے جس قدر کام لیا جائے اسی قدر زیادہ اس کو ترقی ہوتی ہے۔ صحابہ اور تابعین نے حدیث کو اس طرح زبانی سن کر پاد کرتے تھے جیسے آج مسلمان قرآن مجید پاد کرتے ہیں۔ ابک ایک حدث کئی کئی ہزار اور کئی کئی لاکھ حدیثیں زبان پاد کرتا تھا۔ اور پاد رکھتا تھا۔ اور کو بعد میں لوگ اپنی پادداشت کے لئے لکھ بھی لیتے تھے۔ مگر جب تک وہ زبان پاد نہ رکھتے اهل علم کی نکاحوں میں

لئے میزت نہیں ہوتی تھی - اور وہ خود اپنی تحریری پادداشتیں کو عیب کی
لئے میزت نہیں تھے قاتم لئے لوگ ایسا نہ سمجھیں لہ ان کو یہ چیزیں پاد نہیں ہیں۔
لہ میں اس خدا اور تحریری پادداشت ہی اور محدثین سلف، اور خلفاء اسلام
کے نامات نہیں کی بلکہ اس فن کے بڑے بڑے اماموں کے لیے ممتازی اور سیرت
کی تعلیم کی تعریض سے درس کا ہیں اور مسجدوں میں حلقوں قائم کیتے ہیں - ہر آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے لے کر اس وقت تک ہر زمانہ میں، ہر ماں
ہر زبان میں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات، حالات اور ارشادات
کتابیں لکھی گئیں ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اور اسلام کے دشمنوں
بہر سلموں نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرتیں لکھ کر فخر محسوس کیا
اللہ چہ سار گہیں کے الفاظ ہیں :

”نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح نکاروں نا ایک طویل
سلسلہ ہے جس کا خاتم ہونا ناممکن ہے ایکن اس میں جگہ ہانا
بھی باعثِ عزت ہے۔“

جان ڈیون ہوٹ نے اپنی کتاب کو شروع کرنے ہوئے اکھا:

”اس میں کچھ شبہ نہیں کہ تمام محدثین اور فاتحوں میں ایک
بھی ایسا نہیں ہے جس کے وقائع عمری محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)
کے وقائع عمری سے زیادہ مفصل اور سچے ہوں۔“

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیرون مبارکہ کا سب سے مستند، سب سے زیادہ
متعین تو وہ حصہ ہے جس کا مأخذ خود قرآن پاک ہے، جس کی صحت اور اعتبار
میں دوست کیا دشمن بھی شک نہ کر سکے ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کی سیرت کے تمام ضروری اجزا ۔ قبل نبوت کی زندگی، بنیمی، غربت، تلاش حق،
نبوت، وہی، اعلان و تبایغ، معراج، مخالفین کی دشمنی، هجرت، لڑائیاں،
وقائع، اخلاق ۔ اس میں موجود ہیں، اور اس سے زیادہ معتبر تاریخی سیرت دنیا
کے ہر دہ بہ کوئی موجود نہیں ہے ۔ دوسرا مأخذ احادیث ہیں جس کی صحت کے
لیے اورہ کا بیان کافی ہوا ۔ تیسرا مأخذ ممتازی ہیں جن میں زیادہ تو حضور صلی اللہ
علیہ وسلم کے نزوات اور لڑائیوں کا حال اور ضمناً دوسرے واقعات بھی موجود ہیں ۔
چوتھا مأخذ عام تاریخ کی کتابیں ہیں جن کا بہلا حصہ خاص محضور اکرم صلی اللہ

1 "The biographers of the Prophet Mohammed form a long series that is impossible to end but in which it would be honourable to find a place"

علیہ وسلم کے سوانح ہر ہے۔ ہانجوان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور روحانی کارناموں کا الگ دلائر ہے جن کو کتب دلائل کہتے ہیں۔ جہنم مانگنے کتب شماں ہیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف اخلاق و عادات اور فضائل و معمولات زندگی کا بیان ہے۔ اس سے الگ بھر وہ کتابیں ہیں جو مکہ، معلمانہ اور مدینہ، منورہ کے حالات میں ہیں جن میں ان شہروں کے عام حالات کے علوی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامی حالات اور ان مقامات کے نام و نشان ہیں جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی تعلق ہے۔

اس ہوئے تذکرے سے موافق و مخالف ہر ایک کو اندازہ ہو سکتا ہے لہ سیرت محمدی کی تاریخی حیثیت کیا ہے، اور اس کی ترتیب میں کم قدر احتیاط، استناد، اور اہتمام برداشت کیا ہے جو کسی شارع یا بانی دین کی سیرت و احوال کے مجموعہ کی ترتیب میں نظر نہیں آتی۔ یہ تاریخیت صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتیپاز ہے۔

کامل زندگی

کوئی زندگی خواہ کسی قدر تاریخی ہو جب تک وہ کامل نہ ہو ہمارے لئے ندونہ نہیں ہن سکتی۔ کسی زندگی کا کامل اور ہر نفس سے اوری ہونا اس وقت تک ثابت نہیں ہو سکتا جب تک اس زندگی کے تمام اجزاء ہمارے سامنے پہنچ برا اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر لمحہ ہیدائش سے لے کر وفات تک ان کے زمانے کے لوگوں کے سامنے اور ان کی وفات کے بعد تاریخ عالم کے سامنے ہے۔ ان کی زندگی کا کوئی مختصر سے مختصر زمانہ بھی ایسا نہیں گزرا جب وہ اپنے اہل وطن کی آنکھوں سے اوچھل ہو کر آپزدہ کی تیاری میں معروف ہوں۔

ہیدائش، شیر خواری، ایجن، ہوش و تمیز، جوانی، تجارت، آمد و رفت، شادی، احباب، قبل نبوت، قریش کی لڑائی اور قریش کے معاہدے میں شرکت، امین پتنا، خانہ، کعبہ میں پتھر نصب کرنا، رفتہ رفتہ تنهائی ہستدی، غار حرا کی گوشہ نشینی، وہی، اسلام کا ظہور، دعوت، تبلیغ، مخالفت، سفر طائف، معراج، هجرت، غزوات، حدیبیہ کی صلح، دعوت اسلام کے نامہ و پیام، اسلام کی اشاعت، تکمیل دین، حجہ الوداع، وفات، ان میں سے کون سا زمانہ ہے جو انسانوں کی نکاحوں کے سامنے نہیں اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کون سی حالت ہے جس سے اہل تاریخ ناواقف ہیں۔ الہنا یہیں، سونا جا گنا، شادی یا،

دیوبت احباب، نماز روزہ، دن رات کی عبادت، صلح و جنگ، سفر و حضر،
ہال ہونا، کھانا پینا، ہنسنا رونا، اہننا اور ہنا، چلنا ہونا، ہنسی مذاق،
ہل چال، خلوت جلوت، ملنا جلنا، طور طریق، رنگ و بو، خد و خال، قد و فامت،
ہیں تک کہ بیان ابوی کے خانگی تعلقات اور نجی معاملات بھی بوری روشنی
بی مذکور، معلوم اور محفوظ ہیں۔

بڑے سے بڑا آدمی بھی انہے کھر میں معمول آدمی ہوتا ہے۔ اسی لئے
والدیر نے کہا تھا کہ کوئی شخص انہے کھر میں ہبرو نہیں بن سکتا۔ لیکن
پابورتھ استھنے کی رائے میں کم از کم یہ اصول ہے: غیر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے
بنغلق صحیح نہیں۔ کیتنے نے لکھا ہے کہ ”تمام ہیغمبروں میں سے کسی نے
انہی پیروں کا اس قدر سخت امتحان نہیں لیا جس قدر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)
نے، انہوں نے دفتاً انہی کو سب سے ہمیں ان لوگوں کے سامنے بہیت ہیغمبر
کے ایسیں کیا جو ان کو بہیت انسان کے بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ انہی
ابوی، انہے خلام، انہے بھائی، انہے سب سے واقف کار دوست کے سامنے، اور ان
سب نے بلا سس و بیش آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دعوے کی صدالت کو تسلیم
کر لیا۔“ ابوی سے بڑہ کر انسان کی اندروں کمزوریوں کا واقف کار کوئی دوسرا
ہو سکنا مکر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی
لہیں پر سب سے ہمیں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کی ابوی ایمان لائیں جو
مدافت پر سب سے ہمیں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رفاقت میں رہ چکی تھیں۔
بتوت سے ہمیں پندرہ برس تک آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے هر حال اور ہر کیفیت کی نسبت ذات و اتفاقیت رکھتی
اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے هر حال اور ہر کیفیت کی نسبت ذات و اتفاقیت رکھتی
تھیں۔ ہمیں ہمہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہیغمبری کا دعویٰ دھا
تو سب سے ہمیں انہی نے ان کی سچائی کو تسلیم کیا۔

بڑے سے بڑا انسان جو ایک ہی ابوی کا شوہر ہو وہ ابھی ہمت نہیں
کر سکتا۔ وہ اس کو بہ اذن عام دے کہ تم میری ہر بات، ہر حالت، اور
ہر واقعے کو ہر ملا کہ دو اور جو کچھ چھپا ہے سبہ اور ظاہر کر دو۔ مکر
حضرت اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام ازواج مظہرات، جس سے ہر ایک کو بہ اذن
حضرت اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے جو کچھ دیکھیں وہ جلوت میں
عام تھا کہ خلوت میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے جو کچھ دیکھیں وہ دن کی روشنی میں
سب سے ہر ملا ہیان کر دیں، جو رات کی تاریک میں دیکھیں اس کو کھلی چھتوں ہر ہکار کر
ظاہر کر دیں۔ جو بند کوئی ہوں میں دیکھیں اس کو کھلی چھتوں ہر ہکار کر
کہ دیں۔ اس اخلاق و ثقہ و اعتماد کی مثال اور کتاب مل سکتی ہے؟

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جلوت میں ہوں یا خلوت میں، مسجد میں ہوں یا میدان جہاد میں، نماز شبانہ میں مصروف ہوں یا فوجوں کی درستی میں، مذہب پر ہوں یا گوشہ^۲ تنهائی میں، ہر وقت اور ہر شخص کو حکم تھا کہ جو کہہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حالت اور کیفیت ہو وہ سب منظر عام ہر لانی جائے۔ ایک طرف ازواج مطہرات آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلوت خانوں کے حالات سنائے اور بنائے میں مصروف رہیں اور دوسری طرف اصحابِ صفتہ معتقد جاسوسوں کی طرح شب و روز ذوق و شوق کے ساتھ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حالات دیکھنے اور دوسروں سے ان کو بیان کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ مدینے میں رہنے والی آبادی دس برس تک مستقل آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ایک ایک حرکت و سکون اور ایک ایک جنبش کو دیکھتی رہی۔ غزوتوں اور لڑائیوں کے موقع ہر ہزارہا صحابہ کو شب و روز آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھنے اور آپ کے حالات مبارکہ سے واقف ہونے کا موقع ملتا تھا۔ اب آپ سمجھے سکتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی کا کون سا ہملو ہوگا جو زبردہ رہا ہوگا اور اس ہر بھی ایک شخص تک کو بلکہ بڑے سے بڑے دشمن اور مخالف کو ہوری چہان میں اور تلاش و جستجو کے بعد بھی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہر حرف گیری کا کوئی موقع نہ مل سکا۔

ایک حیثیت سے اور غور فرمائیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ صرف اپنے معتقدوں ہی کے حلقوں میں نہیں رہے بلکہ مکرے میں قریش کے مجمع میں رہے۔ نبوت سے ۲۰۰ برس آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی انہیں کے ساتھ گذری اور پھر تاجرانہ زندگی، لین دین کی زندگی، معاملہ اور کاروبار کی زندگی، جس میں قدم ہر پد معاہدکی، بد نیتی، خلاف وعدی، اور خیانت کاری کے عدیق غار تھے۔ مگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس طرح یہ خطر اس راستے سے گذر کرنے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان سے ایک خطاب حاصل ہوا۔ نبوت کے بعد بھی لوگوں کو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر یہ اعتماد تھا کہ اپنی امانتیں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کے ہاس رکھوائے تھیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دعوانے نبوت ہر تمام قریش نے برهمنی ظاہری، مقاطعہ دیا، دشمنیاں ظاہر کیں، گالیاں دیں، راستے روکے، نجاستیں ڈالیں، بہر بھینکے، قتل کی سازشیں کیں، آپ کو صاحر و مجنوں کہا مگر کسی نے یہ جرأت نہ کی کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اخلاق و اعمال کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نکال سکے۔ حالانکہ نبوت اور پیغمبری کے دعوے ہی کے یہ معنی ہیں کہ

اپنی بے گناہی اور معصومیت کا ذمیعی کر رہا ہے۔ اس دعوے کے ابطال
میں اب (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اخلاق و اعمال کے متعلق چند مخالفانہ شہادتیں بھی
کہیں تھیں، تاہم اس دعوے کے توثیق کے لئے انہوں نے اپنی دوست لکھی، اپنی اولاد
کو فربان کیا، اپنی جانیں دیں لیکن بد مسکن نہ ہوا کہ وہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم)
کی ذات پر معمولی خردہ گیری کر کے بھی اس کو باطل کر سکیں۔ کیا اس سے
نہیں ثابت ہوتا کہ جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) دوستوں کی نظر میں تھے وہی
دشمنوں کی نکاح میں بھی تھے۔ اور کوئی چیز زیر ہو رہا اور نامعلوم نہ تھی۔

بہر ایک بات پر اور غور فرمائیے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو
لوگ ابتداء میں ایمان لائے وہ ماہی گیر نہ تھے، اور وہ مصر کے حکوم اور غلام
نوم کے افراد نہ تھے بلکہ ایک ایسی آزاد قوم کے افراد تھے جو اپنے جذبہ حریت
کے لحاظ سے مستائز تھی۔ اور جس نے ابتدائے آفرینش سے آج تک کبھی کسی
می اطاعت نہیں کی تھی۔ جن کے تجارتی کاروبار دور دور تک پہنچے ہوئے تھے
اور جو اسلام لانے کے بعد ساری عظمتوں اور رفتتوں کے مالک بن گئے۔ کیا ایک
معی کے لئے بھی کوئی پہ تصور کر سکتا ہے کہ اب پس پڑ زور، قوی ہازو
اور داناپان روزگار سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی آوفی گوشہ چھپا
رہ سکتا تھا اور وہ دھوکا کہا سکتے تھے؟ بلکہ بھی وہ لوگ تھے جنہوں نے
آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ایک ایک جنبش کی نقل کی ہے۔ اور جو آپ
(صلی اللہ علیہ وسلم) کے ایک ایک نفس قدم پر چلنا اپنی سعادت سمجھتے تھے۔
بہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کاملیت کی ناقابل تردید دلیل ہے۔

اسلام کی نکاح میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیات ایک مسلمان کے لئے
کامل نمونہ ہے۔ لقتہ کان لنکشم ف رسول اللہ اسوہ حسنہ۔ اس لئے اس نمونے کے
تمام ہم لوگوں کے سامنے ہونے پا گئیں اور وہ سب کے سب سامنے ہیں۔ اس سے
ثابت ہو گا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی کے مسلسلہ کی کوئی کڑی کم
نہیں ہے، کوئی واقعہ زیر ہو رہا نہیں ہے، جو کچھ ہے وہ تاریخ کے صفحات میں
آنپسے ہے اور یہی ایک ذریعہ کسی زندگی کے کامل، معصوم اور بے گناہ بقین
کرنے کا ہے۔ نیز ایسی ہی زندگی، جس کے درہم لو اس طرح روشن ہوں، انسان
کے لئے نمونے کا کام دے سکتی ہے۔

اسوہ محمدی کی جامعیت

اس دنیا کی بنیاد ہی اختلاف عمل ہے۔ باہمی تعاون اور مختلف لمحوں اور کاموں ہی کے ذریعے یہ دنیا چل رہی ہے۔ اس میں بادشاہ یا رئیس جمیور اور حکام بھی ضروری ہیں اور حکوم، مطیع اور فرمان بردار رعایا بھی۔ امن و امان کے قیام کے لئے قاضیوں اور ججوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اور سپہ سالار اللہ کا بھی، غربیوں، دولت مندوں، عابد و زاہد، سپاہی و مجاهد، اہل و عیال، دوست احباب، تاجر و سوداگر، امام اور ہبشاوا، سب ہی کا ہونا ضروری ہے۔ غرض اس دنیا کا نظم و نسق ان مختلف اصناف کے وجود اور قیام ہر ہی موقع ہے۔ اور ان تمام اصناف کو اپنی اپنی زندگی کے لئے عملی مجسمے اور نمونے کی ضرورت ہے۔

اسلام ان تمام انسانوں کو منت نبوی صلعم کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ مختلف طبقات انسان کے لئے انہی ہیغمبر کی عمل سیرت میں نمونے اور مثالیں رکھتا ہے جو ان میں سے ہر ایک کے لئے الگ الگ ہدایت کا چراغ بن سکتا ہے۔ اسلام کے صرف اسی نظریے سے ثابت ہو جاتا ہے کہ ہیغمبر اسلام صلعم کی سیرت میں جامعیت ہے۔ یعنی انسانوں کے ہر طبقے اور صنف کے لئے اس سیرت ہاک میں نصیحت ہذہری اور عمل کے لئے درس اور سبق موجود ہیں۔

اصناف انسال کے بعد دوسری جامعیت خود ہر انسان کے مختلف لمحوں کے مختلف اعمال کی ہے۔ ہم چلتے ہوئے بھی ہیں۔ انہیں ایٹھتے بھی ہیں۔ کھانے اپنے بھی ہیں۔ سوئے جاگتے بھی ہیں۔ لین دین بھی کرتے ہیں۔ ہنسنے بھی ہیں روئے بھی ہیں۔ بہنستے بھی ہیں اثاثتے بھی ہیں۔ سیکھتے بھی ہیں۔ سکھانے بھی ہیں۔ مرنے بھی ہیں مارتے بھی ہیں، کھاتے بھی ہیں اور کھلانے بھی۔ عبادت و دعا بھی کرتے ہیں اور کاروبار بھی۔ مہماں بھی بنتے ہیں اور سیزبان بھی۔ ہم کو ان تمام امور کے متعلق، جو ہمارے مختلف العمال جہاں سے تعلق رکھتے ہیں، عمل نمونوں کی ضرورت ہے جو ہم کو ہر نئی حالت کے پیش آئے ہر ایک نئی ہدایت کا سبق اور نئی رہنمائی کا درس دیں۔

ان العمال کے بعد، جن کا تعلق اعضا ہے، وہ العمال ہیں جن کا تعلق دل و دماغ ہے۔ اور جن کی تعبیر ہم اعمال قلب با جذبات اور احساسات ہے۔ کرنے ہیں۔ ہر آن ہم ایک نئے قلبی عمل پا جذبہ یا احساس سے متاثر ہونے ہیں۔

راضی ہیں کبھی خوش ہیں، کبھی غم زدہ، کبھی مصائب سے دوچار
کبھی نعمتوں سے ملا مال، کبھی ناکام ہوتے ہیں اور کبھی کابیاب،
اور کبھی مالتون میں ہم مختلف جذبات کے مانع ہوتے ہیں۔ اخلاق فاضلہ کا
انعام ان ہی جذبات اور احساسات کے اعتدال اور باقاعدگی ہر ہے۔ ان سب
کو ایک عملی سیرت اور نمونے کی حاجت ہے۔

عز، استقلال، شجاعت، صبر، شکر، توکل، رضا بہ تقدیر، مصیبتوں کی
پرداشت، قربانی، قناعت، استغنا، اینار، جود، تواضع، خاکساری، غرض،
نیک و فراز، بلند و پست تمام اخلاقِ ہمlover کے لئے، جو مختلف انسانوں کو
مختلف حالتوں میں یا ہر انسان کو مختلف صورتوں میں ایش آئے ہیں، ہم کو
میل ہدایت اور مثال کی ضرورت ہے، مگر وہ کہاں مل سکتی ہے؟ صرف
مدد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس!

ایک ایسی شخصی زندگی جو ہر طائفہ انسان اور ہر حالت انسان کے مختلف
ظاهر میں ہر قسم کے صحیح جذبات اور کامل اخلاق کا مجموعہ ہو صرف
مدد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے۔ اگر دولت مند ہو تو مکتبے کے
تااجر اور بھرپور کے خزینہ دار کی تقلید کرو، اگر غریب ہو تو شفعت اپی طالب
عییدی اور مدینے کے سہمان کی کیفیت سنو، اگر بادشاہ ہو تو سلطانِ عرب
کا حوال ہڑھو، اگر رعایا ہو تو قریش کے حکوم کو ایک نظر دیکھو، اگر فاتح
ہو تو بدر و حنین کے سہ سالار ہو نکاہِ دوڑاڑ، اگر تم نے شکست کھائی ہے تو
بیرکہ احمد پسے عبرت حاصل کرو، اگر تم استاد اور معلم ہو تو صفتہ کی درس کاہ
کے معلم مقدس کو دیکھو، اگر شاگرد ہو تو روح الامین کے سامنے اٹھنے والے ہو
نظر جماز، اگر واعظ اور ناصح ہو تو مسجدِ مدینہ کے منبر ہو کھڑے ہونے والے
کی پاتیں سنو، اگر تہائی و بے کسی کے عالم میں حق کی منادی کا فرض انجام
دینا چاہتے ہو تو مکتبے کے بے یار و مددگار نبی کا اسوہ حسنہ تہارے سامنے ہے۔
اگر تم حق کی نصرت کے بعد اپنے دشمنوں کو زیر اور مخالفوں کو کمزور ہانا چکرے
ہو تو فاتحِ مکہ کا نظارہ کرو، اگر اپنے کاروبار اور دنیاوی جدوجہد کا نظم و نسق
درست کرنا چاہتے ہو تو بھی نصیر، خیر اور لدک کی زمینوں کے مالک کے
کاروبار اور نظم و نسق کو دیکھو، اگر یتیم ہو تو عبدالله و آمنہ کے جگر گوشے کو
نہ بھولو، اگر بچہ ہو تو حایمہ سعدیہ کے لالے ہی کو دیکھو، اگر تم جوان
ہو تو مکتبے کے ایک چروائی کی سیرت ہڑھو، اگر سفری کاروبار میں ہو تو بصرے

کے کارروائی سالار کی مثالیں ڈھوندو۔ اگر عدالت کے قاضی اور پنچایتوں کے نام
ہو تو کمیٹی میں نور آفتاب سے پہلے آنے والے ثالث کو دیکھو، جو حیر اسود کو
کہنے کے ایک گوشہ میں کھڑا کر رہا ہے، مدینے کی کچھی مسجد کے صحن میں
بیٹھنے والے منعف کو دیکھو جس کی نظر میں شاہ و گدا، امیر و غریب براہر تھے۔
اگر تم بیویوں کے شوہر ہو تو خدیجہ اور عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مدرس
شوہر کی حیات پاک کا مطالعہ کرو۔ اگر اولاد والے ہو تو فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا
کے باپ اور حسن و حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے نانا (صلی اللہ علیہ وسلم) کا
حال پوچھو، غرض، تم جو کوئی بھی ہو اور کسی حال میں بھی ہو تمہاری زندگی
کے لیے نمونہ، تمہاری سیرت کی درستی و اصلاح کے لیے سامان، تمہارے ظلمت خانہ
کے لیے ہدایت کا چراغ اور رہنمائی کا نور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی جامعیت کی بڑی کے خزانے میں ہر وقت اور ہمہ دم مل سکتا ہے۔ اس لیے
طبقہ انسان کے ہر طالب اور نور ایمان کے ہر متلاشی کے لیے صرف محمد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہدایت کا نمونہ اور نجات کا ذریعہ ہے۔

خرس ابی ڈبل و جامع ہستی جو اپنی زندگی میں ہر نوع اور ہر قسم،
ہر گروہ اور ہر صفت انسان کے لیے ہدایت کی مثالیں اور نظائریں رکھتی ہو، وہی
اس لائق ہے جو غیظ و غضب اور رحم و کرم، جود و سخا اور فقر و فائدہ،
شجاعت و بہادری اور رحم دلی و رقیق القلبی، خانہ دای، اور خدا دان، دنیا
اور دین دونوں کے لیے ہم کو اپنی زندگی کے نمونوں سے بہرہ مند کر دے۔
جو دنیا کی ہادشاہی کے ساتھ آسمان کی ہادشاہی کی بشارت دے۔ اور دونوں ہادشاہوں
کے قواعد و قوانین اور دستور العمل کو اپنی زندگی میں برت کر دکھا دے۔ عام
طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ دنیا میں صرف شفو و در گذر، معافی اور نرسی
انسانیت کی تکمیل کے سب سے بڑے ذریعے ہیں۔ بلکہ فقط بھی ذریعہ ہے۔ اس لیے
جس ہستی میں صرف ایک بھی پہلو ہو وہی انسانیت کی سب سے بڑی مصلح اور
محض ہے۔ لیکن ہمیں یہ بتاؤ کہ انسان کے اخلاق میں کیا فقط یہی قوتیں ودعت
ہیں یا اس کے مقابل کی قوتیں بھی ہیں۔ ایک انسان میں دیکھو تو ہر قسم کے
فطری جذبات مثلاً غصہ اور کرم، محبت اور عداوت، خواہش و قناعت، انقام
اور عفو وغیرہ موجود ہیں۔ اس لیے ایک کامل معلم وہی ہو سکتا ہے جو انسانیت
کے ان تمام قویٰ اور جذبات میں اعتدال پیدا کر کے ان کے متعین مصروف کو
متین کرے۔

نیا نات ہوئے، لیکن فتح مکہ سے ۱۴۷ھ جب حضرت عباس رض کے ساتھ وہ اپنا (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے آئے ہیں تو کو ان کا ہر جرم ان کے قتل کا اللہ ہے مگر رحمت عالم کا عفو عام ابوسفیان سے کہتا ہے کہ ذر کا مقام نہیں۔
لہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتقام کے جذبے سے بالا تر ہیں۔ ہر حضور
لہ رسول اللہ علیہ وسلم نہ صرف ان کو معاف فرمائے ہیں بلکہ یہ بھی فرماتے ہیں :

من دخل دار ابی سفیان کان آمنا۔ جو ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے گا اس کو بھی آمن ہے۔

مدد (ابوسفیان رض کی بیوی) جو احمد کے معرکے میں اپنی سویلیوں کے ساتھ ۳۳ کر قریش کے سپاہیوں کا دل بڑھاتی تھی، جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب چھا حضرت حمزہ رض کی لاش کے ساتھ بے ادبی کی تھی اور جس نے ان کے ہنے کو چاک کر کے کایجہ چبانا چاہا، وہ فتح مکہ کے دن نقاب پوش سامنے آئے۔ اور بہان بھی کستاخی سے باز نہیں آئی۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر بھی کچھ تعریض نہیں فرماتے بلکہ یہ بھی نہیں ہو جھٹے کہ تو نے یہ کیوں کیا۔ چنان چہ عفوِ عام کی اس سعیزانہ مثال کو دیکھ کر وہ ہکارِ الہتی ہے۔ ”اے محمد! اُج سے ہمیں تمہارے خیمے سے زیادہ کسی خیمے سے مجھے نظر نہ تھی لیکن اُج تمہارے خیمے سے زیادہ کسی کا خیمہ مجھے محبوب نہیں ہے۔“ اسی طرح ہمار بن الاسود وہ شخص تھا جو ایک حیثیت سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صاحبزادی حضرت زینب رض کا قاتل تھا اور کتنی شرارتوں کا مرتكب ہو چکا تھا۔ مکرے کی فتح کے موقع پر اس کا خون ہدر کیا جاتا ہے۔ اور وہ چاہتا ہے کہ بھاگ کر ایران چلا جائے لیکن ہر کچھ سوچ کر سیدھا در دولت پر حاضر ہوتا ہے۔ اور کہتا ہے ”با رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں بھاگ کر ایران چلا جانا چاہتا تھا لیکن مجھے حضور کا رحم و کرم اور عفو و حلم پاد آیا۔ میں حاضر ہوں۔ میرے جرائم کی جو اطلاعیں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ملی ہیں۔ وہ سب درست ہیں۔“ اتنا سننے ہی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رحمت کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اور دوست و دشمن کی تمیز انہیں جاتی ہے۔

غرض، تمام دنیا میں یہ فخر صرف اسلام کے ہیغمبر کو حاصل ہے کہ وہ تعلیم اور اصول کے ساتھ ساتھ اپنے عمل اور اپنی مثال کو ہش کرتا ہے۔ آخری صحیح کے موقع پر جب کہ شمع نبوت کے گرد ایک لاکھ ہروانوں کا هجوم تھا،

انسانوں کو خدا کا آخری ہیقامت سنایا جاتا ہے۔ عرب کے باطل رسوم اور نہ خشم ہونے والی لزانیوں کا سلسلہ توڑا جاتا ہے۔ مگر تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی ذائق نظریں اور عملی مثال بھی ہر قدم دردش کی جاگ ہے:

”آج عرب کے تمام انتقامی خون باطل کر دیئے گئے ہیں تھے تم سب ایک دوسرے کے قاتلوں کو معاف کر دو۔ اور سب سے ہمیں میں اپنے خاندان کا خون اپنے بھتیجے، ریبعہ بن حارث کے بیٹے کا خون معاف کرتا ہوں۔ جاہلیت کے تمام صودی این دین اور کاروبار آج باطل کرنے جانے ہیں۔ اور سب سے ہمیں میں اپنے چھوا عباس بن عبدالمطلب کا صودی ہوہار توڑتا ہوں۔“

بہ هر حال، آدم علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک اور شام ہے لے کر ہندوستان تک ہر ایک تاریخی انسان کی مصلحانہ زندگی کا جائزہ لے جائے۔ لیکن ایسی عمل ہدایتوں اور کامل مثالوں کا کوئی نمونہ نثار نہیں آ سکتا۔

مزید مطالعہ کے لئے

مولانا سید سلیمان نوری، خطبات مدراس - مطبع معارف، اعظم گڑہ۔

مولانا سلیمان منصور پوری، رحمة للعالمين (جلد اول)۔ شیخ غلام عل، لاہور۔

عبدالحق صاحب، حیات طہبہ۔ اسلامک پلیکیشنز لیٹل، لاہور۔

ڈاکٹر امداد حسین قادری، مقالات سہرت۔ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ۔

نعمیم صدیقی، محسن انسانیت۔ اسلامک پلیکیشنز لمبیٹ، لاہور۔

مولانا شبی نعماں، سیرت النبی، (جلد دوم از باب ”معمولات“ تا ”اخلاق بُری“)۔

دارالمنفین، اعظم گڑہ۔

Abdul Hamid Siddiqui, *Life of Muhammad*. Islamic Publications Ltd,
Lahore.

Faqir Waheeduddin, *The Benefactor*. Lion Press Karachi.

Khurshid Ahmad, *The Prophet of Islam*. Jamiatul Falah Publications,
Karachi.

فہیڈہ آخرت

چند فطری اور عقل سوالات *

انسان خوشی سے زیادہ غم اور راحت سے زیادہ تکالیف محسوس کرتا ہے۔ اور ہے کچھ فطری بات ہے کہ جو چیز انسان کے حسیات کو جتنی زیادہ نہیں لکائے ہے وہ اتنی ہی زیادہ اس کی قوت فکر کو حرکت میں لاقے ہے۔ جب کوئی چیز ہم کو حاصل ہوئے تو اس کی خوشی میں ہم یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرنے کے یہ کہاں ہے آئی؟ کیوں کرانی اور کب تک رہے گی؟ لیکن جب کوئی شے ہم سے کھو جاتی ہے تو اس کا صدمہ ہمارے تو من فکر پر ایک تازیانہ لکا دیتا ہے اور ہم یہ سوچنے لکھتے ہیں کہ یہ کیسے کھو گئی؟ کہاں گئی؟ اب کہاں ہوئی؟ اور کیا یہ ہمیں ہم حاصل ہوئی ہا نہیں؟ یہی وجہ ہے کہ زندگی اور اس کے آغاز کا سوال ہمارے لیے اتنی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا جتنی اہمیت موت اور اس کے انجام کے سوال کو حاصل ہے۔ اگرچہ دنیا کی اس تماشاگہ اور اس میں خود اپنے وجود کو دیکھو کر ہمارے دل میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ یہ ہنکامہ کیسا ہے؟ کیسے شروع ہو گیا؟ کس نے ہر ہا کر دیا؟ لیکن یہ سب فرصت باتیں ہیں۔ اور گھری فکر رکھنے والے خواص کو چھوڑ کر عام انسان ان سوالات میں کم الجھتے ہیں۔ یہ خلاف اس کے موت اور اس کی تلغیوں

* مفسون مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتب "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی"، "رسالہ دینیات" اور "زندگی بعد موت" ہے ماحرث ہے۔ (مرتب)

سے ہر شخص کو دوپار ہونا ہوتا ہے۔ ہر شخص کی زندگی میں بہت سے موقع ایسے آتے ہیں جب وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے عزیزوں، دوستوں، اور ایاروں کو مرتے دیکھتا ہے۔ بے کس اور کمزور بھی مرتے ہیں۔ طاقت اور ہیبت والے بھی مرتے ہیں۔ حضرت ناکِ موتیں بھی اپنے آپیں۔ اور آخر میں ہر شخص کو خود اسی راہ پر گزرنے کا یقین ہوتا ہے جس پر سب گذرنے ہیں۔ ان مناظر کو دیکھ کر شاید ہی کوئی انسان دنیا میں ایسا ہو جس کے دل میں موت کے سوال نے ایک الجهن نہ پڑا کی ہو۔ اور جس نے اس امر پر غور نہ کیا ہو کہ موت کیا ہے؟ انسان اس دروازے سے گذر کر آخر کہاں چلا جاتا ہے؟ اور اس دروازے کے پیچھے کیا ہے؟ بلکہ کچھ ہے۔ بھی یا نہیں؟

بہ تو ایک عام سوال ہے جس پر عوام اور خواص سب نے لمحوں کیا ہے۔ ایک معمولی کسان سے لے کر ایک بڑے فلسفی اور حکیم تک سب ہی اس میں الجھے ہونے ہیں۔ لیکن اسی ضمن میں بعض اور سوالات بھی ہیں جو قریب قریب ہر صاحب فکر اُدیس کے دل میں کھٹکتے ہیں۔ اور زندگی کے بہت سے تلغخ واقعات اس کھٹک کو اور زیادہ بڑھا دیتے ہیں۔

بہ چند برس کی زندگی جو ہم میں سے ہر شخص کو اس دنیا میں ملتی ہے ہر لمحہ اور ہر آن کسی نہ کسی کام، کسی نہ کسی سعی اور کسی نہ کسی حرکت میں پسر ہوتے ہیں۔ جس کو ہم سکون سمجھتے ہیں وہ بھی ایک حرکت ہے۔ جس کو ہم ہم کاری خیال کرتے ہیں وہ بھی ایک کام ہے۔ ان سب میں ہر فعل کا رد فعل، ہر حرکت کی بازگشت، ہر کوشش کا ثمرہ اور ہر سعی کا انجام ضرور ہونا چاہیے۔ نبیکی کا ہم اچھا اور بدی کا ہم اسلا نلا لازم ہے۔ اچھی کوشش کا نتیجہ اچھا اور بُری کوشش کا نتیجہ بُرا ہونا ضروری ہے۔ مگر کیا ہماری تمام کوششوں کے نتائج، تمام ساعی کے ثمرات، تمام العمال کے جواب ہماری اس زندگی میں ہم کو مل جانے ہیں؟ ایک بددکار نے تمام عمر شرارتیوں میں گذاری۔ بعض شرارتیوں کا ہم بلا شبہ اس کو دنیا میں مل گیا۔ کسی شرارت نے اسے بیماری میں مبتلا کر دیا۔ کسی شرارت نے اس کو تکلیفوں، مصیبتوں اور ہربشانیوں میں بہنما دیا۔ مگر بہت سی شراتیں ایسی بھی تو رہ گئیں جن کا ہورا ہورا بدله اس کو دنیا میں نہ ملا۔

مدارتیں ایسی ڈھنکی چھپی رہیں کہ ان کی وجہ سے اس کی بدناسی اور
روانہ نکل نہ ہوئی، اور اگر بالفرض بدناس سی تلافی ہوئی تو جس غریب ہر اس
کیا تھا اس کے نقصان کی کوئی سی تلافی ہوئی؟ اپھر کیا اس شریر کے بد
بلم اور مظلوموں کے صبر، سب کے سب بے نتیجہ ہی رہیں گے؟ کیا ان کا
کام کبھی ظاہر ہی نہ ہوگا؟ یہی حال نیکیوں کا بھی ہے۔ بہت سے نیک
البان عذر بھر نیکی کرنے رہے اور ان کا اورا ہورا ثمرہ انہیں دنیا میں نہ ملا۔
بھلا نیکیوں پر انہیں سزا نہیں ملیں۔ بعض نیکیوں کا حال کبھی دنیا ہر کھلا ہی
نہیں۔ اپھر کیا ان غریبوں کی سب نیکیاں اکارت گئیں؟ کیا اتنی سخت محنتوں
اور کوششوں کا صرف اتنا ہی ثمرہ ذائقہ ہے کہ انہیں فہر کا اطمینان نصیب ہو گیا؟
یہ سوال تو صرف اشخاص و افراد سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن اس کے بعد
ایک اور سوال انواع اور اجناس اور عناصر اور اس تمام عالم کے انجام سے بھی
تعلق رکھتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آدمی مرتے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے
پیدا ہو جاتے ہیں۔ درخت اور جانور سب فنا ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی جگہ
دوسرے درخت اور جانور پیدا ہو جاتے ہیں۔ مکر کیا مرتے اور بینے کا یہ اسلہ
پونی جاری رہے گا؟ کیا کہیں ہہنچ کر یہ ختم نہ ہوگا؟ یہ ہوا، یہ ہاں،
یہ زین، یہ روشنی، یہ حرارت اور یہ قدرتی طاقتیں جن کے ساتھ یہ کاخانہ عالم
ایک خاص لہنگ ہر چل رہا ہے، کیا یہ سب لا زوال ہیں؟ کیا ان کے لیے
کوئی عذر مقرر نہیں ہے؟ کیا ان کے نظام اور ان کی ترتیب میں کبھی کوئی
تغیر واقع نہ ہوگا؟

اسلامی نصور آخرت

اسلام نے ان تمام سوالات کو حل کیا ہے اور اس کے نزدیک ان کا جواب

بہ ہے کہ:

- (۱) انسان کی دنیوی زندگی دراصل اس کی آخری زندگی کا مقدمہ ہے۔
بہ زندگی عارضی ہے اور وہ ہائیڈار ہے۔ یہ ناقص ہے اور وہ کامل۔ تمام اعمال کے
اڑے ہوئے نتائج اس عارضی زندگی میں مترتب نہیں ہوتے۔ اور نہ ہر وہ بیچ
جو بہاں ہو با جاتا ہے اپنے فطری نہرات کے ساتھ اس ناقص زندگی میں ہارا اور
ہوتا ہے۔ اس نقص کی تکمیل اس دوسری زندگی میں ہوگی۔ اور جو کچھ بہاں
بے نتیجہ اور بے ثمرہ رہ گیا ہے وہ اپنے حقیقی نتائج اور نہرات کے ساتھ وہاں
ظاہر ہوگا۔

(۲) جس طرح دنیا کی ہر چیز فرداً فرداً اہنی ایک عمر رکھتی ہے جس کے ختم ہو جانے کے بعد اس میں فساد رونما ہو جاتا ہے، اسی طرح اس بورے نظام عالم کی بھی ایک عمر ہے جس کے تمام ہونے پر یہ سارا کارخانہ درہم بورہم ہو جائے گا اور کوئی دوسرा نظام اس کی جگہ لے کا جس کے قوانین طبیعی اس نظام کے قوانین طبیعی سے مختلف ہوں گے۔

(۳) اس نظام کے درہم بورہم ہونے پر ایک زبردست عدالت قائم ہوئی جس میں انسان کے اُس کے ہر عمل کا حساب لیا جائے گا۔ انسان کو اس روز بھر ایک نئی جسمانی زندگی ملنے گی۔ وہ اہنے خدا کے سامنے حاضر ہو گا۔ اس کے تمام اعمال جو اس نے اہنی بھلی زندگی میں انجام دیے تھے نہیک نہیک جانچے اور توڑے جائیں گے۔ حق اور انصاف کے ساتھ اس کے مقدمے کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اہم اعمال کی اچھی جزا ملنے گی اور برے اعمال کی بوری سزا دی جائے گی۔

لیکن اسلام کے یہیں کردہ اس حل کا تفصیل جائزہ لینے سے بھلے ان کوششوں کا تذکرہ منفید ہو گا جو انسان نے ان سوالات کے حل کرنے کے لئے خود کی ہیں۔

مادہ پرستوں کا نقطہ نظر اور اس کا علمی جائزہ

ایک جماعت کے نزدیک زندگی جو کچھ بھی ہے یہی دنیا کی زندگی ہے۔ نر موت کے معنی بالکل فنا اور معدوم ہو جانے کے ہیں۔ جس کے بعد حیات شعر، احساس، بھول اور نتائج کچھ بھی نہیں۔

إِنَّ هُوَ لَا يَقُولُنَّ ذَلِكُمْ هُنَّ إِلَامَتَنَا الْأُولَى وَمَا أَنْتُمْ بِهِ مُلِئُونَ

اور (انکار آخرت کرنے والے) پہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں صرف پہلی مرتبہ (ایک بار) مرتا ہے اور پھر ہمیں الہنا نہیں ہے۔ (الدخان - ۲۵)

وَقَالُوا مَا هُنَّ لِأَحْيَنَّا لَنَا الْمَوْتُ وَمَنْ كَانَ مَوْلَانَا إِلَّا الْمَهْزُونُ

اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو بس صرف اسی دنیا کی ہے کہ یہیں مرتے اور جیتے ہیں۔ اور ہمیں تو زمانہ مار دہتا ہے۔ (الجانیہ : ۲۲)

خطبہ آخرت

۲۸۵

ان لوگوں کے نزدیک یہ کارخانہ عالم جس طرح چل رہا ہے، یونہی چلتا رہے گا۔ اس نظام میں ایسی پانیداری ہے کہ یہ کبھی درہم بڑھنے والا نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ ایسا کہتے ہیں وہ یہ بات اس بنا پر نہیں کہتے کہ فی الواقع موت ہے بعد کچھ نہیں ہے اور فی الحقيقة یہ کارخانہ عالم لا زوال ہے، بلکہ دراصل انہوں نے مخفی انہی حواس پر اعتماد کیا ہے، اور یہ رائے اس لئے قائم کی ہے کہ موت کے بعد کوئی کیفیت ان کو محسوس نہیں ہوئی۔ اور نظام عالم کی بروہی کرنا اس کے انکار کے لئے کافی دلیل ہے؟ کیا ہمارا کسی شے کو محسوس لہ وجد اور ہمارا عدم احساس اشیا کا خدم ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں کہہ سکتا ہوں آئے ہے۔ اور جب وہ میرے حواس میں آتی ہے وہ دراصل اسی وقت وجود میں ہے۔ میں نے جس دریا کو بہتے دیکھا تھا وہ اسی وقت پیدا ہوا جب میں نے محسوس کیا اور اسے بہتے دیکھا اور جب وہ میری نظروں سے اوچھل ہو گیا تو معلوم تو کوئی صاحب عقل میرے اس قول کو صحیح مان لے گا اگر نہیں کیفیت چوں کہ ہم کو معلوم نہیں اس لئے موت کے بعد سرے سے کوئی کیفیت ہی نہیں ہے۔ پھر جس طرح موت اور فنا کے متعلق بعض حواس پر بہروسہ کر کے حکم لکانا غلط ہے، اسی طرح زندگی اور بقا کے متعلق بھی جو احکام بعض حواس کے بل پر لکائے جاتے ہیں ان کا کچھ اعتبار نہیں، کیوں کہ ہمارے ہاس وہ انکھیں نہیں جن سے ہم موت کی صرحد کے اس پار جہانک سکیں کہ وہاں کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ ہمارے ہاس وہ کان نہیں جن سے ہم آدھر کی کوئی آواز سن سکیں۔ ہم کوئی ایسا آله ہی نہیں رکھتے جس کے ذریعے سے تحقیق کے ساتھ معلوم کیا جاسکے کہ آدھر کچھ ہے ابھی یا کچھ نہیں ہے۔ پھر اگر کارخانہ عالم کے دائی اور لا زوال ہونے کا حکم مخفی اس بنا پر لکانا درست ہے کہ ہم نے اس امر کو درہم بڑھنے نہیں دیکھا تو میں بھی ابک مفہوم عمارت کو دیکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے گی، کیوں کہ میں نے اس کو نہ

۱۔ اور بعض حواس پر اعتماد کر کے ہم نہ نسبجہ نہیں نکال سکتے۔ سائنس اکیڈمی کا موثر گروہ اس رائے کا حامل ہے کہ یہ نظام آمت انتشار اور فنا کی طرف سرگرم عمل ہے ملاحظہ ہو سر جیمس جیمز کی کتاب، *The Mysterious Universe* (مہتب)

کرنے دیکھا ہے اور نہ اس میں کوئی بوسیدگی نظر آئی ہے جو اس کے کبھی گرتے کی
ہیشن گونی کرنا ہو۔ ڈیا میرا یہ استدلال ارباب عقل کی بارگاہ میں مقبول ہوا ہے

ایکن زندگی بعد ووت کا سوال شخص ایک عقلی اور فلسفیانہ سوال نہیں ہے۔
بلکہ ہماری عملی زندگی سے اس بات کا بہت گہرا تعلق ہے اور دراصل ہمارے اخلاق
روپے کا سارا انحصار ہی اس سوال پر ہے۔ کیون کہ اگر میرا یہ خیال ہو کہ
زندگی ہے جو کچھ ہے بس بھی ذہنی زندگی ہے اور اس کے بعد کوئی دوسری زندگی
نہیں ہے تو میرا اخلاق روپے ایک طرح نا ہوگا، اور اگر میں یہ خیال رکھتا ہوں
کہ اس کے بعد ایک دوسری زندگی بھی ہے جس میں مجھے اپنی زندگی کا حساب
دینا ہوگا، اور وہاں میرا اچھا یا برا انجام پڑے یہاں کے اعمال پر منحصر ہوگا،
تو یقیناً میرا اخلاقی طرز عمل بالکل ایک دوسری ہی طرح کا ہوگا۔ اسکی مثال ایسی
ہے کہ جیسے ایک شخص یہ سمجھتے ہوئے سفر کر رہا ہے کہ اسے اس لاهور
سے کراچی تک جانا ہے۔ اور کراچی پہنچ کر نہ صرف یہ کہ اس کا سفر ہمیشہ
کے لئے ختم ہو جائے گا بلکہ وہ وہاں پولیس اور عدالت اور اس طاقت کی دسترس
سے باہر ہوگا جو اس سے کسی قسم کی باز پرسن کر سکتی ہے۔ بر عکس اس کے
ایک دوسرے شخص یہ سمجھتا ہے کہ لاہور سے کراچی ہی تک تو اس کے سفری
صرف ایک منزل ہے۔ اس کے بعد اسے ایک ایسے ملک میں جانا ہوگا جہاں کا
بادشاہ وعی ہے جو پاکستان کا بادشاہ ہے اور اس بادشاہ کے دفتر میں میرے اس
کارناسی کی خفیہ مثل موجود ہے جو میں نے پاکستان میں انجام دیا ہے اور وہاں
میرے ریکارڈ کو جانچ کر فیصلہ کیا جائے گا کہ میں اپنے کام کے لحاظ سے کس
درجے کا مستحق ہوں۔

آپ بآسانی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان دونوں شخصوں کا طرز عمل کس قدر
ایک دوسرے سے مختلف ہوگا۔ ہملا شخص لاہور سے کراچی ہی تک کے سفر
کی تیاری کرے گا اور دوسرے کی تیاری بعد کی طویل مذاہوں کے لئے بھی ہوگی۔
ہملا شخص یہ سمجھے گا کہ نفع یا نقصان جو کچھ بھی ہے کراچی پہنچنے
تک ہے۔ آگے کچھ نہیں۔ اور دوسرے یہ خیال کرے گا کہ اصل نفع و نقصان
سفر کے پہلے مرحلے میں نہیں ہے بلکہ آخری مرحلے میں ہے۔ ہملا شخص اپنے
افعال کے صرف ان ہی نتائج پر نظر رکھے گا جو کراچی تک سفر میں نکل سکتے ہیں۔
ایکن دوسرے شخص کی نتھے ان نتائج پر عوگی جو اس دوسرے ملک میں پہنچ کر

حضرت نوح عليه السلام کی زندگی کفر کے خلاف تھیظ و تھبب کا ولولہ کرنی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیات بت شکنیوں کا منظر دکھان ہے۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کفار سے جنگ و جہاد، شاہانہ نظم و ندق اور اجتماعی دستور و قانون کی مثال پیش کرنے ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی صرف خاکساری، تواضع، عفو و درکذر اور قناعت کی تعلیم دینی ہے۔
حضرت سليمان علیہ السلام کی زندگی شاہانہ اولوالعزیزیوں کی جلوہ کاہ ہے۔ حضرت اپویں علیہ السلام کی حیات صبر و شکر کا نمونہ ہے۔ حضرت یونس علیہ السلام کی سیرت ندامت و انابت اور اعتراض کی مثال ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی پید و بند میں بھی دعوت حق اور جوش تبلیغ کا سبق ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی سیرت گریہ و بکا، حمد و سائنس اور دعا و زاری کا صحیفہ ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی زندگی امید، خدا ہر توکل اور اعتماد کی مثال ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ ملی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ کو دیکھو کہ اس میں نوح اور ابراہیم، موسیٰ علیہ السلام اور داؤد، اپویں اور یونس، یوسف اور یعقوب علیہم السلام کی زندگیاں اور سیرتیں سمٹ کر آگئی ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام قانون لے کر آئے، حضرت داؤد علیہ السلام دعا اور مناجات لے کر اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام زهد و اخلاق لے کر۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قانون ہھر، لائن، دعا و مناجات بھی، اور زهد و اخلاق بھی۔ ان سب کا مجموعہ الناظ و معنی میں قرآن اور عمل میں سیرت محمدی ہے۔

اب سیرت محمدی کی جامعیت کا ایک اور ہمہ دیکھئے۔ دنیا میں دو قسم کی تعلیم گاہیں ہیں۔ ایک وہ جہاں صرف لئے سکھایا جاتا ہے۔ جیسے کوئی میلہ بکل کالج ہے، کوئی انجینئرنگ کالج ہے، ایک ارث اسکول ہے، ایک تجارت کا مدرسہ ہے۔ ان میں سے ہر مدرسہ اور تعلیم کا صرف ایک ہی قسم کے طالب علمون کا انتظام کر سکتی ہے۔ میلہ بکل کالج سے صرف ڈاکٹر نکلیں گے۔ قانون کے مدرسے سے قانون دان تیار ہوں گے۔ تجارت کی تعلیم کا سے صرف تجارت کے واقف کار ہیدا ہوں گے۔ علم و فن کے مدرسے کی خاک سے صرف اہل علم اور اہل فن انہیں گے۔ لیکن کہیں کہیں بڑی بڑی یونیورسٹیاں ہوتی ہیں۔ یہ دوسری قسم کی تعلیم گاہیں میں جو اپنی وسعت کے بطابق ہر قسم کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرتی ہیں۔ ان کے احاطے میں ڈاکٹری کا کالج بھی ہوتا ہے اور صنعت و حرف کا مدرسہ ہوی۔ طلبہ

مختلف دیار سے آتے ہیں اور انہے اپنے ذوق، مناسب طبع اور استعداد کے مطابق ایک ایک کالج یا مدرسے کا انتخاب کرتا ہے ہیں۔ پھر وہاں فوجوں کے جنرل اور سپاہی، عدالتون کے قاضی، اور قانون دان اور ماہر سب ہی ہیدا ہوتے ہیں۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صرف ایک ہی تعلیم، ایک ہی ایشہ اور ایک ہی علم کے جانئے والوں سے انسانی سوسائٹی کی تکمیل نہیں ہو سکتی بلکہ ان سب کے مجموعے سے وہ کمال کو پہنچتی ہے اور پہنچ سکتی ہے۔ اگر صرف ایک ہی علم اور ایک ہی پیشے کے ماهرین سے تمام دنیا معمور ہو جائے تو اس تمدن و تہذیب کی مشین فوراً بند ہو جائے۔ اور انسانی کاروبار ہک فلم مسدود ہو جائے۔ یہاں تک کہ اگر دنیا صرف زندہ پیشہ خلوت نہیں تو ہر جانے تب بھی وہ اپنی تکمیل کے درجے لو نہیں پہنچ سکتی۔ اب اس معیار سے مختلف انبیاء نے کرام علیہم السلام کی سیرتوں پر آپ شور کریں اور تعالیٰ ہے انسان کی ان درسن کاہوں کا جائزہ لیں جن کے اساتذہ انبیا رہے ہیں تو پہلے تو کہیں دس دس، بیس بیس، کہیں سانہ ستر، کہیں سو دو سو، کہیں ہزار دو ہزار کہیں پندرہ ہیں ہزار طالب علم ملیں گے لیکن جب مدرسہ نبوت کی آخری تعلیم کا کو دیکھیں گے تو آپ کو ایک لاکھ سے زیادہ طالب عام ہے یہ وقت نظر آئیں گے۔ پھر ان دوسری نبوت کی تعلیم کاہوں کے طالبہ کو اگر جانتا چاہیں کہ وہ کہاں کے تھے؟ کون تھے؟ کیسے تیار ہوئے؟ اور ان کے اخلاق و عادات، روحانی حالات، اور دیگر سوانح زندگی کیا تھے؟ اور عملی تربیت کے عملی نتائج کیسے ثابت ہوئے؟ تو آپ کو ان سوالات کا کوئی جواب نہیں مل سکتا۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی درس گاہ میں آپ ہر چیز معلوم ہو سکتی ہے۔ ہر چیز تاریخ اسلام کے اوراق میں ثبت ہے۔ پھر یہی نہیں بلکہ اس درس گاہ کو آفاق اور عالم کیتھے، کہ ہر ملک، ہر قوم، ہر وطن، اور ہر خانوادے ملک و وطن، قوم و نسل اور زبان و لہجے کا سوال نہ تھا بلکہ وہ دنیا کے تمام خانوادوں، تمام قوموں، اور تمام زبانوں کے لئے عام تھی۔ پھر اس درس گاہ کی یونیورسٹی میں ذوق، مناسب طبع اور استعداد کے مطابق ہر ملک کے لوگوں کو، ہر قوم کے افراد کو الگ تعلیم ملتی ہے۔ ایک طرف غلطی روزگار، اسرا رفت

دُنیا کے جہاں بان اور ملکوں کے فرمان روا اس درس گاہ سے تعلیم ہاکر
ہیں۔ دوسری طرف ایسے لوگ اپنا ہوتے ہیں جن کے فاتحانہ کارناموں کی
ماں اچ بھی زمانے پر ایٹھی ہوئی ہے۔ تیسرا طرف وہ ایسیوں صحابہ ہیں
جس نے صوبوں اور شہروں کی کاسیاب حکومت کی۔ چوتھی طرف علماء اور فقہاء
کی میڈیم۔ ہانجوں صفت عام ارباب، روایت و تاریخ کی ہے جس میں سینکڑوں
ہیں جو احکام و وقائع کے ناقل اور راوی ہیں۔ چھٹی جماعت اہل صہنہ
کی ہے، جن کے پاس سُر رکھنے کے لئے مسجد نبوی کے چبوترے کے سوا کوئی
بھی نہ ہے۔ بدن پر کھڑوں کے سوا دُنیا میں ان کی کوئی ملکیت نہ ہے۔
وہن کو جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے، ان کو آج کر خود کھاتے، کچھ
اندازیں دیتے اور رات طاعت و عبادت میں بُسر کرتے۔ بیہاں وہ لوگ بھی
ہل آئے میں جن کے سانند آسمان کے نیچے ان سے زیادہ حق کو کوئی پیدا نہ ہوا۔
ای اور طرف بہادر کار ہر داڑوں اور عرب کے مدبرعن کی جماعت ہے تو ایک جماعت
ہی کے ان شہیدوں اور بے گناہ مقتولوں کی ہے جنہوں نے خدا کی راہ میں اپنی
پابند فربان کیں مگر حق کا ساتھ چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے۔

غور کا مقام ہے! یہ وہی وحشی عرب، وہی بت اورست عرب، وہی
ہدالٰق عرب ہیں۔ یہ کیا انقلاب ہو گیا تھا؟ ایک آئسی کی تعلیم جاہل
بیوں کو عاقل، روشن دل، روشن دماغ اور مفہن کبوں کر بنا گئی؟ ایک
نئے پیغمبر کا ولولہ تبلیغ کسی مسیّرس عربوں کو سہ سالار اور بہادر بنانکر
لار و قوت کا خزانہ کیسے عطا کر گیا؟ جو خدا کے نام سے اپنی آشنا نہ ہے،
و ایسے شب زندہ دار، عابد، متقی اور طاعت گزار کیوں کر ہو گئی؟ اس کا
بیلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
ذان انسان کمالات اور صفات حسنہ کا ایک کامل مجموعہ تھی اور یہ سب اپنی
کی جاسعیت کی نیرنگیاں اور جلوہ آرائیاں تھیں۔ کویا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کا بہود بیارک افتاب عالم تاب تھا، جس سے اونچے ہبھاڑ، رتبیلے میدان، بھتی نہریں،
ہر سیز کھلت، اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق تابش اور نور حاصل
کرنے تھے یا اپریاران تھا جو ہبھاڑ اور جنگل، میدان اور کھلت، ریاستان اور
لام ہر جگہ اپستا تھا۔ اور ہر نکٹا اپنی اپنی استعداد کے مطابق سیراب ہو رہا
تھا۔ اور قسم قسم کے درخت اور رنگ رنگ کے پہلوں اور اتنے جم رہے تھے۔
لہاک رہے تھے۔

نبی اکرم کا عمل نمونہ

بہ انپیانے کرام اور بانیان مذہب کی موجودہ سیرتوں کا وہ باب ہے جو تمام تر خالی اور سادہ ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا بہم باب سب سے بڑا اور ضخیم ہے۔ اور بھی ایک معیار اس فیصلے کے لئے کافی ہے کہ نبیوں کا سردار اور رسولوں کا خاتم کون ہو سکتا ہے۔ مفید نصیحتوں، میثہیں سینہوں ہاتوں اور اچھی اچھی تعلیموں کی دنیا میں کمی نہیں۔ کمی جس چیز کی ہے وہ کام اور عمل ہے۔ موجودہ مذاہب کے شارعوں اور بانیوں کی سیرتوں کے تمام منظر ہڑھ جائے۔ دلچسپ تھیوریاں ملیں گی۔ دل آوبیز حکایتیں ملیں گی، خطبیانہ بلند آہنگیاں ملیں گی۔ تقریر کا زور و شور اور فصاحت و ہلاخت کا جوش نظر آئے گا۔ موثر حکایتیں تھوڑی دیر کے لیے خوش کر دیں گی۔ مگر جو چیز نہیں ملے گی وہ عمل کام اور اپنے احکام و نصائح کو آپ برت کر کر کے دکھانا ہے۔

انسان کی عمل سیرت کا نام خلق (اخلاق) ہے۔ قرآن کے سوا اور کسی مذہب کے صحیفے نے اپنے شارع کی نسبت اس بات کی کھلی شہادت دی ہے کہ وہ اپنے عمل کے لعاظ سے بھی بہ درجہاں بلند انسان تھا؟ لیکن قرآن نے صاف کہا اور دوست و دشمن کے مجمع میں علی الاعلان کہا

وَإِنَّكَ لَأَجْرَأْتُمْ مُّتَّقِينَ وَلَئِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ

(اے محمد) یعنی شک تبری مزدوری نہ ختم ہوئے
والی ہے اور بیٹھ کو بڑے (درجہ کے) اخلاق
پر (فائز) ہے۔ (الفلم - ۲۰۳)

چنان چہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا سب سے روشن ہلو بہ ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمہ حیثیت ایک ہیغہ بر کے اپنے ہیرووف کو جو نصیحت فرمائی اس پر سب سے پہلے خود عمل کر کے دکھا دیا۔

۱۔ وہ بات بھی قابل غور ہے کہ قرآن نے حنوزہ صائم کی زندگی کو خود آپ کی نبوت اور قرآن کی صداقت کے لیے بہ طور دلبل پیش کیا ہے۔

فَقَدْ لَيَّنَتُ لِنَذْعُمُ أَهْنَ قَبْلَهُ أَفَلَا تَقْنُونَ

میں اس سے پہلے ایک عمر تم میں رہا ہوں،
کہا تم سمجھتے نہیں ہو۔ (سورہ یونس - ۱۶)
یعنی وہ کہ حضور صلعم تھا، ہمارے درمیان ایک زندگی گزار رہے ہیں، کیا اس زندگی اور پاک ذہنے کو دیکھ کر بھی تم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ یہ شخص کیا راست بازا رجا اور امین ہے۔ جو تمہارے مہماں میں خیانت نہیں کرنا وہ خدا کے بارے میں ہے؟ خیانت کیسے کر سکتا ہے؟ لیکن انسوس کہ تم عقل استعمال نہیں کرتے۔ عقل نو آپ کی صداقت کا بانگ دھل اعلان کر رہی ہے۔ (مرقب)

اپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لوگوں کو خدا کی یاد اور محبت کی تسبیحت کی تو روز میں کوف لمحہ ایسا نہ تھا جب خدا کی یاد سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دل اللہ خدا کے ذکر سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان غافل ہو۔ انہتے ہوتے ہر ہر ہنر، کھانے ابتنے، سوتے جا گئے، ۲۴۷تے اولادتے، ہر حالت میں اور ہر رات خدا کا ذکر اور اس کی حمد زبان مبارک اور جاری رہتی تھی۔ چنان چہ ہمہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہر وقت خدا کی یاد میں مصروف رہتے تھے۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لوگوں کو نماز کا حکم دیا مگر خود آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا حال کیا تھا؟ عام ایروؤں کو تو ہانج و قتوں کی نماز کا حکم مگر خود آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اُٹھے وقت نماز ہڑھتے تھے۔ طلوع آفتاب کے بعد ہر صبح کی نماز ادا کرتے۔ اور نماز ہی کیسی کہ راتِ رات بھر خدا کے پہلو میں کھڑے ہیں حتیٰ کہ کھڑے کھڑے ہانے مبارک میں ورم آجائتا۔ ہمہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا عرض کرتیں "اللہ نے تو آپ کو ہر طرح معاف کر دیا ہے بھر اس قدر کیوں تکلیف الہاتے ہیں۔" فرماتے "اے عائشہ، کیا بخدا کا شکر گذار بندہ نہ بنوں۔" یعنی نماز خشیتِ اللہ سے نہیں ہے بلکہ بتِ الہی اس کا منشا ہے۔ رکوع میں اتنی دیر جہکے رہتے کہ دیکھنے والے کہ شاید آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سجدہ کرنا بھول گئے۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے روزہ کا حکم دیا۔ عام مسلمانوں ہر سال میں نہ دن کے روزے فرض ہیں۔ مگر خود آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کیفیت کیا نہیں کون ہفتہ اور کوئی سینہ روزوں سے خالی نہیں جاتا تھا۔ حضرت عائشہ نے ۹ کوئی ہفتہ اور کوئی سینہ روزوں سے خالی نہیں جاتا تھا۔ رکھنے ہوئے رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں "جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) روزے رکھنے ہوئے تو اپنے کبھی افطار نہ کر دیں گے۔" آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نویعلوم ہوتا تھا کہ اب کبھی افطار نہ کر دیں گے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مسلمانوں کو دن بھر سے زیادہ روزہ رکھنے کی ممانعت فرمائی مگر خود آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ حال تھا کہ کبھی کبھی دو دو تین دن بغیر کھائے ہیں مصلی روزے رکھتے اور اس عمر سے میں ابک دانہ بھی منہ میں نہ جاتا تھا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لوگوں کو زکواہ و خیرات کا حکم دیا تو ہم لے خود اسراہ عمل کر کے دکھایا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شہادت شہر ہے "یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)" آپ قرابت والوں کا حق ہوا کرنے

ہیں، مقرضوں کا قرض ادا کرنے ہیں، غریبوں کی مدد کرنے ہیں، مممازوں کی خاطر تواضع کرنے ہیں۔ ” ہبیشہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا عمل یہ (ہا کہ جو کچھ آتا سب خدا کی راہ میں خرج کر دیتے۔ حالانکہ غزوات اور فتوحات کی وجہ سے مال و اسباب میں کمی نہ تھی، مگر وہ سب غیروں کے لئے تھا۔ اہنے ائمہ کبھی نہ تھا۔ تھا تو اس وہی فقر و فاقہ تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) تمام لوگوں سے زیادہ معنی تھے۔ اور سب سے زیادہ سخاوت آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) رضاخان المبارک میں فرماتے تھے۔ تمام عمر کسی کے سوال کے جواب میں ” نہیں ” کا لفظ نہیں فرمایا۔

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رات کو میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ایک راتنے سے گذر رہا تھا راہ میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ” ابوذر، اگر احد کا یہ پہاڑ میرے لئے مونا ہو جائے تو کبھی میں ہستد نہ کروں گا کہ تین راتیں گذر جائیں اور اس میں سے ایک دینار بھی میرے ہاس رو جائے، البتہ یہ کہ کسی قرض کے ادا کرنے کے لئے کچھ چھوڑ دوں۔ ” یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خوش نما الفاظ ہی نہ تھے بلکہ عمل تھا۔ ایک دفعہ عصر کی نماز کے بعد خلاف معمول فوراً اندر تشریف لے گئے اور باہر آگئے۔ لوگوں کو تعجب ہوا، فرمایا ” مجھے کو نیاز میں یاد آیا کہ سونے کا چھوٹا سائکڑا کھر میں پڑا رہ گیا ہے، خیال ہوا ایسا نہ ہو کہ رات ہو جائے اور محمد کے گھر میں پڑا رہ جائے۔ ” اس سے بڑھ کر یہ کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) مرض العوت میں ہیں۔ بیماری کی سخت تکلیف اور یہ چیزیں ہیں۔ لیکن اسی وقت یاد آیا کہ کچھ اشرفیاں گھر میں پڑی ہیں۔ حکم ہوتا ہے کہ ” انہیں خیرات کردو کیا۔ محمد اپنے رب سے اس طرح ملے گا کہ اس کے بیچھے اس کے گھر میں اشرفیاں پڑی ہوں۔ ”

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے زعد و قناعت کی تعلیم دی لیکن اس راہ میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اپنا طرز عمل کیا تھا؟ آپ سن چکے ہیں کہ عرب کے گوشے گوشے سے جزیہ، خراج، عشر اور زکوٰۃ و صدقات کے خزانے لدے چلے آئے تھے مگر امیر عرب کے گھر میں وہی فقر تھا اور وہی فاقہ تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت خائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہبا کرنی تھیں۔ کہ جحضور صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے مگر دو وقت بھی سیر پر کر کر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کھانا نصیب نہ ہوا۔ جب آپ (صلی اللہ

بِلَهِ وَسَامُ) نے وفات ہانی تو کھر میں اس دن کے کھانے کے لئے تھوڑے سے جتو
کے ہوا کچھ موجود نہ تھا اور چند سو روپے بدلے میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم)
کی زر، ایک ہبودی کے بہان رہن تھی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرمایا کرتے
کہ "مزید آدم کو ان چھزوں کے سوا اور کسی چیز کا حق نہیں۔ رہنے کو
ایک جہونہرا، تن ڈھانکے کو کھڑا، ایک ہترنے کو روکھی سو کھی روپی اور
اللہ" یہ بعض الفاظ کی خوش نما بندش نہ تھی بلکہ یہی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم)
کی ملیز زندگی کا عملی نقشہ تھا۔ رہنے کا مکان ایک حیرہ تھا جس میں کچھی دیوار
اور کچور کے ہتوں اور اونٹ کے بالوں کی چوت تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ
عنہا فرماتی ہیں، آپ کا کپڑا کبھی تہہ کر کے نہیں رکھا جاتا تھا پعنی جو بدن
پبارک ہر کپڑا ہوتا تھا اس کے سوا کوئی اور کپڑا ہی نہیں ہوتا تھا جو تہہ کیا
جانا۔ ایک دفعہ ایک سائل خدمت اقدس میں آیا اور عرض کیا کہ سخت بھوکا ہوں۔
آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ازواج مطہرات کے ہاس کھلا ہویا کہ کچھ کھانے کو
ہو تو ۱۰۰ دین۔ ہر جگہ سے بھی جواب آیا کہ "کھر میں ہانی کے سوا کچھ
نہیں ہے۔" سنہ ۹ ھجری میں جب اسلام کی حکومت پعنی سے شام تک بھیل ہوئی
تھی، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے توشہ خانے کی مالیت یہ تھی: جسم بمارک ہر
ایک تھیند، ایک کھری چار ہائی، سرہانے ایک تکیہ جس میں خرس کی چھال
بھری تھی، ایک طرف تھوڑے سے جو، کھونشی میں ہانی کا مشکیزہ، اور بس!

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لوگوں کو اپنارکی تعلیم دی تو ساتھ ہی ان
کے سامنے اپنا نمونہ پیش کیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے آپ (صلی اللہ
علیہ وسلم) کی محبت معلوم ہے، مگر جب انہوں نے اپنی عسرت اور تنگ دستی
کی وجہ سے ایک خادمہ کی خواہش ظاہر کی تو کاشانہ نبوت سے جواب ملا "اے
فاطمہ! اب تک صفتہ کے غریبوں کا انتظام نہیں ہوا ہے۔" ایک دفعہ آپ (صلی
اللہ علیہ وسلم) کے ہاس چادر نہ تھی۔ ایک صحاہیہ بنے لا کر پیش کی۔ اس وقت
ایک صاحب نے کہا، کپسی اچھی چادر ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فوراً
افار کر ان کی نذر کر دی۔ ایک صھابی کے کھر کوئی تربیب نہیں مگر کوئی
سماں نہ تھا۔ ان سے کہا، عائشہ کے ہاس جا کر آنے کی نوکری مانگ لاؤ۔
"گئے اور جا کر لیے آئے حالانکہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کھر میں اس آنے
کے سوارات کے کھانے تک کچھ نہ تھا۔

خدا ہر اعتماد، توکل اور بھروسے کی شان دیکھنا ہو تو محمد رسول اللہ مل
الله علیہ وسلم میں دیکھئے۔ حکم الہی تھا کہ "وَاصْبِرْ كَما صَبَرَ أَولُوا الْعِزْمَ مِنَ الرَّسُولِ"
یعنی، جس طرح اولو العزم پیغمبروں نے صبر و استقلال دکھایا تو یہی دکھا۔ لیکن
(صلی اللہ علیہ وسلم) نے وہی کر کے دکھا دیا۔ بھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک
ایسی جاہل اور ان ہڑہ قوم میں ہیدا ہونے تھے جو انہے معتقدات کے خلاف ایک
لقطہ یہی نہیں سن سکتی تھی اور اس کے لئے مرنے مارنے ہر تیار ہو جاتی تھی۔
مگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کی کبھی بروائے کی اور انہے فرض کو بھرا
کرتے رہے۔ فرشتہ نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کبھی کبھی تکلیفیں دیں مگر
صبر و استقلال کا سر رشتہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھ سے کبھی نہ چھوٹا
ہجرت کے وقت خارثور میں ہناہ لیتے ہیں۔ کفار آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ابھی
کرنے ہوئے خار کے منہ تک بہنچ جانے ہیں۔ یہ بار و مددگار، نبھتے محمد (صلی
الله علیہ وسلم) اور مسلح قربش کے درمیان چند گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے۔ ابو بکر
رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھبرا اٹھتے ہیں کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم دو
ہی ہیں!! لیکن ایک تسکین بھری ہوئی آواز آتی ہے۔ ابو بکر ہم دونہیں
"لَا تَعْزَزَ إِنَّ اللَّهَ مَعْنَى" گھبراو نہیں، ہمارا خدا ہمارے ساتھ ہے۔ حضور صلی اللہ
علیہ وسلم کے مدینہ بہونچنے کے بعد چوں کہ بہود، منافقین اور قربش کی ریشہ
دوانیاں اور خارت کری حد سے ہڑہ چکی تھیں اس لئے لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کے مسکن کی رات کو حفاظات کرتے۔ لیکن جب آیت "وَاللَّهُ يَعْصِمُكُمْ مِنَ النَّاسِ"
(خدا تجھے کو لوگوں سے بچانے کا) نازل ہوئی تو اس وقت خیمہ سے سر باہر نکال
کر بھرے کے سپاہیوں سے فرمایا "لوگو، واہس جاؤ مجھے چھوڑ دو کہ سبی
حافظت کی ذمہ داری خود خدا نے لے لی ہے۔" غزوہ نجد سے واہسی میں آپ
(صلی اللہ علیہ وسلم) ایک درخت کے نیچے آرام فرمائے ہیں۔ آپ (صلی اللہ
اعلیہ وسلم) بیدار ہوتے ہیں۔ موقع کی زیارت قابل غور ہے، بدو پوچھتا ہے "بتاؤ
اے محمد، اب کون تم کو سیرے ہاتھ سے بچا سکتا ہے؟" اطمینان اور تسکین سے
بھری ہوئی آواز آتی ہے کہ "اللہ!" اس پر اثر جواب سے دشمن متاثر ہو جاتا ہے۔
اور تلوار نیام میں بہنچ جاتی ہے۔ عفو و درگذر سے کام لینا اور دشمنوں سے بدار
کرنا گویا صرف حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ہی حمدہ تھا۔ چنان چہ ابوسفیان،
جو برابر سات سال تک آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف فوجیں لائے رہے، بارہا
آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قتل کا فیصلہ کیا، ہر قدم ہر اسلام کے سخت ترین

لایا ہے ان کی اس رائے کا جو وہ اپنے سفر کی نوبت کے متعلق دیکھنے چاہیے ہے۔ اسی طرح ہماری اخلاقی زندگی بیس بھی وہ عبیدہ ایصلہ کن اور رکھتا ہے ہم زندگی اور موت کے بارے میں رکھتے ہیں۔ عمل کے میدان میں جو قدم ہیں الائبیں تھے اس کی سمت کا تعین اس بات پر منحصر ہوا کہ آہا ہم اس زندگی کو اور آخری زندگی سمجھو کر کام کرو رہے ہیں باکس بعد کی زندگی اور اس کے پیغمبیری صورت میں اس کی سمت بالکل مختلف ہو گی۔

ہنا ہے اگر انسان کے اخلاق اور سیرت کی تعریف اس اعتقاد پر قائم ہو کے

زندگی تو دنیا ہی کی زندگی ہے، وہ ہمیشہ رہ کی۔ تو یقیناً اپسے شخص کی زندگی دو حال ہے خالی نہ ہو گی۔ ناموافق حالات میں اس سے ایک شدید قسم کی باری اور بست ہستی انسان اور طاری ہو گی۔ کیوں کہ جب وہ اپنی نکوکاری کا کرنے لگجے دنیا میں ظاہر ہوتے نہ دیکھئے کا تو اس کی قوت عمل سود ہڑجائے گی، لیکن گا اول جب وہ فربود، بدکاروں اور ظالموں کو دنیا میں نہ ہائے کا تو اس کا دل ایکنے گا تو خیال کرے گا کہ عالم ہستی میں شتر ہی کا بول ہالا ہے اور خیر میں سرگون ہونے ہی کے لئے ہے۔

بخلاف اس کے اگر حالات موافق ہوں تو اس اعتقاد کے اندر ہے انسان ایک نفس ارست حیوان بن جائے گا۔ وہ خیال کرے گا کہ جو دن عیش اور لطف میں ہر ہو جائیں ہیں وہی ختمت ہیں۔ اگر دنیا کی کسی لذت اور کسی لطف سے ہرگز رکھنے تو ہر کوئی زندگی لہیں جس میں اس کی کسر اوری ہو۔ وہ ظلم و ستم کرے گا، لوگوں کے حقوق حصب کرے گا، اپنے لائندے اور اپنے نفس کی خواهشات کے لیے کوئی بدتر کام کرنے میں بھی اس کو باک نہ ہو گا۔ زیادہ ہے زیادہ نہیں اور ثروالت جو اپسے شخص کے تصور میں اسکنی ہے وہ اس ہی ہے جس کے انتہا ہے ایک ناسی، شہوت، عزت یا اسی قسم کے اور دنیوی لائندے حاصل

1۔ اسی وجہ پر کہ جن مصالک میں مادہ ہر ستر کا طلب ہے وہاں خود کشی کی رفتار نہیں لہیز ہے اور وہ اقوام جن کا پختہ پہنچن زندگی بعد وہ اوت ہر ہے ان دونوں خود کشی کے واقعات نہ ہو لیے کے براہر ہیں۔ پروفیسر طلب ہٹن اس امر کا ذکر ہے کہ طور خاص کرنا ہے کہ مسلمانوں میں خود کشی کا رواج سب سے کم ہے اور فرون اولیا میں غور اس کا شان ہیں نہیں ملتا۔ یہ در اصل نتیجہ ہے تصور آخرت ہر زندہ ایمان کا۔ (مرتب)

ہو سکتے ہیں۔ اس طرح ہو صرف ایسے جرائم کو جرائم اور ایسے ہی گناہوں کو گناہ سمجھئے کا جس کا نتیجہ کسی دنیوی سزا یا جسمانی عقوبت یا مادی نقصان کی شکل میں ظاہر ہونے کا اندیشه ہو۔ رہیں وہ نیکیاں جن کا کوئی نفع اس دنیا میں ظاہر ہونے والا نہ ہو، تو وہ اس کے نزدیک حماقت ہے کم لہ ہوں گی۔ اور وہ برائیاں جن کا کوئی نقصان اس دنیا میں عائد ہونے والا نہ ہو تو وہ اس کے نزدیک عین صواب ہوں گی۔

اگر کہیں پورے معاشرے کا نظامِ اخلاق اسی اعتقاد اور اسی ذہنیت پر قائم ہو تو سرے سے اس کے اخلاقی تصورات ہی بدل جائیں گے، اس کا ہوا نظامِ اخلاق خود غرضی اور نفسیات کی بنیاد پر تعمیر ہو گا۔ نیکی محسن دنیوی فائدے کے ہم معنی ہو گی۔ اور بدی محسن دنیوی نقصان کی متارف ہو کر وہ جائے گی۔ غرض، دنیوی زندگی سے آگے کسی اچھے یا ہرے نتیجے کے مرتقب ہونے کا خوف یا امید نہ ہو تو انسان افعال کے صرف ان ہی نتائج پر نظر رکھئے گا جو اس دنیا میں ظاہر ہونے والے ہیں۔ اور اس سے اعمال کی اخلاق قدرؤں میں ایسا تغیر و ایج ہو جائے گا جو ہرگز کسی سہذب انسانی سوسائٹی کے لیے سازگار نہیں ہو سکتا۔

اپ کہہ سکتے ہیں کہ سزا و جزا کے لیے دنیا میں صرف مادی و جسمانی نقصانات اور فوائد ہی نہیں بلکہ خود انسان کے اندر بھی ایک قوت موجود ہے جس کا نام 'ضمیر' ہے۔ اس کی ملامتیں اور اس کی بے اطمینانی اس دنیا میں بدی کے لیے کافی سزا ہیں، اور اس کا اطمینان انسان کے لیے نیکی کا کافی معاوضہ ہے۔ مگر اول توبہت سے گناہ ایسے ہیں جن کے مادی فوائد انسان کو ضمیر کی سرزنش برداشت کرنے کے لئے آمادہ کر دیتے ہیں اور بہت سی نیکیوں کے لیے انسان کو اتنی قربانی کرنا ہڑتی ہے کہ محسن ضمیر کا اطمینان ان کا پورا معاوضہ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے، اگر اپ ضمیر کی حقیقت ہر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ اس کا کام اخلاقی تصورات پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ جو اخلاقی تصورات ایک خاص قسم کی تعلیم و تربیت سے انسان کے ذہن میں راسخ ہو جائے ہیں ان ہی کی تائید اس کا ضمیر کرنے لکھتا ہے۔ بھی وجہ ہے کہ ایک غیر مسلم کا ضمیر جن باتوں پر سرزنش کرتا ہے ایک مسلمان کا ضمیر ان پر سرزنش نہیں کرتا۔ اگر کسی سوسائٹی کے اخلاقی تصورات پہل جائیں اور خوب و شر کے معیار متغیر ہو جائیں تو ان کے ساتھ ساتھ ضمیر کا رخ بھی ہو رجائے گا۔

لسلیہ ناسخ اور اس پر نقد و بصرہ

بہض لوگوں کے خواہ میں موت کے عین فدائے عہد کے نہیں ہیں۔ بلکہ
ہم تبدیل جسم کے ہیں۔ روح اس جسم سے مفارقت کرنے کے بعد کوئی دوسرا
جسم اختیار کرنے ہے، اور وہ دوسرا جسم یا زیادہ صبحونہ الفاظ میں دوسرا قالب اس
قابلیت کی مناسبت ہے ہوتا ہے جو انسان نے اپنی اہل زندگی میں اپنے اعمال اور
انہے رجھانات سے اکام ہونچا ہے۔ اگر اس کے اعمال ہرستے رہے ہیں اور ان کے
اثر سے اس کے نفس میں بڑی قابلیتیں بیدا ہو گئی ہیں تو اس کی روح ادنیٰ درجہ
عی حیوان یا نباتی طبقات میں چل جائے گی۔ اور اگر اچھے اعمال سے اچھی قابلیتیں
اس نے اکام ہونچا ہیں تو روح اعلیٰ طبقوں کی طرف ترقی کرے گی۔ شرط،
عالم میں ہے۔ ارواح بار بار اس دنیا میں قالب بدلتے بدل کر آتی ہیں تاکہ انہے
بھلے اعمال کے نتایج نہ گتیں۔ گورا اس عقیدے کی رو سے ایک شخص جو
اس وقت انسان ہے وہ اس لیے انسان ہو گیا کہ جب وہ جانور تھا تو اس نے اچھے
عمل کیتے تھے۔ اور ایک جانور جو اس وقت جانور ہے وہ اس لیے جانور ہو گیا
کہ انسان کی جون میں اس نے اورے عمل کیتے تھے۔ دوسرے الفاظ میں انسان و حیوان
اور درخت ہونا سب دراصل اہمیت جنم کے اعمال کا نتیجہ ہے! اس طرح اس نظریہ
کو ماننے کے لیے ایسی باتوں کو ماننا ضروری ہے جو صریح علم و عقل کے
خلاف ہیں۔ چنان چہ

۱۔ ناسخ کا یہ چکر ایسا ہے جس کا دونی آشاز قوار نہیں دیا
جاسکتا۔ انسان ہونے کے لئے لازم ہے کہ اس سے ہمیں نبات
اور حیوان ہو، اور نبات اور حیوان ہونے کے لیے لازم ہے کہ
ان سے ہمیں انسان ہو۔ این جہہ یہ واعظی است ۹

۲۔ اگر ناسخ کا چکر ازیں اور ابتدی ہے تو ماننا ہرے کا کہ نہ
صرف وہ ارواح، جو بار بار قالب بدلتی ہیں، بلکہ وہ مادے
بھی، جو ان ارواح کو قالب میں کرتے ہیں، ازیں اور
ابتدی ہیں۔

۳۔ ماننا ہرے کا کہ نباتات، حیوانات اور نوع بشری کی جتنی
امتیازی خصوصیات ہیں وہ سب دراصل ان کے اجسام کے خامیں
ہیں نہ کہ نفوس کے۔ اس لیے جو نفس انسان کے قالب میں

قتل و نکری قوتیں رکھنا تھا وہ حیوان کے قالب میں لا بعقل
ہو گوا - اور نباق قالب میں اس غریب سے حرکت ارادی کی
قوت بھی سلب ہو گئی -

۴۔ نیک اور بد کا اطلاق ان اعمال پر ہوتا ہے جو سوچ سمجھ کر
بالارادہ کیجیے جائیں - اس لحاظ سے انسان کے اعمال تو نیک
اور بد ہو سکتے ہیں، اور ان بد جزا اور سزا بھی ہو سکتی ہیں،
لیکن نباتات اور حیوانات کے اعمال پر نہ تو نیک اور بد کا
اطلاق جائز ہے - اور نہ ان کے لیے جزا و سزا کی کوفہ وجہ
جواز ہے -

۵۔ اگر بعد کی زندگی ہمارے موجودہ جنم کے کروں کا بہل ہے تو
ظاہر ہے کہ برسے کرمون کا بہل برا ہی ہونا چاہیے - اور جب
دوسرے جنم میں وہ برا بہل ہم کو ملا تو یہ کروں کر سکن
ہے کہ اس برسے بہل سے نیک اعمال صادر ہوں - لا عالله اس سے
برے ہی اعمال صادر ہوں گے اور پھر ان کا بہل نہ سے جنم
میں اور بھی زیادہ برا ہو گا -

محض، عقل سليم اس نظریے کو قبول نہیں کرسکتی - اور یہی وجہ ہے کہ
انسان عقل اور علم میں جتنی ترق کرتا گیا، تنسخ کا اختناد بالطل ہوتا چلا گیا۔

ظاہر ہے کہ اس روایت کا انر انسانی زندگی اور تعلق ہد اس کے سوا اور کیا
ہو سکتا ہے کہ ہتوں کو پست کرنے والا اور ترق کی روح کو صرف کرنے والا ہو
جب کہ اس میں سے ہے کوئی مخطوطت ہی نہیں ہائی جاتی - اسی اختناد سے
'احسا' کا خیہہ نکلا ہے جو انسان کی شخصی اور قومی زندگی کے لیے حد درجہ
سبک ہے - جو قوم اس خیہے کی قائل ہو اس کا جنبہ شجاعت فنا ہو جاتا ہے۔
اس کی جسمانی قوتیں مضحل ہو جاتی ہیں - اور وہ قوانین جسمانی کو نشوونا
دینے والی بہترین خذاوں سے محروم ہو جاتی ہے - یہ خیہہ تعلق و تہذیب کا ہیں
دشمن ہے اور انسان کو رہانیت اور ترک دنیا کی طرف لے جاتا ہے - اس کا لازم
نتیجہ یہ نکلا کہ جو لوگ نجات کے طلب ہوں وہ سیلیس بن کر جنگلیہ ملبوہ
پہاڑوں میں جا بیٹھیں اور جو ایسا نہ کریں وہ نجات سے مابوس ہو کر جانوروں
اور درختوں کے طبقات میں جائے کے لیے مستعد ہو جائیں - کیا یہ تخیل تعلق
تہذیب کی ترق میں کسی طرح مددگار ہو سکتا ہے؟ اور کیا کوئی قوم ہے اختناد
رکھ کر دنیا میں قتلہ کرسکتی ہے؟

اسلامی عقیدہ، آخرت اور اس کے سوالات

سوالات کے ان دو غیر مطہن جوابات کے بعد تیسرا حل زیر بحث ہے جو
کرتا ہے۔ اور جیسے جیسے اسلام کے جوابات کو غائز نظر سے دیکھیں گے
ایسا ہمانہ و صداقت مبرہن ہوتی چلی جائے گی۔

اسلام کے نزدیک، جیسا کہ ابتداء اشارہ کیا گیا، ان بنیادی فطری سوالات
کا جواب یہ ہے کہ

(ا) ایک دن اللہ تعالیٰ تمام عالم اور اس کی مخلوقات کو مٹا دے گا۔
بے دنیا کی زندگی عارضی اور فانی ہے۔

(ب) ہر وہ سب کو ایک دوسری زندگی بخشے گا، اور سب اللہ کے
سامنے حاضر ہوں گے۔

(ج) تمام لوگوں نے اپنی دنیوی زندگی میں جو کوہ کیا ہے اس کا
ہوا رنا مہم اعمال خدا کی عدالت میں اپنی ہوگا۔

(د) اللہ تعالیٰ ہر شخص کے اچھے اور بے اعمال وزن فرمائے گا،
جس کی بھلائی خدا کی میزان میں برائی سے زیادہ وزن ہوگی اس کو
بخفی دے گا اور جس کی برائی کا پله بھاریہ رہے گا اسے سزا
دے گا۔

یہ ہے فطری سوالات کا وہ جواب جسے اسلام 'عقیدہ آخرت' کے نام سے
برہوم کرتا ہے۔ یہ وہ مذہب ہے جسے انبیا علیہم السلام نے پیش کیا ہے۔
قرآن مجید اسی مذہب کا ہڑوزد و کبل ہے۔ بلکہ قرآن مجید کا شابد ہی کوئی
بلعہ اپنا ہو جو اس کے تذکرے سے خال ہو۔ مگر قبل اس کے کہ ہم اس
غبہ کے اخلاق نتائج اور تمذیب اسلامی میں اس کے رتبے اور اہمیت ہر کلام
کریں، ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اس نظریے کے حق میں کیا دلائل ہیں؟ اور عقل
کہاں تک اس کو قبول کرنی ہے؟

ظلل کا لیصلہ

۴ سوال کہ موت کے بعد کوئی زندگی ہے یا نہیں ان امور سے تعلق رکھتا
ہے جو ہمارے حواس اور حیسیٰ تجربہ کے حدود سے باہر ہیں۔ ہم جو کچھ
سموس کرتے ہیں وہ صرف اس قدر ہے کہ ایک شخص، جو چند لمحہ قبل تک

سائنس لینا اور اپنے ارادے سے حرکت کرتا تھا، وہ اب زندگی کے تمام آثار سے محروم ہو گیا اور اس کے جسم سے کوئی ابی شئی خائب ہو گئی جس نے اس جامد، غیر نامی، غیر متعارک مادے کو نمودار حرکت کی قوت مہیا کر رکھی تھی۔ اب رہا ہے سوال کہ وہ شئی کہاں چل گئی؟ جسم سے الگ ہو کر بھی موجود ہے با معدوم ہو گئی؟ اور یہ کبھی اس جسم با ابیسے ہی کسی اور جسم سے اس کا تعلق دوبارہ قابیم ہو گا با نہیں؟ تو جہاں تک ہمارے حواس اور تجربی علم کا تعلق ہے ہم اس سوال کا نفیاً با اثباتاً کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ کیوں کہ اس چیز کوئی نفسہ نہ ہم نے ۱۸۶۴ء کبھی معوس کیا تھا اور نہ اب معوس کرنے ہیں۔ اس بنا پر جہاں تک سائنس کا تعلق ہے، یہ سوال اس کے دائرے سے لٹپی خارج ہے۔ جو شخص سائنس کا نام لے کر کہتا ہے کہ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے، وہ سائنس سے انحراف کرتا ہے۔ سائنس کی رو سے کوئی بد تو کہ سکتا ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے (کیوں کہ یہ سیرے میں نیتی اور تجربی علم سے باہر ہے) لیکن، اگر وہ کہے کہ "چوں کہ میں نہیں جانتا کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے اس لیے میں جانتا ہوں کہ مرنے کے بعد کچھ نہیں ہوتا" تو بقیناً معمولیت کے حدود سے تجاوز کر جانے کا۔ ایک گنوار نے اگر 'راکٹ' نہیں دیکھا تو وہ کہ سکتا ہے کہ "مجھے نہیں معلوم کہ 'راکٹ' کیا چیز ہے۔" لیکن جب وہ کہے کہ "میں جانتا ہوں کہ راکٹ کوئی چیز نہیں ہے" (کیوں کہ میں نے اسے نہیں دیکھا) تو عقل مند اس کو احمد کہیں گے۔ اس لیے کہ اس کا کسی چیز کو نہ دیکھنا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ چیز ہے ہی نہیں۔ ایک ادمی کیا، اگر ساری دنیا کے لوگوں نے بھی کسی چیز کو نہ دیکھا ہو تو بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ نہیں ہے با نہیں ہو سکتی۔ اس لیے جب تک ہم کوئی بقینی ذریعہ علم نہیں پانے کم از کم اس وقت تک تو صحیح سائنسیک رویہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم زندگی بعد موت کا نہ انکار کریں، نہ اقرار۔

مگر کیا عمل زندگی میں ہم اس سائنسیک رویے کو نباہ سکتے ہیں؟ بینا نہیں۔ عقل حیثیت سے تو یہ ممکن ہے کہ جب ایک چیز کو جانے کے ذریعے ہمارے پاس نہ ہوں تو اس کے متعلق ہم نقی اور اثبات دونوں سے برہیز کھڑا۔ لیکن جب ابی چیز کا تعلق ہماری عمل زندگی سے ہو تو ہمارے لیے اس کے ذریعے کوئی چارہ نہیں رہتا کہ پا تو انکار ہر اپنا طرز عمل قابیم کریں پا اقرار ہو۔ مثلاً

اپکی نیز میں ہے تو اپ کے لئے یہ ممکن ہے کہ اس کے ایمان دار ہونے والے ہوں گے اور اس کے ساتھ اپ کا کوئی معاملہ نہیں کر سکتے ہیں کہ بات تو اسے ایمان دار سمجھ کر معاملہ کرنا ہو تو اپ کو اس سے معاملہ کرنے والے ہوں گے ایمان دار ہونے والے ہوں گے ایمان داری کو مشکوک سمجھتے ہوئے جو معاملہ اپ کویں گے، عمدہ ایمانی صورت تو وہی ہوگی جو اس کی ایمان داری کا انکار کرنے کی صورت میں ممکنی نہیں۔ لہذا فی الواقع انکار اور افوار کے درمیان شک کی حالت صرف ذہن میں ہو سکتی ہے۔ عملی رویہ کبھی شک پر قائم نہیں ہو سکتا۔ لہذا ہم ہر حال اس امر کا تعین کرنے پر مجبور ہیں کہ آپا موت کے بعد کوئی اور زندگی یا نہیں۔ اگر انسان اس کے تعین میں ہماری مدد نہیں کر سکے تو ہمیں علی استدلال سے مدد لینی چاہیے۔

اس سلسلے میں ہمارے سامنے ایک تو خود انسان ہے۔ اور دوسرے یہ نظام کائنات۔ ہم انسان کو اس نظام کائنات کے اندر رکھ کر دیکھیں گے کہ یہ کچھ انسان میں ہے آپا اس کے سارے مقتضیات اس نظام میں ہوئے ہو جائے میں با کوئی چیز بچی رہتی ہے جس کے لیے کسی دوسری نوعیت کے نظام (دوسری زندگی، 'آخرت') کی ضرورت ہو۔

انسان ایک تو جسم رکھتا ہے، جو بہت سے معدنیات، نمکیات، ہانی اور گیسن کا مجموعہ ہے۔ اس کے جواب میں کائنات کے اندر بھی مٹی، پتھر، دھاتیں، نک، گیسیں، دریا اور اسی جنس کی دوسری چیزوں موجود ہیں۔ ان چیزوں کو کام کرنے کے لیے جن قوانین کی ضرورت ہے، وہ سب کائنات کے اندر کار فرما ہیں، اور جس طرح وہ باہر کی فضا میں ہہاڑوں، دریاؤں اور ہواوں کو اپنے حصے کا کام اور کرنے کا موقع دے رہے ہیں اسی طرح انسان جسم کو بھی ان قوانین کے تحت کام کرنے کا موقع حاصل ہے۔

اہم انسان ایک ایسا وجود ہے جو گرد و پیش کی چیزوں سے غذا لے کر بڑھا اور نشوونما حاصل کرتا ہے۔ اسی جنس کے درخت، ہودے، اور گھاس، اور انس کائنات میں بھی موجود ہیں۔ اور وہ قانون بھی بہان ہانے جاتے ہیں جو

لتو و لبا پائیں والی اجسام کے لئے درکار ہیں۔ بہرالسان ایک زندہ وجود ہے۔
جو اپنے ارادے سے حرثت کرتا ہے، اپنی مدد مخود اپنی کلشی سے فراہم کرتا ہے،
اپنے لئے اس کی اپنی طلاق کرتا ہے اور اپنی نوع کو بالی رکھنے کا انتظام کرتا ہے،
کائنات میں اس جنس کی بھی دوسری ابھت سی تسمیں وجود ہیں۔ خشکی، ہری،
اوڑ ہوا میں سے محابر حیوانات پائی جائے جاتے ہیں؛ اور نہ لوانین بھی یہ تمام و کمال
بہان کا فرمایا ہیں جو ان زندہ هستہوں کے اور یہ دائرہ عمل بر حادی ہوتے
کے لئے کافی ہیں۔

ان سب سے ابہرالسان ایک اور لومہت کا وجود ہیں رکھتا ہے، جس کو
ہم اخلاقی وجود کہتے ہیں۔ اس کے اندر نیک اور بدی کرنے کا سورج ہے۔
نیک اور بد کی تمیز ہے۔ نیک اور بدی کرنے کی قوت ہے۔ اور اس کی نظرت ہے
مطالبہ کرنے ہے کہ نیک کا اچھا اور بدی کا برا نتیجہ ظاہر ہو۔ اور وہ ظلم اور
الصالح، سچائی اور جہوث، حق اور ناحل، رحم اور نہ رحمی، احسان اور
احسان فراموشی، لیاضی اور بطل، امانت اور خیانت اور ایسی ہی مختلف اخلاقی
سمیات کے درمیان فرقہ کرتا ہے۔ وہ صفات میں اس کی زندگی میں ہان جانی میں
اور یہ بعض مہماں چیزوں نیکی میں۔ بلکہ بالفعل ان کے الرات انسان تعدد ہر
مرتب ہونے میں۔ لہذا انسان جس نظرت بر پیدا ہوا ہے اس کا شدت کے ساتھ
وہ تلقانی ہے کہ جس طرح اس کے اعمال کے طبیعی نتائج رونما ہونے ہیں اس طرح
اخلاقی نتائج اپنی رونما ہوں۔

مگر نظام کائنات اور گھری نگاہ ڈال کر دیکھئے۔ کیا اس نظام میں انسال
الصالح کے اخلاقی نتائج پوری طرح رونما ہو سکتے ہیں؟ میں آپ کو بقین دلاتا ہوں
کہ بہان اس کا امکان نہیں ہے۔ اس لیے کہ بہان کم از کم ہمارے علم کی
حد تک کوئی دوسری اوس مخلوق نہیں ہائی جاں جو اخلاق و وجود رکھتی ہو۔
سارا نظام کائنات طبیعی قوانین کے مانعت چل رہا ہے۔ اخلاق قوانین کسی طرف
کا فرمایا نظر نہیں آتے۔ بہان روئی میں وزن اور لیمت ہے، مگر سچائی میں
نہ وزن ہے نہ لیمت۔ بہان آم کی گلہولی ہے ہدیشہ آم پیدا ہوتا ہے مگر حق اور مشی
کا اوج ہونے والی اور کبھی بہلوں کی ہارش ہوئے اور کبھی بلکہ اکثر جو یہوں کی۔
بہان نادی مناصر کے انجیں مقرر قوانین ہیں جن کے مطابق ہدیشہ مقرر نتائج نکلتے
ہیں مگر اخلاقی مناصر کے لیے کوئی مقرر قانون نہیں ہے کہ ان کی فعلیت ہے ہمیشہ

بلد نہ ہے نکل سکتے۔ طبیعی قوانین کی فرمان روان کے مبہب سے اخلاق نتائج کبھی نکل میں نہیں سکتے، کبھی نکلتے ہیں تو صرف اس حد تک جس کی اجازت یا بھی قوانین دے دیں۔ اور بارہا ایسا ہی ہوتا ہے کہ اخلاق ایک فعل سے ایک نتیجہ نکلھے کا تقاضا کرتا ہے مگر طبیعی قوانین کی مداخلت سے نتیجہ بالکل یقیناً نکل آتا ہے۔ اس لیے اول تو موجودہ نظام کائنات جن قوانین پر چل رہا ہے ان کے اندر اتنی گنجائش ہی نہیں ہے کہ انسانی الحال کے اخلاق نتائج ہوئی طرح ہنہ ہو سکیں۔ دوسرے بھاں چند سال کی زندگی میں انسان جو عمل کرتا ہے اس کے رد عمل کا سلسلہ اتنا وسیع ہوتا ہے اور مدت تک جاری رہتا ہے کہ صرف اسے ہوئے نتائج وصول کرنے کے لیے ہزاروں بلکہ لاکھوں اوس کی زندگی درکار ہے۔ اور موجودہ قوانین قدرت کے مانعت ظاہر ہے کہ انسان کو اتنی زندگی ممکن نہیں ہے۔

اس سے سلوم ہوا کہ انسان ہستی کے خاک، عضوی، اور حیوانی عناصر کے لیے موجودہ طبیعی دنیا اور اس کے طبیعی قوانین کا ہیں۔ مگر اس کے اخلاقی نہدرے لیے یہ دنیا بالکل ناکافی ہے۔ اس کے لیے ایک دوسرا نظام عالم درکار ہے جس سے اخلاق کا قانون حکم ران ہو اور طبیعی قوانین اس کے مانعت محض مذکار کی ہیئت ہے کام کریں۔ جس میں زندگی محدود نہ ہو بلکہ غیر محدود ہو، جس میں وہ تمام اخلاقی نتائج جو بھاں مرتب ہونے ہے وہ کتنے میں با آلٹی مرتب ہونے میں اپنی صحیح صورت میں ہوئی طرح مرتب ہو سکیں۔ جہاں سونے اور چاندی کے بجائے نیک اور صفات میں وزن اور قیمت ہو، جہاں اُسکی صرف اس چیز کو جلانے جو اخلاقی جلنے کی مستحق ہو، جہاں عین اس کو ملے جو لیک ہو اور سعیت اس کے حصے میں آئے جو بد ہو۔ عقل چاہتی ہے، فطرت مطالبه کری ہے کہ ایک ایسا نظام عالم ضرور ہونا چاہیے۔

عقل استدلال ہے آگے

جہاں تک عقل استدلال کا تعلق ہے وہ ہم کو صرف "ہونا چاہیے" کی مدد تک لے جا کر چھوڑ دیتا ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ آپا واقعی کوفی ایسا عالم ہے یا نہ؟ تو ہماری عقل اور ہمارا علم دونوں اس کا حکم لکانے سے عاجز ہیں۔ بھاں قرآن ہماری مدد کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہاری عقل اور تمہاری فطرت میں چیز کا مطالبه کری ہے فی الواقع وہ ہونے والی ہے۔ موجودہ نظام عالم جو

طبعی قوانین اور بنا ہے ابک وقت میں توڑا ڈالا جائے گا۔ اس کے بعد ابک دوبرا نظام انسے گا جس میں زمین و آسمان اور ساری چیزوں ابک دوسرے ذہنگ بر ہوں گی اور اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو، جو ابتدائے آفرینش سے قیامت تک ہیدا ہونے تھے، دوبارہ ہیدا کر دے گا اور ہے بک وقت ان سب کو اپنے سامنے جمع کرے گا۔ وہاں ابک ابک شخص کا، ابک ابک قوم کا اور ہوری انسانیت کا ریکارڈ خلطی اور روگزشت کے انہیں محفوظ ہو گا، ہر شخص کے ابک ابک عمل کا جتنا رد عمل دیا میں ہوا ہے، اس کی ہوری رواداد موجود ہو گی، وہ تمام نسلیں گواہوں کے دلیا میں ہوا ہے، اس کی ہوری رواداد موجود ہو گی، ابک ابک ذرہ جس اور کثیرے میں حاضر ہوں گی جو اس رد عمل سے متاثر ہوئیں۔ ابک ابک ذرہ جس اور انسان کے اقوال اور العمال کے نقوش ثبت ہونے اپنی داستان سنائے گا۔ خود انسان کے ہاتھ اور ہاؤں اور زبان اور تمام اعضا شہادت دین گے۔ کہ ان سے اس نے کس طرح کام لیا۔ ہر اس رواداد پر وہ سب سے بڑا حاکم ہو رے انصال کے ساتھ نیصلہ کرے گا کہ کون کتنے انعام کا مستحق ہے، اور کون کتنی سزا کا مستوجب ہے۔ بہ انعام اور ہے سزا، دونوں چیزوں اتنے بڑے ایسا نہ ہوں گی جس کا کوئی اندازہ موجودہ نظام عالم کی محدود مقداروں کے لحاظ سے نہیں کہا جا سکتا۔ وہاں وقت اور جگہ کے معہار کہہ اور ہوں گے، وہاں مقداریں کہوں اور ہوں گی، وہاں کے قوانین قدرت کسی اور قسم کے ہوں گے، انسان کی جن نیکیوں کے اثرات دنیا میں ہزاروں برس چلتے رہے ہیں وہاں وہ ان کا بھرپور صلہ وصول کر سکے گا۔ بغیر اس کے کہ موت اور بیماری اور بڑھاہا اس کے عیش کا سلسلہ توڑ سکیں اور جس انسان کی برائیوں کے اثرات دنیا میں ہزارہا برس تک اور بے شمار انسانوں تک ہٹلتے رہے ہیں وہ ان کی ہوری سزا یہ ہکتے گا بغیر اس کے کہ موت اور بے هوشی اکرائے تکلف سے بھا سکے۔

ایسی ابک زندگی اور ابیسے ابک عالم کو جو لوگ نامیکن سمجھتے ہیں ان کے ذہن کی تنگی پر ترس آتا ہے۔ خصوصاً آج کل جب کہ سائنسی ایجادات اور انکشافات قدم پر اس نظریہ "آخرت کی تائید و توثیق کرنے چلے جا رہے ہیں۔" مثلاً خود سائنس دانوں کا نقطہ نظر ہے کہ ابک دن سورج نہندا اور ہے نور ہو جائے گا۔ سیارے ابک دوسرے سے نکرانیں گے۔ اور ہے دنیا لباه ہو جائے گ۔ یا جیسا کہ ہٹلتے سمجھا جاتا تھا کہ جو آواز ہمارے سنا سے نکلتی ہے وہ ہوا میں ہوری سی لہر ہیدا کر کے فنا ہو جاتی ہے۔ مگر اب معلوم ہوا کہ ہر آواز اپنے گرد و اپنی کی چیزوں پر اپنا نقش چھوڑ جاتی ہے جس کو دوبارہ ہیدا کیا

بامکننا ہے۔ چنان چہ گراموفون کا ریکارڈ اسی اصول پر ہتا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ ہماری ہر حرکت کا ریکارڈ ان تمام چیزوں پر منقوش ہو رہا ہے جن کے ساتھ اس حرکت کا کسی طور پر تصادم ہوتا ہے۔ لیکن، اگر ہمارے موجودہ نظام عالم کا موجودہ قوانین قدرت کے ساتھ موجود ہونا ممکن ہے تو آخر ایک دوسرے نظام عالم کا دوسرے قوانین کے ساتھ وجود میں آنا کیوں ناممکن ہو؟

قرآنی استدلال

اس موقع پر اگر مختصرًا قرآنی طرزِ استدلال پر کچھ رoshni ڈال دی جائے تو یہ جانہ ہو گا۔ اس سلسلے میں اصولی طور پر قرآن نے جو طرزِ استدلال اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ سب سے بہلے وہ قدرت اللہی کے آثار کا مشاهدہ کرنے اور ان پر فکر کرنے کی دعوت دینا ہے۔ مثلاً

أَوْلَادُكُلُّ أُنْوَافِ الْأَنْوَافِ إِذَا رَأَوْا مِنْهُمْ

کیا ان لوگوں نے آسانوں اور زمین
کے انتظام پر ہور نہیں کیا۔
(الاعراف۔ ۱۸۵)

گوہا اشارہ کیا گیا کہ اگر تم انکھیں کھوں کر ان آثار کو دیکھو، جو شب و روز تمہارے سامنے بیش ہو رہے ہیں اور زمین و آسمان کے انتظام کا مشاهدہ کرو اور ان سب محسوسات اور مشاهدات پر غور و فکر کر کے حقیقت تک بہنچنے کی کوشش کرو تو تم کو معلوم ہو جائے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ درست ہے۔ ہر وہ ان ہی آثار و مظاہر میں سے ان چیزوں کو پیش کرتا ہے جو سب سے زیادہ بدینہ ہیں۔ اور ان سے استدلال کرتا ہے کہ جس بات (آخری زندگی) کو تم بعد از عقل سمجھ رہے ہو، تمہاری عقل و قیاس سے دور ہو مگر حقیقت میں ناممکن نہیں ہے۔ چنان چہ فرمایا:

إِنَّمَا أَنْتَ مُشَدِّدٌ عَلَى الْأَنْوَافِ لِئَلَّا يَدْرِهُ

کیا تمہارا پیدا کرنا زیادہ دشوار ہے
یا آسان کا؟ خدا نے تو اپس
(بڑی چیز کو) بنایا ہے۔ (النازعات۔ ۲۰).

جس خدا نے اتنا بڑا نظام کائنات اپنا کیا ہے، جس نے اجرام سماوی کو اپنے قانون کی بندشیوں میں جائز رکھا ہے۔ جس کی قدرت ان عظیم الشان اجرام کو اس التظام کے ساتھ حرکت دے رہی ہے کہ کوئی جرم انہے مدار سے بال بوار تجاوز نہیں کر سکتا اور جس کی طاقت نے کائنات کے طبقوں کو اپنا غیر مرل اور غیر محسوس سہاروں پر قائم کیا ہے جن کے ادراک سے تم حاجز ہو اس خدا کے متعلق یہ گمان کرنا کہ وہ تم جیسی خیر مخلوق کو ایک دفعہ ملاک کر کے دوبارہ زندہ کرنے اور قادر نہیں ہے، کبیسی بڑی خام خیال ہے۔ انسان کے بعد وہ ہمارے قریب ترین ماحول یعنی زمین کے آثار کی طرف ہم کو متوجہ کرتا ہے:

وَوَسَّعَ اللَّهُ تَرْقَى الْأَرْضَ تَكْثِيرًا فَإِنَّمَا الْأَنْجَافَ الَّتِي أَنْجَفَ اللَّهُ تَرْقَى لِكُلِّ إِنْسَانٍ
مَلِكٌ لِّنَفْسِهِ لَكِبِيرٌ

اور اس کی نشانیوں میں ہے ایک ۴۵ کہ تو زمین کو دیکھتا ہے کہ سونی ہڑی ہے۔ پھر جہاں ہم نے ہانی ہر سایا اور وہ بیبک الہیں اور لہمہانے لگ۔ تو جس نے اس کو زندہ کیا وہی مددوں کو یہیں زندہ کرنے کرنے والا ہے۔ یعنی وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (سم السجدہ۔ ۳۹۔)

لِكُلِّ إِنْسَانٍ رَبِّ رِبْنَتِهِ لَكِبِيرٌ لَكِبِيرٌ لَكِبِيرٌ لَكِبِيرٌ

اگر تم کو علم نہیں کے بعد جس الہمنے میں شک ہے
تو (تمہیں) معلوم ہو کہ ہم نے میرے (جیسی یہ) جان
نے ہے تم کو پیدا کیا ہے۔ (المع۔ ۵)

اسی طرح ان صاف اور واضح اور ہمارے مشاهدہ و احساس سے قریب تر شواہد پیش کرنے کے بعد فرآن مجید ایک ایسی کھلی دوڑ دلیل پیش کرتا ہے جو بالکل معمول سمجھو سے متعلق رکھنی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اشیا کو علم سے وجود میں لانا زیادہ مشکل ہے بہ نسبت اس کے کہ ان کو منتشر اور ہر اگنڈہ ہو جانے کے بعد دوبارہ بھل صورت پر پیدا کیا جائے۔ اس جو طاقت اس دشوار تر کام کو انجام دینے سے عاجز نہ ہوئی، وہ انسان تر کام کو انجام دینے سے کیوں کر عاجز ہو سکتی ہے؟ اگر ایک شخص موٹر ایجاد کرنے پر قادر ہے اور اس کو بنا چکا ہے تو کیا یہ بات عقل میں اسکتی ہے کہ وہ موٹر کے پیروں کو الگ الگ کرنے کے بعد دوبارہ جوڑنے پر قادر نہیں ہے؟ اسے، مثال پر قیاس کرلو کہ ہائی فیصلہ

کو عدم کے وجود میں لا یا ہے، تمہیں صرف کے بعد دوبارہ بہدا کرنے کے بعد نہ ماجز نہیں ہو سکتا۔

لَمْ يَأْتِ الْحَيَّ بِهِ الْمُؤْمِنُ لَكُلُّ هُدًىٰ وَلَمْ يَأْفُوْنَ فَلَمْ يُرْجُوا

اور وہی تو ہے جو آخریں کی ابدا کرنا ہے بھر
وہی اس کا امادہ کرے گا اور ۹۰٪ امادہ اس کے
لئے محل نر ۰.۵ (البروم۔ ۲۴)

زندگی پر الرات

بہ تک جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ بات توثیق موگی ہوگی کہ
لوگوں کی زندگی کے بعد ایک آخری زندگی کا وجود ہے، آنا ممکن اور اغلب اور
لہذا حکمت کے مطابق ہے۔ اور حل مسلم اور علم ہم کو آخری زندگی کے
لئے تصور ہے، جو قرآن نے بھی کہا ہے، ایمان لائے ہے نہیں روکنے بلکہ اس
پر امادہ کرنے ہے۔ اور ۹۰٪ بھی ہمارا جا جکا ہے کہ حیات آخری کا منہلہ ہے
ایک لطفانہ مسئلہ ہے کہ انسان کی اخلاق اور ۹۰٪ زندگی سے اس کا
ایک کہا تعلق ہے۔ اس کو مانئے ہے دنیوی زندگی اور اس کے معاملات کے
تعلل انسان کا نقطہ نظر پرہادی ہو دیں بدلتا ہے۔ اس انتقاد کو تسلیم کرنے
کے معنی ہے یہ کہ اسلام ایسے اپنے کو ایک ذمہ دار اور جواب دہ ہستی سمجھیے
اور اپنی زندگی کے تمام معاملات پر سمجھیے ہوئے ہجام دے کہ وہ اپنی حرکت
اور ہر فعل کے لئے ذمہ دار ہے۔ ایک زندگی ہے اس کو اپنے تمام اعمال کی
جباب دھی کرنی ہے اور مستقبل کی سعادت و نیافت اس کے حال کی نیک اور بدی
پر منحصر ہے۔ جو شخص اس آخری زندگی کا معتقد ہوگا اس کی نظر اپنے اخلاقی
لل تعالیٰ کے صرف اپنی ذاتی نتائج پر تکہ رکھے گا جو اس زندگی کے بعد ایک دوسرا زندگی میں
ظاہر ہونے والی ہیں۔ اور ان نتائج کے لحاظ سے ہر فعل کے مفہد ہا مضر ہونے
کا ممکنہ کہے گا۔ اس کو جس طرح زہر کے سہل اور سوڈی ہونے کا
ہین ہوگا اسی طرح خیانت اور جہالت کے سہل اور سوڈی ہونے کا بھی ہین ہوگا۔
وہ جس طرح روشنی اور ہلکی کو مفہد سمجھی کا اسی طرح عدل و نیامت اور عدالت کو
ہی مفہد ہے۔ گا۔ وہ اپنے ہر فعل کے ایک متعین لور ہٹھی توجہ کا قائل ہوگا۔

خواہ وہ نتیجہ اس زندگی میں ظاہر فہ ہو بلکہ برعکس صورت میں ظاہر ہو، اس کے ہاں اخلاق اعمال کی معین اخلاق تدریں ہوں گی اور ان قدر توں مید دنیوی فوائد یا مضرتوں سے کوئی تغیر واقع نہ ہو گا۔

اس طرح اسلام نے آخرت کے عقیدے کو اپنے اخلاقی طبقے اور نظامِ شرع کے لیے ابک زبردست پشت ہناہ بنا دیا ہے، جس میں ابک طرف خیر و صلاح اور عمل کرنے اور شر و مساد سے بچنے کے لیے خلقی ترغیب ہوئی موجود ہے اور دوسروی طرف نیکی ہو بقیتی جزا اور ابدی ہو بقیتی سزا کا خوف بھی ہے۔ اس کا خابطہ اور نظام اپنی حقاً و استحکام کے لیے مادی طاقت اور حاکمانہ انتدار کا محتاج نہیں ہے بلکہ وہ ایمان بالبوم الآخر کے ذریعے سے انسان کے نفس میں ابک اپسے طاقتور ضمیر کی تشکیل کرتا ہے جو کسی ہر وونی لالج اور خوف کے بغیر انسان کو اپ سے اپ ان نیکیوں کی طرف راحب کرتا ہے جن کو اسلام نے آخری نتائج کے اعتبار سے نیکی قرار دیا ہے اور ان گناہوں سے بچنے کی تاکید کرنا ہے جن کو اس نے آخری نتائج کا لعاظ کرنے ہوئے گناہ نہیں را یا۔

قرآن میں جگہ جگہ اس عقیدے کو مکارم اخلاق کی تعلیم کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ تقویٰ اور ہوہیزگاری کا حکم دیا جاتا ہے تو ساتھ می ارشاد موتا ہے کہ

وَالْكُفَّارُ لَا يَعْلَمُونَ

اُنہے ڈرو اور جان رکھو کہ تم کو اس کے پاس حاضر ہونا ہے۔
(البقرہ۔ ۲۲۲)

راہِ خدا میں سرفوشی کے لیے ابھارا جاتا ہے تو ساتھ ہی یہ ہی بقین دلایا جانا ہے کہ اگر تم مارے جاؤ گے تو درحقیقت مر نہ جاؤ گے بلکہ ہیشہ کی زندگی ہاؤ گے:

وَلَا تَقُولُوا إِنَّمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللہِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَمْوَاتٌ وَلَكِنَ لَا يُشْعِرونَ.

اور جو لوگ اُنہے کہ راہ میں قتل کیجئے جائیں ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زدہ ہیں، لیکن تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہے۔
(البقرہ۔ ۱۵۲)

غایہ آخرت

۲۰۱

صائب اور صبرگی تلقین کی جان ہے تو ساتھ یہ ابھی کہ دھا جاتا ہے کہ
ماں دین کے لیے خدا کی طرف سے عنایت اور رحمت ہے:

أَوْلَادُ عَلَيْهِمْ صَلَوةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ

یہ لوگ میں جس بر ان کے رب
کی جانب سے صلوٰۃ اور رحمت
۔ (البقرہ - ۱۵۴)

یہ خوبی اور بہادری کا جذبہ اس طرح ہیدا کیا جاتا ہے کہ

كَلَّ الْمُبْرَكَ يَكْتُلُونَ الْكَفَرَ كَذَلِكَ فَمَنْ أَنْهَا كُلُّ نَعْلَمٍ غَلَبَهُ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ

جو لوگ سمجھتے ہیں کہ انہیں افک کے پاس حاضر ہونا ہے انہوں
نے کہا کہ افک کے حکم ہے چھوٹی جماعت بھی بڑی جماعت پر
 غالب آجائی ہے۔ (البقرہ - ۲۲۹)

سخت ہے سخت مشکلات کے مقابلے میں لٹ ک جانے کی قوت ہے کہ کر ہیدا
کی جان ہے کہ

نَارٌ جَهَنَّمُ أَقْدَحُوا

جہنم کی آگ دنبا کی گرمیوں سے زیادہ
سخت ہے۔ (براہ - ۸۱)

نیک کامیں میں مال خرچ کرے کے لیے اہمارتے ہونے بون ارشاد ہوتا ہے

وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُؤْتَى إِلَيْكُمْ وَلَا تُنْفِقُوا إِلَّا مِنْ

جو کچھ تم خیرات کرو گے اس کا پورا اجر تم
کو ملے گا اور تمہارے ساتھ ظلم نہ ہو گا۔
(البقرہ - ۲۴۲)

بخل ہے روکنے کے لیے ارمایا جاتا ہے

وَلَا يَمْسِكُنَ النَّبِيْنَ يَنْقُلُونَ بِمَا أَنْتَمْ لِهُمْ مِّنْ فَضْلٍ هُمْ بَلَى مُوْزَعُهُمْ بِمَطْلُوكَنَ مَا لَمْ يُؤْلَمُهُمْ

جو لوگ مال میں جو خدا نے اپنے بخل سے ان کو دیا ہے بخل کرنے میں
وہ اس کو اپنے حق میں اچھا نہ سمجھیں (وہ اچھا نہیں) بلکہ ان کے لیے
ہرا ہے۔ وہ جس مال میں بخل کرتے ہیں تیاست کے دن اس کا طوق بنا کر
ان کی گردنوں میں ڈالا جائی گا۔ (آل عمران - ۱۸۰)

سود خوری کے ظاہری فائدوں سے دست بردار ہونے کے لیے بد کر کر
آمادہ کہا جاتا ہے ۱۵
وَالْفُوَاهِمَا تُرْجِعُونَ فِيهِ مِنَ اللَّهِ

اس دن سے ذرو جس من نم
کے پاس لوٹلے جائیں گے۔
(الفہر۔ ۱۸۱)

مناعِ دنیا سے بے نیازی اور بدکاروں کی خوش حالی بر رشک نہ کرنے کی
تعلیم اس طرح دی جانی ہے ۱۶

لَا يَفْزَدُكُ تَطْبُ الَّذِينَ لَهُ دُوَافِي الْهَلَادِ: مَتَّأْتِيَّ لِلَّذِينَ لَمْ يَأْتِهِمْ جَعْلَمٌ وَأَبْلَسَ الْمَهَادِ، لِكِنَ الَّذِينَ هُنَّا
رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنَّتٌ كَمْبُرٌ مِنْ قَنْبِهَا الْأَنْبَابُ غَلِيلٌ لَهَا لَزِيَّةٌ عِنْدَهَا اللَّغْوُ مَا هَدَ اللَّهُ خَلَقَ لِلْأَكْرَمِ

دلیا کے ملکوں میں کفر ک روشن اختیار کرنے والے لوگوں کی چلت پورت ۱۷
کسی دھوکے میں نہ ڈالی۔ بے بھنس چند روزہ زندگی کا نہوا سا لطف ۱۸، پھر
۱۹ سب جنم میں جائز گئے جو بدترین چالیں قرار ہے۔ ایک جو اونگ انہی رب
کے لئے دلیل زندگی بوز کرنے ہیں ان کے اپنے اپنے باعث ہیں جن کے لیے توہین
بھتو ہیں، ان پاغوں میں وہ حدیثہ رہیں گے، ان کے لیے اونک طرف ۲۰ ہے
مامان نہایت ۲۱، اور جو کمہ اونکے پاس ہے نیک لوگوں کے لیے وہی سب
۲۲ بہتر ہے۔ (آل عمران۔ ۱۹۸۔ ۱۹۹۔ ۱۹۰)

شبیدہ آخرت کی اس اہمیت والادب کے بیش نظر اس علیحدے ہر ایمان و ایقان
و کھنا ایک مسلمان کے لیے ناگزیر ہے۔ اور جب تک اس ہر ایمان نہ لائے کوئی
السان مسلمان نہیں ہو سکتا۔ بلکہ مسلمان تو خدا بڑی جزا ہے، مج ۲۳ ہے
کہ آخرت کا انکار انسان کو انسانیت ۲۴ کرا کر جیوانیت ۲۵ بھی بدتر درجی
بھی لیے جاتا ہے۔

هزیلہ مدالعے کے لیے

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامی تہذیب اور امن کے اصول و مبادی
(باب سوم، فصل هفتام، اور باب چہارم)۔ اسلامک پلیکیشنز لیبلڈ، لاہور۔
مولانا سید مسلمان ندوی، صورت العی، (جلد چہارم، ابواب بر مقیدہ، آخرت)۔
دارالمحظیں اعظم گروہ۔

مولانا صدر الدین اصلاحی، اساس دین کی تہذیب (باب سوم)۔ اسلامک پلیکیشنز
لیبلڈ، لاہور۔

مولانا محمد منظور نہیں، الی، القرآن کہا کہتا ہے؟ مکتبہ الفرقان، لکھنؤ
افتخار احمد بلخی، جواہر رسالت (عنوان "انداز بودہ و باقی" اور
"ستولیت")۔ المطربات، کراچی۔

اسلامی تصور عبادت اور اسلامی عبادات

وَرَأَنَّكَ رُوَسَّى عِبَادَتٍ وَهُوَ أَسْلَمٌ فَقَدِرَ هُنَّ جَسَرٌ كَيْمَانٌ
كَيْمَانٌ كَيْمَانٌ وَمَا خَلَقْتَ إِلَيْنَا إِلَّا لِيَعْبُدُونَ (میں نے جنون اور انسانوں کو بیدا
کیا گیا ہے) - امّا همارے لیے اس بات کا سمجھنا بڑا
ضروری ہے کہ عبادت کیا ہے اور اس کا صحیح تصور کیا ہے -

(۱) عبادت کا ایک تصور ہے جسے جاہلی تصور عبادت کہا جا سکتا ہے -
اس تصور کی رو سے عبادت محض پوجا ہاٹ تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے - جاہل
لوگ اپنے معبدوں کو انسانوں پر قیام کرنے ہوئے بہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح
بڑے آدمی، سردار یا بادشاہ خوشامد سے خوش ہونے ہیں، نذرانے پیش کرنے سے
بہربان ہو جانے ہیں، ذات اور عاجزی کے ساتھ ہاتھ جوڑنے اور سرجہ کانے سے
پہیج جانے ہیں، اور ان سے یوں ہی کام نکلا جا سکتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ
بھی انسانوں سے خوشامد، نذر و نیاز اور عاجزی کا طالب ہے - اس تصور کی بنا پر
جاہل مذہب چند مخصوص اوقات میں مخصوص مراسم ادا کرنے کو عبادت کے
نام سے موسوم کرنے ہیں -

(۲) عبادت کا دوسرا تصور، جسے جو گیانہ با راہبانہ تصور عبادت کہنا موزوں
ہوگا، یہ ہے کہ انسان دنیاوی زندگی سے الگ ہو کر خدا سے لو لکائے، سرافہ،
نقش کشی اور مجاهدات و ریاضات کے ذریعے سے اپنی اندر وی فتوں کو نشو و نادمے
اور دنیوی زندگی کی ذمہ داریوں سے سبکدوشی حاصل کر کے اُخزوی نجات حاصل

ہ پہلے تین حصے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی کتاب "اسلامی عبادات پر تحقیق نظر"
سے مانعہ ہیں البتہ اس میں موجودہ کتاب کی ضرورتوں کے پیش نظر کہیں کہیں صرف دری
انسانی کہیے گئے ہیں - (مرتب)

کرے۔ عبادت کا بہ تصور آن مذاہب میں بابا جاتا ہے جن کی بنیاد زندگی کے راہبانہ تصور ہر ہے اور جن کے نزدیک دین اور دنیا ایک دوسرے کی خد ہیں، اور جو دنیا کی زندگی اور اس کی ذمہ داریوں اور اس کے علاقے سے باہر نجات کا راستہ لہوندے ہیں۔

اسلام کا تصور عبادت ان دونوں سے مخفف ہے ③۔ اسلام صرف خداوند عالم خدا نے واحد کا بننے ہے۔ اس کا خالق، اس کا مالک، اس کا حاکم۔ کچھ اختیارات ہے جس نے اس زمین پر اس کو اپنے نائب کی حیثیت سے مقرر کیا۔ کچھ ملکت اور عطا کیجئے، کچھ ذمہ داریاں دھن، کچھ خدمتیں سرد کیں۔ اپنی ملکت اور رعیب کے حصے پر اقتدار دیا۔ اس دنیا میں اس کا نام اپنے مالک کے مقصد کو ہوا کرنا ہے، اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنا اور ادا کرنا ہے، آفاقی سپرد کی تقریب کی مدت ختم کرنے کے بعد جب وہ مالک کے سامنے حساب کے لیے بیش ہو ہوئی خدمتوں کو انجام دینا ہے۔ اس کی آئندہ ترق کا انحصار اسی پر ہے کہ اپنی فرمان کارنامہ زندگی سے یہ ڈاٹ ہو گا وہ ایک فرض شناس، مطبع اور تو اس کے فرمان بردار بنتے تھے، نہ یہ کہہ سست، کام چور، فرض ناشناس یا باغی و نافرمان تھا۔

فرمان بردار بنتے تھے، نہ یہ کہہ سست، کام چور، فرض ناشناس یا باغی و نافرمان تھا، نہ یہ کہہ سست، کام چور، فرض ناشناس یا باغی و نافرمان تھا۔ اس نقطہ نظر سے عبادت کے وہ دونوں تصور، جو اپر بیان کیے گئے ہیں، اس شخص میں۔ جو شخص اپنے اوقات میں سے تھوڑا سا وقت خدا کو پوجنے میں صرف ناقص ہیں۔ کہ اب وہ آزاد ہے کہ جو چاہے کرے، اس کی مثال ایک کرکے بہ سمجھتا ہے کہ اب وہ آزاد ہے کہ جو چاہے کرے اور جسے اوری تھواہ اپسے ملازم کی ہے جسے آپ نے رات دن کے لئے رکھا ہو اور جسے اوری جھک کر دے کر آپ پروردش کر رہے ہوں ایکن وہ بس صبح شام اکر آپ کو جھوک جھک کر سلام کر دیا کرے اور اس کے بعد آزادی کے ساتھ جس کی چاہے نوکری بجا لائے۔ اسی طرح جو شخص دنیا اور اس کے معاملات سے الگ ہو کر ایک گوشے میں جا اوپھنا ہے اور اپنے سارا وقت ہو جا ہاٹ اور ریاضت میں صرف کر دینا ہے، اس کی مثال اس شخص کی ہے جسے آپ اپنے باغ کی رکھوالی کے لیے مقرر کریں مگر وہ باغ کو اور اس کے کام کاچ کو چھوڑ کر آپ کے سامنے ہر وقت ہانہ باندھ کھڑا رہے، صبح سے شام اور شام سے صبح تک آفاؤ آفاؤ ہکارتا رہے اور بالعمانی کے سطح پر جو ہدایات آپ نے اسے دی ہیں ان کو خوشحالی اور ترتیل کے ساتھ پڑھنا رہے لیکن باغ کی اصلاح و ترقی کے لیے کچھ نہ کوئے دے۔ اسے

ملازموں کے متعلق جو کچھ رائے آپ قائم کریں گے وہی رائے اسلام ہی، اب سے
عبادات گزاروں کے متعلق قائم کرتا ہے۔

اسلام کا تصور عبادت یہ ہے کہ آپ کی ماری زندگی خدا کی بندگی میں
بدر ہو، آپ انہی آپ کو دائمی اور ہمد و قی ملازم سمجھوں، آپ کی زندگی کا
ایک لمحہ بھی خدا کی عبادت سے خال نہ ہو، اس دنیا میں آپ جو کچھ بھی
کریں خدا کی شریعت کے مطابق کریں، آپ کا سونا جا کنا، انہنا، بیٹھنا، کھانا پینا،
بھروس کہ سب کچھ خدا کے قانون کی ہابندی میں ہو۔ خدا نے جو خدمات آپ کے
بہرداری میں، اور زندگی کے جو فرائض آپ سے متعلق کیے ہیں، ان سب کا بار
آپ نفس کی ہوری رفاقتی کے ساتھ انہائیں اور ان کو اس طرف سے ادا کریں
جس کی طرف خدا نے انہی رسولوں کے ذریعے آپ کی رہنمائی کی ہے۔ آپ ہر وقت
اور ہر کام میں خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری محسوس کریں اور سمجھوں کہ آپ کو
انہی ایک ایک حرکت کا حساب دینا ہے۔ انہی گھوڑیں بیوی بھوں کے ساتھ،
انہی محلے میں ہمسابوں کے ساتھ، انہی سوسائٹی میں دوستوں کے ساتھ، انہی کاروبار
میں اہل معاملہ کے ساتھ برناو کرنے وقت ایک ایک ایک بات اور اپنے ایک کام میں
خدا کی مقرر کردہ حدود کا آپ کو خیال رہے۔

ہس دنیا کو چھوڑ کر کونوں اور گوشوں میں جا بیٹھنا اور باخت کرنا
عبادات نہیں ہے بلکہ دنیا کے دھنڈوں میں بھنس کر اور دنبوی زندگی کی ماری
ذمہ داریوں کو سنبھال کر خدا کے قانون کی ہابندی کرنا عبادت ہے۔ ذکر الہی
کا مطلب یہ نہیں ہے کہ محض زبان ہر اہل اللہ جاری ہو بلکہ اصل ذکر الہی
بہ ہے کہ جو چیزیں خدا سے مخالف کرنے والی ہیں ان میں آپ بھنسیں اور بھر
خدا سے غافل نہ ہوں۔ دنیا کی زندگی میں جہاں قانونِ الہی کو توڑنے کے
بے شمار مواقع، بڑے بڑے فائدوں کا لالج اور بڑے بڑے تھماںوں کا حرف لمحے
ہوئے سامنے آتے ہیں، وہاں خدا کو باد رکھیے اور اس کے قانون کی پیروی کرنے
رہیے۔ حکومت کی کرسی پر بیٹھیے لیکن بہ ذہن میں رہے کہ میں بندوں کا خدا
نہیں، خدا کا بندہ ہوں۔ عدالت کے منصب پر متمنکن ہوئے اور ظلم کرنے پر
قدرت رکھنے کے باوجود یہ خیال رکھیے کہ میں خدا کی طرف سے عدل قائم کرنے
ہو مأمور ہوں، زمین کے خزانوں ہر قابض و متصرف ہوئے اور بھر باد رکھیے کہ
میں ان خزانوں کا مالک نہیں ہوں بلکہ امانت دار ہوں اور پائی پائی کا حساب
مجھے اعلیٰ مالک کو دینا ہے۔ فوجوں کے کمانڈر بنیے اور خوف خدا آپ کو

طاقت کے نئے میں مددوں ہونے ہے بھا تاریخ، سیاست و جہاں بانی کا کٹھن کام ہاتھ میں لیجئے اور بھر سجائی، انصاف اور حق بہتندی کے اصول پر عمل کر کے دکھائے۔ تجارت، صنعت و مالیات کی ہاگیں سنبھالیے اور بھر کامیابی کے ذرائع میں ہاک و نا ہاک کا امتیاز کرنے چلیجے۔ ہر طرف ظلم و دخما اور فرب و بدکاری کے راستے آپ کے لیجے کھلیے ہوں اور دنیاوی کامیابیاں اور مادی لذات ہر طرف سے دعوت دے رہی ہوں اور بھر خدا کی باد اور آخرت کی باز ہوس کا خوف آپ کے ہاول میں ایڑھاں ڈال دے۔ حدہد اللہ میں سے ابک ابک کے قائم کرنے میں هزاروں مشکلائیں دکھائی دیں، حق کا دامن تھامنے اور عدل و صداقت پر قابو رہنے میں جان و مال کا زیبا نظر آئے، خدا کے قانون کی ہیروی کرنا زمین و انسان کو دشمن بنانے کا ہم سعنی ہو جائے بھر بھی آپ کا ارادہ متزلزل نہ ہو اور آپ کی جیبنِ عزم پر شکن نہ آئے۔ یہ ہے اصلی عبادت!

احلام نے روحانی ترقی اور خدا کی بافت کا بھی بھی راستہ بتایا ہے۔ انسان خدا کو جنگلوں اور ہباؤں میں یا گوشہ ہانے عزلت میں نہیں ہا سکتا۔ خدا اس کو انسانوں کے درمیان اور دنیوی زندگی کے ہنکاموں میں ملے کا اور اس قدر قریب ملے کا کہ گوبا وہ اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا ہے۔ جس انسان کے سامنے حرام کے فائدے اور ظالم کے موقع قدم پر آئے اور ہر قدم پر وہ خدا سے ڈر کر ان سے اجتا ہوا چلا، اسے خدا کی بافت ہو گئی۔ جس نے کھر میں تقریب کے لمحوں میں اور کاروبار کے ہنکاموں میں، ہر کام اس احساس کے ساتھ کیا کہ خدا مجھ سے دور نہیں ہے، اس نے خدا کو ہر لمحہ اپنے قریب سے قریب تر ہالیا۔ جس نے سیاست اور حکومت اور صلح و جنگ اور مالیات اور صنعت و تجارت جیسے ایمان کی سخت آزمائش کرنے والے کام کیے اور بھاں کامیابی کے شیطانی ذرائع سے بچ کر خدا کے مقرر کیے ہوئے حدود کا پابند رہا، اس سے بڑھ کر مضبوط اور سجا ایمان اور کس کا ہو سکتا ہے؟ اس سے زیادہ خدا کی معرفت اور کسے حاصل ہو سکتی ہے؟ اور اس سے زیادہ خدا کا مقرب اور کون ہو گا؟

اسلامی نقطہ نظر سے انسان کی روحانی فتوں کے نشو و نما کا راستہ بھی ہے۔ روحانی ارتقا اس کا نام ہے کہ آپ اپنے نفس کی خواہشات پر قابو ہائیں۔ اپنے ذہن اور جسم کی تمام طاقتیوں سے صحیح کام لیں، اپنے اخلاق میں خدا کے اخلاق سے قریب تر ہوئے کی کوشش کروں، دنیوی زندگی میں، جہاں قدم پر آزمائش کے موائع ہیں، اگر آپ حیوانی اور شیطانی طریق کار سے بھتے ہوئے

اسلامی تصورِ عبادت اور اسلامی عبادات

۳۰۴

ہیں اور ہو رے شعور اور تمیز سے اُس طریقے پر کار بند رہیں جو انسان کے شاہان شان
میں تو آپ کی روحانیت روز اروز ترقی کریں چلے جائے گی اور آپ کا ہاتھ ہو جائے گا جس سے آپ کام
کرنے ہیں، وہ آپ کی آنکھ ہو جائے گا جس سے آپ دیکھتے ہیں اور وہ آپ کے
باہم ہو جائے گا جس سے آپ راہ چلتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں بندہ اللہ کے
رنگ میں رنگ جاتا ہے اُس کی صفات کا بابنڈ ہو جاتا ہے۔ وہ رب ہے راضی
ہو جاتا ہے اور رب اس سے راضی۔ رضی اللہ عنہم و رضوانہ۔

اس بحث سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلام انسان کی ہوری دنیوی زندگی
کو عبادت میں تبدیل کر دینا چاہتا ہے، اُس کا مطالبہ یہ ہے کہ اُدمی کی زندگی
کا کوئی لمحہ بھی خدا کی عبادت سے خالی نہ ہو۔ 'لا الہ الا اللہ' کا الوار کرنے
کے ساتھ ہی یہ بات لازم آجاتی ہے کہ جس اللہ کو اُدمی نے اپنا معبود تسلیم کیا
ہے اُس کا عبد یعنی بندہ بن کر رہے۔ اور بندہ بن کر رہنے کا نام ہی عبادت ہے۔
کہا جا سکتا ہے مگر عمل انسان کی ہوری زندگی کا انہی تمام گوشوں کے ساتھ عبادت
بن جانا اُسان کام نہیں؛ اُس کے لیے بڑی زبردست تربیت کی ضرورت ہے؛ اُس کے لیے
ضروری ہے کہ خاص طور پر ذہن کی تربیت کی جائے، مفبوط کردار بنایا جائے،
عادات و خصائیں کو ابک خاص سائیجی میں لھا لے جائے اور صرف انفرادی سیوت
ہی کی تعمیر ہر اکتفا نہ کر لیا جائے بلکہ ابک ایسا اجتماعی نظام قائم کیا جائے
جو بڑے ہمایت پر افراد کو اس عبادت کے لیے تیار کرنے والا ہو اور جس میں جماعت
کی طاقت فرد کی پشت ہنا، اُس کی مددگار، اور اُس کی کمزوریوں کی تلاش کرنے
والی ہو۔ یہی غرض ہے جس کے لیے اسلام میں نماز، روزہ، مع و زکوٰۃ کی
عبادتیں فرض کی گئی ہیں۔ ان کو عبادات کہنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہس
عبادات بھی ہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اُس اصلی عبادت کے لیے انسان
کو تیار کریں، یا یہ کہ یہ اُس کے لیے تربیت کا لازمی نصاب ہیں، انہی سے
وہ مخصوص ذہنیت پہنچی ہے، اُس خاص کردار کی تشکیل ہوئی ہے، منظم عادات و
خصالیں کا وہ پختہ سائیجہ بتا ہے اور اُس اجتماعی نظام کی پنهانیوں استوار ہوئی ہیں
جس کے بغیر انسان کی زندگی کسی طرح عبادت الہی میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔ نیز
یہ کہ ان کے ذریعے ہے بندہ رب سے قریب نہ آتا ہے، اُس کی روح کو بالیدی حاصل
ہوئی ہے اور وہ زمین و اُسان کے مالک کا محبوب اور پسندیدہ بندہ بن جاتا ہے،

ان چار چیزوں کے سوا اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے بے مقصد حاصل ہو سکے۔ ایسی بنا پر ان کو ارکان اسلام قرار دبا گیا ہے، یعنی بہ وہ ستون ہیں جن پر اسلامی زندگی کی عمارت کھڑی ہوئی ہے۔

ایسے، اب ہم دیکھیں کہ ان میں سے ابک ایک رکن اسلامی زندگی کی عمارت کو کس طرح قابض کرتا ہے اور کس طرح انسان کو اس بڑی عبادت کے لیے تیار کرتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

نماذ

۱۔ مقصد حیات کی باد دھانی : انسان کی ہری زندگی کو عبادت ہیں تبرہل کرنے کے لیے سب سے بہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اس کے ذہن میں بہ شعور ہر وقت تازہ رہے کہ وہ خدا کا بندہ ہے۔ یہ ضرورت اس لیے ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانی حواس سے بالاتر ہے لیکن گمراہی کی طاقتیں ہوست بہلی ہوئی ہیں۔ لہذا ضرورت اس بات کی ہوئی ہے کہ انسان کو بار بار اس بات کی باد دھانی کی جاتی رہے کہ اسے اپنی زندگی ایک مخصوص انداز سے گذاری ہے۔ یہ نماز کا سب سے بڑا اندھہ ہے۔ جیسے ہی آپ صبح کو الہیں وہ آپ کو یہ بات باد دلان ہے۔ دن کے کام کاج کے هنکاموں سے دو بار کہہ بیج کر لائی ہے اور اسی چیز کو باد دلائی ہے۔ شام اور رات کو جب تربیع یا آرام کا وقت ہوتا ہے تو نماز آپ کو آکاہ کرتی ہے کہ تم خدا کے بندے ہو، شیطانی نفس کے بندے نہیں ہو۔ نماز کی اسی خصوصیت کی بنا پر قرآن میں اسے "ذکر" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی باد دھانی کے ہیں۔

۲۔ فرض شناسی : چون کہ انسان کے سپرد ہے کام ہوا ہے کہ وہ ہر قدم پر خدا کے احکام کو بجا لائے لہذا ضروری ہے کہ اس میں فرض شناسی اور مستعدی بیدا ہو بلکہ اس کی فطرت نانیہ بن جائے۔ مثال کے طور پر فوج کو دیکھیے، وہاں کن کن طریقوں سے فرانفس کو سمجھئی اور ادا کرنے کی مشق کرائی جائی ہے۔ رات دن میں کئی بار بگل بجا یا جاتا ہے، سپاہیوں کو ایک جگہ جمع ہونے کا حکم دبا جاتا ہے، ان سے قواعد کرائی جاتی ہے اُخر کمن لیئے؟ اس لیے کہ سپاہیوں میں فرض شناسی بیدا ہو اور جو لوگ ان صفات سے محروم ہوں ان کی آزمائش ہو جائے تاکہ ان کی اصلاح کی کوششی ہو با بالآخر ان کو فوج سے نکال دیا جائے۔

اسلامی تصور عبادت اور اسلامی عبادات

۴۰۹

دنیوی فوج کے لئے کام کا وقت تو کبھی برسوں میں آتا ہے، تب یہی قواعد روزانہ کرائی جاتی ہے، لیکن اسلام کی تیار کردہ فوج تو ہر وقت پرستش کاری ہے۔ اسے زندگی کے ہر آن شیطانی قوتوں سے لڑنا ہے، مرانش بجا لانے ہیں، حدود اللہ کی مخالفت کریں ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی فوج کے لئے زیادہ سخت تنظیم، تربیت اور ازیانش کی ضرورت ہے اور انہی مقاصد کے تحت نماز دن اور رات میں ہائج ہار فرض کی گئی ہے تاکہ ایک طرف تو مسلمانوں کی تربیت ہو اور دوسری طرف سچے اور بھائی مسلمانوں میں امتیاز ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ

بین العبد و بین الکفر ترك الصلواء

بندے اور کفر کے درمیان ترك صلواء واسطہ ہے۔
پہنی ترك صلواء وہ ہل ہے جسے ہار کر کے ادمی ایمان سے کفر کی طرف جاتا ہے۔

۳۔ تعمیر سیرت: نماز کا تیسرا اہم کام یہ ہے کہ وہ انسان کی سیرت کو ان خاص ڈھنگ ہر تیار کریں ہے جو اسلامی زندگی بسرو کرنے کے لئے ضروری ہے۔

دنیا میں ہر جگہ جیسا کام کسی جماعت کو کرنا ہوتا ہے اسی کے لحاظ یہ اس کی تربیت کی جاتی ہے۔ مثلاً سول سروس کا مقصد وفاداری کے ساتھ ملک کا انتظام کرنا ہوتا ہے لہذا وہاں سارا زور نظم مملکت کی صلاحیت پیدا کرنے پر دیا جاتا ہے، سپاہیوں کا کام جنگ کرنا ہوتا ہے اس لئے انہیں اسلحہ کا استعمال سکھایا جاتا ہے اور اطاعت امیر اور تنظیم کی تربیت دی جاتی ہے۔ اسلام کا مقصد ایک ایسی جماعت کی تیاری ہے جس کا مقصد اولین نیک کو قائم کرنا اور بدی کو مٹانا ہے اور جسے سیاست، عدالت، تجارت، صنعت، صلح و جنگ غرض یہ کہ ہر شعبہ زندگی میں خدا کے قوانین کی پابندی کرنی ہے اور انہیں ہو ری دنیا میں نافذ کرنے کی ذمہ داری سنبھالنی ہے۔ یہ عظیم کام اس وقت نک نہیں ہو سکتا جب تک انسان میں خدا کا خوف، اس کی محبت اور اس کی خوشبوی کی خواہیں نہ پیدا ہو اور جب تک ادمی یہ جان نہ لے کہ خدا حاکم اصلی ہے اور ہر انسان اس کے سامنے جواب دے گے۔ مسلمان اسلام کے طبقے ہر ایک ادم بھی نہیں چل سکتا جب تک کہ یقین نہ ہو کہ خدا ہر جگہ ہر حال میں اسے دیکھ رہا ہے، اس کی ہر حرکت ہے ہا خبر ہے، اندھیرے میں بھی اس کو دیکھتا ہے، تنهائی میں بھی اس کے ساتھ ہے اور اس کے دل میں جو نیت ہوں ہوں ہے اس کو بھی وہ جانتا ہے۔ ابھی یقین انسان کو خدا کے احکام کی

اسلامی للسنه' حیات

اُور اُن کو لاونڈ کی ادروی کے لئے تیار کرنا ہے، اور نماز کا مقصد ہے
اوپر اُن کو بار بار انسان کے ذہن میں قازہ کرنے۔

اُمار کا ارادہ لرنے کے ساتھ ہی روح کی تربیت اور اسلامی سیرت کی تعمیر
کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اور ہر ایک ایک حرکت، ایک ایک فعل اور
ایک ایک لعل جو نماز سے منسلق ہے کچھ اس طور پر رکھا گیا ہے آہ اس ہے
خود ہے خود انسان کی سیرت اسلام کے ساتھ میں ڈھلتی چلی جاتی ہے۔ اسی وجہ
کی وجہ سے قرآن میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ

إِنَّ الْكَلَامَ تَنَاهٍ عَنِ الْكُفَّارِ وَاللَّهُ أَنْكَرَ

بَقِيَّاً نَمَازٌ بِيَ حِبَّانِيْ اُور بِرَأْيِيْ)
روکنیٰ ۲۵۔ (العنکبوت -

اسی بنا پر نماز قدیم ترین زمانے سے الیا کی تعلیمات کا جزو رہی ہے۔
جتنے انبیا خدا کی طرف ہے آئے ہیں ان سب کی شریعت میں نماز اولین رکن
اسلام تھی۔ اسلامی تعریک میں جب بھی کبھی زوال آیا نماز کا نظام تربیت لون
جانے کی وجہ ہی سے آہا کیوں کہ اسلام کے طریقے ہو چلنے کے لئے اسلامی سیرت
ضروری ہے، اور اسلامی سیرت نماز کے نظام تربیت ہی سے ہوتی ہے اور جب ہے
نظام نوئی کا تو سیرتیں بکثر جائیں گی اور اس کا لازمی نتیجہ زوال و انحطاط ہو گا۔

۲۔ ضبط نفس : تعمیر سیرت کے ساتھ نماز انسان میں ضبط نفس کی طاقت
ہی پیدا کرنے ہے۔ نماز میں دعائیں اور تسبیحوں کے ساتھ اوقات کی ہابندی،
طہارت و خیرہ کی شرائط اور جسمانی حرکات کا جزو اسی لمحے لکھا گیا ہے کہ انسان
انھے نفس پر ہوری طرح قابو پانہ رہے، اور اسے انھے ارادے کے تعت چلانے میں
شاق ہو جائے۔ صبح کا وقت ہے، نیند آ رہی ہے، آرام طلب نفس کہتا ہے،
بڑے رہو، اب کہاں اللہ کر جاؤ گے، نماز کہتی ہے کہ وقت آچکا ہے، سیدھی طرح
انھو، وضو کرو، جائزے کا موسیم ہے تو ہوا کرے، ہانی گرم نہیں ہے، نہ سی،
نهندا ہی ہانی استعمال کرو اور چلو سجد کی طرف۔ ان دو مطالبات میں سے اگر
کسی نے نفس کے مطالیب کو ہورا کر دیا تو اس کا نفس اس سے بیٹ گیا رونہ
لہیں نے نفس بر قابو ہالیا۔ ابی طرح ظهر، عمر، مغرب، عشا ہر وات نفس
کسی نہ کسی مشغولیت، فائدے، نقصان، لطف، لذت، مشکلات وغیرہ کے

اسلامی تصور و عبادت اور اسلامی عبادات

۴۱۱

بہانے ڈھونڈتا ہے لیکن نماز ہر وقت تازیا نہ بن کر آجائی ہے اور اپ کی اونگتھی ہوئی قوت ارادی کو جگات ہے۔ اگر آپ نماز کا مطالبہ ہورا کرنے رہے تو آپ خواہشات نفس کا زور توڑ دیں گے، ان اور حکم رانِ ووجائز گے اور آپ بنی ہے طاقت؛ یہا ہو جائے گی کہ اتنے علم و ارادے کے مطابق اینیں تبدل کر سکیں۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ نماز چھوڑ کر اُدسو خواہشات نفس کا پرو بن کر گراہ ہو جاتا ہے:

لَكُفَّرُ مِنْ أَعْدَادِهِمْ خَلَقُ أَهْلَأَعْظَمَ الْأَكْلَهُ وَالْبَعْدَلَةُ الْمُهُورُ لِلْوَقْتِ الْمُكْبَرِ

بہر ان کے بعد اپسے ناخلف لوگ آئے جنہوں نے نماز کو شائع کر دیا اور خواہشات نفس کی پیروی اختیار کر لی، لمدا منقرب وہ گمراہی میں مبتلا ہوں گے۔ (مریم - ۵۹)

یہاں تک ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ نماز کے فوائد و منافع کا صرف ایک ہہلو ہے، یعنی یہ کہ نماز افراد کو کس طرح تیار کرنے ہے۔ ہم نے دیکھا کہ نماز

(۱) اُدسو کے ذہن میں اس حقیقت کو تازہ رکھتی ہے کہ وہ دنیا میں خود مختار نہیں ہے بلکہ اللہ رب العالمین کا بندہ ہے اور اسی حیثیت سے کام کرتا ہے؟

(۲) انسان کبو فرض شناس بناتی ہے؟

(۳) فرض شناس اور فرض ناشناس میں تمیز کا ذریعہ بھم بہنجان ہے؟

(۴) خیالات کا ایک ہورا نظام ترتیب دیتی ہے تاکہ اس کی سیرت پختہ ہو سکے؟

(۵) انسان میں یہ قوت ہیدا کرنی ہے کہ وہ اتنے عقیدے اور بصیرت کے مطابق جس طرز عمل کو ملکیت سمجھتا ہے اس ہر عمل کر سکے؟

اور (۶) بندے کو رب سے قریب لانی ہے اور اس کے قلب کو ہاکیزی اور روح کو بالیڈگی عطا کرنے ہے۔

اجتماعی فوالد: اب ہیں نماز کے ایک دوسرا ہے ہم لوہ نظر ڈالنی چاہیے۔ یہ ظاہر ہے کہ انفرادی سیرت تنہ کوئی نتیجہ نہیں ہیدا کر سکتی جب تک کہ جماعت میں بھی وہی سیرت موجود نہ ہو۔ اُدسو دنیا میں کوئی کام اکولا نہیں

کر سکتا۔ اس کی ساری زندگی اپنے بھائی بندوں، دوستوں اور همسایوں، معاملہ داروں اور ساتھیوں کے ساتھ ہزاروں قسم کے تعلقات میں جکڑی ہوئی ہے۔ اب اکر ایک انسان اپسے لوگوں کے درمیان گھرا رہے جو خدا کے قانون کو تسليم نہیں کرتے، با اس کی نافرمانی پر تسلیم ہونے ہیں تو اکپلے اُدمی کے لئے اپنی زندگی میں اس قانون کو جاری کرنا دشوار ہو جائے گا، حالانکہ مسلمانوں کے ذمے کام نہ صرف ہے کہ اسے اپنی زندگی میں جاری کریں بلکہ ہری دنیا پر غالب و نافذ کریں۔ اس کام کے لیے اُدھ ایک مسلمان کاف نہیں ہے بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ سب مسلمان مل کر ایک جتنا ہیں اور ہر اس کام کے لیے کوشش کریں۔

نماز ہماری اس ضرورت کو بھی ہوا کرنی ہے۔ وہ اس اجتماعی نظام کا ہوا ڈھانچہ بناتی ہے، اس کو قابیم کرنی اور رکھنی ہے۔ اور اسے روزانہ ہائج مرتبہ حرکت میں لائی ہے تاکہ وہ ایک مشین کی طرح چلتا رہے۔ اس لیے بنج وقت نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا واجب فرار دبا گیا ہے، حکم ہے کہ اذان کی آواز سننے ہی دوڑ جاؤ۔ جیسے نوجی مپاہی بگل سننے ہی سمجھے لیتا ہے کہ کائنات نے ہمیں طلب کیا ہے اور اس کی تعہیل کے لیے دوڑنا ہے اسی طرح ہر مسلمان جہاں بھی اذان کی آواز سننے سب کام چھوڑ کر قریب کی مسجد کا رخ کرے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ جب کبھی کوئی مہم درپیش آئے تو سارا گروہ ایک منظم جنم کی صورت میں جمع ہو سکے اور اس کے لیے کام کر سکے۔

بے تو محض اذان کا فائدہ تھا۔ اب آپ مسجد میں جمع ہوتے ہیں، بہاں ایک دوسرے کو دیکھتے اور ہم جانتے ہیں۔ اور اس حیثیت سے متعارف ہوتے ہیں کہ سب ہم مقصد اور ایک ہی راہ کے مسافر ہیں۔ اس نظر سے جب آپ دیکھیں گے کہ میرا کوئی بھائی، بھنی ہرانے کپڑوں میں ہے، کوئی پربیان صورت ہے، کوئی فاقہ زدہ ہے تو آپ کے دل میں ہمدردی کا جذبہ ہیدا ہو کا اور جو لوگ خوش حال ہیں وہ غریبوں کی مدد کر سکیں گے۔

ہر مسجد میں تمام مسلمان مساوی الحیثیت ہیں۔ ایک چمار اگر ہملے آتا تو وہ اکلی صاف میں ہو گا اور ایک رئیس اکر بعد میں آئے تو پچھلی صفوں میں رہے گا؛ کوئی بڑنے سے بڑا اُدمی بھی مسجد میں اپنی نشست محفوظ نہیں کر سکتا اور نہ کوئی شخص اس بات کا مجاز ہے کہ کسی شخص کو اس کی جگہ ہے

دے۔ تمام مسلمان ایک ہی صنق میں کھڑے ہوں گے۔ بہاں نہ کوئی ہونا اور نہ کسی کے برابر کھڑے ہونے سے کوئی نا ہاک نہیں ان طرح وسائلی کے افراد کو پاد دلایا جانا ہے کہ خدا کی نکاح میں تم سب ابراہ ہو۔ طبقاتی امتیاز پا نسل، قبیلہ، رنگ اور وطن کی عصوبیتیں غلط ہیں۔

مسجد میں ہر مسلمان امام ان سکتا ہے۔ البتہ مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے ذکر ہم کر دیں گے، انتہائی معنی خیز ہیں، ان کے ذریعے سے مسلمانوں کو یہ بنا بایا گیا ہے کہ اس چھوٹی سی مسجد کے باہر امن و سیف مسجد میں، جس کا نام زین ہے، مسلمانوں کا اجتماعی نظام کیسا ہونا چاہیے، انہیں کہا امام بالیڈر منتخب کرنا چاہیے اور اس کے ساتھ کسی قسم کا تعلق رکھنا چاہیے۔

ہدایت دی گئی ہے کہ امام اپسے شخص کو منتخب کیا جائے، جو بڑھیکار ہو، نیک سیرت ہو، دین کا علم رکھتا ہو۔ حکم دیا گیا ہے کہ امام اپسے شخص کو نہ بنایا جائے جس سے جماعت کی اثربت فراپش ہو۔ یوں تو نہیں نہیں بہت مخالف کس کے نہیں ہوتے لیکن، اگر جماعت میں زیادہ تر اُدمی کسی شخص کی اقتدار کرنے سے کراحت کرتے ہوں تو اسے امام نہ بنایا جائے۔ ان ساری ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سردار قوم کے انتخاب میں کن چیزوں کا لحاظ کرنا چاہیے۔

حکم ہے کہ جو شخص امام بنے وہ نماز بڑھانے میں جماعت کے خلاف لوگوں کا بھی لحاظ رکھئے، محض جوان، مضبوط اور فرمودت والی آدمیوں کو اپنی نظر رکھ کر لمبی لمبی قرات اور لمبی لمبی رکوع اور سجدے نہ کرنے لگے بلکہ یہ ہی خیال رکھئے کہ جماعت میں بڑھے ہیں، ایمار ہیں ہیں اور کمزور اور مشغول اُدمی ہیں، جو اپنا کام چھوڑ کر آتے ہیں۔ اس طرح گویا سردار قوم کو تعلیم دی جا رہی ہے کہ جب وہ سردار بنایا جائے تو افراد کے ساتھ اس کا طرز عمل کیسا ہونا چاہیے۔

حکم دیا گیا ہے کہ امام کی سختی سے اپروی کرنی چاہیے۔ اس کی حرکت یہ ہلی حرکت کرنا منع ہے۔ اس طرح قوم کو بنا بایا جا رہا ہے کہ اسے اپنے

سردار کی اطاعت کس طرح کرنی چاہیے۔ البتہ اگر امام غلطی کرے تو مقتدیوں کا فرض ہے کہ اسے "سبحان اللہ" کہہ کر نوک دیں۔ "سبحان اللہ" کے معنی ہیں کہ "اللہ ہاک ہے" مطلب یہ کہ تم سے غلطی ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں، غلطیوں سے میرا ذات تو صرف خدا کی ہے۔ امام کا فرض ہے کہ انہی غلطی کی اصلاح کرے ایکن اگر وہ سمجھتا ہے کہ وہ صحیح ہے تو مقتدیوں کا فرض ہے کہ اس کی پیروی کرتے رہیں۔ یہ تو چھوٹی موفی غلطیوں کی بات ہے، لیکن اگر غلطی سنگین ہو اور کفر و شرک تک ہنچتی ہو تو جماعت کا فرض ہے کہ فوراً علیحدہ ہو جائے اور اس امام کو ہٹا کر دوسرا امام مقرر کرے۔ قومی زندگی میں بھی یہی حیثیت ہے۔ جب تک سردار قوم حدود اللہ میں کام کر رہا ہو اس کی اطاعت واجب ہے ایکن اگر وہ خدا کی حدود کو تواڑے تو ملت اسلامیہ کا فرض ہے کہ اب سے رہنماؤں اور اکابر کو ان کے عہدوں سے اتار دے اور ان کی جگہ خدا ترس لوگ منتخب کرے۔

نماز کے انہی فوائد کی بنا پر اس کو دن میں بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ اسے 'عہد الدین' یعنی دین کا ستون کہا گیا ہے۔ جس نے اسے گرداباً اس نے دین کی عمارت ڈھادی اور جس نے اس کی حفاظت کی اس نے دین کی عمارت محفوظ رکھی۔

* مزید برآں نماز کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لکھیجئے کہ نماز کو قرآن ہاک میں "ایمان" تک دہا گیا ہے اور قسمہ وانہ نے فرمایا ہے کہ توک نماز اور ایمان ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ نماز روحانی ترقی اور قرب الہی کا سب سے موثر ذریعہ ہے۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان کی تعریف ہی یہ فرمائی ہے کہ نماز اس طرح ہڑھی جائے جیسے آپ خدا کو دیکھ رہے ہیں اور اگر یہ کیفیت نہ ہو تو کم از کم یہ کہ خدا آپ کو دیکھ رہا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو انکھوں کی نہنڈک قرار دیا ہے۔ حنفیت یہ ہے کہ نماز ایمان بھی ہے اور ایمان کی ہمچان بھی ہے، دل کا نور اور انکھوں کی نہنڈک بھی ہے اور انفرادی اور اجتماعی سیرت کی صورت گر بھی۔ نماز دین کا وہ ستون ہے جس کے قیام سے دین قائم ہے اور جس کے منہدم ہو جانے سے دین کا عمارت ابھی منہدم ہو جاتی ہے۔

روزہ

نماز کی طرح روزہ بھی زمانہ قدهم سے انبیا کی شریعتوں کا لازمی جزو رہا ہے

اسلامی تصور عبادت اور اسلامی عبادات

۲۱۵

نماز روزمرہ کا عمومی نظام تربیت ہے اور روزہ سال بھر میں ایک ماہ کا
بید معمولی نظام تربیت ہے جو آدمی کو تقریباً ۲۰ کھنچتے تک اپنے مخصوص لیسپن
کے شکنچے میں کسے رکھتا ہے تاکہ روزانہ کی تربیت سے جو خرابیاں رہ گئی ہوں
و دور ہو جائیں ۔

روزے کا قانون یہ ہے کہ آخر شب طافع سحر کی بھلی علامات ظاہر

ہونے ہی آدمی ہر بکایک کھانا پینا اور مبادرت کرنا حرام ہو جاتا ہے اور
مروب آذاب تک ہو رے دن حرام رہتا ہے ۔ شام آتے ہی حرمت کا بند اچانک
لوٹ جاتا ہے ، جو چیزیں ایک لمحہ بھلے تک حرام تھیں اب حلال ہو جاتی ہیں
نا آنکہ دوسرے روز کی مقررہ ساعت آجائی ہے ۔ ماہ رمضان کی بھلی تاریخ سے بد
عمل شروع ہوتا ہے اور ایک مہینہ تک سلسل اس کی تکرار جاری رہتی ہے ،
گوپا ہو رے تیس دن انسان ایک مددید ترین لیسپن کے تحت رہتا ہے ۔

۱۔ احساس بندگی :

اس نظام تربیت ہر غور کرنے سے جو بات بھلی
نظر میں واضح ہو جاتی ہے وہ ہے کہ اسلام اس طبقے سے انسان کے شعور میں
اللہ کی حاکیت کے اقرار و اعتراف کو مستحکم کرنا چاہتا ہے اور اس شعور کو
اندا مستحکم بنا دیتا ہے کہ احکام الہی کے روپ و انسان اپنی آزادی اور خود مختاری
سے دست بردار ہو جائے ۔ خدا کا وجود بعض ایک ما بعد الطبعی عقیدہ نہ رہے بلکہ
عمل زندگی میں محسوس و کار فرما عو جائے ۔ کفر اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان
خدا کے مقابلے میں اپنے آپ کو خود مختار محسوس کرے اور اس کے مقابلے میں اسلام
بہ ہے کہ انسان ہر آن اپنے آپ کو خدا کا بندہ اور محکوم محسوس کرے ۔ اور
جبکہ اوپر بیان کیا نماز کا مقصد امن شعور بندگی کی باد دھافی ہے ، اسی
طرح رمضان کے روزے سال میں ایک مرتبہ ہو رے ۲۰ کھنچتے ہیں اس شعور
کو ذہن پر قائم رکھتے ہیں تاکہ سارے سال انسان کے ذہن پر اس کے اثرات
ثابت رہیں ۔

۲۔ اطاعت امر :

احساس بندگی کے ساتھ ساتھ جو چیز لازی ہیدا ہوگی
وہ بہ ہے کہ انسان اپنے اپ کو جس خدا کا بندہ سمجھ رہا ہے اس کی اطاعت کرے ۔
ان دونوں میں فطری طور پر ایسا ربط ہے کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے ۔
اپ جس کی خداوندی کا اعتراف کریں گے لازماً اطاعت بھی اسی کی کریں گے ۔
اگر احساس بندگی درجہ شدید ہوگا اطاعت اس بھی اپنی ہی شدت سے ہوگی ۔

چنان چہ روزے کا مقصد احساس بندگی کی باد دھانی کے ساتھ ہی ساتھ اطاعت امر کی تربیت دینا بھی ہے۔ روزہ انسان کو مہینہ مہینہ بھر کئی کئی کوئی اس حالت میں رکھتا ہے کہ اس کو اپنی ابتدائی ضروریات ہو ری کرنے کے لئے بھی خداوند عالم سے اذن و اجازت کی طرف رجوع کرنا ہوتا ہے۔ اپنی خواہش ہو یا دوسروں کی، انسان بلا اذن خداوندی روزہ نہیں چھوڑ سکتا؛ اس طرح اس کی اطاعت میں دو طرف ہے سٹ کر ایک مرکزی انتدار کی طرف بھر جاتی ہیں۔

روزے میں اگرچہ ہدایت صرف دو خواہشات (خدا اور صنفی خواہش) ہر واحدی لکانی گئی ہے لیکن اس کی اصل روح یہ ہے کہ انسان ہر بندگی کا احساس ہو ری طرح طاری رہے۔ اس کے بغیر اگر انسان محض بھوکا ہے اسراہ لے تو یہ روزہ لاش کی طرح ہے روح ہوگا۔ نبی صامد نے فرمایا ہے کہ ”جس نے جھوٹ بوانا اور جھوٹ ہر عمل کرنا نہ چھوڑا تو خدا کو کوئی حاجت نہیں کہ وہ شخص اپنا کہاانا ہینا جھوڑ دے۔“ اسی طرح ابک حدیث میں آیا ہے کہ ”کتنے ہی روزہ دار ہیں کہ روزے ہے بھوک اور ہاس کے سوا انہیں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔“ ان دونوں احادیث میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ روزے کا مقصد بھوکا ہیسا رہنا، نہیں بلکہ نفوی اور طہارت ہے۔

۳۔ تعمیر سیرت: روزے کا تیسرا مقصد انسان کی سیرت کی تعمیر ہے۔ اس سیرت کی بنیاد تقویٰ ہو رہے۔ تقویٰ سے مراد کوئی خاص شکل و صورت اخبار کرنا نہیں ہے بلکہ قرآن اس کو بڑے وسیع مضمون میں استعمال کرتا ہے وہ ہو ری انسان زندگی کے ایسے رویے کو تقویٰ کے نام سے تعبیر کرتا ہے جس کی بنیاد احساس بندگی اور ذہنی داری ہر ہو (اس کے مخالف رویے کا نام قرآن کی رو سے فجور ہے)۔ دنیا کے نساد کا سبب فجور ہے۔ اور دیگر عبادات کی طرح روزے کا مقصد بھی یہ ہے کہ انسان میں فجور کے رنجانات ختم کرنے جائیں اور تقویٰ کو نشو و نمادھا جائی۔ اب دیکھئے کہ روزہ کس طبقے سے اس کام کے سر انعام دینے میں مدد دلتا ہے۔

ابک شخص سے کہا جاتا ہے کہ خدا نے تم ہر ہائیڈی لکانی ہے کہ صبح سے شام تک کچھ نہ کھاؤ۔ نہ صرف جلوٹ میں بلکہ خلوٹ میں بھی اکل و شرب سے اور ہیز کرو۔ اب ایسی صورت میں اگر کوئی شخص روزے کی تمام شرائط ہو ری کرتا ہے تو ٹور کیجیے کہ اس کے نفس میں کس قسم کی کیفیات ابھری ہیں۔

اسلامی تصور عبادت اور اسلامی عبادات

۳۱۴

اول، تو ہد کہ اسے خدا کے عالم الغیب ہونے کا ہوا بقین ہے اور ہمیں ہے جو اسے تھہائی میں بھی روزے کے حدود کا ہابند رکھتا ہے۔

دوم، اس کو آخرت اور حساب و کتاب اور ہوا ایمان ہے اس لیے کہ اس کے بغیر کوئی شخص ۱۲، ۱۳ گھنٹے بھوکا نہیں ہو سکتا ہے۔

سوم، اس کے اندر اپنے فرض کا احساس ہے۔ بغیر اس کے کہ کوئی شخص اس پر کھانے نہیں کی ہابندی لکائے اس نے خود سے اپنے اوہر بہ ہابند کر دی۔

چہارم، مادیت اور روحانیت کے انتخاب میں اس نے روحانیت کو منتخب کر لیا اور دنیا اور آخرت کے درمیان ترجیح کا سوال جب اس کے سامنے آیا تو اس نے آخرت کو ترجیح دی۔ اس کے اندر اتنی طاقت نہیں کہ اخلاق فائدے کی خاطر مادی نعمان برداشت کر لیا۔

پنجم، وہ اپنے اُب کو اس معاملے میں آزاد نہیں سمجھتا کہ سروں دیکو کر مناسب موسم میں روزے رکھ لے بلکہ جو بھی وقت مقرر کیا گیا ہے، اس نے اس کی ہابندی کی ہے۔

ششم، اس میں صبر و استقامت، تحمل، بکاری اور دنیوی تحریمات کے مقابلے کی طاقت کم از کم اتنی ہے کہ رضاۓ الہی کے ہند نصوب الین کی خاطر وہ ایک ایسا کام کرتا ہے جس کا نتیجہ مرلنے کے بعد دوسری زندگی ہو ملتوبی کر دیا گیا ہے۔

ہے کیفیات، جو روزہ رکھنے کے ساتھ انسان کی زندگی ہیں ابھری ہیں، روزوں میں عمل ایک طاقت بن جائی ہیں اور ہر سال ایک ماہ روزہ رکھنے رکھتے رکھتے ہے انسان کی فطرت ثانیہ بن جائی ہیں۔

۲۔ ضبط للغس: اس تراث کے خاطرے میں کسی کے لیے دو خواہشوں کو خاص طور پر منتخب کیا گیا ہے۔ یعنی بھوک اور جنسی خواہش۔ اور ان کے ساتھ تیسرا خواہش، آرام کرنے کی خواہش، یہی زد میں آجائے ہے اس لیے کہ تراویح ہڑھنے اور سحری کے لیے الہمنے سے اسی اور یہی کالی ضرب اڑتی ہے۔

بُقایے نفس کے لیے مذا اور آرام اور بُقایے نسل کے لیے توالد و تناسل حیوانی زندگی کے مطالبات میں اصل و بنیاد کا حکم رکھتے ہیں۔ انسان کے حیوان جسم کے اہم ترین مطالبات ہی ہیں۔ اور حیون کہ وہ ذرا اونچے قسم کا حیوان ہے لہذا وہ صرف غذا ہی نہیں مانگتا بلکہ اونچی قسم کی اور نت نئی خذائیں تلوش کرتا ہے۔ یہی حال دیگر خواہشات کا ہے کہ ان میں بھی انسان کا مطالبه ہے جسمانی تسکین نہیں رہ جاتا، ہزاروں نڑا کتھن اور بار بکان نکل آتی ہیں۔ اب اکر انسان کا مطمع نظر دین جائے کہ کسی طرح ان خواہشات کی تسکین کرتا رہے تو یہ خواہشات نفس انسانی در سوار ہو جاتی ہیں۔ اس کے بخلاف اگر انسان ارادے کی راکھن، فضولی سے تدارے رہے تو ان خواہشات کو اپنے بھجوئے اور مرضی کے مطابق حلا سکا ہے۔ روزے کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد انسان کو اس کے حیوانی جسم در اندار بخشنا ہے۔ مذکورہ بالا تین خواہشات، جو انسان کی تمام حیوانی خواہشات میں سے زیادہ اہم ہیں، روزہ ان تینوں کو گرفت میں لے لیا ہے اور ان کے بعد میں مضمون اکام دے کر راہیں ہمارے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ تیس دن کی مسلمان میٹن کا مقصد وہ ہے کہ بجائے اس کے کہ ہمارا نفس ہم پر غلبہ حاصل کر لے ہم اپنے خادم ہر پورا اقتدار حاصل کر لیں، جس خواہش کو جاہیں روک دیں اور اپنی جس قوت سے جس طرح چاہیں کام لئے سکیں اس لیے کہ وہ شخص جسے اپنی خواہشات کا مقابلہ کرنے کی کبھی عادت نہ رہی ہو اور جو نفس کے ہر مطالعے پر لے جوں و چرا سر جھکا دینے کا خوگر رہا ہو اور جس کے لیے حیوانی جیلت کا داعیہ ایک فرمان واجب الاذعان کا حکم رکھتا ہو، دنیا میں کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔

بہاں روزے اور غیر اسلامی نفس کشی کی مشقوں کا اصولی فرق ذہن میں رکھنا چاہیے۔ اس لیے کہ بہ دوسروی قسم کا اقتدار تو دراصل ابھی جاہل، مطلق العنان خودی کا استبداد ہے جو اپنے سے بالآخر کسی حاکم کی مطیع اور کسی خابطہ و قانون کی پابند نہیں ہے۔ اس اقتدار کے لیے انسان خود اپنی فطرت سے لڑتا ہے اور جسم اور نفس سے ان کے جائز حقوق چھینتا ہے۔ اس کے بخلاف اسلامی روزہ جس خودی کو نفس اور جسم پر اقتدار دیتا ہے وہ مطلق العنان خودی نہیں بلکہ خدا اور اس کے قانون کی اطاعت کرنے والی خودی ہے۔ ابھی خودی جو خدا کی طرف سے آئی ہوئی ہدایات، علم اور کتاب مسیحی کی رہنمائی میں جائز والی ہے، وہ خدا کے دینے ہوئے نفس و جسم کو اپنی ملکیت نہیں سمجھتی بلکہ اسے خدا کی امانت مان دی اس پر خدا کی منشا کے مطابق حکومت کرنے ہے۔

ایسا یہودی کا حاصل اپنے جسم پر ظلم نہیں کرتا بلکہ اس کو تمام جائز راحتیں
اپنے ہونانا ہے لیکن وہ اسے اس بات کی اجازت نہیں دینا کہ حدود اللہ کو
نہ لے ڈالے ۔

اجتماعی الرات : بہان تک جو کچھ کہا کیا ہے وہ افراد کی تربیت ہے
یعنی تھا۔ ہم نے دیکھا کہ

اول ، اس تربیت کے ذریعے سے جماعت کے ہر فرد کو مخداوند عالم کی
ماکہت کے مقابلے میں اپنی خود مختاری سے عمدہ دست بردار ہو جانے کے لیے
پہنچا جائے ۔

دوم ، ہر فرد کے ذہن میں خدا کے عالم الفیب والشہادہ ہونے اور آخرت
میں باز پرس کا عقیدہ عملی مشق و تمدن کے ذریعے اس طرح جاگزین کر دیا جائے
کہ وہ خود اپنی شخصی ذمہ داری کے احساس کی بنا پر (نہ کہ خارجی دباوی
وہی ہے) قانون الہی کی اطاعت کرنے لگے ۔

سوم ، ہر فرد میں روح ہمونک دی جائے کہ ماسوا اللہ کی بندگی و اطاعت
اعتقاداً و عملًا منکر ہو جائے اور اس کی بندگی اللہ کے لیے خالص ہو جائے ۔

چہارم ، ہر فرد کی اخلاقی تربیت اس طرح کی جائے کہ اسے اپنی خواہشات
پر مکمل انتدار حاصل ہو جائے اور اس میں صبر و تحمل ، جفاکشی ، توکل علی اللہ ،
ثابت قدسی و یکسونی کی صفات پیدا ہو جائیں اور اس کے کردار میں اتنی موت آجائے
کہ وہ خارجی ترمیحیات اور سیلانات نفس کا مقابلہ کر سکے ۔

بھی وجہ ہے کہ روزے ہر عاقل و بالغ فرد پر فرض کیجئے گئے ہیں ۔ اگرچہ
ضروری نہیں کہ تمام افراد میں مندرجہ "ہالا خصوصیات بدرجہ" اتم پیدا ہو جائیں
جو اس سے پیدا کرنی مطلوب ہیں ۔ اس لیے کہ خارجی عوامل کے ملاوہ ذاتی
استعداد اور خواہش بھی ضروری ہے ، لیکن خارجی طور پر اس سے بہتر نظام تربیت
دنیا میں ممکن نہیں ہے ۔

اجتماعی فروالد : اگرچہ روزہ انفرادی فعل ہے لیکن نماز کے باجماعت ہونے
کی وجہ سے جس طرح نماز اجتماعی فعل بن جاتی ہے اسی طرح روزہ رکھنے کے لیے
اپک خاص سہوئی کے تقریر نے اس فعل کو ایک اجتماعی عمل بنا دیا ہے ۔

اس حکیماں تدبیر ہے روزے کے اخلاق و روحانی منافع ہیں جو انسانہ ہوا ہے لہری طرف بہاں چند مختصر اشارات کیجئے جائے ہیں:

تقویٰ اور ہاکبزگی کی لفڑا: اس عمل کی خصوصیت یہ ہے کہ ابک خارج سم کی فضیلی لفڑا پیدا ہو جائی ہے۔ ابک شخص انفرادی طور پر کسی ذہنی کیفیت کے تحت کوئی کام کر رہا ہو اور اس کے گرد و پیش دوسرے لوگوں میں "ذہنی کیفیت" نہ ہو تو وہ اس ماحول میں اجنبی بن کر رہ جائے گا۔ اور ماحول نہ صرف یہ کہ اس کے بڑھانے میں کوئی مدد نہ دیے گا بلکہ اس کی کیفیتیں کو کھوادے گا۔ لیکن، اگر ہوئے ماحول پر وہی لفڑا طاری ہو اور تمام لوگ ابک ہی خجال اور ابک ہی ذہنست کے مانع ابک ہی عمل کر رہے ہوں تو معاملہ بروکس ہو گا۔ اس وقت ابک ابسی اجتماعی لفڑا بن جائے گی جس میں ہوڑی جامن اور وہی ابک کیفت چھائی ہوئی ہوگی اور ہر فرد کی اندرولی کیفت ماحول کی خارجی اعانت سے مذاہلے کر بے حد و حساب بڑھتی چلی جائے گی۔ ابک ابک سماں کا الگ الگ جنگ کرنا اور سماں کا برداشت کرنا کسی فر مشکل ہے؟ لیکن جہاں فوج کی فوج ابک سانہ مارچ کر رہی ہو وہاں جذبات شہادت و حساست کا ابک طوفان امند آتا ہے جس میں ہر سماں مستانہ وار بہتا چلا جاتا ہے۔

روزے کے لیے رمضان کا مہینہ مقرر کر کے شارع نے یہی کام لیا ہے۔ جس طرح کہ دیکھنے ہیں کہ ہر غلہ اپنا موسیٰ آئے ہو خوب ہملا ہمولا ہے اسی طرح رمضان کا مہینہ گویا خیر و صلاح اور تقویٰ و طہارت کا موسیٰ ہے جس میں برائیاں دہنی اور نیکیاں ہملا ہمولا ہیں۔ اسی لیے احادیث میں آیا ہے کہ جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیے جائے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیے جائے ہیں۔

جماعتی احسان: اجتماعی عمل کا ابک دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے لوگوں میں لطیری اور اصل وحدت پیدا ہوتی ہے۔ نسل ہا زبان کا اشتراک لطیری قویت پیدا نہیں کرف۔ اُدمی کا دل صرف اسی سے ملتا ہے جو خیالات اور عمل میں اس سے ملتا ہے۔ ہمیں وہ اصل رشتہ ہے جو دو اُدمیوں کو ابک دوسرے سے باندھتا ہے۔ جب کوئی شخص اپنے گرد و پیش کے لوگوں کو ذہنست اور عمل

بہ اپنے ہے مختلف ہاتا ہے تو صریح طور پر اپنے آپ کو ان کے درمیان اجنبی مدد کرتا ہے۔ مگر جب بہت ہے لوگ مل کر ابکھی می ذہنی عمل کے ساتھ اپنی ہی عمل کرنے ہیں تو ان میں باہمی بگانگت، ریالت، بک جہتی اور برادری کے گھرے تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں۔ نیک ہو ہا بدی دونوں صورتوں میں اپنامی نسبیات اسی طرح کام کریں ہے۔ مگر لمرق ہے کہ بدی کے راستے میں الاد کی نسبیات کا دخل رہتا ہے جس کا نظری مہلان فرد فرد کو ہواز کر الگ کر دینے کی طرف ہے۔ اس بنا پر برادری مستعکم نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف نیک کے راستے میں نسبانوں دہتی ہے اور نیک خیالات و اعمال کا اشتراک بہترین رینے، اخوت پیدا کر دیتا ہے۔

امداد باہمی کی روح: اس اجتماعی عبادت کا تیسرا زبردست کام یہ ہے کہ ہے عارضی طور پر تمام لوگوں کو ابک سطح پر لے آئی ہے، اگرچہ امیر امیر ہی رہتا ہے اور غریب غریب، لیکن روزہ چند گھوٹوں کے لیے امیر ہو بھی وہی کیفیت طاری کر دیتا ہے جو اس کے نالہ کش بھائی پر گذرق ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی مصیبت حقیقی طور پر محسوس کرتا ہے۔ اور خدا کی رضا کا جذبہ اسے غریب بھائیوں کی مدد پر اکساتا ہے۔ جس قوم کے امیروں میں غریبوں کی تکلیف کا احساس اور ان کی عمل ہمدردی کا جذبہ ہو اور جہاں صرف اداروں میں کو خیرات نہ دی جاتی ہو بلکہ فردآ فردآ بھی حاجت مندوں کو تلاش کر کے مدد پہنچائی جاتی ہو، وہاں لہ صرف یہ کہ قوم کے کمزور حصے تباہ ہونے سے بچ جاتے ہیں اور اجتماعی فلاح پر تواریخی ہے بلکہ غربت اور امارت میں حسد و نفرت کے بجائے محبت اور شکر گزاری کے تعلقات استوار ہوتے ہیں اور وہ طبقائی کشمکش کبھی رونما نہیں ہو سکتی جو ان قوبوں میں بربا ہوتی ہے جن کے مالدار لوگ جانتے ہیں نہیں کہ فقر و فاقہ کبا چیز ہوتی ہے اور جو قحط کے زمانے میں تعجب سے بوجھتے ہیں کہ لوگ یہو کے کیوں مر رہے ہیں۔
الہی روفی نہیں ملتی تو وہ کیوں کیوں نہیں کہا نہیں؟

زکواۃ

* زکواۃ کے بارے میں قرآن و سنت میں جو کچھہ کہا گیا ہے اس پر نظر دالیں تو محسوس ہوتا ہے کہ عبادات میں اس کا مقام اماز ہے اس ایک ہی درجہ

پر محسوس ہوتا ہے کہ عبادات میں اس کا مقام اماز ہے اس کا کتاب "اسلام ایک نظر میں" ہے، ماخوذ ہے۔

۰ یہ سعد مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی کی کتاب "اسلام ایک نظر میں" (مرتب) ہے۔

نہیں ہے، مثال کے طور پر قرآن میں ایمان کے بعد جہاں اعمال صالحہ کا ذکر آتا ہے بالعموم صرف دو اعمال کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ابک نماز کا اور دوسرے زکوٰۃ کا۔ یعنی ایک معیاری مومن کا تصور سامنے لانا ہوتا ہے تو عموماً اس طرح کے اللہ استعمال ہوتے ہیں:

لَئِنْ لَكُنَ الظُّلُمُ وَعَمِلُوا الطَّيِّبَاتِ وَأَقْلَمُوا الْعَكْلَةَ وَأَتُوا الرِّزْقَ لِهُمْ بَخْرَةً لَمْ يَعْدُنَّ تَبَرُّهُ

(بلا شہم) لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے صالح اعمال کیے، اور نماز قایم کی اور زکوٰۃ دی، ان کے لیے ان کے رب کے باس اجرہ۔ (البقرۃ۔ ۲۴۴)

حالان کہ نماز اور زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت یہ ایسے اچھے اعمال رخلاق ہیں جن کا وجود معیاری مومن و مسلم بنے کے لیے ضروری ہے۔ سوال ہے کہ قرآن محض دو کا نام لیے کر خاموش کیوں ہو جاتا ہے؟

اس کی وجہ پر معلوم ہوئے ہے کہ نماز اور زکوٰۃ دین میں اتنا اہم ملام رکھتی ہیں کہ جس نے ان دونوں کو اچھی طرح ادا کر لیا اس نے گوپا ہولے دین پر عمل کرنے کی بھی فضانت اور عمل شہادت فراہم کر دی۔ وہ اس طرح کہ احکام دین کی اصول تقسیم دو ہی طرح ہو سکتی ہے۔ ابک قسم ان احکام کی مولیٰ جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کے حقوق سے ہے اور دوسری قسم ان احکام کی ہوگی جن کا تعلق بندوں کے حقوق سے ہے۔ نماز حقوق اللہ کا مفہوم ہے اور زکوٰۃ حقوق العباد کا جس طرح اگر ایک شخص والی نماز کا حق ادا کر دے تو ممکن ہی نہیں کہ وہ مسجد میں باہر آکر خدا کو بھول جائے اسی طرح اگر ایک شخص زکوٰۃ کا حق ادا کر دے تو یہ ممکن نہیں کہ بندگان خدا کے حقوق پاٹاں کرتا رہے۔

زکوٰۃ کی اس اہدیت کی ابک اور وجہ بھی ہے۔ قرآن اس طبیعت کی ہمارے تلقین کرتا ہے کہ دین و ایمان میں زندگی اسی وقت آ سکتی ہے جب اللہ کی محبت ہر دوسری محبت پر غالب، اور آخرت کی طلب فر دوسری طلب پر نکلم ہو۔ نماز اور زکوٰۃ انسان کو ابسا ہی خدا ہرست اور آخرت پسند بنانے کی سب ہے زیادہ موثر تدوہوں ہیں۔ ابک ابجای طور پر اور دوسری سلی طور پر۔ نماز انسان کو خدا اور آخرت کی طرف لے جانے ہے اور زکوٰۃ اسے دنیا کی طرف لڑک جانے سے محفوظ رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت کی کامیابی کا راستہ اگر کڑی چڑھان کا راستہ ہے تو یہ دونوں چیزوں اس راستے پر سفر کرنے والی انسان عمل

اسلامی تصور عبادت اور اسلامی عبادات

۳۹۲

کے دو انجن ہیں۔ نماز کا انجن اسے آگے سے کوہنہتا ہے اور اس طرح کاری آگے بڑھتی ہل جاتی ہے۔

[مقاصدِ زکواۃ]

زکواۃ کے مقاصد کے بارے میں کتاب و سنت میں جو کہہ فرمایا گیا ہے
کہ جائزہ لہجے تو معلوم ہوتا ہے کہ زکواۃ کے تین اہم فوائد یا مقاصد ہیں۔

نزکبہ نفس : زکواۃ کا حقیقی اور بنیادی مقصد جس کا تعلق بالکلیہ شخص
یا اپنا ذات ہے ہوتا ہے، یہ ہے کہ زکواۃ دینے والے کا دل دنیا کی حرص سے
ہاں ہو کر نیک اور تھوڑے کے کاموں کے لئے تیار ہو جائے۔ قرآن میں ہے :

وَسَيِّئُهُمَا الْأَكْثَرُ الَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا أَنْهَا كَرْبَلَةَ

اس شخص کو جہنم سے دور رکھا
جائے گا جو خدا سے کرنے والا ہو
اور جو اپنے نزکبہ کی حاطر دولت
دوسروں کو دینا ہو۔ (اللیل ۱۸۱)

گوہا صدقہ اور زکواۃ کی اصل غایت دل کی ہاں اور نفس کا نزکبہ ہے۔
برشنس جانتا ہے کہ دنیا کی محبت ہی وہ چیز ہے جو خدا ہرستی کی اصل دشمن
ہے اور جو انسان کو خدا اور آخرت سے بیگانہ بنانکر رکھ دیتی ہے۔ حضور
(صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہے کہ ”دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے۔“
دنیا کی محبت مختلف شکلوں میں اسکتی ہے لیکن اسی سب سے معروف اور خطرلاک
شکل دولت کی محبت ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کوامت مسلمہ کے لیے
سب سے بڑا خطرہ بنایا تھا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا قول ہے ”میری آست
کا (سب سے بڑا) فتنہ مال ہے۔“ اگر آدمی اپنے آپ کو اس فتنے کی گرفت سے
بچالے تو اور بہت سی برائیوں سے بچ سکتا ہے۔ اور اچھائیاں نشو و نما ہاسکتی
ہیں۔ خود زکواۃ کے لفظی معنی بھی ہاکیزگی اور نمو کے ہیں، گوہا اس طرح نفس
میں ہاکیزگی آتی ہے اور صفات حسنہ کی قوت نمو میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ
بادر کھانا چاہیے کہ زکواۃ کا بنیادی مقصد بعض اس بات سے حاصل نہیں ہوتا کہ
انی دولت کا ایک حصہ نکال کر کسی غربب کو دے دیا جائے بلکہ اسی وقت
حاصل ہو سکتا ہے جب اس عمل کے اچھے سبھی نتی اور عمل اعتمام ہو۔ مقصود

صرف خدا کی رضا کا حصول ہو، نام و نمود کی خواہیں ہا کسی ہر احسان دمر لے کا جذبہ کار لرمائی ہو، لینے والے کی عزت نفس کو نہیں نہ ہنچائی جائے، زکوہ ہاک کمائی ہے ادا کی جائے اور زکوہ کوئے کے ارکان ہیں لیکن اصل عینہ نفس کی ہوں؟ جس طرح نماز کا ظاہری ہملو اس کے ارکان ہیں لیکن اصل چیز توجہ الٰہ ہے اسی طرح زکوہ کا ظاہری ہملو ادائیگی نقد و جنس ہے لیکن اس کا باطن دلیا کے مقابلے میں آخرت کو فوکیت دینا ہے۔ اور باطن کے تکافی اس وقت ہوئے ہو سکتے ہیں جب اور کی شرائط کا خیال رکھا جائے۔

امداد باہمی: زکوہ کا دوسرا مقصد ہے کہ ملت کے نادار افراد کی مدد کی جائے تاکہ ان کی بنيادی ضروریات ہوئی ہوئی رہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :

ان افہم النرض علیہم صدقہ نو خلد من
اگبنا لهم فترد ال فرقا هم۔

اس سے معلوم ہوا کہ زکوہ کا ایک مالی اجتماعی اور معافی ہملو ہی ہے اور اس کے بغیر زکوہ کا اسلامی ہملو مکمل نہیں ہوتا۔ ایک شخص ہے ہوئی للہمہ کے ساتھ اپنی دولت کا حصہ نکالا تو بلاشبہ اس نے اپنے دل کی ہاک اور اپنے نفس کے تذکرے کا اہتمام کر لیا۔ مگر اس کا یہ فعل شریعت کے نزدیک اپنی ادائی زکوہ نہیں ہنا۔ یہ ادائی زکوہ اس وقت ہنرے کا جب وہ اپنی نکال ہوئی دولت کو حق داروں کے حوالے کر دے کا۔ یعنی دل کی ہاک اور نفس کے تذکرے کا زکوہ کی بنيادی غرض و خاکہ ہونا مسلم، لیکن اس مال و زکوہ کا غربیوں کی حاجت روانی کا ذریعہ بتا ہیں اپنی جگہ بالکل ضروری ہے اور اس کے بغیر زکوہ کا شرعی فریضہ ادا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے زکوہ کو کھانے پتھرے افراد کی دولت میں غربیوں کا حصہ کہا ہے۔ اور یہ حق اپسائے جس کی خاطر اسلامی حکومت تلوار ہیں الہا سکتی ہے۔ دین میں اس بات کی جو اہمیت ہے اس کا ہورا اندازہ اس حدیث سے ہوتا ہے کہ ”وہ شخص مومن نہیں جو خود تو سیر ہو کر کھالی اور اس کے ہملو میں اس کا ہڑو سی ہو کر رہے۔“ اسی طرح ایک طویل حدیث میں بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ابک انسان ہے کہیں کا کہ میں نے تجھے سے کھانا مانکا تھا لیکن تو نے مجھے کھانا نہیں کھلا لیا۔ ہندہ جواب دے کا کہ خدا یا میں تجھے کہیں کھلا سکتا ہوں،

اسلامی تصور عبادت اور اسلامی عبادات

۲۲۵

ند تو اس مارے جہاں کا ہالنہار ہے ۔ ارشاد ہو کا کہ کیا تعجب نہیں معاوم کہ
بیرے ہلاں بندے نے تجوہ سے کہاں مانگا تھا ایکن تو نے اسے کھلانے سے انکر
کر دیا تھا ۔

جو دین ایک حاجت مند کی بھوک ہیاس کو خود اللہ تعالیٰ کی بھوک ہیاس
تعجب کرتا ہو، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کے بہان غربیوں اور ناداروں
کی حاجت اور آری کی کیا اہمیت ہوگی ۔

دین کی نصرت : زکواہ کا ایک اور مقدار دین کی حفاظت اور نصرت ہے ۔
قرآن میں اہل ایمان سے جگہ مطالبه کیا گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اپنے
مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کرو ۔ جہاں اہل ایمان کی بنیادی صفات بیان کی
جاتی ہیں ان میں اللہ کی راہ میں اپنے مال سے جہاد کرنے کی بات لازماً موجود
ہوتی ہے ۔ اس کا مفہوم بالکل واضح ہے ۔ اور وہ یہ کہ دین کی خاطر جہاد کرنے
کے لیے جن مصارف کی بھی ضرورت ہوئے انہیں اپنے پاس سے سپا کرو ۔

دین کی حفاظت و نصرت معمولی کام نہیں، اس لیے اس کی خاطر اپنی
دولت خرج کرنا بھی معمولی کام نہیں ۔ قرآن حکیم نے ایک جگہ جہاد کا حکم
دہنے ہونے فرمایا :

وَأَنْتُخُوا فِي سَيِّئِ الْهُوَ لَا تُلْقُوا يَدَكُمْ إِلَى الْقَمَلَةِ!

✓
اپنے کی راہ میں خرج کرو اور ہاتھ روک کر اپنے
آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو ۔ (البقرة - ۱۹۵)

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دین کی حفاظت و نصرت کے لیے مالی اتفاق
کے جی چرانا ہلاکت کو مول لینا ہے ۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ۔

زکواہ کی مقدار

زکواہ کی قانونی اور لازمی مقدار مختصرًا حسب ذیل ہے :

(۱) زرعی ہداوار ہر۔ اگر آب پاشی کی ضرورت پیش آئی ہو تو ہائج

فیصلی۔ نہ آئی ہو تو دس فیصلی؛

(۲) جمع شدہ رقموں، زیوروں اور تجارتی مالوں ہر ڈھانی فیصلی؛

(۳) جنگل کی چڑائی ہر ہائی والے جانوروں ہر ڈبڑھے ڈھانی فیصلی تک

(۴) معدنیات اور دفینوں میں ہے بھس فیصلی تک؛

اتسی زکوٰۃ کا ادا کرنا تو ہر مالدار مسلمان ہر فرض ہے۔ یعنی قانونی طور
ہو ضروری ہے۔ لیکن اسلام کی تلقین یہ ہے کہ اس قانونی حد ہر نہ رکا جائے بلکہ
اس سے اگے بڑھنے کی رضا کارانہ کوششی جاری رکھی جائے۔ جس قدر مال قانونی
طور ہر منعین کر دیا گیا ہے اس کی ادائیگی کو زکوٰۃ کہتے ہیں، اس کے اگے
رضا کارانہ طور ہر جو کچھ خرچ دیا جائے اسے صدقہ ہا اتفاق فی سبیل اللہ کہتے ہیں۔

زکوٰۃ کے مصارف

زکوٰۃ کے مصارف اللہ تعالیٰ نے قرآن میں منعین کر دیے ہیں:

زکوٰۃ لفڑا اور مساکین اور زکوٰۃ کے صبغے میں کام کرنے والوں
اور ان لوگوں کے لیے ہے جن کے دلوں کو اسلام کی طرف ملاٹا ہے
اور (خلاصی ہے) کو دن چھڑانے میں، فرض ادا کرنے میں، اور خدا
کی راہ میں اور مسافر ہر خرچ کرنے کے لیے مفرد کی گئی ہے۔

اس طرح قرآن نے منعین کر دیا کہ زکوٰۃ کے حق دار آئندہ ہیں جن کی
تفصیل یہ ہے:

(۱) لفڑا: ۴۰ و لوگ ہیں جن کے ہاس کچھ مال تو ہو مگر ان کی
ضروریات کے لیے کال نہ ہو، تنگ دستی میں گزر اسر کرتے ہوں اور کسی
مانگتے نہ ہوں۔

(۲) مساکین: ۴۱ بہت ہی تباہ حال لوگ ہیں جن کے ہاس انہیں نہ کی
ضروریات ہوئی کرنے کے لیے بھی کچھ نہ ہو۔ بعض صحابہ اپسے لوگوں کو ہر
مساکین کے زمرے میں رکھنے تھے جو کمائی کی طاقت رکھتے ہوں مگر جنہوں
روزگار نہ ملتا ہو۔

(۳) صبغہ زکوٰۃ کے کارکن: ان سے مراد وہ لوگ ہیں جنہیں حکومت
زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے مفرد کرے، ان کو زکوٰۃ ہی کی مدد سے تنخوا
دی جائے گی۔

(۴) مؤلفہ القلوب: ان سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو اسلام کی حادث
کے لیے ہا اسلام کی مخالفت سے روکنے کے لیے روپیہ دینے کی ضرورت پہنچ آئے۔
اگر دوف نو مسلم اپنی قوم کو چھوڑ دی آئئے کی وجہ سے یہ روزگار ہو گیا تو
ہواں کی مدد کرنا مسلمانوں ہر فرض ہے۔

اسلامی تصور عبادت اور اسلامی عبادات

۴۲۴

(۵) مسلمی سے رہائی دلانے کے لئے : اگر کوئی شخص ملکی کے بندے نہ لے جائے تو اسے زکواہ دی جائے تاکہ انہے مالک کو روپیہ دے کر انہی کو دین چھوڑا لے۔ آج کل کے زمانے میں ملکی کا رواج نہیں ہے اس لیے جو لوگ جیسا نہ ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے قید ہو گت رہے ہوں ان کو زکواہ دے کر بے ملکی حاصل کرنے میں مدد دی جا سکتی ہے۔

(۶) قرض دار : جس شخص ہر اتنا قرض ہو کہ اسے ادا کرنے کے بعد اس کے بے ملکی نعماب ہے کم مال بھٹا ہو اسے زکواہ دی جا سکتی ہے۔

(۷) مل سبیل افہم : یہ لفظ تمام نیک کاموں پر استعمال ہوتا ہے لیکن اس سے بے ملکی طور پر مراد دین حق کا علم بلند کرنے کی جدوجہد میں مال اعانت کرنا ہے۔

(۸) مسالہ : اگرچہ مسالہ کے ہاتھ اس کے وطن میں کتنا ہی مال کیوں نہ ہو لیکن حالات مسافرت میں اگر وہ محتاج ہو گیا ہے تو اسے زکواہ دینی چاہیے۔

زکواہ معاشی نقطہ نظر سے

* اسلام دین اور دنیا کے استزاج کا داعی ہے۔ اس لیے اس کی عبادات بھی اخلاق فوز و فلاح کے ساتھ دنیوی زندگی کی اصلاح اور اس کی صحیح خطوط پر تعمیر کی بھی ضامن ہیں۔ زکواہ جہاں جب مال کو کم کرنی اور خدا کی راہ میں خرج کرنے اور مال قربان کرنے کا جذبہ پیدا کرنے ہے وہی معاشی نقطہ نظر سے یہ سماں فلاح کی ایک ہمہ گیر اسکیم ہے جس کے ذریعہ ملک و ملت کے محبوب اور نادار افراد کی مدد کی جاتی ہے اور انہیں زندگی کی جدوجہد میں ہر اور کی شرکت کے لائق بنایا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت یہ ہات پیدا کرنی ہے کہ ہر شخص کے لائق ہو جانا چاہیے۔ اور معاشی دولت میں جو ہمہ ہو جائے اور جو کر جائے کی دولت صرف اسی کے لیے ہے اور معاشی دولت میں جو ہمہ ہو جائے اور کر جائے اسے لئا ہو جانا چاہیے۔ کشمکش حیات نہیں زندہ رہنے کا حق صرف اس کو ہے جو مسابقت میں دوسروں سے اگے بڑھ جائے۔ اسلام اس ذہنیت کی نفی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے : جو کچھ دوست تم کماتے ہو وہ صرف تمہاری محنتوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس میں نظرت کی ہے شمار قوبیں شریک کار ہیں۔ نیز ہورا معاشرہ مزاروں طریقے پر تمہارا معاون و مددگار ہے۔ اس لیے تمہارے مال میں تمہارے علاوہ

دوسروں کا بھی حق ہے۔ اہل نبوت کی ذمہ داری ہے کہ معاشی دول میں جو اچھے رہ جائے اسے سارا دین اور آگے بڑھائیں۔ جو معاشرہ بمزوروں کی مدد نہ کرے، ناداروں کو سہارا لہ دے، اور گیرتوں کو تھام نہ لے وہ انسان معاشرہ کسے جائز کا مستحق نہیں۔ اسلام نظام زکواہ کے ذریعے سے، عیشت دو صحت مند بنیادوں پر استوار کرتا ہے اور اس میں امداد باہمی کی روح کو جاری و ساری کر دیتا ہے۔

جدید علم عیشت میں سماجی فلاح کا تصور بہت نیا ہے۔ لیکن اسلام نے ہمیں ہی دن سے فلاحی اور خدمتی ریاست کا تصور پیش کیا اور زکواہ کی شکل میں امداد باہمی کا ایک اپنا نظام قائم کیا جس کے ذریعے سے تمام شہریوں کی انسانی ضروریات کی ضمانت دی گئی۔ اسلامی حکومت نے ابتداء سے ہی اس نظام کو عمل قائم کیا، آبادی کی مردم شماری کی، ناداروں کے رجسٹر بنانے، ہر ضرورت مند کو سرکاری وظیفے دیتے اور تھوڑے ہی عرصے میں یہ حال ہو گیا کہ یہ قول مورخ طبری زکواہ دینے والے تو ہر طرف تھے مگر زکواہ لینے والے نہ ملتے تھے۔

ہر زکواہ دولت کی تقسیم میں غیر فطری عدم مساوات کو ختم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس ذریعے سے امپروں کی دولت غریبوں کی طرف منتقل ہوئی ہے اور اس طرح تقسیم دولت صحت مند بنیادوں پر واقع ہوئی ہے۔

عیشت کا ایک اور بنیادی مسئلہ دولت کی ذخیرہ اندازوی کو روکنا اور سرمایہ دری کو بڑھانا رہا ہے۔ آج کی دنیا میں جہاں جہاں معاشی بس ماندگی ہے اس کا بڑا سبب دولت کی خلط تقسیم اور صحیح سرمایہ کاری کا فقدان ہے۔ زکواہ کا ایک معاشی وظیفہ ہے بھی ہے کہ اس کے ذریعے سے دولت اپنے سرمایہ کاری کی طرف منتقل ہوئی ہے اس لیے کہ اگر اسے ذخیرہ کیا جائے تو ۳۰ سال میں وہ اپنے سے اپنے ختم ہو جائے گی۔ اس لیے اس کا فطری نتالا ہوتا ہے کہ دولت کو روک دئئے کے بعد کاروبار میں لکا با جاتا ہے اور اس سے معاشی ترقی رونما ہوئی ہے۔

ہر معاشی بعران کے جس چکر میں سرمایہ دارانہ دنیا گرفتار ہے اس کو دور کرنے میں بھی زکواہ بڑی مفہمد و معاون ہو سکتی ہے۔ تجارتی چکر سرمایہ کاری اور قوت صرفہ میں عدم توازن کی بنا پر رونما ہوتا ہے لیکن زکواہ جہاں ایک طرف اپداواری عمل کو تیز تر کر رکھتے ہیں وہیں دوسری طرف عوام میں قوت خوبید کا اضالہ

کرنی ہے۔ اس طرح یہ مبینت میں معاشی توازن قائم کرنے کا ایک خود کار
الہا ان جان ہے۔

زکوٰۃ ایک انقلابی معاشی تصور ہے اور یہ حقیقت بڑی افسوس ناک ہے کہ
مسلمانوں نے اپنی تک اس کے ہدہ جہنمی معاشی ہماروں کا مطالعہ نہیں
لیا ہے۔ اگر اس کے معاشی لوائند ہر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ
دریے نظام معاشی کی قلب ماهیت کر دیتی ہے۔ اسے صحت مند اور انسان
پا دوں پر قائم کرنی ہے اور ایک ایسا نظام قائم کرنی ہے جس میں جد و جہد
کے دروازے سب کے لئے کھلے ہوں اور زندگی کی نعمتیں تمام انسانوں کے لئے
ام ہوں۔

حج

• حج کے لغوی معنی زیارت کا ارادہ کرنے کے ہیں۔ شریعت کی زبان میں
ہی عبادت کو حج اس لیے کہا گیا ہے کہ اس میں انسان کعبہ کی زیارت کا
ادہ رکھتا ہے۔ حج ہر بالغ اور صاحب استطاعت مسلمان ہر زندگی میں ایک ہمار
فن کیا گیا ہے۔ جو شخص حج کی قدرت رکھنے کے باوجود حج نہیں کرتا وہ
مسلمان ہونے کو جہنملا تا ہے:

وَلِلّٰهِ عَلَى الْقَابِسِ حِجُّ الْيَمِينِ مَنْ لِسْتَ مُطَاعِمٌ لِنَفْذِ سَهْلِ الْأَدْوَدِ وَمَنْ لَكُفَّرَ فَلَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَنِ الْمُعْتَمِدِينَ ۝

لوگوں پر افہ کا ہے حق ہے کہ جو یہیں استطامت رکھنا ہو اس کے گھر کا حج کرے
اور جس لیے کفر کی روشن اختخار کر (اے جان لینا چاہیے کہ) افہ سارے اہل جہاں
کے لیے نیاز ہے (آل عمران۔ ۹۰)

اسی طرح ایک حدیث میں آتا ہے کہ "جس شخص کو کسی بھاری ہا
الی ضرورت یا ظالم حکم ران نے روک نہ رکھا ہو اور اس کے باوجود حج
کرے تو چاہے وہ یہودی مرے جائے نصرانی۔"

حج کی اس اہدوں کے پیش نظر ہیں دیکھنا چاہیے کہ آخر کعبہ کیا
ہے جس کی زیارت کی اتنی اہمیت ہے، اور جو مراسم حج بیو ادا کیجے جائے ہیں
کے وجہ کون ہے تصویرات کام کر رہے ہیں؟

کہیں کی اہمیت : تعمیہ کی تعمیر اج سے تدبیباً ساری چار ہزار ہر سال میں
حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام کے ہاتھوں ہوتی تھی۔ اس کی تعمیر
کا حکم اور جگہ د تین دنوں خدا کی طرف ہے تھی۔ یہ دنیا میں بہلا کوئی
جو خدا کی عبادت کے مرکز کی حیثیت ہے بنایا گیا۔ اس گھر کی اہمیت ہے متعلِّق
قرآن میں آیا ہے کہ

وَإِذْ جَعَلْنَا لِبَيْتِكَ الْمَكَابِهَ الْمَثَابِهِ وَأَنَّا وَالْهُدُوْبِ مِنْ نَقْلِهِ لِهُدَمَهُ مَصَّلٌ

اور جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کے لیے مرجع اور امن
کی جگہ بنایا اور حکم دیا کہ ابراہیم کے کھڑکے ہونے کی
جگہ کو نماز ہدمیت کی جگہ بنالو۔ (البقرة - ۱۲۵)

جس وقت اس گھر کی تعمیر متروع ہوتی اس وقت اس کے مقدس معماروں نے
خدا کے حضور میں دعا کی تھی کہ

رَبَّاَتَقْبَلَ مَا تَلَاقَ أَنْتَ الْعَوْيَهُ الْمُلَيَّهُ بِقَوْلِنَحْلَنَا مُسْلِمَوْنَ لَهُ وَمَنْ ذَرْتَنَا أَنْتَ الْمُسْلِمَهُ لَهُ
وَأَنَّا مَنْتَلِمَلَنَا وَلَتَ عَلَيْهَا إِلَهٌ إِلَّا أَنْتَ الْكَوَافِرُ الرَّوْحَمَهُ

خدا یا، ہمارے عمل کو قبول فرماء، پہلیاً تو سب کچھ سنا اور جانتا ہے، مالک، میں
اپنا سجا فرمان بردار بنا دے اور ہماری اولاد میں سے ایک ایسا گروہ پیدا کر دے جو
نیرا فرمان بردار ہو اور ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتلا اور ہم پر کرم کی نظر رکھو،
بیشک تو نظر کرم فرمانی والا اور رحم کرنے والا۔ (البقرة - ۲۲۸ - ۲۲۹)

اس دعا سے معلوم ہوا کہ جس مقصد کی خاطر اس عمارت کی تعمیر عمل میں
انی ہے اس کی تکمیل ایک اوسے گروہ کے ذریعے ہے ہوگی جو انہیں بزرگوں کی ہا
دوسرے الفاظ، میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہوگا۔ چنان چہ جب
کہیں کی تعمیر سکمل ہو گئی تو حضرت اسماعیل علیہ السلام یہیں پس گئے۔ انہیں
کی اولاد میں سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کے ہاتھوں حضرت ابراہیم
اسماعیل علیہما السلام کی دعا ہوئی ہوئی۔ کہیں کی اسی اہمیت کے باہم نظر
مسلمانوں کا قبلہ، یعنی مرکز، قرار دیا گیا۔ نہ تمام مسلمان اس طرف رخ
کو کے نماز ہڑھا کریں۔

حج کے مراسم: اب ذرا ان مراسم ہر ایک نثار ڈالنے جو حج میں ادا
کیجئے جائے ہیں۔ جب کوئی شخص حج کے لیے روانہ ہوتا ہے تو مکرے سے کا
دونہ ہٹلے حج کی بالا عدد نہت پاندھتا ہے جسے "احرام" کہتے ہیں۔ احرام بالذمیح

لیا ہے، خدا کو مخاطب کو کے بلند آواز سے اکارنا ہے۔

لَبِّکَ الْهُمَّ لَبِّکَ، لَبِّکَ لَا شَرِيكَ لَكَ حَاسِرُونَ،
لَبِّکَ، انَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُكَبَّلُونَ،
لَبِّکَ، مَنْ حَاسِرُونَ، تَبَرَا كُولِي شَرِيكَ لَنْبِينَ،
سَمْدَ قَبْرِيَ هُنَّ، نَعْمَتِينَ تَبَرَا كُولِي شَرِيكَ لَنْبِينَ کَہ
بَادِ شَاهِي تَبَرَا هُنَّ اور تَبَرَا کُولِي شَرِيكَ لَنْبِينَ کَہ
(لَبِّکَ) کی بہ صدا اب ورد زبان بن جاتی ہے، احرام کے بعد عین وعشرين

ہے چھز اس بہ حرام ہو جاتی ہے، زیب و زینت منوع ہو جاتی ہے، اس حال
بین وہ مکنے ہہنگتا ہے اور وہاں کعبے کا طواف کرتا ہے۔ ذی الحجہ کی ۸ ویں تاریخ
کو لوگ منی کے مقام کے لیے روانہ ہوتے ہیں، وہاں سے عرفات جانے ہیں وہاں
ہے مزدلفہ اور وہاں سے ۱۰ویں آتے ہیں۔ 'جمرات' کو کنکرباہ مارتے ہیں،
زبانی کرنے ہیں سرمندانے ہیں، اور کعبے کا بار بار طواف کرنے ہیں۔

یہاں ان مراسم کی تفصیل کا موقع نہیں لیکن ان کے پھر جو روح کا فرما
ہے اس کی طرف اشارہ ضروری ہے۔

مناسک حج کی حکمتیں :

(۱) ان مراسم ہر گھری نظر ڈالیے تو ہو ایک چیز سے بندگی کی تصویر
اپنی ہے۔ احرام کے لباس کو لیجئے۔ یہ لباس نہیں بلکہ ایک طرف فقیری کے
احساس اور دوسری طرف فداکاری کے جذبے کا منہ بولنا نشان ہے۔ جس وقت ایک
نیبر یہ نوا اپنی جھوٹی وا کعبے کسی داتا کے دربار میں، یا ایک جانباز سپاہی
اپنی وردی میں میدان جنگ کی طرف جانا ہے تو اس کے خیالات اور جذبات
کو سمجھنے کے لیے الفاظ کی ضرورت باقی نہیں رہتی بلکہ اس کی ہیئت ہی سب کچھ
بنا اور سمجھا دیتی ہے۔ نہیک اسی طرح کعبے کی طرف جانے والی کی ہیئت خود
بولنی ہے کہ وہ اللہ ہی کے درکا بھکاری ہے اور اس کی لوج کا کفن برد و شس سپاہی!

(۲) اسی کے ساتھ ساتھ احرام کا یہ لباس ایک اور عظیم حقیقت کا اعلان
کرو رہا ہوتا ہے۔ دنیا کی مختلف قوموں کے افراد جب اپنا وطنی لباس اتار کو

ا۔ مناسک حج کے مطالعے کے لیے فقہ کی کسی بھی اچھی کتاب کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے
ملاحظہ ہو مولانا انتخار احمد بلخی کی کتاب "حج اور اس کے مناسک" یا فیروز ستر
کی شائع کردہ "کتاب الحج"۔ (منہ)

ایک ہی قسم کے کپڑے ہن لبنتے ہیں اور ایک ہی نعرہ (لبیک) سب کی زبان سے بلند ہو رہا ہوتا ہے تو اسلامی قومیت ایک اپنے ایک اختیار کر لیتی ہے اور اندر بھی دیکھ لبنتے ہیں کہ اسلام کا رشتہ سارے مادی رشتہوں سے زیادہ مفہومی اور درحقیقت انسانوں کو حقیقی طور پر جوڑنے والا واحد رشتہ ہے۔

(۲) جس وقت ہر چھار طرف مدانے لبیک (میں حاضر ہوں) بلند ہوئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حج کی جو منادی کی تھی بہ آوازین اسی کا جواب ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی منادی میں چند رسوم کے ہوا کرنے کی نہ تھی بلکہ انہی آپ کو روح ایمان اور حقیقت اسلام میں ڈال لبنتے کی منادی تھی۔ اس اعتبار سے لبیک کا نعرہ انہی آپ کو مالک کے حوالے کر دینے کی ایک بے ہیں خواہیں کا اظہار ہے۔

(۳) جوں ہی کہیے ہر نظر برق ہے، اس کا تاریخی ہس منظر اور وہ جذبہ جو اس کی تعمیر میں شامل تھا، نظروں کے سامنے ہم جاتا ہے اور انسان کو ہاد آ جاتا ہے کہ میں بھی اسی کی امت کا ایک فرد ہوں جس کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی اور جس کا نام انہوں نے امت مسلمہ رکھا تھا۔

حجر اسود پر جب وہ انہی ہاتھ رکھتا ہے تو دل پر یہ حقیقت نقش ہو جاز ہے کہ پہ اللہ کے ہاتھ میں ہاتھ دے رہا ہوں، بندگی و خلاصی کا عہد تاز کر رہا ہوں اور اثوار کر رہا ہوں کہ اس عہد سے کبھی نہ بھروں گا۔

(۴) طواف کیا ہے؟ فقط رفائیہ الہی کی خاطر انہی آپ کو قربان کر دینے کا والیاں جذبہ، جب مرد مونیں کہیے کے ارد گرد چکر لکاتا ہے تو شمع و بروائہ کا شاعر انہ تحلیل ایک واقعہ بن جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بندہ انہی مولیٰ کے دربار میں اُکر مجسم ندویت اور سراہا کیف و سرمستی بن گئی۔ ہر اس طواف میں کالی اور گوری، عربی و عجمی، نامی و آریائی، خرض کہ ہر نسل، ہر زبان اور فرمومت کے لاکھوں لوگ ایک ہی لباس بھئے اور ایک ہی جذبات لیے کہیے کے گرد گھومنے ہیں، تو یہ منظر بتین دلاتا ہے کہ جس طبع افہ ایک ہے اس طرح اس کے دین پر ایمان رکھنے والے ہمی تمام ظاہری اختلافات کے باوجود ایک ہی ہیں۔ ان کا محور اور سرکن ایک ہے اور ان کی وفاداری بند اللہ ہان قاریان ایک ہی ذات حق کے لیے ہیں۔

اسلامی تصور عبادت اور اسلامی عبادات

۳۲۳

(۶) صفا و مروہ کے درمیان کی 'سی' امن عزم کی مظہر ہے کہ حضرت ابراهیم اور اسماعیل علیہم السلام کا راستہ ہی ہمارا راستہ ہوگا اور اس راستے پر ہیں ہم اپنے قدم مست نہ ہونے دیں گے۔

(۷) ساتویں ذی الحجه سے لے کر دسویں ذی الحجه تک سارے حاجیوں کا ایک ہی امام کی قیادت میں سفر اور قیام ایک منظم فوجی زندگی کا نقشہ بیش کرتے ہیں۔ لاکھوں بندگان خدا کا یہ احرام پوش گروہ کفن بردوش سماہیوں کا ایک بزرگ لشکر نظر آتا ہے۔ یہ صورت حال بتائی ہے کہ است مسلمہ کے تصور کے ساتھ سistem اجتماعیہ اور فوجی زندگی کا تصور بالکل لازم ہے اور اس گروہ کی ساری سعی و جہد دین کی نصرت کے لئے وقف ہے۔

(۸) جمرات کے ستونوں پر کنکریاں مارنا ہتھروں کی اس بے ہناہ ہارش کی ہادگاری ہے جس نے اپر ہد کے لشکر کو انہی مقامات پر تھن نہیں کر کے رکھ دیا تھا۔ ان مقامات پر کنکریاں مارنا اس عزم کا اظہار ہے کہ جو اللہ کے دین کی طرف نچھی نظر سے دیکھئے گا ہم اس کا منہ بھیر کر رکھ دیں گے۔

(۹) قربانی وہ 'ذبح عظیم' ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کا فلذیہ قرار دیا تھا۔ اس لیے اللہ کی راہ میں جانور قربان کرنا در حقیقت اپنے اپ کو نیبان کرنے کا قائم مقام ہے۔ بہ اس بات کا خاموش اقرار ہے کہ ہماری جان اللہ کی راہ میں نذر ہو چکی ہے اور وہ جب اسے طلب کرے گا ہم بلا تامل بیش کر دیں گے۔

مراسم حج کے ایجمنے کام کرنے والی ان ساری حقیقتوں کو دیکھئے۔ بندگی رب کا کونسا جذبہ ہے جو اس میں لہو ہن نہیں لے رہا ہے۔ خصوصاً جذبہ "جماد"، جو بندگی کی معراج کمال ہے، وہ تو ان سارے اعمال میں اس طرح سمویا ہوا ہے کہ ہورا صحیح جہاد کی علامتی مشق معلوم ہونے لگتا ہے۔ بھی وجہ ہے کہ جب عورتوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد کی اجازت چاہی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارا بہترین جہاد حج ہے!

حج کی شان جامعیت: ان باتوں کے علاوہ اگر حج کے مراسم کو ایک اور بھلو سے دیکھئے تو محسوس ہوگا کہ یہ حج اگرچہ کہنے کو ایک عبادت ہے لیکن فی الواقع اس میں ہر عبادت اور ہر عملی خیر کی روح موجود ہے۔

(۱) وہ نماز بھی ہے ، اس لیے کہ نماز کی حقیقت ذکر ہا یاد دھانی ہے ، اور حج میں اُدمی سلسلہ زبان ہے ذکر (لیک لیک اللہم لبیک) کرتا رہتا ہے اور ساتھ ہی ان مقامات کی زیارت کرتا ہے جو اس کے احساسِ عبدت کو ابھار دیتی ہیں۔

(۲) وہ زکوٰۃ بھی ہے ، اس لیے کہ ہر حج کرنے والے کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ قربانی کا گوشتِ محبیوں کو کھلانے ۔ اس کے علاوہ بغیر مالی قربانی کے حج کیا ہی نہیں جا سکنا ، اور زکوٰۃ کی حقیقت بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کی خاطر اپنی دولت صرف کی جائے ۔

(۳) وہ روزہ بھی ہے ، اس لیے کہ جنسی ملات روزے میں اگر صرف دن کو منوع ہے تو حج کے دورانِ راتوں میں بھی منوع رہتا ہے ۔ رہا کھانے ہٹنے کا معاملہ تو روزے کی طرح اگرچہ حج میں کھانا ہٹنا منع نہیں ہے مگر اس کے بجائے اس میں زدب و زنت وغیرہ کی جو دوسری بہت سی ہابندیاں عاید ہوئیں میں وہ بڑی حد تک اس ممانعت کی قابیہ مقام بن جاتی ہیں ۔ اس طرح نفس کی خواہشوں کو کنیوں کرنے کی مشق جس طرح روزے میں ہوتی ہے اسی طرح حج میں بھی ہوتی ہے ۔

* اسلامی عبادات کے اس سلطنتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ عبادات کے اس نظام کا اصل مقصد اسلام کا انسان مطلوب تیار کرتا ہے ۔ یہ انسان کو اس ذمہ داری کے لیے تیار کریں جو خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سید کی ہے ۔ یہ انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم گی۔ صفاتِ محمودہ انسان میں پیدا ہیں اور سیرت و کردار کی تعمیر کریں اور روحانی ترقی اور اخلاقی بالہی کی راہ ہموار کریں ہیں ۔ عبادات کا اصل مقصد یہ ہے کہ نفس کا تزکیہ ہو، تقویٰ کی روح پیدا ہو، خدا سے تعلق استوار ہو، اور خدا کی اطاعت، اس کی بندگی پور اس کی محبت در جیز ہر خالب آجائے ۔ نفس کی اصلاح کے بغیر کوئی اصلاح ممکن نہیں اور نفس کی اصلاح کا اصل اور مؤثر ترین طریقہ وہ عبادات ہیں جو خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کی ہیں ۔

اسلامی تصور عبادت اور اسلامی عبادات مزید مطالعے کے لئے

--5

مولانا مظاہر نعمنی ' دین و شریعت (باب چہارم) . مکتبہ الفرقان ، لاہور .
مولانا سید ابوالاعلیٰ وودودی ، اسلامی عبادات ہر ایک تعلیمی نظر .
اسلامیک پبلکیشنز لمبٹڈ لاہور .

مولانا سید ابوالاعلیٰ وودودی ' خطبات (باب ۱۲ نا ۲۸) . اسلامیک پبلکیشنز لمبٹڈ ،
لاہور .

مولانا سید سلمان ندوی ' صیرۃ النبی (جلد پنجم) . دارالدین ، اعظم گڑا .
انسخار احمد بلخی ، حج اور اس کے مناسک . المطبوعات ، کراچی .
مولانا امین احسن اصلاحی ، " تذکیرہ نفس " لاہور .

حصہ سوم

اسلامی نظام حیات

گزشته صفحات میں اسلام کی علمی اور فکری بنیادوں اور دور حاضر کے بہدا کردہ سائل اور گفتگو کی جا چکی ہے۔ اس بعثت سے معلوم ہوا کہ انسان کی سب بڑی ضرورت صحت مند نظریہ حیات ہے۔ مذہب سے انحراف کی جتنی راهیں بھائی انسان نے اختیار کی ہیں بالآخر وہ سب خاطر اور تباہ کرنے ثابت ہوئی ہیں۔ عقلی تعزیہ اور تاریخی تجربہ دونوں اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ مذہب کے بغیر انسانی زندگی حقیقی کامیابی، سکون و اطمینان اور امن و امان سے بالامال نہیں ہو سکتی۔ اور وہ مذہب جو اپنی حقیقی شکل میں محفوظ ہے اور جو زندگی کے تمام سائل کو بحسن و خوبی حل کر سکتا ہے اسلام ہے۔

اسلام کا نقطہ آغاز نفس انسانی کی اصلاح ہے۔ وہ انسان کو اس کے صحیح نام سے روشناس کرتا ہے اور خدا، رسول، کتاب اور یوم آخرت پر ایمان کے ذریعے کائنات اور اس کی حقیقتوں اور زندگی اور اس کے مقاصد سے انسان کا رشتہ مجمع بنیادوں پر استوار کرتا ہے۔ توحید، رسالت اور آخرت وہ بنیاد ہیں جن پر اسلام کا ہورا نظام قائم ہے۔ اسلامی زندگی کا ہر ہملو انہی بنیادوں سے واپس ہے۔

اسلامی معاشرہ کا مرکز رسول خدا کی شخصیت ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کا پیکر مجبوٰ تھے۔ اسی لئے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہوری انسانیت کے لئے "اسوہ حسنہ" بتایا گیا۔ یہ وہ معیار ہے جس کے مطابق تمام انسانوں کو انہی زندگیوں کو ڈھاننا ہے۔

انہی انسان مطلوب کو تیار کرنے کے لئے اس معیار کے ساتھ ساتھ اسلام ایک مفصل تربیتی نظام بھی فراہم کرتا ہے جو آن صفات کو پیدا کرتا اور پروان چڑھانا ہے جو پسندیدہ اور مطلوب ہیں اور آن برائیوں سے انسان کو بچاتا اور باک کرتا ہے جو اسلام کی نکاح میں مذہب و مذہب کورس اسلام کا نظام عبادت ہے۔

ایک خاص قسم کے انسان کے ساتھ اسلام ایک خاص طرز کا معاشرہ ہے جو انسان کے ہر شے کے اثر کو شے کی صورت گردی کرنا چاہتا ہے تاکہ زندگی کی تمام وسعتوں میں خدا کا قانون گھصے میں اسلام کے اجتماعی نظام سے بحث کی جائی ہے۔

انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے اجتماعیت پسند ہے۔ مسہد سے بعد نکلے اسے انسانوں کے اجتماع سے سابقہ دربیش ہے۔ وہ اس دنبا میں آتا ہے دو انسانوں کے اجتماعی تعلق سے۔ ایک خاندان میں انکھیں کھوئیں ہے اور معاشرے میں اور اپنے باکر بڑا ہوتا ہے۔ مدرسہ اور اسکول میں تعلیم ہاتا ہے۔ خالے میں آنہتا ہیٹھتا ہے۔ بازاروں میں چلتا ہوتا ہے۔ ہر قدم پر دوسرے انسانوں سے معاملات کرتا ہے۔ تعلیم کی جدوجہد ہو یا معاش کی تگ و دو، ہر قدم پر اسے معاشرہ اور ربانی کا سہارا لینا ہوتا ہے۔ اجتماعیت کا یہ دائمہ اتنا وسیع اور اتنا موثر ہے کہ انسان کی ہوری زندگی اس میں گردش کرنے گزر جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی اصلی نامیابی یا ناکامی اسی اجتماعیت کے دائیرے میں دیکھی جاتی ہے۔

اسلام تمام اجتماعی مسائل کو اخلاقی نقطہ نگاہ سے حل کرنا چاہتا ہے۔

وہ عائلی مسائل کو بھی لینا ہے اور معاشرے پر جدوجہد گیوں کو بھی، معاشی جدوجہد بھی اس کا موضوع ہے اور سیاسی فکر و عمل بھی، لیکن ان سب میں اس کا مخصوص زاویہ نظر یہ ہے کہ تمام معاملات خدا کی اطاعت، اخلاق اصولوں کی بالا دستی، احترام انسانیت، دوسروں کے حقوق کی پاسداری اور آخرین میں جواب دھی کے اصولوں پر طے ہوں۔ زندگی کے تمام شعبوں کے لیے اسلام بنیادی اور اصولی تعلیمات دینا ہے اور ہمارے حدود کو واضح کر دینا ہے جسپر کسی قیمت پر بھی توڑا نہیں جا سکتا۔ بنیادی اصولوں کے تعین اور حدود کی تحدید کے بعد وہ انسان کو آزادی دینا ہے کہ اپنے زمانے کے حالات کے مطابق اپنا راستہ نکالیے۔ اس طرح اسلامی نظام ان ہے انتدابیوں سے بچ جاتا ہے جن کا اغراض پرستی کی وجہ سے انسان مرتكب ہوتا رہا ہے نیز اس حکمت عملی کے نتیجے میں انسان معاشرہ جمود کا شکار ہوئی نہیں ہوتا۔ اس نظام میں ترقی اور ارتقا کے ہر ممکن موقع موجود رہتے ہیں۔ اور خدا کی حدود میں رہتے ہوئے انسان کا ہر قدم بلندی اور ترقی کی جانب الیٹا ہے۔

زیر نظر حصے میں ہم اسلامی نظام حیات کے مختلف پہلوؤں کو بھی کرسیں گے۔

باب ۱۲ "سریعت اسلام کے مأخذ" کے متعلق ہے اور ان میں کوششی تکی ہے کہ ہدایت کے بنیادی سرچشمتوں۔ یعنی قرآن اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ کا ضروری تعارف کراہا جائے اور دلائل اور تاریخی شواہد سے ان کے مقام کو واضح کیا جائے۔

باب ۱۳ "اسلام کے اخلاق نظام" کے متعلق ہے۔ ان باب میں اسلام کے تصور اخلاق کو بیان کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اسلام میں اخلاق زندگی کے مقاصد، اس کے حرکات اور ان کو نافذ کرنے کے ذرائع کیا ہیں۔ نیز ان اخلاقی صفات کو بیان کیا گیا ہے جو پسندیدہ یا ناپسندیدہ ہیں۔

باب ۱۵ میں "اسلام کے معاشری نظام" کا ایک مجلہ خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ ان میں عائلی زندگی کی بنیادوں اور معاشرت کے اساسی اصولوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز یہ بتایا گیا ہے کہ اسلامی معاشرے کے بنیادی ادارے کون کون سے ہیں اور معاشری اصلاح کا عمل کن اصولوں پر ہونا چاہیے۔

باب ۱۶ "اسلامی نظریہ تعلیم" کے متعلق ہے۔ ان میں اسلام کے تعلیمی اصول اور مسلمانوں کے نظام تعلیم کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اگر ان تعلیمی اصولوں اور مسلمانوں کی مذکورہ تعلیمی روایت کو نگاہ میں رکھا جائے تو یہ آسانی ہر مسلمان ملک اپنی ضرورت کے مطابق ایک نئے نظام تعلیم کا نقشہ بنا سکتا ہے جو اسلام کے تصور سے ہم آہنگ ہو اور وقت کی ضرورت کو بھی ہورا کر دے۔

باب ۱۷ میں اسلام کے معاشی اصولوں کو پیش کیا گیا ہے۔ ان باب میں اس امر کی کوششی کی گئی ہے کہ طلبکا اسلام کے بنیادی معاشی اصولوں سے تعارف کرا دیا جائے اور اسلام کے معاشی نظام اور جدید سرمایہ داری اور اشتراکیت کے نوعی اور مزاجی فرق کو نمایاں کر دیا جائے۔

باب ۱۸ میں "اسلام کے سیاسی نظام" سے بحث کی گئی ہے۔ ان میں اسلامی ریاست کی خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے اور ان ہم لوگوں کو واضح کیا گیا ہے جن ہر مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر کا اتفاق ہے۔

ان ہوری بحث کے بعد یہ نظری موال ہیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی قوت کو کس اعلیٰ مقصد کے لئے استعمال ہونا چاہیے؟ ملت اسلامیہ کا

اصل مشن کیا ہے، اور اسلام اپنے منانے والوں سے کس چیز کا تقاضہ کرتا ہے؟ ان امور پر آخری پب، یہ روشنی دالی گئی ہے اور اس کا عنوان "اسلام کے تقاضے" رکھا گیا ہے۔ اس سے انک طرف ملت اسلامیہ کے حقیقی نصب العین کی وساحت ہو جائی ہے اور ذوبہتی تاریخ وہ حقیقت ہوئی سامنے آجائی ہے کہ ہر مسلمان کو ملک کے فرد کی حیثیت سے کن مقاصد کے لئے سر کرم خمل ہونا چاہئے تاکہ اسلام کے عالم کبیر مسن کی تکمیل میں وہ اپنا حصہ ادا کر سکے اور اس طرح دنیا اور آخرت میں کامیابی سے ہمکنار ہو سکے۔

عوین توقع ہے کہ اس نیوں نے حصے کے مطالعے سے قاری کے سامنے اسلامی نظریہ حیات کی پوری تصور پر اجائے گی۔

(مرتب)

نشریہت اسلامی کی مأخذ

۱) اسلامی نظام زندگی کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے ہم بہ علوم کوں کہ اسلامی شریعت کے مأخذ کیا ہیں؟ اسلام زندگی کا جو نقشہ بجوبز کرتا ہے وہ محض انسانی عقل اور تجربے کی روشنی میں ترتیب نہیں پاتا، بلکہ ابتدائی اور اولین رہنمائی اللہ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے حاصل کی جاتی ہے اور اور پھر اس کی روشنی میں عقل اور تجربے کی مدد سے زندگی کا نظام قائم کیا جاتا ہے۔ چون کہ اس نظام زندگی کی بنیادی خصوصیت ہی ہے کہ یہ خدا کی دی ہوئی ہدایت پر مبنی ہے اس لیے نظام زندگی کے مختلف شعبوں اور ان میں اسلام کے مخصوص مزاج کا مطالعہ کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی شریعت کی حقیقت، اور اصلاح کے لیے اسلام کے طریق کار کا مطالعہ کرو لیا جائے اور قدرے تفصیل سے یہ دیکھو لیا جائے کہ ہدایت کے جن سرچشموں سے ہم روشنی حاصل کر رہے ہیں وہ کتنے قابل اعتماد ہیں۔ مندرجہ ذیل صفحات میں یہی بحث کی گئی ہے۔

شریعت: معنی و مفہوم

۲) * شریعت (شرعہ اور شرع) کے لغوی معنی "کھلی ہونے، روشن، سیدھے اور صاف راستہ" کے ہیں۔ ایک مذہبی اصطلاح میں اس سے مراد وہ قوانین و احکام ہیں جو ایک رسول، اللہ تعالیٰ کی اطاعت، اس کی بندگی، اور فرمان برداری اس باب کو متعدد اہل علم کی نگارشات سے مرتب کیا گیا ہے اور اس کی ترتیب میں مولانا افتخار احمد بلخی صاحب نے میری خصوصی معاونت کی ہے۔ (مرتب)

۳) ۴ حصہ مولانا افتخار احمد بلخی کا تحریر کردہ ہے۔ (مرتب)

نے ابے او کوں کے سامنے پیش کرتا ہے

۱۔ یکل جعلنا ممنکر ثیزغہ و ممنھا جا۔

ہم نے نم میں سے ہر ایک
جسے لیجے ایک شریعت اور ایک
راہ، مل مقرر کر (المائدة - ۲۸)

(۳)

بعنی، تمام انبیاء اور نبیم سابقہ کتب النبیہ کا دین تو یہی اسلام تھا، ان
شریعت، بعینی عبادت کے طریقے، معاشرت کے اصول، باہمی معاملات اور تنقیح
کے قوانین، حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے حدود وغیرہ امور سے متعلق تفصیل
کا جہاں تک تعلق ہے ان میں اختلاف رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف زمانوں اور
سخائف قوموں کے حالات کے مطابق اپنے رسولوں کے ہاض مختلف شریعتیں بھیجیں تھیں
اور جب تک دنیا نے تمدن اور اجتماعی زندگی کے وہ سارے وسائل ہیدانہیں کر لے
کہ ساری دنیا کو ادک دیوں اور ایک شریعت پر جمع کیا جاسکے، اُس وہی تک
اللہ تعالیٰ الگ الگ قوموں میں رسولوں کو مبعوث فرماتا رہا جو اپنی اپنی قوم کو
الگ الگ، سانسیگی اور تہذیب و اخلاقی کی تعلیم و تربیت دیتے رہے۔ اسکے
ہم دیکھتے ہیں کہ پسا اوقات ایک ہی زمانے میں ایک سے زائد انبیاء مختلف
خطہ نے اپنی میں دعوت حق کے فرانض انعام دیتے رہے ہیں۔ جب ان انبیاء کی
دولم و رہب سے قوموں کا اخلاقی سعور بیدار ہو گیا اور انسان، معاشرہ اور تمدن
کے ساتھ وسائل اپنے ترقی کر چکے کہ اب ساری دنیا کے اپنے ایک ہی رسول و نبی
کی بعثت کا وہ آہ پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو بیرون
فرمایا اور آپ کے ذریعے ساری انسانیت کو وہ مکمل نظام زندگی عطا فرمایا جو تمدن
پری نوع انسان کے مزاج اور حالات و ضروریات کے مطابق ہے۔ اب اسی نظام حیات
پر عمل بہرا ہو کر خدا کی رضا حاصل کی جا سکتی ہے۔

(۴)

اس طرح اب دین بو وہی ہے جس کی طرف سلسلہ "رسالت کی بھلی کلی" ہے
ہی انسانوں کو بلا یا کیا، لیکن برائی شریعتیں منسوخ کر دی گئیں، اور ان کی
جگہ ...ی شریعت قادمہ کی گئی جس میں رہتی دنیا تک تمام انسانوں کے لئے
عبادت کے طریقے، معاشرت کے اصول اور باہمی معاملات کے قوانین اور حلال و حرام
کی حدود پکسان ہیں۔

امن سے معلوم ہوا کہ شریعت وہ الہی قانون ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انسانوں تک پہنچا دے اور اسی اے شریعت کی احتلالی تعریف ان کی ذریعہ میں کی جاتی ہے:

القانون الا للهی الثابت من النبي صلی اللہ علیہ وسلم لفتویم العفائد والا عمال و نہذب الاخلاق و تدیر المترزل
سباسط المدن

شريعت کا مقصد اور اس کی هدایت گیری

* "اسلام" نسلیم و اطاعت کا دو برائے اور جو لوگ "سلام" و اطاعت" کا بہ فعل کرنے ہیں اسلام میں داخل ہو جانے ہیں اور وہ "سلام" کہلانے ہیں۔ یعنی اپسے لوگ جنہوں نے خدا کی حاکمیت مان لی، اپنی خود اختاری سے اس کے حق میں دست بردار ہو گئے، اور اس بات کو انہوں نے خود اپنے اوہ لازم کر لیا کہ اپنی زندگی کا نظام خدا کے احکام کے مطابق چلانی گے۔

ایسے تمام لوگ جنہوں نے سلام کا بہ فعل کیا ہو ایک وحدت میں منتسلک کی جانے ہیں اور ان کے اجماع سے "سلام سوسائٹی" کی تشکیل و تنظیم ہوتی ہے۔ یہ سوسائٹی ان سوسائٹیوں سے بالکل مخالف ہے جو انسانی حوادث کے تھجھی میں بنتی ہیں۔ اس کی تشکیل ایک ارادی فعل سے ہوئی ہے، اور اس کی تنظیم ایسے معاہدے کے ذریعے سے عمل میں آتی ہے جو خدا اور بندوں نے دریافت شعوری طور پر واقع ہوتا ہے۔ اس معاہدے میں بندے یہ سلام کرنے ہیں کہ خدا ان کا حاکم ہے، اس کی ہدایات ان کے اپنے دستور زندگی ہے^(۱) اس کے احکام ان کے ائمے فانون ہیں۔ وہ ای کو خوب مانیں گے جسے خدا خیر بنانے گا، اور اسی کو شر سلام کوئی گے جسے خدا شر کہنے گا۔ صحیح و غلط اور جائز و ناجائز کا معیار و خدا ہی سے ایں گے۔ اور اپنی آزادی کو ان محدود کے اندر محدود رکھیں گے جو خدا ان کے اپنے کوہنج دے گا۔ مختصر ہے کہ اس معاہدے کی بنیاد پر جو سوسائٹی بنتی ہے وہ یہ افرار کرتی ہے کہ وہ اپنے معاملات زندگی میں "کیا ہونا چاہیے" کا جواب خود تجویز نہیں کرے گی بلکہ اس جواب کو قبول کرے گی جو خدا کی طرف سے ملے گا۔ اس واضح افرار کی بنیاد پر جب ایک

• یہ حصہ مولانا مودودی صاحب کی کتاب "اسلامی قانون" سے اخوذ ہے۔ (مرتب)

سوائی بن جائی ہے تو خدا کی طرف سے "الکتاب" اور "الرسول" اے ایک صابھہ زندگی دینے ہیں جو "شریعت" کہلاتا ہے۔ اور سوانحی پر خود اپنے میں افراطی وجہ سے یہ لازم ہو جانا ہے کہ وہ اپنے عوامیات زندگی کو اس نظم اور اس اسکیم کے مطابق چلانے جو اس شریعت میں تعویز کی گئی ہے۔

(6)

معروفات و منکرات

جس زمانے میں جس رسول کی جو شریعت نہیں اس کا اصل مقصود معروفات کا ہروان چڑھانا اور منکرات کا استعمال تھا، اور شریعت محمدیہ کا مقصود معروفات انسانی زندگی کے نظام کو معروفات پر قائم کرنا اور منکرات سے ہاک کرنا ہے۔ معروفات سے مراد وہ نیکیاں، خوبیاں اور بہلائیاں ہیں جو انسانی فطرت کو جیلو بخشنی ہیں اور جن کو انسانی فطرت ہمپسہ سے بہلائی کی حیثیت سے جانتی ہے۔ اور منکرات سے مراد وہ برائیاں ہیں جن کو ہمیشہ سے انسانیت کا ضمیر ادا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں "معروف" فطرت انسانی سے مناسب رکھنے والی چیز ہے جو خالق فطرت ہی کی طرف سے اس کی تابناکی کے لئے تعویز کرده ہے۔ اور "منکر" اس کے خلاف ہے۔

(7)

"شریعت" ہمارے لئے انہی چیزوں کو بہلائی قرار دیتی ہے جو خدا کی بنائی ہوئی فطرت کے مطابق ہیں اور انہی چیزوں کو بہلائی قرار دیتی ہے جو خدا کی فطرت سے موافق نہیں رکھتیں۔ وہ بہلائیوں اور برائیوں کی محض ایک فہرست ہی بنا کر ہمارے حوالے کر دینے پر اکتفا نہیں کریں بلکہ زندگی کی ہوئی اسکیم ایسے نقشے اور بنائی ہے کہ اس کی بنیادیں معروف (بہلائیوں) پر قائم ہوں اور معروفات اس میں ہروان چڑھ سکیں۔ اور منکرات کو اس کی تعویز میں شامل ہونے سے روکا جائے اور نظام زندگی میں ان کے درآئے اور ان کا زہر بھیلنے کے موقع باقی نہ رہنے دیے جائیں۔ اس غرض کے لئے وہ معروفات کے ساتھ ان اسباب اور ذرائع کو بھی اپنی اسکیم میں شامل کریں جن سے وہ قائم ہو سکتے اور ہروان چڑھ سکتے اور نشوونما میں کسی طور پر سدراء ہو سکتے ہیں۔ اس طرح اصل معروفات کے ساتھ ان کے قیام و ترقی کے وسائل بھی معروف شمار ہو جائے ہیں، اور ان کے موانع منکرات کی فہرست میں شامل کر دیے جائے ہیں۔ یہی معاملہ منکرات کے منکر کے وقوع یا ظہور یا نشوونما کا ذریعہ ہے۔ لامعاشرے کے پورے نظام کو

شریعت اسلامی کے مأخذ

۳۳۶

چریقت امن طرز ہر ڈھالتی ہے کہ ایک ایک معروف اپنی حقیقی صورت میں قائم ہو، زندگی کے تمام متعلقہ شعبوں میں اس کا ظہور ہو، ہر طرف سے اس کو قائم ہونے اور ہروان چڑھنے میں مدد ملے اور ہر وہ رکاوٹ دور کی جانے جو کسی طرح سے اس کی راہ میں حائل ہو سکتی ہو۔ اسی طرح ایک ایک منکر کو چن چن کو زندگی سے نکالا جائے، اس کی پیدائش اور نشوونما کے اسباب روکے جائیں، جدھر جدھر وہ زندگی میں گھس سکتا ہے اس کا راستہ بند کیا جائے اور اگر وہ سر آنہا ہی لے تو ہر سختی کے ساتھ اسے دبا دیا جائے۔

معروفات کو شریعت تین قسموں میں تقسیم کریں ہے

(8)

(۱) وجہ یا فرض: یعنی وہ معروفات جو مسلم معاشرے پر لازم کئے کئے ہیں۔ ان کے متعلق شریعت مباح صاف اور قطعی احکام دیتی ہے

(۲) مندوب یا مطلوب: یعنی وہ معروفات جن کو شریعت چاہتی ہے یا پسند کریں ہے وہ معاشرے میں قائم اور جاری ہوں ہے ان میں سے بعض کا اشارہ شارع کے ارشادات سے نکلتا ہے۔ بعض کے قیام و نشوونما کا بندوبست کیا گیا ہے۔ اور بعض کی صرف مفارش کی گئی ہے تاکہ معاشرہ بعیشت مجموعی با امن کے صالح لوگ ان کی طرف خود توجہ کریں۔

(۳) مباح: شریعت کی زبان میں ہر وہ چیز اور فعل مباح ہے جس کی معافت نہ کی گئی ہو۔ اس تعریف کی بنا پر مباحثات صرف وہی نہیں ہیں جن کی اجازت کی تصویر ہو یا جن کے معاملے میں ہیں صاف طور پر اختیار دیا گیا ہو بلکہ ان کا دائروہ بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ چند بیان کردہ مفہومات کو چھوڑ کر، دنیا میں سب کوچھ مباح نہمیرتا ہے۔ بھی مباحثات کا وہ دائروہ ہے جس میں شریعت نے ہم کو آزادی عمل دی ہے۔ اور اسی دائروے میں ہم کو اپنی ضرورتوں کے مطابق قوانین و مصواب اور طریقہ کار خود تعویز کر لینے کے اختیارات حاصل ہیں۔

منکرات کو شریعت میں دو قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے

(۱) حرام یعنی قطعی ممنوع: جس سے باز رہنا اور اپنی افرادی و اجتماعی زندگی کو اس سے ہاک رکھنا مسلمانوں

ہر لازم کر دیا گیا ہے۔ اور سرہست میں اس کے متعلق صاف صاف احکام دے دیے گئے ہیں۔

(۲) مکروہ: یعنی اس نے بھائی سارے دشی نہ کسی طور پر صراحتاً پا کنایتاً ناپسندیدہ کا اطمینان کرتا ہے۔ جس سے بہ آسانی علوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس درجے میں ناپسندیدہ ہے۔ بعض مکروہات حرام کے قریب ہیں، اور بعض مباح کی سرحد سے ملے ہوئے ہیں، اور بہت تھے ان کے دریافتی مراتب بڑے ہیں۔ بعض کو روکنے کے لئے بند کرنے کا شریعت کے نظام میں بندوبست کیا گیا ہے، اور بعض کو ناپسندیدہ بتا کر چھوڑ دیا گیا ہے۔ ناکہ معاشرہ خود یا اس کے صالح عناصر سدھاب کریں۔

معروف و منکر کے بہ احکام ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں میں پہلے ہونے ہیں۔ مذہبی عبادات، شخصی کردار، اخلاق و عادات کھانا ہینا، پہننا اور اوڑھنا، نشست و پرخاست، بات چیت، خاندانی زندگی، معاشری تعلقات، معاشی معاملات، ملکی انتظام، شہریت کے حقوق و واجبات، قیام عدل کا نظام، حکومت کے طریقے، صلاح و جنگ اور دوسری قوموں کے ساتھ تعلقات، اغرض زندگی کا کوئی شعبہ اور پہلو ایسا نہیں ہے جس کے متعلق شریعت نے ہم پر ذیکر اور بدی کے طریقے، بہلانی اور برائی کے راستے اور ہاک و ناہاک کے استیازات واضح نہ کر دیے ہوں، وہ ہمیں ایک صالح نظام زندگی کا ہورا نقشہ دیتی ہے جس میں صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ وہ کون سی بہلانیاں ہیں جنہیں ہم کو قائم کرنا، بڑھانا، اور نشوونما دینا ہے اور وہ کون سی برائیاں ہیں جن سے ہم کو چھانا اور جن کو دبانا اور مٹانا ہے۔ کن حدود کے اندر ہماری آزادی عمل کو محدود رہنا چاہیے۔ اور علاً ہمیں کون سے طریقے اختیار کرنے چاہئیں جن سے ہماری زندگی میں مطلوبہ بہلانیاں ہروان چڑھیں اور برائیوں کا استھصال ہو۔

بہ ہورا نقشہ "زندگی ایک ہی نقشہ" زندگی ہے۔ اور اس کا ابک مجموعی مراجع ہے جو تفہیم ہو در مقام نہیں رہ سکتا۔

شریعت اسلامی کے مأخذ

۱) شریعت کی اصطلاحی تعریف اور گزر چکی ہے، جس سے بد اسانی سمجھا جاتا ہے کہ صاحب شریعت رسول ہوتا ہے، نہ کہ کوئی امام یا محدث۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اصطلاحاً شریعت موسوی اور شریعت محمدی وغیرہ تو کہ سکتے ہیں، لیکن شریعت حنفی اور شریعت مالکی وغیرہ نہیں کہہ سکتے۔ البته فقه حنفی اور فقه مالکی وغیرہ کہہ سکتے ہیں اور کہتے ہیں کیوں کہ فقه کی اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ

حکمة شرعية فرعية عملية

وہ علم جس کا تعلق اپسے اور سے هو جو عمل ہوں، فروعی ہوں، اور شریعت کی طرف منسوب اور اس سے مانخوذ ہوں۔

جیسا کہ اصول فقه کی اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ

علم بقواعد بتوصل بها الى كافية استباط المسائل عن دلائلها التفصيلية
آن قواعد وضوابط کا علم جو ذریعہ و وسیله بننے ہیں اس بات کے معلوم کرنے کے مسائل کو آن کے تفصیل ذلائل سے کس طرح مستبسط کیا جانا چاہیے۔

آن سے معلوم ہوا کہ شریعت اور فقه (اور اصول فقه) خالص اصطلاحی معنوں میں ایک دوسرے کے مسائل نہیں ہیں۔ شریعت اور فقه کے درمیان فرق آن کی تعریفوں کے الفاظ ہر ذرا گھری نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے، کیوں کہ فقه میں جن احکام سے بحث ہوئے وہ خود شارع کے امر و حکم ہر مبنی ہونے ہیں اور شریعت سے مانخوذ و مستبسط ہونے ہیں (شرعیہ)۔ دوسرے یہ کہ فقه کے دائرة بحث میں صرف وہ امور آئتے ہیں جو فروعی ہونے ہیں (فرعیہ)، اور جو صرف عملی ہوتے ہیں (عملیہ)۔ لیکن شریعت کی اصطلاحی تعریف میں، جیسا کہ اورہ بیان کیا گیا "عقائد و اعمال" دونوں داخل ہیں۔

۲) یہ تو ہیں شریعت اور فقه کے اصطلاحی معنی، لیکن عوامی استعمال کی (ووے) فقه اور شریعت کو متراծ بعنی ایک ہی مفہوم کا خیال کیا جاتا ہے۔ اس بنا پر جب "شریعت اسلامیہ کے مأخذ" کا فقرہ بولا جاتا ہے تو اس وقت لفظ "شریعت" علمی و فنی اصطلاح میں نہیں بلکہ عوامی استعمال کی حیثیت سے بولا جاتا ہے اور اس کا مطلب دراصل "فقہ اسلامی کے مأخذ" ہوتا ہے۔

ماحد اول : الكتاب

شريعت، یعنی اسلامی قانون کا بہلا مأخذ، سب سے بہل دلیل، سر جنہیں اول اور مأخذ اسی "الكتاب" یعنی قرآن کریم ہے، جو خدا کا کلام ہے۔

١ ﴿كُلُّ الْكِتَابِ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ﴾

(ب) کتاب یقیناً خدائی رب العالمین
کی طرف سے نازل ہونی ہے۔
(السجدہ - ۲)

﴿كُلُّ أَنْزَلٍ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّ الْأَرْضِ﴾

(ب) کتاب ہے، جسے ہم نے تمہاری طرف
نازل کیا ہے، تاکہ لوگ اس کی آیات
میں تدبر کریں۔ (ص - ۲۹)

٢ ﴿كُلُّ الْكِتَابِ مُحَمَّدٌ لِكَبُرُّ الْأَرْضِ﴾

(ب) کتاب زمین و آسان کے پیدا کرنے
والے کی نازل کردہ ہے۔ (طہ - ۱۲)

اور یہ اسلامی شریعت و قانون کا اصل الاصول ہے۔ اس میں شریعت کی بنیاد
بیان کی گئی ہیں۔ عقائد کے باب میں اس کے اندر ہوئی تفصیل و وضاحت ہے
اور عبادات و حقوق کو اختصار سے بیان کیا گیا ہے۔

٣ ﴿قُرْآنٌ كَيْ حِيشَتْ﴾
اسلامی شریعت میں اس قرآن کی وہی حیثیت ہے جو ملکی قوانین میں دستور
کی ہوتی ہے۔ یہ قرآن خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کے بعد سارے مسلمانوں کے لیے ایسا ہے۔

﴿فَلِإِيمَانِكُمْ مَا يُؤْتُكُمْ إِنَّمِنْ أَنْ يُبَيِّنَ فَهُدًى لَّهُمْ وَهُدًىٰ وَرَحْمَةٌ لِّلْقَوْمِ يُؤْمِنُونَ﴾

(۱) نبی آپ کہدیں کہ میں تو ہیں اسی پر چلتا ہوں جو میرے پروردگار کی
طرف سے مجھے پر وحی کیا گیا ہے، یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے سمجھ
بوجہ کی باتیں ہیں۔ اور (ب) ایمان دار لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت
ہے۔ (الاعراف - ۲۰۳)

شریعت اسلامی کے مأخذ

۲۵۱

وَمَنْ لَمْ يَعْلَمْ بِهَا أَنْذَلَ اللَّهُ الْكَوْثُرَ وَالْكَوْثُرُ

(۴)

اور یہ شک ہے (قرآن - الكتاب) تیرے اور تیری قوم کے لیے نصیحت ہے - (الزخرف - ۲۲)

إِنَّمَا أَنْذَلَ اللَّهُ الْكَيْتَبَ بِالْمُقْرَبِ لِتَعْلَمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَنْذَلَ اللَّهُ

بے شک ہم نے آپ پر یہ کتاب حق کے ساتھ انواری ہے تاکہ لوگوں کے درمیان آپ اس طرح فیصلہ کریں جس طرح افہم آپ کو دکھائے - (الناء - ۱۰۵)

اس لیے یہ قانون شرعی کا اصل سرچشمہ ہے

وَلَقَدْ جَنَاحَتْ هَرَكَتْ قَضَلَةَ عَلَى عِلْمِهِ مُدْئِي وَنَعْمَةَ الْقَوْمِ بِلَامِنْتَنْ

اور یہ شک ہے ان کے پاس (ایک) ایسی کتاب لائے ہیں جس کو ہم نے علم کے ساتھ ایماندار لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت بنا کر بھیجا ہے اور مفصل بیان کیا ہے - (الاعراف - ۵۲)

لَكَ هَذَا الْقُرْآنُ يَهْدِي لِلْقَوْمِ هِيَ الْفُورَمْ

بے شک یہ قرآن اس (راہ) کی ہدایت کرتا ہے جو بہت ہی سیدھی ہے۔ (بنی اسرائیل - ۹)

اور تمام انسانی معاملات میں اسی قرآن کی حیثیت حکم کی ہے۔ یعنی مسلمان وہ جو لوگ کے حکم کے مطابق اونے تمام معاملات کا فیصلہ کرتا ہے۔

وَمَنْ لَمْ يَعْلَمْ بِهَا أَنْذَلَ اللَّهُ الْكَوْثُرَ الْكَوْثُرَ

اور جو اس کے مطابق فیصلہ نہ کریں جو ہم نے فازل کیا ہے تو ایسے ہی لوگ دراصل کافر ہیں - (المائدہ - ۲۲)

اس قرآن کی وہی خصوصیت و صفت ہے جو ایک دستور کی واقع ہے۔ یعنی کہ اس میں مخصوص احکام کا بیان مجمل ہے یعنی جزویات و تفاصیل سے اس میں لہت کم بحث کی گئی ہے۔ اس کا اصل کام ہے کہ بنیادی چیزوں کو ہری لفاظ کے ساتھ پیش کرے۔ وہ زندگی کے ایک ایک بھلو کے مطابق قابلی خابطے اور قوانین نہیں بتاتا بلکہ وہ ہر شعبہ زندگی کے حدود اربعہ بتا دیتا ہے۔

اور نہایاں طور پر چند گوشوں میں سنگ نشان کھڑا کر دینا ہے جو اس بات کا نام
کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ان شعبوں کی تشکیل و تعمیر
کرنے خصوصی در ہوئی چاہیے۔ ان ہدایات کے مطابق عملاً اسلامی زندگی کی صورت
کرنا نبی صل اللہ علیہ وسلم کا کام تھا۔ انہیں مأمور ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ
دنیا کو اس انفرادی سرت و کردار اور اس معاشرے اور ریاست کا نمونہ دکھائی
جو قرآن کے درے ہوئے امویوں کی عملی تعبیر و تفسیر ہو۔^۱

قرآن : موضوعات ، مقصد اور انداز تخطیب

کتابوں کے بڑھنے کے عادی ہیں ، ان میں ایک متعین موضوع اور معلومات ،
خیالات اور دلائل کو ایک خاص ترتیبی ترتیب کے ساتھ سلسلہ بیان کی
جاتا ہے اسی بنا پر جب کوئی شخص ۲۶۱ مرتبہ قرآن کا مطالعہ اس موقع کے
ساتھ کرتا ہے کہ "کتاب" ہونے کی حیثیت سے اس میں بھی عام کتابوں کی
طرح پہلے موضوع کا تعین ہو گا اور اصل مضمون کو ابواب اور حصص میں تقسیم
کر کے ترتیب وار ایک ایک سلسلہ ہو بعثت کی جائے گی اور اسی طرح زندگی کے
ایک ایک شعر کو لے کر اس کے متعلقی یہی احکام و ہدایات سلسلہ وار درج
ہوں گی تو بیان اسے اپنی توقع کے بالکل درخلاف ایک دوسرے ہی انداز بیان
سے ساتھ پیش آتا ہے جس سے وہ اب تک بالکل نا آشنا تھا۔ بیان وہ دیکھا
ہے کہ اعتقادی مسائل ، اخلاقی ہدایت ، قانونی احکام ، دعوت و نصیحت ،
 عبرت ، تنقید ، ملزمت ، تجویف ، بشارت ، تسلی ، دلائل ، شواهد ، تاریخی
قصص ، آثار کائنات کی طرف اشارے ، بار بار ایک دوسرے کے بعد آرئے ہیں۔
ایک ہی مضمون مختلف طریقوں سے مختلف الفاظ میں دھرا یا جا رہا ہے۔ ایک
مضمون کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا اچانک شروع ہو جاتا ہے
 بلکہ ایک مضمون کے بیچ میں دوسرا مضمون یا کایک آجاتا ہے مغایط
اور تکلم بار بار بدلتے ہیں اور خطاب کا رخ وہ کر مختلف مستوں میں پھرنا
ہے ۱) بابوں اور فصلوں کی تقسیم کا کہیں نشان نہیں - تاریخ ۲) تو تاریخ
نگاری کے انداز میں نہیں ، فلسفہ اور ما بعد الطبیعت کا ذکر ہے تو منطق وفلسفہ

۱) یہ بند ڈاکٹر مصطفیٰ احمد زرقا کے مضمون "اسلامی قانون کے ماحصلہ طبع" جراغ راء

اسلامی قانون نمبر ، جلد اول ہے ماخوذ ہے۔ (مرتب)

۲) یہ بحث مولانا مودودی کے "مقدمہ تفہیم القرآن" ہے ماخوذ ہے۔ (مرتب)

شریعت اسلامی کے مأخذ

۲۵۳

ی زہاں میں نہیں، انسان اور موجودات عالم کا ذکر ہے تو تعلیم طبیعت کے
لذتی ہو نہیں، تعدن و سیاست اور معيشت و معادوت کی گفتگو ہے تو علوم
عمرانی کے طرز پر نہیں، قانون احکام اور اصول قانون کا بیان ہے تو متنوں کے ذہنگ
با کل مختلف چنانچہ یہ کتاب ف الحقيقة تمام دنیا کے لذیجہر میں اپنے
مزک ایک ہی کتاب ہے۔ اس کی ترتیب دنیا کی ساری کتابوں سے بالکل مختلف
طور پر ہوئی ہے۔ اپنے موضوع اور مضمون و ترتیب کے لحاظ سے اپنی یہ ایک
نرالی چیز ہے ।

اصل ۱

۱ اس کتاب کو سمجھنے کے لیے اسے نقطہ آغاز کے طور پر اس کی وہی اصل
بول کریں ہوگی جو خود اس کے پیش کرنے والے (محمد صل اللہ علیہ وسلم) نے
بیان کی ہے۔ اور مختصرراً یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عقلی و ارادی قوتوں سے ملامال
کر کے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے تاکہ وہ خدا ہی کو اپنا حاکم و
آنا تسلیم کرے اور اس عطا کردہ اختیارات سے سرموجاواز نہ کرے کیوں کہ
اس کی زندگی کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کے آخری فیصلے میں کامیاب ہونا ہے۔ اس
کے برعکس ہر رویہ خلط اور مختلف ہو گا (جسے اختیار کرنے کے لیے انسان آزاد
ہے)۔ ہر اس زندگی سے بعد ایک اور زندگی ہے جو ہدیہ رہے گی اور وہاں ابدی
راحت با ابدی رنج و مصیبت کے علاوہ کچھ نہ ملے گا جس کا مدار اس بات پر ہے
کہ انسان دنیا میں کون سا رویہ اختیار کرتا ہے۔ ہر انسانی فلاخ و بہبود اور
اس کی هدایات کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر ہمیجے۔ جن کا کام یہ تھا کہ صحیح
رویجے کی طرف انسان کو دعوت دیں، جسیں هدایت کو انسانوں نے گم کر دیا ہے
با سخّ کر دیا ہے اسے پھر اصل صورت میں پیش کوئی۔ پیغمبر ہزار ہا بوس تک

۱۔ مدعی، مرکزی مضمون اور قرآن کے موضوع کو معلوم کرنے کے لیے اس کی اصل کی طرف
توجه ضروری ہے۔ اس ترتیب کا سبب یہ ہے کہ قرآن کا مخاطب انسان کا شعور کل ہے
اس کا کوئی شعبہ نہیں ہے، وہ بیک وقت وجودان۔ عقل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ایک عام
مصنف اپنے خیالات کو کسی منطقی تقسیم کے ساتھ پیش کرتا ہے تو ابواب قائم کرتا ہے،
وجودان و لئیفیات کا ذکر ہوتا ہے تو انداز بیان دوسرا ہوتا ہے اور اس میں منطق کو دخل
کم ہوتا ہے اور ترتیب بھی دوسری ہوئی ہے، افسانہ یا تاریخ لکھتا ہے تو اس میں
واقفمات کے تسلیل کا خیال رکھتا ہے، غرض کتاب کی ترتیب، کانٹق نفس مضمون سے
ہے۔ اخلاق کی کتاب میں ابواب داخل کیجے جاسکنے ہیں لیکن جو کتاب بیک وقت
انسان کی جملہ شعوری و لاشعوری قوتوں سے مخاطب ہو وہ کسی ایسی تقسیم کو مفید
نہیں پاسکتی۔ اس لیے قرآن کا انداز دوسری کتابوں سے مختلف ہے، قرآن پڑھنے والے
کو قلب و دماغ، ہوش و وجودان سب کو بیک وقت حاضر رکھنا چاہیے ورنہ وہ پورا
فائدہ نہیں الہا سکتا۔ (مرقب)

دنیا میں آئے رہے اور وہی ایک دعوت اور ایک هدایت بیش کرتے رہے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کام کے لیے مبعوث کیا جس کے لئے پھولے انبیا آئے رہے تھے۔ عام انسان اور پھولے انبیا کی بگڑی ہوئی امتنیں سب ان کے مخاطب تھے ① سب کو صحیح رویت کی دعوت دینا، سب کو از مر نو خدا کی هدایت بہنچا دینا اور جو اس دعوت و هدایت کو قبول کریں انہیں ایک اس امت بنا دینا ان کا کام تھا جو ایک طرف خود اپنی زندگی کا نظام خدا کی هدایت بر قائم کرے اور دوسری طرف اصلاح دنیا کی جدوجہد کرے۔ اسی دعوت اور اسی هدایت کی کتاب بد فرقان ہے جو اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور نازل فرمائی اور اس کتاب کے لیے اس نے اپنا انتظام کر دیا کہ نہ بے گم ہو سکتی ہے اور نہ مسخ کی جا سکتی ہے۔

موضع 3

اس اصل کی وضاحت کے بعد آمانی سے مسجھا جا سکتا ہے کہ قرآن کا موضوع "انسان" ہے اس اعتبار سے کہ بہ لحاظ حقیقت نفس الامری اس کی فلاحت اور اس کا خسروان کسی چیز میں ہے۔ اس کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ ظاہر اپنی با قیاس آرائی یا خواہش کی خلافی کے سبب ہے، انسان نے خدا اور نظام کائنات اور اپنی ہستی اور حیات دنیوی کے مال و انجام وغیرہ کے متعلق جو نظریات قائم کرے ہیں، اور ان کی بنا پر جو رویت اختیار کرے ہیں، وہ سب حقیقت نفس الامری کے لحاظ سے غلط اور نتیجے کے اعتبار سے خود انسان ہی کے لیے تباہ کن ہیں۔ حبیث وہ ہے جو انسان کو خلیفہ بنانے وقت خدا نے بتادی تھی۔ اور اس حقیقت کے لحاظ سے انسان کے لیے وہی رویہ درست اور خوش انجام ہے جس کی تعلیم اللہ کے سے انسان کے لیے اور جسے "صراط مستقیم" کہا جاتا ہے۔

4

ان بنیادی امور کو ذہن میں رکھ کر کوئی شخص قرآن کو دیکھنے تو اسے صاف نظر آئے گا کہ بہ کتاب کہیں اپنے موضوع سے ہال برا بھر لیں ہیں ہیں۔ اول سے آخر تک اس کے مختلف النوع مضامین اس کے مرکزی مضمون سے مربوط ہیں۔ خواہ وہ زمین و آسمان کی صاخت، انسان کی خلقت، آثار کائنات کے مشاهدات بیش کرے، خواہ گزری ہوئی قوموں کے والفات، مختلف قوموں کے عقائد و اخلاق اور اعمال پر تنقید، مابعد الطبيعي امور وسائل کی تشریح اور ہم سے دوسری چیزوں کا ذکر کرے، وہ ہمیشہ ان چیزوں کا ذکر

شریعت اسلامی کے مأخذ

۲۵۵

بقدر ضرورت کرنے کے بعد غیر متعلق تفصیلات کو چھوڑ کر انہے مقصد اور مرکزی مضمون کی طرف رجوع کرتا ہے۔

(1) ۱۰ محرم قرآن اس نوعیت کی کتاب نہیں ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بک وقت اپنے لکھ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیا ہو، نیز یہ اس نوعیت کی کتاب بھی نہیں ہے کہ اس میں تعریضی طریقے نہ موضع اور مرکزی مضمون کے متعلق بحث کی کئی ہو بلکہ اس کی نوعیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہے ایک بندے کو اپنے برادری کی خدمت کے لئے منتخب کیا۔ اس کام کے آغاز میں جن ہدایات کی ضرورت تھی صرف وہی دی گئیں اور وہ زیادہ تو تین مضمایں ہر مشتمل تھیں۔ ایک ہبہمبر کو خود اس عظیم الشان کام کی تیاری کے لیے تعلیم - دوسرے، حقیقت نفس الامری کے متعلق اہنڈائی معلومات اور حقیقت کے ہارے میں غلط فہمیوں کی مجمل تردید تیسرا، "صحیح رویہ" کی طرف دعوت اور ہدایت الہمی کے پیشہ اصول اخلاق کا بیان۔ شروع شروع کے یہ پیغامات بہت چھوٹے ہوں ہر مشتمل تھے جن کی زبان نہایت شستہ، شیرین، پُر اثر، اور مخاطب قوم کے مذاق کے مطابق بہترین ادبی رنگ لیے ہوئے تھی تاکہ دلوں میں یہ ہول نہ شرکی طرح پہلوت ہو جائیں۔ ۱۰ محرم قرآن نے انہے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہر جو شعبہ خطبوں کی شکل میں پیغامات پہیجنے شروع کئے، جن میں دریا کی سی روانی، سیلاں کی سی قوت اور تیز و تند اس کی سی تاثیر تھی۔ ان خطبوں میں ایک طرف اہل ایمان کو ان کے فرائض بتانے کئے، ان کے اندر جماعتی شعور پیدا کیا گیا، انہیں تقوی، فضیلت اخلاق اور ہاکیزگی سیرت کی تعلیم دی گئی۔ ان کو دین کی تبلیغ کے طریقے بتانے کئے، کامیابی کے وعدے کئے گئے اور جنت کی بشارت دی گئی۔ صبر و ثبات اور بلند حوصلگی کی تعلیم دیتے ہوئے راہ خدا میں جد و جہد کرنے پر ابھارا گیا۔ دوسری طرف مخالفین اور راہ راست سے منہ موزٹنے والے اور غفلت کی نیند سونے والے لوگوں کو ان ہجھلی قوموں کے انجام سے ڈرایا گیا جن کی تاریخ سے وہ خود واقع تھے۔ ۱۰ محرم حضرت کے بعد سے توحالات کا نقشہ بدلتا ہوا۔ امت مسلمہ ایک باقاعدہ ریاست کی بنا ڈالنے میں کامیاب ہو گئی، ہجھلے انبیا کی امتیوں سے سابقہ پیش آیا۔ ہر ای جاہلیت کے علم اور داروں سے جنگ کی نوبت آئی۔ خود امت مسلمہ کے اندر وی فرقہ نظام میں مختلف قسم کے منافق کھوس آئے۔ اور کئی سالاں کی شدید کشمکش سے گذر کر آخر کار یہ امت کامیاب کی اس منزل پر ہٹھی

کہ سارا عرب اس کے زبر نگین ہو گیا۔ اور عالم گیر دعوت و اصلاح کے دروازے اس کے سامنے کھل گئے اس سحلے اور ان ادوار کی بھی مخصوص ضرورتوں کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپسے بیانات آئے جن کا انداز کبھی آتشیں خطا بر کر کبھی شاہانہ فرمانیں و احکام کا، کبھی معلمانہ درس و تعلیم کا اور کبھی مسلمانوں الہام و تقویم کا ہوتا تھا۔ اس میں نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ریاست و مدنبر صالحہ کی تعمیر، زندگی کے مختلف شعبوں کے اصول و ضوابط، کفار، منافقین، اہل کتاب سے سلوک، مسلمانوں کو زندگی کے مختلف معاملات و احوال میں صحیح طرز عمل کی تفصیل ہدایت دی گئی۔ عرض ایک طرف عالم گیر دعوت و اصلاح کی اور دوسری طرف جماعت مسلمین کے مرداری اور تیسری طرف رئیس حکمران کی مختلف حیثیتوں کا تعین کیا گیا۔

اگرچہ اسی طرح دعوت و اصلاح کے ادوار کی ضروریات کے مطابق قرآن کے مختلف حصے نازل ہوتے رہے اور تیسیس (۲۲) سال کی مدت میں اس کی تکمیل ہوئی۔

۱۔ ندوین، جمع و ترتیب اور حفاظت

* یہ بات صرف قرآن سے ہی مخصوص ہے کہ یہ کتاب جس طرح محضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر نازل ہو، من و عن بغیر کسی تبدل و تغیر اور تعریف را تفسیم یا ترمیم و تنسیخ کے بالکل اصلی اور محفوظ حالت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ اس پر سب کا اتفاق ہے، حالانکہ اس سے ہم کی آسمانی کتابیں اب تو اپنے شکل و صورت اور اصلیت بالکل کھو چکی ہیں۔ قرآن سے پیشتر کی آسمانی کتابوں کے برعکس اس کتاب (قرآن) کی حفاظت کی ضمانت خود اس کے نازل کرنے والے نے کوئی گنجائش نہیں اور یہی وہ حقیقت ہے جو تاریخ کے مطالعے سے بھی ثابت ہوئے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

لَا يَأْتِيهَا الظُّلُمُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ

قرآن میں نہ سامنے سے بطل کے گھسنے کی گنجائش ہے نہ پیچھے ہے۔ (سم السجدۃ - ۲۲)

* یہ بند مرتب کا تحریر کردہ ہے۔

لَكَ عَلَيْنَا الْجُنَاحُ

بلا شبهہ مم پر قرآن کے جمع
و رکھنے کی ذمہ داری ہے۔
(القیامہ - ۱۲)

صحیح

حافظ

لَتَأْتِنَّنَا اللَّذِكْرُ وَلَا إِلَهَ لَسْتُمُونَ

بے شک مم نے اس الذکر (قرآن) کو اثارا
کرنے والی ہیں (العبر - ۹)

بَلْ هُوَ قُرْآنٌ يَعْبَدُ فِي لَوْحٍ مَفْوَظٍ

بلکہ وہ تو بلند و بالا، برتر قرآن لوح
محفوظ میں ہے۔ (البروج - ۲۰۲۱)

اور قرآن کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ اس کی حفاظت، جمع و ترتیب
اور کتابت کا سلسلہ اس کے نزول کے ساتھ ہی جاری ہوا اور آخری صفحے تک
باری رہا، جب کہ اس سے اہلے کی انسانی کتابیں ابتداءً زیادی پادداشتیں اور
کینوں اور قسموں کی شکل میں رہیں اور صدیوں بعد قلم بند ہوئیں۔ لیکن قرآن اول
تا آخر ابتدائی دور میں لکھ لیا کیا تھا۔

• اس مسلسلے میں سورہ فاتحہ کے بعد قرآن کی بہل سورہ (البقرہ) کی بہل

آیت میں اولین شہادت ہے:

ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَبَّ لَهُ وَهُوَ

بے ایک نوشته ہے جس میں شک
نہیں ہے۔ (البقرہ - ۲۰)

ایش کرنے والا اس کو ابتداء ہی سے نوشته اور مکتبہ (کتاب) شکل میں ایش
کرنا چاہتا ہے۔ اور کتاب یا نوشته کا یہ لفظ کجو اس مقام پر استعمال
نہیں ہوا بلکہ قرآن کی ہو بڑی سورت میں کتاب یا نوشته ہونے کا مسلسل ذکر
ملتا چلا جائے گا۔ ہر:

• ہے مولانا مناظر احسن گھلانی کی کتاب "ندوین فرآن" سے مالحوظ ۵۔ (مرتبہ)

لَأَيْمَانِ الْمُطَهَّرِينَ

اس (قرآن) کو صرف پاک لوگ می
چھو سکتے ہیں۔ (الواقة - ۹)

کافروں ہی اس بات اور کافی دلیل ہے کہ خود قرآن نے انہی آپ کو ایک ایسا نوشته اور مکتبہ شکل میں ایش کیا ہے جس کے چھو جانے کا بھی امکان نہیں۔

کتابت ✓ پھر اس کی کتابت و حفاظت کا اہتمام دیکھئے کہ دو شنبہ (ایج الدو
سنه ہم نبی کو دوسری وحی اور تبلیغ کا حکم ہوا۔ ہج شنبہ کو خالد بن سعید
مشرف بہ اسلام ہونے۔ ان ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت شروع کرائی۔
ان کی دختر ام خالد بنت سعد نے بیان کیا ہے کہ سب سے اہلے بسم اللہ میرے
نے اکھی۔ اس طرح نزول وحی سے چوتھے دن کتابت شروع ہوئی جو نزول فزان
کے اختتام تک برابر جاری رہی۔ اور ایک دو نبیس ہوت سے اصحاب سے کتابت وہی
کا کام لیا جاتا نہیں بلکہ مورخین نے ان کی تعداد ۲۶ تک بنائی ہے اور کتابہ انسان
و اربعوں) اور کتابوں کی اتنی بڑی تعداد مقرر کرنے کی وجہ یہی تھی کہ وقت
ابک نہ ملے تو دوسرا اس کو انعام دیدے۔ حتیٰ کہ ایک صحابی حنظله بن (ایج زہ)
تمام ۵ نبیوں کے خلیفہ اور سردار تھے اور ان کو حکم یہ تھا کہ کوئی رہے با
کہ رہے وہ ضرور حاضر رہیں تاکہ کتابت وحی میں رکاوٹ نہ ہو۔ اس انتظام کا
نتیجہ تھا کہ نزول کے ساتھ ہی هر قرآنی آیت قلم بند ہو جاتی تھی۔ حضرت ام سلمہ ز
لہتی ہیں کہ جبرنیل علیہ السلام قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو
(لکھوانے تھے)۔ مزید احتیاط یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف لکھوں
ہو ہی فناءت نہ فرمائے تھے بلکہ کائب جب لکھ لکھنے تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم)
پڑھوا کر سئیے۔ اگر دونی حروف یا لفظ لکھنے سے چھوٹ جاتا تو اس تو آپ
(صلی اللہ علیہ وسلم) درست کرتا۔ جب یہ سب کام ہو رہا ہو جاتا تب اشتافت عام
کا حکم دے دیا جاتا تھا۔ پھر جو لکھنا جانتے تھے لکھ لیا کرنے تھے۔ معتبر
زید بن ثابت رضی کے الفاظ میں ॥ اجب کوئی آیت نازل ہوئی تھی تو حضور صلی اللہ
علیہ وسلم مجھے کو بلاۓ تھے۔ میں تختی اور دوات قام لے کر حاضر ہوتا۔ آپ
(صلی اللہ علیہ وسلم) لکھاتے، لکھا اور پھر سئیے، اگر کوئی غلطی ہوئی تو
صحیح کرایا۔ پھر یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ قرآن کی کتاب
کے ایسے بغاۃت احتیاط بہترین چیزوں کا انتخاب کیا گیا تھا۔ جن میں ا

شوبعت اسلامی کے مأخذ

۲۸۹

رفاع^۱، لحاف^۲، کتف^۳، عسوب^۴، ادیم^۵، افتتاب^۶، وغیرہ عام طور پر مستعمل تھیں تاکہ ابک طویل مدت تک آفات و حوادث سے حفاظت رہے۔

* غرض، اس حزم و احتیاط، اور النظام و انصرام کے ساتھ قرآن کریم اپنی بیدت نزول میں بصورت تحریر جمع ہوتا رہا۔ اور آیات اور سورتوں کی جمع و ترتیب کی تکمیل بہ حکم خداوندی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی اور یورا قرآن موجودہ ترتیب آیات و سورے کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر ہدایت و نگرانی قید تحریر میں آگیا۔ چنان چہ تمام اہل اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ اج تک اسی نبوی جمع و ترتیب کے مطابق ایک نقطہ اور شوشه کی بھی کمی بیشی کے بغیر قرآن محفوظ و موجود ہے۔ جیسا کہ مولانا بخارالعلوم "شرح مسلم مسلم الثبوت" میں لکھتے ہیں کہ۔

"قرآن کی بہ ترتیب جس پر اج ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، اور اس کی صحت پر تمام امت کا اتفاق ہے۔"

اور مشہور شیعی فاضل علامہ سید محمد اپنی کتاب "تنزیہ الفرقان" میں مشہور شیعی مجتهد علم القرآن علامہ سید مرتضی سے ناقل ہیں کہ

"قرآن جس ترتیب پر اج ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بھی وہ اسی طرح مرتب تھا، اور اسی طرح سے اس وقت پڑھا جاتا تھا، اور اسی طرح سے باد کیا کیا، اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح ہے سنایا جاتا اور اپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے پڑھا جاتا اور صحابہ کی پڑی جماعت نے اکثر ہمار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یورا قرآن اسی طرح سنایا، جس سے صاف روشن ہے کہ قرآن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مرتب تھا نہ کہ متفرق و غیر مرتب۔"

چبڑا (چرمی قطعات)۔ ^۱ پتھر کی سفید پتل پتل نخیان۔ ^۲ اونٹ کے موٹلھی کی گول ہلی (طلتری کی طرح)۔ ^۳ کھجور کی شاخوں کی جڑ کا وہ کشادہ اور عریض حصہ جس میں کانٹے والی پتتے نہیں ہوتے۔ ^۴ باریک کھال سے دباغت کے عمل سے تیار ہوتا تھا (اور عرب میں گوشت خور ملک ہونتے کے وجہ سے ان کا کافی ذخیرہ تھا چنان چہ خیمہ بھی صرف ادیم کے چبڑوں سے تیار کیا جانا تھا)۔ ^۵ قلب کی جمع۔ اونٹ کے کجاوہ کے چولے اور پتلے نختوں کے نکلے۔ ^۶

یہاں سے اس بحث کے اختتام تک کا حصہ مولانا افتخار احمد بلخی کا تحریر کردہ ^۷ (مرتب)

بہر نہ صرف یہ کہ اس کا صرف ایک ہی نسخہ تھا جو رسول کو نہ ملی اللہ علیہ وسلم کے ائمہ لکھا گیا تھا، جن کو سرداری جلد دھا جا سکتا ہے، الکہ بت سے صحاہ کے داس بھی پورا فرقان مکبویہ شکل میں تھا اور بہت سے اسے صحاہ بھی نہیں جن نے یاں اکرچہ مکمل قرآن لکھا ہوا نہ تھا ایکن اس دلیل کے بڑا حصہ تحریری شکل میں تھا، اور یہ سب ایسی تاریخی حقیقتیں ہیں کہ ان کے ذریعے ذریعے مستشرقین تک ان کا اعتراف کرنے اور ان کی مشہاد دیتے ہیں،

چنان چہ سر ولیم بیور نے لکھا ہے ۱۵

"اس بات کے باقی کی زار دس وجوہ ہیں کہ رسول کی زندگی میں منفوق طور پر قرآن کے لکھنے ہونے نسخے صحاہ کے یاں موجود تھے، اور ان نسخوں میں پورا قرآن یا تقریباً تمام قرآن لکھا ہوا تھا یہ"

اور ڈاکٹر راؤ وبل رقم طراز ہیں ۱۶

"قرآن کے لکھنے ہونے نسخے عہد رسول میں عام طور پر زیر اسعمال

تھے۔"

بہر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اس قرآن کے لکھنے جانے اور اس کی نسخہ اشاعت میں جنی عظیم السان وسعت ہوئی ہے اسے علامہ ابن حزم اپنی مشہور کتاب "الفصل بین المآل والنحل" میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

"جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو اس وقت کا کل جزیرہ عرب مسلمان ہو گیا تھا، جو عرب میں بعد قلزم سے لے کر سواحل بن سے گیرتا ہوا مشرق میں بحر فارس سے دریائے فرات پر گذرتا ہوا شام کے کنارے کنارے بعد قلزم پر ختم ہونا ہے اور اس جزیرہ عرب میں یہ شمار شهر اور ماضعات ہیں، جسے یمن، بحرین، عمان، نجد، قبیله طی کے دو بھائی (اجا - سامی) قبان، بصر و زیعہ و قضاہہ قصبات، طائف، بکہ، مدینہ وغیرہ، غرض یہ تمام جزیرہ مسلمان ہو گیا تھا، اور اس میں کوئی شہر اور کوئی گاؤں اور کوئی آبادی ایسی نہ تھی جہاں مسجد نہ ہو، اور ان تمام مسجدوں میں بانجوان و قب نماز میں قرآن پڑھا جاتا تھا، اور مسلمان اپنے بھول اور غورنوں اور مزدوں کو قرآن کی نعلم دیتے تھے۔ پھر حضرت ابو بکر رضی خلیفہ ہونے اور ڈھائی سال خلیفہ رہے، فارس اور روم سے جماد کیا، یمانہ کو از سر نو فتح کیا اور اب قران کو جانتے والے اور زیادہ ہو کئے اور یہ سوار

شریعت اسلامی کے مأخذ

۴۶۱

معاہدہ نے جس طرح قرآن کو لکھا تھا اسی طرح بعد میں دیگر بلاد اسلامیہ میں بہت سے لوگ تھے جنہوں نے قرآن لکھا تھا، اور کوئی شہر مسلمانوں کا ایسا نہ تھا جس میں قرآن کے نسخے لکھے ہوئے نہ ہوں، ہر خلیفہ اول کا انتقال ہوا اور حضرت عمر رضی خلیفہ ہوئے اور تمام فارس، تمام شام، جزیرہ اور تمام شہر اپسا نہ تھا جس میں قرآن کے نسخے لکھے نہ کئے ہوں، ہر ہر قریبہ شہر اپسا نہ تھا جس کے نسخے لکھے نہ کئے ہوں، ہر ہر قریبہ قرآن کی تعلیم دی جاتی۔ اس طرح لا تعداد قرآن لکھے گئے، اور بدستور قرآن پڑھا بنا رہا، اور دس سال کچھ میں یہی حالت رہی، اور عبد عمر میں مصر و عراق اور شام و یمن کی وسیع و عربیش سر زمین میں ایک لاکھ تھے کم نسخے قرآن کے مسلمانوں کے ہاس نہ ہوں گے۔ ہر حضرت عمر رضی کا انتقال ہوا تھے ماتھے قرآنی نسخوں اور مساجد وغیرہ تمام یاتوں میں زیادتی ہوئی، اور اس زبانے میں قرآن کے اس قدر نسخے لکھے گئے اور مسلمانوں کے ہاس موجود تھے کہ کوئی اس پر قادر نہیں کہ اس کا شمار بتا سکے اور اس کی تعداد کا اندازہ لکا سکے۔

ماخذ دوم : السنۃ*

تعريف - معنی : "سنۃ" کے لغوی معنی طریقے اور راستے کے ہیں۔ خواہ وہ اچھا ہو یا برا۔ چنان چہ ایک حدیث میں ہے "لہ" جس نے کوئی اجھی سنۃ قائم کی اسے خود اپنے عمل کا بھی اجر ملے کا اور قیامت تک اس سنۃ کی پیروی کرنے والے کے عمل کا بھی۔ "لیکن عرف میں اس لفظ (سنۃ) سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ثابت شدہ اور معلوم طریقہ ہے جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار عمل کیا جس کی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے محافظت فرمائی اور جس کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم عام طور پر ہابند رہے۔ اور ہر محدثین کی اصطلاح میں آکر اس لفظ (سنۃ) کے معنیوں کا دائرہ پھیل گیا، اور اس سے مراد ہوا رسول کا قول، تقریر اور آپ کی صفات اور سیرت کے بارے میں جو کچھ بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس اصطلاح کی (وسم) "سنۃ" لفظ "حدیث" کا مترادف ہے۔

* بہ حصہ بولانا افتخار احمد بلخی کا تحریر کردہ ہے۔ (مرتب)
۱۔ وہ کام جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا گیا اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس سے منع نہیں فرمایا، اصطلاح میں "تقریر" کہلاتا ہے۔

اس کا درجہ آتا ہے۔ کیوں کہ سنت اپنی اصل حیثیت سے قرآن کے اعمال کی تفہیل اور قرآن کے مأخذ ہے۔ اور قرآن کے اعمال کی تفہیل میں مونیر ہوتے کہ اس کے متعلق اشکال کی توضیح و تفسیر ہے۔ لیکن قرآن سے مرتبہ میں مونیر ہوتے کہ اس کے متعلق ایک جہت سے سنت بجائے خود ایک مستقل مصدر قانون ہے۔ کیوں کہ اس لحاظ سے مسئلہ قانون سازی کا منبع ہونے کے باوجود سنت قرآن کے تابع نہیں ہے۔ مگر اس لحاظ سے وہ قرآن کا بیان و تفسیر ہونے کے علاوہ ان مقامات پر بھی قرآن کے مبادی اور اس کے قواعد عامہ سے متجاوز نہیں ہوتی جہاں قرآن خاموش ہے۔

حجت حدیث و سنت: حدیث اور سنت دونوں متوازیں ہوں، جسما کہ مختاری کی اصطلاح ہے، یا سنت کو رسول کے طریقہ عمل کے لیے خاص سمجھا جائے اور حدیث کو قول رسول کے لیے اور ہر حال حدیث و سنت کی حیثیت دینیں میں سند اور حجت ہونے کی ہے، اور ہر ثابت شدہ سنت اور ہر وہ ارشاد یا عمل جو کو رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف نسبت ہو اور وہ قرآنی معیار اور اصول روایت و درانی کی رو سے بہ ظن خالب ہی صحیح نہیں ہے، تو وہ جمہور امت مسلمہ کے غلبہ میں واجب التسلیم ہے۔ اور یہ بات ایسی نہیں جس کے لیے کسی قسم کی باریکہ بینی اور علم و بصیرت کی ضرورت ہو۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ خدا کو مذاہ مان لینے کے بعد اس کی فرمان برداری ضروری ہو جاتی ہے، کیوں کہ عقل عام تک اس بات کو جائز اور ممکن نہیں سمجھتی کہ ایمان تو ہو مگر وہ اپنے اندر کسی طرح کی اطاعت کا مطالبه نہ رکھتا ہو، اسی طرح رسول کو رسول مان لینے کے بعد رسول کے ہر قول اور ہر عمل کو رضاۓ اللہی کی یقینی اور واحد کلبدھ ہاں کرنا ضروری ہے۔ اور رسول پر ایمان بھی اپنے اندر رسول کی اطاعت و اتباع کا مطالبه رکھتا ہے، خواہ رسول کا جسمانی وجود بھی ہو یا اس کا صرف ارشاد ہاں طریقہ عمل سامنے ہو۔

تاہم حدیث و سنت کی حجت اور ان کے دینی سند ہونے سے متعلق بہائی نکات کے طور پر چند دلائل درج ذیل ہیں۔ ان دلائل کو ہم آسانی سے دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

- (۱) قرآن کی اندرونی شہادت
- (۲) خارجی شہادت

شریعت اسلامی کے مأخذ

۲۶۳

- اور ہر خارجی شہادت کے دو شعبے ہوتے ہیں :
- (۱) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور صحابہ کرام کے بعد علمائے امت کی حدیث و سنت کے حجت ہوتے کی شہادت ۔
 - (۲) عقلی حیثیت سے اس کی حججت کا ثبوت ۔

اندرونی شہادت

جبکہ تک قرآنی تصویریات کا تعلق ہے ، تو اس سلسلے میں ہمارے سامنے نہ آن کی بے شمار آیات ہیں سے چند یہ ہیں :

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَدَ فِيمَا لَمْ يُؤْلَمُ مِنْ أَنْفُسِهِمْ بَلَّغُوا عَلَيْهِمْ أَيْتِهِ وَإِذْ كَبُوْرٍ وَيَعْلَمُهُمْ أَنْكَبَ وَأَجْلَمَةً

یقیناً افہ تعالیٰ نے مومنوں پر احسان کیا ، جب کہ اس نے ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر افہ کی آیات نلاوت کرتا ہے ، اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے ۔ (آل عمران - ۱۶۴)

امن سے معلوم ہوا کہ فریضہ رسالت مغض اللہ کی آیات کا دوسروں تک ہہونچا دینا ہی نہیں ہے بلکہ جو لوگ ایمان لے آئیں ان کے معاملے میں رسول کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ ان کو ان آیات الہمی کی تعلیم بھی دیں ۔ اور تعلیم الفاظ کے مبنای دینے کا نام نہیں ہے ، بلکہ مشکل مطالب کا حل کرنا اور مجلد و مبہم باتوں کی تفہیل و تشریح کو تعلیم کہونے ہیں ۔ اور تعلیم کبھی صرف زبان سے ہوتی ہے ، کبھی صرف عمل سے ہوتی ہے اور کبھی زبان و عمل دونوں سے ہوتی ہے اور بھی وہ "تعلیم کتاب و حکمت" ہے جو احادیث و سنن کے نام سے مشہور ہے ۔

نہذا اللہ کی جانب سے مامور کیجئے ہوئے اس علم الكتاب (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات کو درمیان سے ہٹا کر بعض اپنی عقل و فکر کے بل بوتے ہو الكتاب (قرآن) کا کوئی مفہوم بتھیں کیا جائے گا تو امن کے بارے میں بہ خصانت نہیں دی جا سکتی کہ وہ یقیناً خدا کی مراد و منشا کے مطابق ہے ، لیکن رسول کی زبان و عمل سے بیان کیجئے ہوئے قرآنی مفہوم کے متعلق ایک لمحہ کے لئے بھی وہ شک نہیں کیا جاسکتا کہ وہ خدا کی مراد و منشا کے نہیک نہیک مطابق نہ ہو دیوں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ کام وحی کی نگرانی میں کرتے تھے :

إِنَّمَا تَنْهَىُنَا إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ بِالْحُقْقِ لِتَتَكَلَّمَ بَيْنَ النَّاسِ هُنَّا أَرْبَابُ اللَّهِ

(۱۷۷ محدث) ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ نہماری طرف بھیجی ہے تاکہ لوگوں کے درمیان تم اس طرح فصلے کر دے جس طرح افہ نہ کو دکھائے ۔ (الناس - ۱۰۵)

اس آدت میں "بما اراک اللہ" کا جملہ خاص طور پر قابل غور ہے۔
بماراپت (جیسا کہ تم دیکھو) نہیں کہا گیا ہے، بلکہ بما اراک اللہ (جیسا کہ اللہ تم کو دکھانے) کہا گیا ہے، اراۃ (دکھانا) اور تنزیل (نازل کرنا) استعمال و مفہوم اور معنی کے لحاظ سے دو مختلف جیزس ہیں، تنزیل کا تعلق اس وحی سے ہے جو الفاظ کے ساتھ نازل ہو، اور اراۃ میں وہ الہام و القا داخل ہے جو بذریعہ الفاظ نہ ہو، اور لفظ وحی لغت اور حقیقت کے لحاظ سے تنزیل اور اراۃ دونوں دو شاخے ہے۔ بھی وہ "بما اراک اللہ" ہے جس کو محدثین اور ائمہ مجتہدین اپنی اصطلاح میں "وحی خفی" یا "وحی غیر متلو" سے تعبیر کرتے ہیں۔
بعنی اللہ کی وہ "اراۃ، (دکھانا) جس کا اظہار و بیان نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ و اعمال (حدیث و سنت) کے ذریعے و وسیط سے کیا، اللہ کی اراۃ تو ہے، مگر الفاظ نہیں جس کی تلاوت کی جانے۔ لہذا کسی بات سے متعلق رسول کی تعلیم، کسی امر سے متعلق رسول کی تفصیل و تشریع اور کسی معاملے سے متعلق رسول کا فیصلہ بعض ایک بشو کا فیصلہ نہیں ہے، بلکہ اللہ کی اراۃ کا نتیجہ اور فرات نبویہ کا وہ فیصلہ ہے جس میں کوئی دوسرا شخص رسول کا شریک و سہم نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔

اس بہ آبیت اس بات پر صراحتاً دلالت کدرہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر ایک تو تنزیل (انا انزلنا ...) ہوئی، اور اس کا مصدق قرآن ہے، اور دوسری چیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارائۃ الہبی (بما ارزک، اللہ) عطا ہوئی جو اہنے معنی و مفہوم کے لحاظ سے تنزیل سے جدا گانہ حیثیت رکھتی ہے، لہذا اس ارائۃ الہبی (وہی خفی با وہی غیر متلو) کا بھی کوئی مصدق ہونا چاہیج اور وہ یہی حدیث و سنت ہے۔

اور ہر اس "اراءہ الہی" کی شہادت خود قرآن میں بہ کثرت ہے، یہ طور
مثال صرف دو آبینی درج ذبل ہیں:

إِنَّ عَلَيْنَا جَمِيعَهُ وَقُرْآنَهُ تَعْدَانَ عَلَنَّا يَسَانَهُ :

اس قرآن کا جمع کرنا اور پڑھوافا ہمارے ذمہ ہے
..... پھر اس (کے معانی) کا بیان بھی ہمارے ذمہ ہے۔
(القيمة ۱۹۰۔ ۱۴۰)

اس آیت میں تین باتیں فرمانی گئیں ہیں ، اور ان تینوں کو اللہ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے ۔

فروعت اسلامی کے مأخذ

۲۶۵

(۱) جمع قرآن (۲) قرآن کا بڑھوala (۳) قرآن کا بیان

جمع و ترتیب قرآن سے متعلق کوئی ایسی آیت نہیں جس سے یہ واضح ہو کہ اللہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ تنزیل یہ هدایت دی ہو کہ فلاں فلاں آیت کو فلاں فلاں مقام اور رکھو۔ یہ کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر تنزیل کے کیا، لیکن کون یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ رسول کا یہ کام بعض نجی حیثیت سے تھا اور اس کو رسالت سے کوئی تعلق نہ تھا، اور یہ کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قرآن کی آیات اور امن کی سورتوں کو جس ترتیب ہے جمع کیا، اس کی نگرانی و رہنمائی خدا نے نہیں کی تھی۔

اس کے ارخلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کام کو اللہ نے اپنی طرف (علینا) منسوب فرمایا۔ اسی طرح قرآن کا بیان اللہ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے (ثم ان علینا بیانہ)، اور بیان کہتے ہیں توضیح و تشریع کو۔ مجلہ کی تفصیل کو، اس کے منشا کی تعین کو اور اشارات کی وضاحت کو۔ اب سوال یہ ہے کہ قرآن میں چو اصولی اور مجلہ احکام ہیں، اس آیت کی رو سے ان کا بیان اور ان کی تفصیل و تشریع من جانب اللہ ہونی چاہیے یا نہیں؟ ظاہر ہے، جواب اثبات میں ہوگا، کبھی کہ ان کے بیان و تفصیل و تشریع کو اللہ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔ لیکن قرآن ان کی تفصیل اور تشریع سے خاموش ہے، اور حدیث و سنت ان کی تفصیل و تشریع پہنچ کر کی ہیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حدیث و سنت تنزیل نہ ہونے کے باوجود اراءۃ اللہ اور وہی میں داخل ہے جب ہی قرآن کے مجلہ اور اصولی احکام کی تشریع و بیان کی نسبت اللہ کی طرف (ثم ان علینا بیانہ) صحیح ہوگی باوجود یہکہ وہ تشریع و بیان حدیث و سنت میں ہے۔

حدیث و سنت کا بیان القرآن ہونا دوسری آیتوں سے بھی معلوم

ہوتا ہے، مثلاً

وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْمَذْكُورَ لِتُبَيَّنَ لِلنَّاسِ مَا نَهَى إِلَيْهِمْ

ہم نے آپ کی طرف المذکور (قرآن) نازل کیا ہے،
ناکہ لوگوں کے سلسلے آپ اس چیز کی وضاحت
کر دیں جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے۔
(التحل - ۲۲)

وَمَا نَرَى لِأَعْلَمَ الْكِتَابَ لِلشَّيْءِ إِنَّمَا لِلَّهِ الْبَصُورُ فَإِنْ هُوَ

اور ہم نے تم پر یہ کتاب مخفی اس لیے آثاری ہے
کہ تم ان کے سامنے وہ اصل حقیقت کھوں دو جس
میں وہ اختلافات کر رہے ہیں ۔ (النحل - ۱۶)

(ب) انی نضر جب اپنے مکانات سے نکال دیے گئے اور ان کے کھجوروں کے
درختوں میں سے کھو کاٹ دیے گئے اور کچھ جھوڑ دیے گئے تو اس واقعے سے
متعلق قرآن بہ اعلان کرتا ہے کہ

مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِبَنَةٍ أَوْ سَرْكَنَوْهَا قَائِمَةً عَلَى أَصْوَلِهَا فَإِذَا ذَرْتُمْ لَهُ

کھجور کے جو درخت تم نے کاٹ ڈالی یا اپنے جڑوں پر
کھڑا رہنے دیا ، سو وہ خدا کے اذن سے نہا ۔ (المشیر - ۵)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا آس موقع ہو درختوں
کو کاٹ ڈالنے کا حکم دینا از روئے وحی تھا ، مگر قرآن میں کوئی ایسی آیت
نہیں جو اس حکم خداوندی پر دلالت کر رہی ہو ۔ معلوم ہوا کہ وہ حکم خداوندی
بذریعہ "تنزیل نہ تھا ، بلکہ بذریعہ "اراء اللہی یا دوسرے لفظوں میں بذریعہ" وحی
خفنی تھا ۔

اب اخیر میں سورہ آل عمران کی وہ آیت بھی بخش نظر رکونے کی ہے جس میں
صحابہ ، کرام وضی اللہ تعالیٰ عنہم کو اہل کتاب کے ہنکنڈوں سے ہوشیار کرنے
جوئے ارشاد ہوا کہ

وَلَيَقْتَلُنَّ الْكُفَّارَ وَلَا يُنْثَرُ شَلْلٌ عَلَيْكُمْ أَيْتُ اللَّهُ وَهُنَّ كُلُّهُمْ رَسُولُهُ

اور قم کس طرح کفر کر سکتے ہو جب کہ تم کو اپنے کی
آیتیں سنائی جانی ہیں اور تمہارے درمیان اس کا رسول
وجود ہے ۔ (آل عمران - ۱۰۱)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کفر سے بچانے والی دو مستقل چیزوں ہیں ،
ایک تو اپنے کی آیات اور دوسری خود رسول کا مستقل وجود ، جو اپنی تعلیم و تلقین
اور فیض صحبت اور اثر سے لوگوں کو بھیکھنے نہیں دیتا ۔ لہذا آج جب کہ
الله کی آیات ، یعنی قرآن تو ہے مگر رسول کا جسمانی وجود ہمارے درمیان نہیں
تو ہدایت کا وہ دوسرا سر چمٹہ حدیث و منت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ؟

بھی جب حدیث و سنت کا بہ مقام و مرتبہ منین ہو کہا کہ و نعلم الكتاب ہے،
لوضیح کتاب ہے اور اراعة الہی کی صداق ہے، تو اب اس میں کیا شبہ
جاتا ہے کہ حدیث و سنت کی حیثیت مخف فاریطی نظائر کی نہیں ہے،
و دینی مقام رکھتی ہیں، دینی سند ہیں اور دین میں حجت ہیں۔

رہا حدیث و سنت کا واجب التسلیم ہونا، تو اگرچہ ان کے دینی سند و حجت
میں کوئی ضرورت نہیں رہتی کہ ان کے واجب التسلیم ہونے کے بھی دلائل
میں کوئی جانبی، بھر بھی چند قرآنی تصريحات درج ذیل ہیں۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا يَهْدِي بِرَبِّ الْوَالَّهِ

ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اس لیے بھیجا
کہ باذن الہی اس کی اطاعت کی جائے۔
(الناء۔ ۶۲۔)

اس سے اصولی طور پر معلوم ہوا کہ رسالت اور بطاع (جن کی اطاعت
کی جائے) ہونا لازم و ملزم ہے، کسی رسول کی رسالت کی تصدیق کونا ہی
واجب الاطاعت پذیر کرنا ہے۔

دوسری بات بھاں یہ اپنی نظر و کمنج کی ہے کہ اطاعت کے لئے اصل
یعنی حیثیت سے مرکزی اہمیت نبی کی ذات، اس کے اسوہ اور مثال کو
بیاری ہے۔ یعنی یوں نہیں کہا گیا ہے کہ وما انزلنا من کتاب الای بعمل
ہ (ہم نے کسی کتاب کو نبی نازل کیا مگر اس لیے کہ اس ہر عمل کیا
بجائے۔) بلکہ فرمایا گیا ہے کہ "و ما ارسلنا من رسول الا بیطاع باذن الله"
واجب الاتباع ہوئی ہیں، اسی طرح انبیا و رسول کی هستیاں بھی بالاستقلال
واجب الاتباع اور واجب الاتباع ہوئی ہیں، اور ابسا کیوں نہ ہو جب کہ
واجب الاطاعت اور واجب الاتباع ہوئی ہیں، اور ابسا کو بیہودہ فرمایا ہے
بہ ابک تاریخی حقیقت ہے کہ اللہ نے کتاب کے بغیر تو انبیا کو بیہودہ فرمایا ہے
مگر نبی کے بغیر کوئی کتاب نازل نہیں کی گئی ہے، اور ہر نبی، عام
ازیں کہ اس ہر کتاب نازل کی گئی ہو یا بغیر کتاب کے اس کی بعثت ہوئی ہو،
ہوں گے وہ واجب الاطاعت ہوتا ہے، اس لیے فرمایا گہ "و ما ارسلنا من رسول
الای بیطاع باذن الله"۔

اس کے ملاں الرَّأْنَ میں متعدد مطامات ہو "اطبِعُوا أَنَّهُ وَالظَّبِيعُوا الرَّسُولُ" اور "اطبِعُوا أَنَّهُ وَرَسُولُهُ" جیسے جملوں کے ذریعے اطاعت الہوی کے ساتھ ساتھ اطاعت رسول کا بھی حکم ہے، لہذا جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور الرسول اور رسولہ کا اطلاق ہوگا، جتنے لوگ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت کی تصدیق کریں گے، ان ہو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت واجب ہوگا۔ اور اطاعت رسول کے الفاظ بولیں، یا حدیث و سنت ہو عمل کریں، یا ایک مرض لفظی تعبیر کا فرق ہے ~~خ~~

وَمَا أَنْهَىٰ إِلَيْهِ رَبِّهِ لَا مُكَافِئٌ لِّكَوْنَتِهِ لَمْ يَلْوَدْنَا مِنْ آنِهِ هُنَّ

اور کسی مومن مرد اور مومنہ، مورت کے لیے یہ گنجائش نہیں کہ جب افہم اور اس کے رسول کس امر کا فیصلہ کر دیں تو ان لوگوں کو اپنے معاملے ہیں (اس فیصلے کے قبول و عدم قبول کا) کوئی اختیار باقی نہ ہے۔ (الاحزاب - ۲۱)

بہ آہت اس امر کے لیے نصیحت ہے کہ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور رسولہ (اللہ کا رسول) کا اطلاق ہوگا، (اور قیامت تک ہوگا) آمن وقت تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر آس بات کا ہے چون و چرا تسلیم کرنا لازم ہے جس اور "ما نقضی رِولہ" (جو اللہ کا رسول یہ صلیلہ کردے) صادق آتا ہے، اور کسی مومن اور مومنہ کو حق استرداد حاصل نہیں، اور حدیث و سنت یہی مالکیت رسولہ (رسولہ) ہی تو ہے۔

نہ صرف رسول کی اطاعت کا حکم ہے، بلکہ رسول کے اتباع کا بھی حکم ہے:

لَمْ يَذْكُرْنَا لَكُوْنَتِنَّا بِرَبِّنَا لَنَفْوَانَوْهُ حَسَنَةٌ

(سلمانو) نسہاری پیروی کے لیے رسول افہم کی ذات میں بہترین اسرہ ہے۔
(الاحزاب - ۲۱)

۱ اطاعت، حکم کی تعییل کرنے اور سرتسلیم ختم کر دینے کو کہتے ہیں۔ اور اتباع کے مفہوم ہیں کسی کے پیچھے پیچھے چلتا، نہ صرف کسی کے عمل کی طرح عمل کرنا بلکہ اس لیے اس کے عمل کی طرح عمل کرنا کہ اس نے وہ عمل کیا ہے۔ اثناء رسول کا مفہوم ہے ہوا کہ رسول کے عمل کی طرح اس لیے عمل کیا جائے کہ رسول نے وہ عمل کیا ہے۔

شریعت اسلامی کے مأخذ

۳۶۹

اور بہ تاکید اس لمحے کی گئی کہ قرآن ہر ہوڑی طرح عمل کر کے ہی خدا کی فرمائی برداری کا حق ادا کیا جا سکتا ہے، اور خدا کی فرمائی برداری ہی کو کسی شخص خدا کا محبوب بندہ بن سکتا ہے۔ اور خدا کا محبوب بندہ بننے کے لمحے اتباع رسول کو شرط لازم نہ رایا گیا ہے:

قُلْ لِنَّمَّا تَعْبُدُونَ اللَّهُ فَإِنَّمَا يَعْبُدُنِي مَنْ يَكْفُلُهُ اللَّهُ

(اے نبی) کہہ دو، کہ امکن نہ حقیقت میں افہ
سے سمجھتے رکھتے ہو تو ہمرا اتباع کرو
تب افہ تم کو اپنی سمجھتے ہے نوازے گا
(آل عمران - ۲۱)

لہذا اس کا واضح ترتیب یہ نکلتا ہے کہ خدا کی اطاعت کی واحد شکل اتباع رسول،
ہنسی سنت رسول کی ہوڑی ہے۔

فَأُمِّلُوكُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ الْقَيْقَى الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَتِهِ وَالْحُجَّةِ

پس ایمان لا افہ اور اس کے رسول نبی امی پر ہو خدا اور
اس کے تمام کلام پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کا اتباع کرو۔
(الاعراف - ۱۵۸)

اس آیت میں افہ ہر ایمان کا مطالبہ ہے اور رسول کے اتباع کا حکم ہے،
اس میں باریک نکتہ یہ ہے کہ ایمان بالله کے بعد آپ سے آپ اطاعت الہی
لازم نہیں جاتی، تو اس اطاعت الہی کے باب میں بتایا کہ اس کی واحد شکل
اتباع رسول ہے۔

✓ صرف یہی نہیں، بلکہ قرآن نے جس طرح اللہ کی معصیت کو ضلالت کہا
ہے اور اس کے مرتكب کو وعد سانی ہے اسی طرح رسول کی معصیت کے
ارتکاب کو بھی ضلالت قرار دیا ہے اور ارتکاب کرنے والوں کو وعد کا
ستوجب نہیں رکھا ہے:

وَمَنْ يَعْمَلُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا فَلَيَعْلَمُ

اور جو کوئی بھی افہ اور اس کے رسول کی
فاغرمانی کرے، وہ کہل گمراہی میں بٹلا ہو گیا۔
(الاحزاب - ۲۶)

وَمَنْ يَتَعَشَّلُ لِهِ وَيَسْأَلُهُ فَإِنَّ لَهَا كَلْجَهْنَهْ غَلَدَنَهْ فَنَّا لَهُنَّهْ

اور جو شخص افہ اور اس کے رسول کی نافرمانی
کرے گا تو ابھی شخص کے لیے نار جہنم ہے ،
جس میں یہ ہمہ رہیں گے۔ (العن - ۲۲)

يَكْتَبُهُنَّ لِهَا لِهَنَّهْ لِلرَّفَادَهْ وَعَصَمَوَالرَّبُولَ لَوْسُونَهْ بِهِمُ الْأَرْكَنَهْ

اس (آیات کے) دن وہ سب لوگ جو رسول کے سرکشی
کرنے والے رسول کی نافرمانی کرنے ہیں، تھنا کریں کہ کہ
کافی زمان ہٹھ جاتی اور وہ اس میں سما جائیں۔
(الناس - ۲۲)

ان آیات ، خصوصاً آخر الذکر آیت ، سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح
قرآن سے العرات خلات اور باعث سزا ہے ، اسی طرح حدیث و سنت سے یہ نیازی
اور اعراض بھی خلات ہے اور اس سے سرکشی کا نتیجہ دودھاک عذاب اور آخرت
میں رسوانی ہے ۔

خارجی شہادت

* قرآن کی الفروق شہادت کے بعد خارجی شہادت کے "تاریخی شواہد"
والی شے ہو ہی اس لیے طائفانہ نظر ڈال اپنی مناسب ہے کہ قرآن نے یہ اعلان
کیا ہے کہ

وَمَنْ يَكْتَبُهُنَّ لِهَنَّهْ مِنْ تَهْدِيَتِكَنَّ لَهُ الْهُدَى وَيَكْتَبُهُنَّ غَيْرَتِكَنَّ لَهُ الْجُنُونَهْ فَلَيْلَمَالَقَلْ وَضَلَلَهُ جَنَّهْ

جو شخص رسول کی مخالفت پر کمر بھے ہو حالانکہ اس پر وہ راست واضح ہو چکی
اور مومنین کی روشن کے سوا کسی اور روشن پر چلے تو اس کو ہم اسی طرف چلا جائیں گے
جذہر وہ خود پھر گیا اور اسے جہنم میں جھوٹکیں گے۔ (الناس - ۱۱۵)

صحابہ "کرام رض" اور ان کے بعد دینی روشن ہر چلنے والی علماء و معاشر
کے حدیث و سنت کو دینی حجت و سند پاور کیا اور چوں کہ حدیث و سنت کا
دلجن میں سند و حجت پاور کرنا ہیں ایک "سبیل المؤمنین" ہے ، اور چوں کہ

• مانعہ از مولانا مودودی ، "تفہیمات" ، افتخار احمد بلخی "افکار حدیث کا منظرو
بس "منظر" جلد ۲ ، مولانا سید سلیمان ندوی سیرۃ النبی جلد ۲ ۔

شریعت اسلام کے مانند

۳۶۱

مجاہد اور ان کے بعد جمیلۃ حديث و سنت کو سرمایہ دن مجتہد تھے تو ہر حدیث و سنت کی حجت سے انکار کرنا "سبیل المؤمنین" ہے رو گردانی کرنے کے متراویں ہوا۔

اس سلسلے میں سب ہے یہی صحابہ "کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے رویہ کو دیکھئے - صحابہ ہر معاملے میں بدیکھتے تھے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا رویہ کیا رہا ہے اور ہر موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے اسوہ کی پرووف کرتے تھے اور انسانیت کے یہ کلمائیں حوصلہ جس کو صاحب امر بناتے تھے وہ یہی بات ہے کہتا تھا کہ "میری اطاعت کرو اگر میں خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کروں اور اگر میں خدا کے احکام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے سرموہی انحراف کروں تو نہ میری اطاعت ہے اور نہ تقلید"۔

صحابہ "کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد ہر دو لوگ معتبر و معتمد تاریخ کا ناطق بھسلہ ہے کہ محدثین و فقہاء اور ائمہ مجتہدین نے حدیث و سنت کو دینی سند تحلیل کیا ہے اور وہ حدیث و سنت کو قرآن کے بعد اسلامی قانون کا ایک مستقل مانند قرار دیتے رہے ہیں، چنانچہ امام شافعی فرماتے ہیں کہ سعیہ کسی ابھی شخص کا بتہ نہیں ملتا جس نے بجائے خود حدیث و سنت کا انکار کیا ہو۔

اب رہ جاتا ہے عقل ثبوت، تو جیسا کہ ابتداء میں اشارہ کیا جا چکا ہے، عقل عام تک کا تقاضا اور بھسلہ ہے کہ حدیث و سنت کو حجت اور سند کا مزتبہ حاصل ہو۔ اور بعض تاریخی یا علمی نظائر کی حد تک اس پر توجہ نہ دی جائے، کیوں کہ سب سے اہلی حور طلب امر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن اور اس سے یہی تمام اسمائی کتابوں کو رسولوں کے واسطے سے کیوں نازل کیا؟ کیا خدا اس پر قادر نہ تھا کہ مطبوعہ کتابیں یکاک زمین پر اقتدار دیتا اور ان کا ایک ایک لمحہ نوع بشری کے ہر فرد کے پاس آپ سے آپ ہمچ جاتا؟۔ یقیناً وہ اس پر قادر تھا۔ تو سوال ہے کہ اس نے نشر و اشاعت کا یہ ذریعہ کیوں نہ اختیار کیا؟ کیوں کہ تو ہے ظاهر ہدایت کا یقینی ذریعہ موسکتا تھا۔ چنانچہ اس کا جواب خود کلام اقت دہتا ہے کہ خدا نے جتنے رسول ہمچ جیے ہیں ان کی بحث کا مقصد ہے رہا ہے کہ وہ فرمانیں خداوندی کے مطابق حکم دن اور لوگ ان کے احکام کی اطاعت کریں۔ وہ الہی فوائد کے مطابق زندگی

بسر کر دین اور لوگ آنسی کے نمونے کو دیکھو کہ اس کا انباع کر دیں۔^۱

وَمَا أَنْسَلْتَ مِنْ لِئَوْلِي لَا يُنْطَعِطُ بِإِلَهِ اللَّهِ

(یعنی) ہم نے جو رسول بھی بھیجا اسی لئے بھیجا کہ افکار اذن ہے اس کی اطاعت کی جائی۔ (النہاد - ۶۲)

اگر بعض کتاب اللہ آثار دی جاتی اور کوفی رسول نہ آتا تو لوگ آبات کے معانی میں اختلاف کرنے اور کوفی اس کا فیصلہ کرنے والا نہ ہوتا، لوگ احکام کے منشا سمجھنے میں غلطیاں کرنے اور کوفی ان کو صحیح منشا بنانے والا نہ ہوتا۔ امن سے معلوم ہوتا ہے کہ تنہ کتاب اللہ کافی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ رسالت کا رشتہ ناقابلہ انتظام ہے اور احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اسوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی بھی اسی طرح فرض ہے جس طرح خود کتاب اللہ کے احکام کی اطاعت فرض ہے۔ جو شخص کہتا ہے کہ ہم صرف کتاب اللہ کو لیں گے اور حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا اسوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ لیں گے وہ دراصل رسالت سے اپنا تعلق منقطع کر دیتے ہیں اور وہ اس واسطے کو کائنات میں جسے خود اللہ نے اپنے بندوں اور اپنی کتاب کے درمیان ایک لازمی واسطے کے طور پر قائم فرمایا ہے۔ وہ کویا یہ کہتا ہے کہ خدا کی کتاب اس کے بندوں کے لیے کافی تھی مگر خدا نے بلا ضرورت یہ فعل عبث کیا کہ (معاذ اللہ) کتاب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے نازل فرمایا۔

کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لازمی تعلق ثابت ہو جائے کے بعد اب اس سوال ہر غور کیجیے کہ آپا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام کی اطاعت اور ان کے اسوہ حسنہ کی پیروی صرف ان کی حیات جسمانی تک نہیں^۲ اگر اپنا ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت صرف اسی عهد کے لیے تھی جس میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے جسم مبارک کے ساتھ زندہ تھے، اور (آپ صلی اللہ علیہ وسلم) کے رحلت فرمائے ہیں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت کا تعلق عالم دنیا سے منقطع ہو گیا۔ اس صورت میں رسالت کا منصب یہ معنی ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام اگر بعض ایک نامہ یا کی طرح کتاب اللہ کو پہنچا دینا تھا، اور اس ہے پڑھ کر کسی چیز کی ضرورت نہ تھی تو جیسا کہ ۶۴۷ء میں کہا گیا کہ اس صورت میں ۱ نقصیل کے لیے ملاحظہ مرباں "رسالت"۔ (مرتب)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت ہی نہ تھی۔ یہ کام کوئی فرشتہ کر سکتا تھا، بلکہ بلا واطہ ہی مسکن تھا۔

لیکن، اگر کتاب اپنچا دینے کے علاوہ بھی کسی شے کی ضرورت تھی اور اسی کے لیے اتباع کے احکام دیے گئے تھے، اور اگر هدایت نوع بشری کے لیے قرآن کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی هدایات اور سیرت نبوی کے عمل نہ ہونے کی تھیں تو ہر یہ سب صرف تمثیل ہا چوبیں سال کے لیے ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ بعض ایک صدی کے چوتھائی حصے کے لیے ایک رسول میموٹ کرنا اور اتنی سی مدت کے لیے رسالت کا اتنا بڑا منصب قائم کرنا اور ایک چیز کو جو، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم و جان کا تعلق بنتطم ہوتے ہی دنیا کے لیے غیر ضروری ہو جانے والی تھی، اتنی شد و مدد کے ساتھ ذریعے هدایت قرار دینا، یہ سب کچھ بجوان کا کوئی معلوم ہوتا ہے جو (معاذ اللہ) خدا نے حکیم و دانا کے ہر گز شایان شان نہیں ہے۔ اور جب ایسا ہے (یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت ہمیشہ کے لیے ہے) تو وہ تمام آیات اور احکام بھی ہمیشہ کے لیے ہیں جن میں انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی اطاعت ضروری قرار دی گئی ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات کو اسوہ حسنہ بتایا گیا ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اتباع کو رضاۓ الہی کے حصول کا واحد ذریعہ کہا گیا ہے۔ اور هدایت کا دامن آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بھروسی کے ساتھ واپسی کر دیا گیا ہے (وان تطیعوه تهندوا)۔ تو رضاۓ الہی حاصل کرنے اور هدایت ہانے کی ضرورت ظاہر ہے کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عہد لوگوں کو تھی اسی طرح اُج کے لوگوں کو بھی ہے اور قیامت تک جو لوگ آئیں گے ان سب کو بھی رہے گی۔

✓ اکتنی موافق سی بات ہے کہ اگر قرآن کے علاوہ دین میں کوئی چیز حجت اور سند نہیں ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول دینی حیثیت ہے کوئی مقام نہیں رکھتا تو ہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآن کے بارے میں یہ کہنا بھی قادر ہے سے حجت نہ ہونا چاہیے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ ہس جب قرآن کے علاوہ نبی کا ایک قول بھی حجت بن گیا تو ہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیگر اقوال کی حجت کا کس طرح انکار کیا جا سکتا ہے؟ حجت کا دروازہ ایک قول کے لیے کھلتا ہے تو سب کے لیے کھلے گا اور بند ہو گا تو ہر قول کے لیے بند ہو جائے گا۔ اور یہ بات تو بالکل قطعی ہے، جس کا ہار ہار اعادہ کیا گی

کے حدیث و سنت کے بغیر تو در اصل قرآن ہے یہی اکتساب نہیں ہے۔ احادیث و آثار اور روایات کے بغیر تو خود آیات کا مفہوم و مطلب بیہم اور اڑی حد تک تشنہ رہ جائے گا۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی جس طرح اپنے (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیات میں فوری تھی اُج بھی ہے اور ائمہ بھی رش کی ای (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صاف تاکید ہے کہ "میں تمہارے درمیان دو چیزوں پھر چلا ہوں، جب تک تم الہیں تھا سے رہو گے گمراہ نہ ہو گے۔ کتاب اللہ اور میری سنت" حضرت اہن عباس کے واسطے ہے یہ فرمان نبوی قابل غور ہے۔ جب تمہارے سامنے کتاب اللہ ہے کچھ رکھا جائے تو وہ واجب التعمل ہے۔ ان کے نزد میں کسی کے لیے عذر جائز نہیں، اگر کوئی چیز کتاب اللہ سے نہ ہو لیکن نبی کی سنت ہے ہونو وہ بھی ویسی ہی واجب التعمل ہے۔ ایک (لذ) صحیح کی نماز کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو میرے بعد زندہ رہے وہ بہت زیادہ اختلافات دیکھے گا۔ میں تم میری سنت اور میرے راست رو ہدایت پاں خلفا کے طریقے پر جیسے رہنا اور خبردار حدیث اور بدعت سے بچنا کیوں کہ ہر بلدنگ کرامی ہے۔"

ان تفصیلات ہے یہ بات اپنے اپنے واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ نے جب اس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی تاکید فرمائی ہے جب اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا محبوب بنتے بننے کے لیے شرط لازم قرار دیا، جب معصیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہو وعید سنائی، جب اطاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم دیا، جب حدیث و سنت کو بیان القرآن اور تعلیم الكتاب فوارد دیا تو ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث و سنت کو محفوظ ہونا چاہیے، ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و اتباع اور تعلیم و تشریع قرآن پر عمل ایک ناقابل عمل حکم ہو گدہ جائے گا، چنان چہ خدا نے ان کی حفاظت کے سامان بھی فراہم کر دیے الہ وہ اُج تک محفوظ ہے۔ یہ (سنت) قرآن میں محفوظ ہے، ایت کے تعامل کی شکل میں محفوظ ہے، نوادرت کی صورت میں محفوظ ہے، اور ان روایات و آثار کے اندر محفوظ ہے جو قرآنی سورے اور روایت و درایت کے مسلمہ اصول پر پوری انویں

کتابت، حفاظت، تدوین: * اور کی تفصیل ہے یہ بات تو واضح ہو گئی ہو گی نہ حدیث کا تعلق اڑا راست ایک خاص تحلیقی وجود یعنی محدث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ہے اور صرف ایک واحد شخص کی زندگی کے واقعات کا ایمان اس کا اصل دانہ کار ہے۔ جب کہ عام تاریخی ذخیروں کا تعلق کسی حکومت، کسی علمی الشان جنگ وغیرہ یا اسی قسم کی اور منتشر اور ہر اگدہ چیزوں سے ہے جن کا احاطہ احادیث کے برخلاف آسان لہیں ہے۔

یہ بات بھی بالکل روشن ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مورخین یعنی صحابہ کرام کا باہمی تعلق ایک عینی شاہد کا تھا جس کی بنیاد پر عشق و سرمستی، والہانہ محبت، اور عظمت و اطاعت کے جذبات بر قائم تھیں اور جو ہر چیز سے دست بردار و کر صوف اس کی آواز میں کم ہونے کا آخری اور قطیٰ نیصہ کر چکے تھے۔ فوبین کے درمیان کسی قسم کا حجاب حائل نہ تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ مسجد میں، بازار میں، کھر میں، سفر میں، حضر میں، ہر جگہ ملتے تھے اسی لیے اس تاریخ (حدیث) کے ہر ہر واقعہ اور جزو کو، اور ایک ایک خط و خال کو انہوں نے محفوظ رکھا تھا۔ اور اس کو اسی طرح دوسروں تک پہنچانے کی ذمہ داری بھی وہ بول کر چکے تھے۔ ہر حاضر خائب کو اور ہر پہلا پوچھلوں کو بتلاتا تھا۔ کیوں کہ منی کے میدان میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) خود اعلان فرم کر کے تھے "اللہ اس بندے کو ترویزہ رکھئے جس نے میری بات سنی بھر اسے باد رکھا اور جس نے نہیں سنا ہے اس تک انہیں پہنچا دیا۔" ہر حکم تھا "الا لجیلیغ الشاہد الغائب" (تم میں سے جو حاضر ہے وہ خائب کو پہنچاتا جائے) اور "ان باتوں کو باد رکھو اور جو تمہارے پیچھے ہیں انہیں اس سے مطلع کرنے رہنا" کیوں کہ "تم مجھ سے من رہے ہو، تم سے بھی سنا جائے کا اور جن لوگوں نے تم سے سنا ہے ان سے بھی لوگ سنیں گے" (حدیث)۔ چنان چہ صحابہ کرام جن حقائق و تعلیمات (حدیث) کی نشر و اشاعت کے ذمہ دار نہ رہائے گئے تھے اس کا چھپانا وہ گناہ خیال کرتے تھے۔ کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد انہیں باد تھا کہ "جب کسی سے علم کی کوئی بات پوچھی جائے اور اسے وہ چھپائے تو قیامت کے دن اُس کی لکام اسے پہنچائی جائے گی" اور اسی کا نتیجہ تھا کہ

* ماخوذ از مولانا ناظر احسن گیلانی۔ "تدوین حدیث" ڈاکٹر مصطفیٰ سماں، "سن رسول" اور ڈاکٹر محمد حبید افہم "مقدمہ صحیفہ همام بن منہ"۔ (مرتب)

مسکرات میں مبتلا ہیں لیکن بعض ہے ہے سرفی ہے کہ اس وقت ہیں عہد اس
خیال ہے کہ "علم چھپائے" کا الزام ان ہو نہ وہ جانے حدیث بیان کرئے
جانے تھے (ضحاہ) - لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ جس ذات گواہی کے ہر قبول
کو وہ خدا کی بات اور خدا کا حکم سمجھتے تھے اس نے بار بار ہے کہرت اس کی
نظرت میں یہ تهدیدی خوف اس طرح راسخ کر دیا تھا کہ "جو مجہ پر قصد
جهوٹ باندھے کا، اس کا نہ کانا اُگ (جہنم) میں ہوگا" اور عقل ہی نہ کافی
کرنے ہے کہ جس قسم کے ایمان و اہماں کی دولت سے ہے۔ لوگ سرفراز تھے
اس کی موجودگی میں خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہاؤ جھوٹ باندھنے کی جرأت
ان کو نہیں ہو سکتی تھی - اور جس اعلیٰ کردار کے وہ مالک تھے - اس سے
خلط بیان کی توقع کون کر سکتا تھا جب کہ قرآن نے ہی مفتری علی اللہ
(خدا ہر جھوٹ باندھنے والے) کو سب سے ہڑا ظالم فرار دیا ہے - اس لیے بعض
صحابہ اپنی اس نازک تاریخی ذمہ داری کا احسان اس طرح کرتے کہ ذخیرہ حدیث
کے سب سے بڑے راوی حضرت ابو هریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ دو اسی قاعدہ تھا
کہ حدیث جس وقت بیان کری شروع کرنے تو کہتے "فرمایا رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم صادق و مصدق ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس نے مجہ پر
قصد آ جھوٹ باندھا، چاہیے کہ اپنا نہ کانا اُگ میں تیار کرے۔" اہر جو کوئی
بیان کرنا چاہتے نیاں فرمائے۔

جن مورخین کا تعلق اپنے تاریخ سے اس قدر ہو اور جن لوگوں کا تعلق
حضور اَلمِرْم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قسم کا ہو انہوں نے نبی کریم
علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی کی تکھیداشت میں، جس کے خدا کی طرف سے ہی
وہ حافظ اور مبلغ فرار دیے گئے تھے، کس اہتمام و انہماک اور توجہ سے کام
لیا ہوا۔ اپک اپک "مئے مبارک" جس کے نزدیک دنیا و مافیا ہے، زیادہ
محبوب تھا ان کے نزدیک اپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اقوال و افعال کی کہا
تیحت ہوگی -

ان حقایق کی روشنی میں تاریخی ذخیرے کبیسے غیر معتبر نظر آتے ہیں
جن کی بنیاد صرف ہر ان قبروں کے کتبون، سکتوں کے نہپوں، کھنڈرات، سنگ
ہا برنجی تختیوں ہا خود نوشت سوانح عمریوں ہر قابیم کی گئی ہے، جن کے
سنگ کی کوئی ذمہ داری نہیں ایسا بلکہ روایت اس قسم کی بھی باقی جاگ ہے کہ
"یہ ہر ان تغلق کچھ دن ہوئے گلزار دی گئی تھی" بہر اس سے نفع نظر

شریعت اسلامی کے مأخذ

ہمائلہ ایک شخصی بیان سے اُسے نہیں اڑھتا۔ عینی شاہدوں کا تو سوال ہی ہبودیدہ ہے ।

لیکن مسلمانوں کا یہ تاریخی سرما یہ "حدیث" ایک امتیازی شان رکھتا ہے جس کو قدرتی عوامل نے تدوین و تعلفظ میں ہوری مدد دی تھی۔ اس کے چشم دید گواہوں اور امن کے مورخین کی تعداد ایک لاکھ سے تجاوز کرکے ہے جس میں مرد کے الفاظ میں "بہان ہوئے دن کی روشنی میں جو ہر چیز اڑ رہی ہے اور ہر اسٹوپہ نک وہ ہنچ سکتی ہے۔"

جہاں تک حدیث کی کتابات کا تعلق ہے ایک عام خلط فرمی یہ ہافی جائی ہے کہ حدیث کی تدوین و ترتیب دو ڈھانی سو سال بعد صحابہ سنہ^۱ کے زمانے ہے ہوئی یا اہم اُسے بڑھایا تو این شباب زہری سے مسلسلہ ملا دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات جتنی مشہور ہے اتنی ہی خلط ہے۔ حدیث کی تدوین، جیسا کہ اورہ کے مختصر سے جائزے سے معلوم ہو گیا ہوا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے ہی شروع ہو چکی تھی اور بعد کی پیداوار بالکل نہیں ہے۔

"صحابہ" کرام، جن کا تعلق اوپر بتایا جا چکا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہے کسی قسم کا تھا، حدیث کے زندہ نسخے نہیں اور تدوین حدیث کی بہلی صورت وہی قرار ہاتے ہیں۔ اور حدیث کا بہت بڑا ذخیرہ دراصل ان ہی کی حفاظت و روایت کا مر ہون منت ہے۔ اگر کتابی صورت میں احادیث کا ذخیرہ حفظ نہ کیا جاتا تو یہ ذریعہ بھی دراصل بہت کافی تھا۔ ہمارے بہان حدیث کا بڑا حصہ تواتر ہی کے ذریعے سے ہنچا ہے۔

حافظت حدیث کے اس ذریعے کے علاوہ دوسرا ذریعہ حفاظت کتابی شکل میں تدوین ہے۔ اس سلسلے میں ذہل کی چند شہادتیں کالی ہوں گی:

ہجرت مدینہ کے قوراً بعد ہی "بہلا تحریری دستور سلکت" کتابت حدیث کا بہلا ثبوت ہے جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ریاست مدینہ میں نافذ

^۱ صحابہ سنہ ہے مراد حدیث کی چہ صحیح نہیں اور قابل اعتماد کتابوں ہیں جو اپنے مولفین کے نام سے جانی جاتی ہیں یعنی بخاری، سلم، ترمذی، ابو داؤد، نسائی لعدا این ماجہ۔ (مرائب)

فرمایا اور جس میں قریش، مدینہ کے مسلمانوں اور انصار و بہود کے حقوق کا تعین ہے^۱۔ اسی طرح هجرت کے ابتدائی زمانے میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہر دو شماری کرانی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے الفاظ ہیں "مجھے ان لوگوں کے نام لکھوں دو جو اسلام کا اقرار کرنے ہیں۔" سرکاری دستاویزوں اور معاهدوں، ہروانوں وغیرہ کا آغاز تو هجرت سے ۲۷ ہی ہو چکا تھا۔ چنان چہ تمیم داری کو للسطین کا شہر جبرونہ وہ ذریعہ ہروانہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جا گیر میں دھا تھا۔ با سفر هجرت میں سراقہ بن مالک کو ہروانہ امن عطا فرمایا۔ اس سے قطع نظر سنہ ۹ ہجری میں قبیله جمینہ سے حلیفی کا معاهدہ، اور بنی صفرہ سے معاهدہ کا مخطوطہ اب تک ملتا ہے، بہ معاهدوں کا سلسلہ زندگی بہر جاری رہا۔ سنہ ۱۰ ہجری میں خندق کے زمانے میں بنی فزارہ اور غطفان سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک توثیق طلب با سودہ معاهدہ کیا تھا جسے بعد میں محو کر دیا گیا۔ با سنہ ۹ ہجری کا صلح نامہ حدیبیہ اور اس کے بعد الفاظ وہ آہس کا بعثت میانہ مشہور ہے۔ سنہ ۹ ہجری میں آل اکیدر دومہ الجندل سے اطاعت کا معاهدہ، اور قیصر و کسری، متوقس و نجاشی وغیرہ حکمرانوں کو تبلیغی خطوط کی روائی رون چبڑی ہیں۔ کسری نے نامہ مبارک کو جو تحریری صورت میں تھا، ہاں کر دیا تھا۔ انتظامی ضرورتوں سے اکثر موقع اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جزیروں نامے عرب کے اطراف و اکناف میں اپنے ہر جگہ کے گورنراؤں اور لامپیوں وغیرہ کو وفاً فوغاً جو ہدایات و فرامین تحریری صورت میں روانہ کیئے، تاریخ میں محفوظ ہیں۔ خطوط ہر ثبت کرنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک سہر تیار کرانا بھی معروف والمعہ ہے۔ محض ایسی سیاسی وغیر سیاسی دستاویزوں وغیرہ میں تحریری حدیشوں کو اکٹھا کرنے کی کوششوں کا آغاز حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور عہد صحابہ ہی میں شروع ہو چکا تھا۔

عہد نبوی میں ان مندرجہ بالا سرکاری طور پر لکھی ہوئی احادیث کے علاوہ نجی طور اور اتفاقی میثمت سے مرتب شدہ احادیث کے نسخوں کی بھی بہ کثیر شہادتیں ملتی ہیں۔ مثلاً نتح مکہ کے موقع پر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو امام خطبہ دھا تھا ایک یعنی شخص ابو شاہ کی درخواست ہو انہیں لکھوا کر دے دیا۔

۱) ویفہ ڈاکٹر محمد حبید افک ک مرتب کردہ کتاب "بسی وثیقے" مطبوعہ ادارہ ترقی ادب لاہور، میں دیکھا جا سکتا ہے۔ نیز موصوف کی کتب "دور نبی کا نظام حکمرانی" (The Muslim Conduct of State) میں بھی اس پر گفتگو کی گئی ہے۔ (مرتب)

شریعت اسلامی کے مأخذ

۱۹

ماہبان ان مالک انصاری کو اپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ایک خطیے کی بات بڑی لگ انہوں نے اسے لکھ لیا۔

اگرچہ چند ایسی روایتیں بھی ملتی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں لکھنے کی ممانعت فرمائی، جس ہر لکھی ہوئی چیزیں مٹادی گئیں بلکہ ابک مانیہ تو کہنے ہیں کہ خاصی تعداد میں جلا ہمی دی گئیں۔ لیکن خور ہے ہمہ انہیں کرنے ہر نظر آتا ہے کہ ان کا تعلق یا تو ابتدائی اسلام سے تھا یا ابھی لوگوں کے متعلق تھا جو تازہ مسلمان ہوئے تھے اور قرآن و حدیث میں فرق نہ کر سکتے تھے۔ جنہیں قرآن خوب باد تھا اور جن کی صلاحیتوں ہر اطمینان تھا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حدیث لکھنے کی نہ موف اجازت دی بلکہ ترجیب بھی دی ہے۔ مثلاً ایک انصاری نے انہیں حافظ کی کمزوری کی شکایت کی تو اپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا "انہی داہمے ہاتھ سے مدد لو" (لکھ لو)۔ اسی طرح عبداللہ بن عمرو بن العاص رض حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے ملفوظات نبوی لکھا کرنے تھے تاکہ انہیں باد رکھ لیں؛ لوگوں نے انہیں منع کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بشر ہیں کبھی خوشی اور کبھی خنکی کی حالت میں ہوتے ہیں، اس لیے بلا امتیاز اپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہر بات کو لکھ لینا مناسب نہیں ہے۔ عبداللہ بن عمرو نے اس ہر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا "کیا رضامندی اور غصب ہر حالت میں جو اپ کبھی لکھ لیا کروں؟" تو اپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا "ہاں، بخدا اس سے (منہ سے) جو کچھ بھی نکلتا ہے حق ہی ہوتا ہے۔" چنان چہ حضرت عبداللہ بن عمرو نے ایک ہزار حدیثوں کا مجموعہ مرتب کیا جس کا نام "صادقة" رکھا۔ حضرت انس بن مالک، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت سعد اسی طرح حضرت علی، حضرت انس بن مالک، حضرت عبداللہ بن جنابہ، بن عبادہ، حضرت ابو هریرہ، حضرت سعد بن ربیع، حضرت سمرة بن جنابہ، حضرت عبداللہ بن ربیعہ اور حضرت ابو موسیٰ اشعیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیرہ میں حدیثیں جمع کیں اور مجموعے مرتب کیئے۔ وہب بن منبه شاگرد حضرت ابو هریرہ رض، مسلمان بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، همام بن منبه شاگرد حضرت ابو هریرہ رض، مسلمان بن قیس شاگرد جابر رض وغیرہ کے مجموعے مشہور و معروف ہیں۔ ام المؤمنین حضرت عابشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ہر ہنا تو آتا تھا مگر خود لکھتی نہ تھیں چنان چہ ان کے بھانجی عروۃ بن زبیر نے ان کے علاوہ دیگر صحابہ کی حدیثیں بھی لکھی تھیں جو جنگ حرہ میں تلف ہو گئیں جن کا انبیاء ساری عمر نعم رہا۔ حضرت عائشہ رضی کے دوسرے شاگرد عمرہ بنت عبدالرحمن اور قاسم بن محمد تھے۔ ان کے پاس بھی

فرمایا اور جس میں تربیش، مدینہ کے مسلمانوں اور انصار و بہود کے حقوق کا تعین ہے^۱۔ اسی طرح هجرت کے ابتدائی زمانے میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سردم شماری کرائی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے الفاظ ہیں "مجھے ان لوگوں کے قلم لکھوں دو جو اسلام کا اقرار کرنے ہیں۔" سرکاری دستاویزوں اور معاہدوں، ہروں اور وغیرہ کا آغاز تو هجرت سے ۶۲ھ میں ہو چکا تھا۔ چنان چہ تمیم داری کو للطیبین کا شہر حبرون، وہ ذریعہ، ہروانہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جا گیر میں دیا تھا۔ با سنتر هجرت میں سراجہ بن مالک کو ہرالد کو سلطنتی نظر سے فتح نظر سنہ، هجری میں قبیله جہینہ سے حابیفی کا معاہدہ، اور بنی صفرہ سے معاہدہ کا سخطوطہ اب تک ملتا ہے، وہ معاہدوں کا سلسلہ زندگی بہر جاری رہا۔ سنہ هجری میں خندق کے زمانے میں بنی فزارہ اور خطفان سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک تونیق طلب ہا مسودہ معاہدہ کیا تھا جسے بعد میں محو کر دیا گیا۔ یا سنہ ۹ھ ہجری کا صلح نامہ حدیبیہ اور اس کے بعد الفاظ ہر آہس کا بحث میانہ مشہور ہے۔ سنہ ۹ھ ہجری میں آل اکیدر دومہ الجندل سے اطاعت کا معاہدہ، اور قصر و کسری، متوقس و نجاشی وغیرہ حکمرانوں کو تبلیغی خطوط کی روائی دوف چبڑی میں۔ کسری نے نامہ^۲ مبارک کو جو تحریری صورت میں تھا، ہاکی کر دیا تھا۔ انتظامی ضرورتوں سے اکثر مبالغہ ہو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جز بہر نماںے عرب کے اطراف و اکناف میں انہی ہر جگہ کے گورنراؤں اور قائمیوں وغیرہ کو وہناً لوناً جو مددابات و فرامین تحریری صورت میں روانہ کئے، تاریخ میں محفوظ ہیں۔ خطوط ہر ثبت کرنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک سہر تیار کرانا بھی معروف والقہ ہے۔ لمحض ایسی سیاسی وغیر سیاسی دستاویزوں وغیرہ میں تحریری حدیثوں کو اکٹھا کرنے کی کوششوں کا آغاز حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور عہد صحابہ میں شروع ہو چکا تھا۔

مهد نبوی میں ان مندرجہ بالا سرکاری طور پر لکھی ہوئی احادیث کے علاوہ نبی طور پر اور اتفاق حیثیت سے مرتب شدہ احادیث کے نسخوں کی بھی ۴ کٹوت شہادتیں ملتی ہیں۔ مثلاً فتح مکہ کے موقع پر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو امام خطبہ دیا تھا ایک ہمنی شخص ابو شاہ کی درخواست ہے انہیں لکھوا کر دے دیا۔

۱۔ یہ وثیقہ ڈاکٹر محمد حبید افہ کی مرتب کردہ کتاب "ببسی وثیقے" مطبوعہ ادارہ ترقی ادب لاہور، میں دیکھا جا سکتا ہے۔ نیز موصوف کی کتب "دور نبیری کا نظام حکمرانی" (The Muslim Conduct of State) میں بھی اس پر گفتگو کی گئی ہے۔
2۔ (مرتب)

فرمایا اور جس میں قریش، مدینہ کے مسلمانوں اور انصار و بہود کے حقوق کا تعین ہے ۔ اس طرح هجرت کے ابتدائی زمانے میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سو مردم شماری کروانی ۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے الفاظ ہیں " مجھے ان لوگوں کے نام لکھ دو جو اسلام کا افراز کرتے ہیں ۔ " سرکاری دستاویزوں اور معاہدوں، ہروائوں وغیرہ کا آغاز تو هجرت سے ۶۲۷ھ ہے چکا تھا ۔ چنان چہ تمیم داری کو للسطین کا شهر حبرون وہ ذریعہ اروانہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جا گیوں میں دھا تھا، با سفر هجرت میں سراجہ بن مالک کو ہروانہ امن عطا فرمایا ۔ اس سے فتح نظر سنہ، هجری میں قبیاء جمینہ سے حلیفی کا معاہدہ، اور بنی صفوہ سے معاہدہ کا مخطوطہ آپ تک ملا ہے، بہ معاہدوں کا سلسلہ زندگی بھر جاری رہا۔ سنہ هجری میں خندق کے زمانے میں بنی فزارہ اور خطفان سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک توثیق طاب ہا سودہ معاہدہ کیا تھا جسے بعد میں مودودیا کیا۔ با سنہ ۹ھ جبری کا صلح نامہ حدیبیہ اور اس کے بعد الفاظ ہر آہس کا بعثت معاہدہ مشہور ہے ۔ سنہ ۹ھ جبری میں آل اکبدر دوبہ الجندل سے اطاعت کا معاہدہ، اور تیسری و کسری، متوقس و نجاشی وغیرہ حکمرانوں کو تبلیغی خطوط کی روائی رونمہ ہے ۔ کسری نے نامہ مبارک کو جو تحریری صورت میں تھا، ہائی کردیا تھا۔ انتظامی ضرورتوں سے اکثر موقع اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جزیرہ نماں عرب کے اطراف و اکناف میں اپنے ہر جگہ کے گورنراؤں اور قانیوں وغیرہ کو وقتاً جو ہدایات و فرمانیں تحریری صورت میں روانہ کیئے، تاریخ میں محفوظ ہیں۔ خطوط ہر ثبت کرنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مہر تیار کرانا ہی سرور واقعہ ہے۔ محض ایسی سیاسی وغیر سیاسی دستاویزوں وغیرہ میں تحریری حدیثوں کو اکٹھا کرنے کی کوششوں کا آغاز حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور عہد صحابہ ہی میں شروع ہو چکا تھا ۔

عبد نبوی میں ان مندرجہ بالا سرکاری طور پر لکھی ہوئی احادیث کے علاوہ نبی طور پر اور اتفاق حیثیت سے مرتب شدہ احادیث کے نسخوں کی بھی یہ کثیر شہادتیں ملتی ہیں ۔ مثلاً نوح مکہ کے موقع پر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو امام خطبہ دیا تھا ایک ہمی شخص ابو شاہ کی درخواست پر انہیں لکھوا کر دے دیا۔

۱۔ ہر ویقفہ ڈاکٹر محمد حمید افہم کی مرتب کردہ کتاب "بسی وثیقے" مطبوعہ ادارہ ترقی ادب لاہور، میں دیکھا جا سکتا ہے۔ نیز موصوف کی کتب "دور نبوی کا نظام حکمرانی" (The Muslim Conduct of State) میں بھی اس پر گفتگو کی گئی ہے۔ (مرتب)

امادیت کا ذخیرہ تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کوئی ہائج سو احادیث کا مجموعہ تیار کیا تھا لیکن ہبھر وہ سوچ کر تاب کر دیا کہ وکھیں سو سے کوئی خلط لفظ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ ہو گیا ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی احادیث نبویہ کو حکومت کی جانب سے جمع کرنے کا احتیاط کیا اور صحابہ کرام نے اس کی حمایت میں مشورہ بھی دیا لیکن اور آپ نے بد ارادہ منسوخ کر دیا۔ حضرت مبداءہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے تو وفات کے بعد ایک بار شتر تعالیٰ کا چھوڑا تھا۔ مبداءہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے غلام نانج املا لکھا کرتے تھے۔

حضرت حدیث کی کتابت، اس کی حفاظت، اور جمع و تدوین کا آغاز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں شروع ہو چکا تھا جسے صحابہ "کرام" نے وسعت دی اور تابعین نے اضافی کیجیے لیکن صحابہؓ کے سرتبیں نے اسے ہام مروج ہر بہنجا دیا اور اچھا کی کتاب کے بعد انسان ذخیرہ علم میں جو چیز سب سے زیادہ معتبر اور صحیح ترین شکل میں محفوظ ہے وہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہے۔

ماخذ سوم : "اجتہاد"

* اسلامی شریعت کے اصل مأخذ قرآن و سنت ہی ہیں۔ اجتہاد کی حیثیت ایک ضمی مأخذ کی ہے جو اول الذکر دونوں مأخذ کے تابع اور ان کی بنائی ہوئی محدود کے اندر ہماری رہنمائی کرتا ہے اور جس کی مدد سے ہر دور میں شریعت کے حقیقی منشا کو سمجھنے اور متعین کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

تعریف : "اجتہاد" کے لغوی معنی ہو ری ہو ری کوشش صرف کرنے کے میں لیکن اصطلاح میں اس سے مراد وہ کوشش ہے جو احکام کا علم شرعی دلائل سے حاصل کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔ یعنی دین کے سرچشمتوں سے احکام استنباط کرنے کی سعی کونسا ہے۔

علامہ امدی اہنی مشہور کتاب "الاحکام فی اصول الاحکام" میں اجتہاد کی تعریف اس طرح کرتے ہیں :

"ارباب اصول کی اصطلاح میں لفظ اجتہاد مخصوص ہے اس انتہائی کوشش

* از مرتب

۱. صہی مخصوصی "فلسفہ شریعت اسلام"۔

شریعت اسلامی کے مأخذ

۲۸۱

کو نہیں کیجئے جائے کہ یہ شریعت کے بارے میں یہ کمان خالب حاصل کرنے کے میں کی جائے کہ یہ شریعت کے موافق ہے۔ ”

۷ امام شاطبی ”الموالقات“ میں اجتہاد کی یہ تعریف کرتے ہیں (جلد ۲، صفحہ ۲۱۸)

”اجتہاد نام ہے شرعی احکام معلوم کرنے اور ان کو حالات پر تطبیق دینے کے لئے انتہائی کوشش کرنے کا۔“

۸ اجتہاد قانون و شریعت اسلامی کا تیسرا مأخذ ہے اور اجتہاد کی صورت میں ہوں کہ ہوا راست کتاب و سنت کے نصوص سے حکم معلوم کرنے کے بجائے کوشش کر کے کتاب یا سنت کے اشارات سے ایک حکم معین کرنا پڑتا ہے۔ اس وجہ سے اس کو کتاب یا سنت کے الفاظ کے بجائے اجتہاد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

۹ شرعی اصطلاح میں اجتہاد چوں کہ اس انتہائی کوشش کو کہتے ہیں جو کتاب و سنت کے اشارات و مضمرات سے کوئی حکم معلوم کرنے کے لئے کی جائے اس لئے کوشش کے باب میں اہلی چیز جس کی طرف خود لفظ اجتہاد اشارہ کر رہا ہے یہ ہے کہ یہ کوشش سهل انکارانہ یا نیم دلانہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہوئے دل و جان سے ہوف چاہیے اور تحقیق و تلاقوں کے مارے وسائل جو اس کار عظیم کے لیے مطلوب ہیں وہ سب استعمال ہونے چاہیں۔ حضرت معاذ بن جبل رضوالی مشہور حدیث کے یہ جملے قابل غور ہیں : ”اگر کتاب و سنت سے واضح احکام میں کوئی رہنمائی نہ ملی تو میں کوشش کر کے اپنی رائے مستہمن کرنے کی کوشش (اجتہاد) کروں گا اور اس کوشش میں کوئی کسر نہ الہار کہوں گا۔“

یعنی یہ نہیں کروں گا کہ جو خیال ذہن میں آجائے اس کے مطابق معاملات کا لبعلہ کر دوں بلکہ اپنے امکان کے حدود تک جستجوئے حتیٰ کروں گا۔ حضرت معاذ رض کے یہ الفاظ ان لوگوں کے لیے ایک تنبیہ ہیں جو قرآن و حدیث تو درکنار سے ہے غربی زبان سے ہی کوئی من نہیں رکھتے لیکن اس کے باوجود جو وسوسہ دل میں گذر جاتا ہے اس کو مجتہدانہ شان کے ساتھ بیش کرنے میں ذرا اہل باک نہیں کرنے۔

۱ بہادر سے باب کے اختتام تک کی بحث مولانا امین احسن اصلاحی کے ایک مفہوم ”اجتہاد“ سے مانخوذ ہے جو مائنہ چراغ راہ کراچی (املاہی قانون نسخہ) میں شائع ہوا تھا۔ (مرتب)

شرط: اجتہاد ایک نہایت اہم اور مشکل کام ہے۔ اس کے لیے شریعت کا کہرا علم بھی ضروری ہے اور ان حالات کے "مالہ و ما علیہ" سے بھی اچھی طرح واقع ہونا ضروری ہے جن کے بارے میں شریعت کا حکم معلوم کرتا ہے۔ قانون بجائے خود بھی ایک مشکل چیز ہے۔ اس کے اندر حروف و الفاظ تو دو کتاب روز و اوقات (جیسے کاما (۱) اور ڈیش (۲)) تک کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس وجہ سے چب تک کسی شخص کو شریعت کے بواہ راست سمجھنے کا علم حاصل نہ ہو ؟ قانون کی عام چیزوں کے سمجھنے کا حق ہوئی ادا نہیں کر سکتا چہ جانے کہ اجتہاد کرسکے۔ اجتہاد میں معاملہ صرف قانون کی واضح دلکشی کے سچوں پر کا ہی نہیں ہوتا بلکہ شریعت کے مفہومات و اشارات اور کتاب و سنت کے لوازم و متفہومات کی روشنی میں نظر ڈیش آمدہ حالات کا شرعی حکم معین کرنا ہوتا ہے۔ اس کام کے لیے ظاہر ہے کہ نہایت اعلیٰ فنی قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے اور صرف فنی قابلیت ہی کی روشنی میں نہیں بلکہ ذوق سماں بھی ضروری ہے۔ شریعت کے اعلیٰ علم اور اس کے لئے ذوق کے بغیر کوئی شخص اجتہاد کا اہل نہیں ہوسکتا۔ اس وجہ سے وہ بات تو صحیح ہے کہ اسلام میں اجتہاد کسی خاص طبقے باگرو کا اجراء نہیں ہے لیکن وہ بات بالکل غلط ہے کہ اسلام میں ہر شخص اجتہاد کا کام جائز ہے۔ جس کام کے لیے قابلیت کا ہونا بالکل بدیہی امر ہے اس کا معجزہ ہر شخص کیسے ہو سکتا ہے۔ ہر اجتہاد میں اس قابلیت کے ساتھ سانہ ایک بہت بڑی آخری ذمہ داری کا بھی سوال ہے۔ جو شخص اجتہاد کرتا ہے وہ صرف لوگوں کی دنیا ہن کے معاملات میں دخل نہیں دیتا بلکہ ان کے دین اور ان کی آخرت کے معاملے میں بھی ذمہ دار نہیں رہتا۔ اس وجہ سے اگر وہ نا اہلیت کے باوجود اجتہاد کی جسارت کرتا ہے تو صرف اپنی ہی آخرت برپا نہیں کرتا بلکہ دوسرے بہت لوگوں کی آخرت بھی خطرے میں ڈالتا ہے۔

اجتہاد کی اس علمی و اخلاقی اہمیت کے سبب اس کے لیے اصول فہمی کتابوں میں جو شرائط بیان کی گئی ہیں ان کا خلاصہ تین شرطوں اور سادہ الفاظ میں ہے کہ

(۱) اجتہاد کا اہل و شخص ہے جس کو کتاب و سنت ہر پورا ہوا مبین حاصل ہو۔

شریعت اسلامی کے مأخذ

۴۸۳

۱ وہ ایش آمدہ حالات و وسائل کی تھی تک ایسے ہونے والا اور ان کے "مالہ و ما علیہ" کو اچھی طرح سمجھنے والا ہو۔

۲ وہ اخلاق و سیرت کے لحاظ سے ابک قابل اعتقاد انسان ہوتا کہ لوگ اپنے دین کے معاملہ میں اس پر اعتقاد کر سکیں۔

ضرورت: اجتہاد کی ضرورت انسانی زندگی میں مسلم ہے کیوں کہ زندگی بہادر نہ مسائل سے دو چار رہتی ہے۔ ان مسائل کا حل اگر شریعت سے معلوم کرنے کی کوشش نہ کی جائے تو ہماری زندگی کا ربط شریعت سے لوث جائے گا اور اس کو کوئی مسلمان اسلام پر قائم رہنے ہونے گواہا نہیں کر سکتا۔ ہماری روحانی و ایمانی حیات کے لیے اس سے کمیں زیاد، ضرورت اجتہاد کی ہے جتنی ہماری وادی، زندگی کے قیام و بقا کے لیے ہوا اور ہانی کی ضرورت ہے۔

ہمارے سامنے جد مسائل اور حالات ہیش آئیں اگر ہم ان کے بارے میں شریعت کا حکم موافم کیجیے یعنی اپنے کو ان کے حوالے کر دیں تو امن کا نتیجہ صرف یہی نہیں نکلے گا کہ ان حالات کی حد تک ہماری زندگی غیر اسلامی ہو جائے گی بلکہ امن ام کا بھی اندیشه ہے کہ ان حالات کا دباؤ ہیں اپنی زندگی کے نقید حصے میں بھی اسلامی روش سے ہٹنے پر مجبور کر دیے، حالانکہ مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ زندگی میں جو قدم بھی انہائے اسلام کے حکم اور اس کے انتارے کے مطابق انہائے۔ زندگی جن حالات و تغیرات سے گزری ہے ان میں کوئی مرحلہ بھی مسلمان کے لیے ابسا نہیں آتا جس پر وہ اسلام سے استفنا کا محتاج نہ رہتا ہو۔ اپنی اس خصوصیت کے سبب مسلمان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اجتہاد کے بغیر اپنی اسلامیت کو برقرار رکھ سکے۔

مزید مطالعے کے لیے

خورشید احمد (مرتب)، چراغ راہ، "اسلامی قانون نجد" ، جلد اول و دوں۔

مکتبہ چراغ راہ۔ کراچی

مولانا محمد تقی الدین امینی، فقہ اسلامی کا تاریخی ہیں منظور۔ ثنویتہ سنہری اسلامیک اسٹڈی سرکل لاہور۔

صحیح مسیحیانی ، للسلہ " شریعت اسلامی " - مجلس ترقی ادب ، لاہور .
 مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ، اسلامی قانون - اسلامک پبلیکیشنز لمبیٹا ، لاہور .
 ڈاکٹر مدظلوم سہاعی ، سنت رسول - مکتبہ " چراغ راہ " کراچی .
 مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ، حدیث اور القرآن - مکتبہ " چراغ راہ " کراچی .
 افتخار احمد بلپنی ، الکار حدیث کا منظور و ہس منظور - جلد سوم ، باب " حبیب
 حدیث و سنت " . مکتبہ " چراغ راہ " کراچی .
 مولانا مناظر احسن گیلانی ، تدوین حدیث - مجلس علمی " کراچی .
 مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ، سنت کی آئندی ہیئت - اسلامک پبلیکیشنز لمبیٹا ، لاہور .
 ڈاکٹر محمد حمید افغان ، صحیلہ " هدام بن منبه " - حیدرآباد دکن .
 مولانا امین احسن اصلاحی ، اسلامی قانون کی تدوین - لاہور .
 مبد الرحیم ، اصول شرعی محمدی - دارالمعارف ، حیدرآباد .

اسلامی نظام اخلاق

* جو علم بہلائی اور برائی کی حقیقت کو ظاہر کرے، السالوں کو اُس میں کس طرح معاملہ کرنا چاہیے، اس کو بیان کرے، لوگوں کو اپنے اعمال میں کس منتها نظر اور مقصد عظیم کو پیش نظر رکھنا چاہیے، اس کو واضح کرے، لیز مفید اور کارآمد ہاتوں کے لیے دلیل راہ بنے، بلکہ مختصر الفاظ میں جو فضائل و رذائل کا علم بخشے اور یہ بتائے کہ انسان کس طرح فضائل سے مزین اور رذائل سے محفوظ رہ سکتا ہے اس کو "علم اخلاق" کہتے ہیں۔

لیکن یہ ادنیٰ خور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تمام انسان اعمال اس نام کے نہیں ہیں کہ ان کے اچھے یا بے ہونے کا حکم دہا جاسکے۔ مثلاً سانس لینا، دل کا حرکت کرنا، تاریکی سے روشنی میں اچانک آجائے سے ہلک جھپکنا وغیرہ ایسے اعمال ہیں جو انسان سے غیر ارادی طور پر صادر ہوتے ہیں اس لیے ان امور کے پیش نظر انسان کونہ نیکو کار کہہ سکتے ہیں اور نہ خلط کار۔ اور نہ اس سلسلے میں اس سے کوفہ محاسبہ کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں یہ اعمال علم اخلاق کا موضوع نہیں ہو سکتے۔ البتہ انسان سے جو اعمال ارادی طور پر انجام ہاتے ہیں اور وہ ان کو ان کے نتائج و ثمرات پر خور کرنے کے بعد کرتا ہے، مثلاً شفناکانے کی تعمیر یا اپنے دشمن کے قتل کا ارادہ اور اس کی تداہر میں کامیابی وغیرہ۔ چون کہ یہ "ارادی اعمال" ہیں اس لیے ان میں کی تلقین میں کامیابی وغیرہ۔ انسان اس نام کے اعمال ان بڑی اچھے یا بے ہونے کا حکم لکایا جاسکتا ہے۔ انسان اس نام کے اعمال

* یہ حصہ مولانا حلظ الرحمن صاحب میوهاروی کی کتاب "اخلاق اور بلطفہ اخلاق" کے ان مباحث کی تلقین ہے جو کتاب مذکور میں صفحات ۱۲ تا ۲۰ پر پیش کیے گئے ہیں۔ (مرتب)

کے لیے خدا اور مخلوق کے سامنے جواب دے ہے، اور بھی علم اخلاق کا موضوع قرار ہاتے ہیں۔

هر ایک علم کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنے اندر شفیع رکھنے والے کو از اسود کے بارے میں جن بڑے علم میں بحث ہوئی ہے ناگدانہ نظر عطا کرتا ہے۔ چنان چہ علم اخلاق کی بھی بھی شان ہے کہ جو شخص اس کے ساتھ شفیع رکھتا ہے وہ اس کو اعمال کے کھرے کھوئے کی پوکہ ہر قدرت عطا کرتا ہے۔ اور ان کی صحیح اور ہائیڈار تقویم ہر آئے ابسا حاوی کر دیتا ہے کہ ان کے متعلق حکم نالذ کرنے میں وہ لوگوں کے رجحانات اور تقلیدات کے زبر اثر نہیں رہتا بلکہ اپنے پصلے میں علم الاحلاق کے نظریات، قواعد و قانون اور قیاسات سے مدد حاصل کرتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ علم اخلاق کی خوض صرف نظریوں اور قاعدوں کی سرفت تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس کے مقاصد عظیمی میں بد بھی شامل ہے کہ ہمارے ارادے میں تائیر اور ہدایت کا فرموما ہو، کہ بھی تائیر ارادے کو عمل خیر برآمدہ کرنی ہے۔ اور ہم میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ ہم اپنی حیات کی تشکیل کریں، اپنے اعمال کو ہاک اور عمدہ بنائیں، اور حیات انسانی کے لیے ایک اعلیٰ مثال قائم کر دیں، یعنی اپنے اندر حسن عمل، حسن کمال، اور اخوت و مواسات عامہ جیسے فضائل پیدا کریں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ ”تائیر“ کو ہر موقع پر کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور فطرت انسان اس سے متاثر نہیں ہوتی۔

علم اخلاق کا اصل وظیفہ یہ ہے کہ وہ انسان کے سامنے خیر و شر اور نیک و بدی کو واضح کر دیتا ہے اور اس طرح نیک اور سجاہی کی راہ کو انسان کر دیتا ہے۔ اس کا کام جبری طور پر جماں بنا دینا نہیں، انسان کو صالحیت کی راہ دکھانا ہے جس پر چلنے والے چلنے کا انحصار فرد کے ارادے ہر ہے۔ یہ علم ایک طبیب کی طرح انسان کو چھینے پر برسے میں امتیاز کر دیتا ہے اور اس کی چشم عبرت و بصیرت کو کھول دیتا ہے تاکہ انسان خیر و شر اور اس کے آثار و لوازم کو جان لے۔ اب آئے اس کی قوت ارادی کا کام ہے جو علم اخلاق کے اقسام (احکام) کے اختیار اور اس کے نواہی (مصنوعات) سے برهیز اور آمادہ کر سکے۔

اسلام کا نظریہ اخلاقی

* انسان کے اندر اخلاق میں ایک فطری میں ہے جس کی بنا پر انسان بعض

میقات کو پسند اور بعض کو ناپسند کرتا ہے۔ بد افرادی طور پر انسانوں میں کم و بیشی ہو سکتی ہے لیکن ہمارا مشاہدہ ہے کہ مجموعی طور پر انسانیت کے یمور نے اخلاق کے بعض اوصاف ہر خوبی کا اور بعض ہر برانی کا ہمیشہ پکشان مکمل لگایا ہے۔ سچائی، انصاف، ہاس عہد اور امانت کو ہمیشہ ہے انسان اخلاقیات میں تعریف کا مستحق سمجھا گیا اور کبھی کوئی ایسا دور نہیں گزرا جب جہوٹ، نظم، بد عہدی اور خیانت کو پسند کیا گیا ہو۔ همدردی، فیاضی اور فراخ دل کی ہمیشہ قدرگی گئی اور خود غرضی، سنگ دل، بغل اور تنگ نظری کو کبھی عزت کا مقام حاصل نہیں ہوا۔ صبر و تحمل، استقلال و بردباری، اولوالعزمی و شجاعت ہمیشہ ہے وہ اوصاف رہے ہیں جو داد کے مستحق سمجھے گئے اور بے صبری، پھرپھورا ہن، تلون مزاجی، ہست حوصلک اور بزدلی ہر کبھی تعسین و آفسنگ کے پھول نہیں ہر سائے گئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسانی اخلاقیات دراصل وہ عالم کیوں حقیقتیں ہیں جن کو سب انسان جانتے ہیں۔ نیک اور بدی کوئی ذہکی چیزیں نہیں ہیں کہ انہیں کہیں سے لہونڈ نکالنے کی ضرورت ہو۔ وہ تو انسان کی جانی بہجانی چیزیں ہیں جن کا شعور ادمی کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید اپنی زبان میں نیک کو "معروف" اور بدی کو "منکر" کہتا ہے۔ یعنی نیک وہ چیز ہے جسے سب انسان بہلا جانتے ہیں اور منکر وہ بھی کوئی خوبی اور بہلانی کی حیثیت سے نہیں جانتا۔ اسی حقیقت کو قرآن مجید دوسرے الفاظ میں یوں بیان کرتا ہے کہ فالهمها فجورها و تقواها (سورة الشمس) یعنی نفس انسان کو خدا نے برانی اور بہلانی کی واقفیت الہامی طور پر عطا کر رکھی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر برانی اور بہلانی جانی اور بہجانی چیزیں ہیں اور دنیا ہمیشہ ہے بعض صفات کے نیک اور بعض کے بد ہونے پر متفق رہی ہے تو ہر دنیا میں مختلف اخلاق نظام اور نظریے کیوں ہیں؟ اور اخلاق کے

* یہ حصہ مولانا مودودی صاحب کی کتاب "اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر" اور ان کی نشری نظریہ "اسلام کا اخلاقی نظام" میں مانعہ ہے۔ (مرتب)

معاملے میں آخر اسلام کا وہ خاص طبیہ کا ہے جسے اس کی امتیازی خصوصیت کہا جا سکے۔

اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے جب ہم دنیا کے مختلف اخلاقی نظاموں پر تکمیلی نظر میں جو فرق ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ مختلف اخلاقی صفات کو زندگی کے مجموعی نظام میں سوونے، اور ان کی حد، ان کا مقام اور ان کا معرف تجویز کرنے اور ان کے درمیان تناسب قائم کرتے ہیں یہ سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ہر زیادہ کبھی زندگی سے دیکھنے پر اس فرق کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ دراصل وہ اخلاق حسن و قبح کا معہار تجویز کرنے اور خیر و شر کے علم کا ذریعہ متعین کرنے میں مختلف ہیں اور ان کے درمیان اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ قانون کے اچھے وہ قوت نافذہ کون سی ہے جس کے زدہ ہے وہ جاری ہو اور وہ کہاں ہیں جو انسان کو اس قانون کی ہابڑی پر آمادہ کریں۔ لیکن جب ہم اس اختلاف کا کھوج لکاتے ہیں تو آخر کار یہ ہوتا ہے کہ وہ اصلی چیز جس نے ان سب اخلاقی نظاموں کے راستے الگ کر دیتے ہیں یہ کہ ان کے درمیان کائنات کے تصور، کائنات کے اندر انسان کی حیثیت اور انسان زندگی کے مقصد میں اختلاف ہے اور اسی اختلاف نے جزوئے لیے کوششوں تک ان کی روح، ان کے مزاج اور ان کی شکل کو ایک دوسرے سے مختلف کر دیا ہے۔

کائنات کے متعلق اسلام کا تصور یہ ہے کہ اس دنیا کا ایک خالی و ناظم ہے۔ وہی ہم سب انسانوں کا آتا ہے۔ وہ حکیم ہے، قادر مطلق ہے، کامل ہے اور چھپی کا جاننے والا ہے، سبوح و قدوس ہے، اور اس کی خدائی اپس طریقے پر قائم ہے جس میں لیڑہ نہیں ہے۔ انسان اس کا بندہ اور نائب ہے لہذا انسان کا فرض ہے کہ اپنی زندگی کا نظام خدا کے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق ڈھالی۔ انسان اپنی زندگی کے ہر سے کارنامے کے لیے خدا کے سامنے جواب دے گا اور اسے یہ جواب دہی اپنی مکمل تربیت شکل میں آخرت میں کرنی ہے۔ چنان چہ انسان کی تمام سی و کوشش اس مقصد پر مکروز ہونی چاہیے کہ وہ آخرت کی جواب دہی میں اپنے خدا کے حضور کامیاب ہو۔ دنیا کی موجودہ زندگی دراصل

۱۔ تفصیل بیان کے لیے ملاحظہ ہو باب "اسلام کا تصور زندگی"۔ (مرتب)

۲۔ یعنی بہت پاک، بے حد برکت والا اور لائق تعریف۔ (مرتب)

اسلامی نظام اخلاق

۳۸۹

امتحان کی سہلت ہے۔ اس امتحان میں انسان انہیں وجود کے ساتھ شریک ہے۔
یہی تمام قوتون اور قابلیتوں کا امتحان ہے۔ زندگی کے ہر بہلو کا امتحان ہے۔
الہی کائنات میں جس چیز سے جیسا کچھ بھی اس کو سابقہ پیش آتا ہے، اس کی
لماں جانج ہوئے ہے کہ انسان نے اس کے ساتھ کیسا معاملہ کیا۔ اور جانج
وہستی کرنے والی ہے جس نے کائنات کی ہر چیز کو انسان کی خدمت گذاری
کے لئے مستخر کر دیا ہے اور جس نے خود انسان کو اُس کے دل و دماغ اور افراد
نہیں، اُس کے خیالات اور آراؤں تک کا ہوا ہوا علم ہے اور ان کی ہر تفصیل
وہستی کے پاس محفوظ ہے۔

مقصد: یہ تصور کائنات و انسان اُس اصلی ہدایت کو منعین کرتا ہے

جس کا حصول انسان سعی و عمل کا مقصود ہونا چاہتے اور وہ ہے خدا کی رضا۔
بھی وہ معیار ہے جس پر اسلام کے اخلاقی نظام میں کسی طرز عمل کو ہو کوئے
نیعلہ کیا جاتا ہے کہ وہ خیر ہے یا شر۔ اس کے تعین سے اخلاق کو وہ سور
بہاز کی سی نہیں رہتی کہ ہوا کے جہونکے اور موجودوں کے تہیڑے اسے ہر طرف
دوڑاتے ہوئے۔ اس کی بنا پر انسان کے سامنے ایک مرکزی مقصد آجاتا ہے۔
جس کی روشنی میں زندگی میں اخلاقی صفات کی مناسب حدیں، مناسب جگہیں اور

مناسب عملی صورتیں مقرر ہو جائیں اور ہمیں وہ مستقل اقدار ہاتھ لگ جائیں ہیں
جو تمام بدلتے ہوئے حالات میں اپنی جگہ قائم رہ سکیں۔ ہر سب سے ہڑی ہات
بھی ہے کہ رضاۓ الہی کے مقصود قرار ہا جانے سے اخلاق کو ایک بلند ترین
خاتم مل جائی ہے جس کی بدولت اخلاق ارتقا کے امکانات لا متہا ہو سکتے
ہیں۔ اور کسی مرحلے پر بھی اغراض ہرستوں کی ایانشیں اس کو ملوٹ نہیں
کر سکتیں۔

مأخذ:

مہم کو اخلاق حسن و قبح کے علم کا ایک مستقل ذریعہ بھی دیتا ہے۔ اس نے
ہمارے علم اخلاق کو محض عقل یا خواہشات یا تجربے یا علوم انسانی پر منحصر
نہیں کر دیا ہے کہ ہمیشہ ان کے بدلتے ہوئے فیصلوں سے ہمارے اخلاقی احکام
بھی بدلتے رہیں اور انہیں کوئی ہائیڈاری نصیب ہی نہ ہو سکے، بلکہ وہ ہمیں
ایک معین مأخذ دیتا ہے۔ یعنی خدا کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم



کی مت، جن سے ہم کو ہر حال اور ہر زمانے میں اخلاقی ہدایات ملتی ہیں اور یہ ہدایات اپسی ہیں کہ خانک زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر بین الاقوامی سیاست کے بڑے سے بڑے مسائل تک زندگی کے ہر اہلو اور شعبہ میں وہ ہماری رہنمائی کرنی ہیں۔ ان کے اندر معاملات زندگی ہر اخلاق کے اصولوں کا وسیع ترین انطباق ہاہا جانا ہے جو کسی مرحلے ہر کسی دوسرے ذریعے علم کی احتیاج ہمیں محسوس نہیں ہوتے دیتا۔

قوت نافذہ: ہر اسلام کے اسی تصور کائنات و انسان میں وہ قوت نافذہ

بھی موجود ہے جس کا قانونِ اخلاق کی پشت ہر ہونا ضروری ہے، اور وہ ہے خدا کا خوف، آخرت کی باز ہر س کا اندیشہ، اور ابدی مستقبل کی خرابی کا خطرہ۔ اگرچہ اسلام ایک طالع رائے عام ہی تیار کرنا چاہتا ہے جو اجتماعی زندگی میں اشخاص اور گروہوں کو اصول اخلاق کی ہابندی ہر مجبور کرنے والی مواد اور ایک اپنا سیاسی نظام بھی بنانا چاہتا ہے جس کا اقتدار اخلاق قانون کو بیرون نافذ کرے، لیکن اس کا اصل اعتماد اس خارجی دباؤ ہر نہیں ہے بلکہ اس اندروں دباؤ ہر ہے جو خدا اور آخرت کے عقیدے میں مضمود ہے۔ اخلاق احکام دینے ہے ہمیں اسلام آدمی کے دل میں یہ بات بٹھاتا ہے کہ تیرا معاملہ اس خدا کے ساتھ ہے جو ہر وقت، ہر جگہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ تو دنیا بھر سے چھپ سکتا ہے مگر اس سے نہیں چھپ سکنا۔ دنیا بھر کو دھوکہ دے سکتا ہے مگر اسے دھوکہ نہیں دے سکتا، دنیا بھر سے بھاگ سکتا ہے مگر اس کی گرفت سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ دنیا محض تیرے ظاہر کو دیکھتی ہے مگر وہ تیری نیتوں اور ارادوں تک کو دیکھ لیتا ہے۔ دنیا کی تھوڑی سی زندگی میں تو چاہے کچھ کرے بھر حال ایک دن تجھے سرنا ہے اور اس عدالت میں تجھے حاضر ہونا ہے جہاں وکالت، رشوٰت، سفارش، جہوں شہادت، دھوکہ اور فریب کچھ نہ چل سکے گا۔ اور تیرے مستقبل کا ہے لاگ فیصلہ ہو جائے گا۔ یہ عقیدہ دل میں جاگزین کر کے اسلام گوبا ہر آدمی کے دل میں ہولیں کی ایک چوکی بٹھا دیتا ہے جو اندر سے اس کو احکام کی تعییں ہر مجبور کرنی ہے۔ خواہ باہر ان احکام کی ہابندی کرانے والی کوئی ہولیں، عدالت اور جیل موجود ہو یا نہ ہو۔ اسلام کے قانون اخلاق کی پشت ہر اصل قوت ہی ہے جو اسے نافذ کرائی ہے۔ رائے عام اور حکومت کی طاقت اس کی تائید میں موجود ہو تو نور علی نور، ورنہ تنہ

ابمان مسلمان افراد اور مسلمان قوم کو سیدھا چلا سکتا ہے، بشرطے کہ واقعی
ابمان دلوں میں جا گزیں ہو۔

محركات: اسلام کا یہ تصور کائنات و انسان وہ محركات ہی فراہم کرتا ہے
جو انسان کو قانون اخلاق کے مطابق عمل کرنے کے لیے ابھارتے ہیں۔ انسان کا
اس بات پر راضی ہو جانا کہ وہ خدا کو اپنا خدا مانے اور امن کی بندگی کو اپنی زندگی
کی طریقہ بنائے اور امن کی رضا کو اپنا مقصد زندگی نہیں بنائے، یہ اس بات کے لیے
کافی محرك ہے کہ وہ ان احکام کی اطاعت کرے جن کے متعلق اسے یقین ہو کہ
خدا کے احکام ہیں۔ اس محرك کے ساتھ آخرت کا یہ عقیدہ ہی ایک طاقت ور
محرك ہے کہ جو شخص احکام الہی کی اطاعت کرے کا اس کے لیے ابدی زندگی
میں ایک شاندار مستقبل یقینی ہے، خواہ دنیا کی اس عارضی زندگی میں اسے کتنی
ہی مشکلات، نقصانات اور تکلیفوں سے دوچار ہونا ہڑے۔ اور اس کے برعکس
جو بہان سے خدا کی نافرمانیاں کرتا ہوا جائے گا، اسے ابدی سزا بھگتا ہڑے گی،
چاہے دنیا کی چند روزہ زندگی میں وہ کیسے ہی مزے لوٹ لے۔ یہ امید اور یہ
خوف اگر کسی کے دل میں جا گزیں ہو تو اس میں اتنی زبردست قوت محركہ
موجود ہے کہ وہ ایسے موقع پر بھی اسے نیک پر ابھار سکتی ہے جہاں نیکی کا نتیجہ
دنیا میں سخت نقصان د نکلتا ہوا نظر آتا ہے۔ اور ان موقع پر بھی بدی سے دور
رکھ سکتی ہے جہاں بدی نہایت ہر لطف اور نفع بخش دکھائی دے۔

اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام اپنا تصور کائنات، اپنا
معیار خیر و شر، اپنا مأخذ علم اخلاق، اپنی قوت نافذہ اور اپنی قوت محركہ الگ
رکھتا ہے۔ ان ہی چیزوں کے ذریعے سے معروف اخلاقیات کے مواد کو اپنی قدرتوں
کے مطابق ترتیب دے کر زندگی کے تمام شعبوں میں جاری کرتا ہے۔ اسی بنا پر
یہ کہنا صحیح ہے کہ اسلام اپنا ایک مکمل اور مستقل بالذات اخلاق نظام
رکھتا ہے۔

اسلامی نصور کی امتیازی خصوصیات: اس نظام کی امتیازی خصوصیات
یوں تو بہت سی ہیں مگر ان میں تین سب سے نمایاں ہیں جنہیں اس کا خاص عطیہ
کہا جا سکتا ہے۔

۱) پہلی خصوصیت یہ ہے کہ رضاۓ اللہی کو مقصود بنا کر اخلاق کے لئے ایک ایسا ہالند معیار فراہم کرتا ہے جس کی وجہ سے اخلاق ارتقا کے امکانات کی کوئی انہا نہیں رہتی۔ ہر ایک مانذہ علم مقرر کر کے اخلاق کو وہ ہائیڈاری اور استقلال پہنچتا ہے جس میں ترق کی گنجائش تو ہے مگر تلون اور بے (بطک) کی گنجائش نہیں ہے۔ نیز خوف خدا کے ذریعے سے اخلاق کو وہ قوت نالذہ دہنا ہے جو خارجی دھاؤ کے بغیر انسان سے اس کی ہابندی کرواتی ہے اور خدا و آخرت کے عقیدے سے وہ قوت محکہ فراہم کرتا ہے جو انسان کے اندر خود بہ خود قانون اخلاق اور عمل کرنے کی رہبست اور آمادگی پیدا کر فہر ہے۔

۲) دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ خواہ مخواہ کی اُبج سے کام لے کر نرالی اخلاقیات نہیں پیش کرتا اور نہ انسان کے معروف اخلاقیات میں سے بعض کو بلا وجہ کھٹانے اور بعض کو بلا سبب بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ان میں اخلاقیات کو لینا ہے جو معروف ہیں، جن کو انسانیت کے اجتماعی ضمیر نے قبول کیا ہے اور ان میں سے بھی بعض چند کو نہیں، بلکہ سب کو لینا ہے۔ ہر زندگی میں ہر سے توازن اور تناسب کے ساتھ ایک ایک کا محل، مقام اور معرف تجویز کرتا ہے اور ان کے انطباق کو اتنی وسعت دیتا ہے کہ افرادی کردار، خانگی معاشرت، شمری زندگی، ملکی سیاست، معاشی کاروبار، بازار، مدرسہ، عدالت، ہولس لائن، چھاؤنی، میدان جنگ، صلح کانفرنس، بین الاقوامی معاملات، غرض بچ جانے، ہر جگہ، ہر شعبہ زندگی میں وہ اخلاق کو حکم ران بناتا ہے اور اسی کوشش یہ ہے کہ معاملات زندگی کی باگیں خواہشات، اغراض اور مصلحتوں کی بجائے اصول اخلاق کے ہاتھوں میں ہوں۔

۳) تیسرا خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانیت سے ایک ایسے نظام زندگی کے قیام کا مطالبہ کرتا ہے جو معروف ہر قایم اور منکر سے ہاک ہو، امن کی دعوت یہ ہے کہ جن بھلانیوں کو انسانیت کے ضمیر نے ہمیشہ بھلا جانا ہے انہیں قایم کرے اور ہر وان جڑھانے، اور جن براہیوں کو انسانیت ہمیشہ سے برا سمجھتی چلی آئی ہے اس کی بیع کی کرے۔ اس دعوت اور جنہوں نے لبیک کہا ان کو جمع کر کے اس نے ایک امت ہنائی جس کا نام امت مسلمہ ہے۔

ان کو ایک امت بنانے کی واحد خرض بھی ہے کہ وہ معروف کو جاری و قائم کرے اور منکر کو دبائے اور مٹانے کے لیے منظم سعی کرے۔ اب اگر اسی کے ماتھوں معروف دے اور منکر قائم ہونے لگے تو وہ ماتم کا مقام ہے، خود اپنی امت کے لیے ہی اور ساری دنیا کے لیے ہیں۔

اخلاقی صفات

* تو ہر عمل صالح، اگر وہ خالص خدا کی رضا کے لیے کیا جائے اسلام کے نزدیک عبادت کا درجہ رکھتا ہے، اور عبادت ہی کھلانے کا مستحق ہے۔ لیکن سلیمان مفکرین نے عوام کے لیے ہات کو اسان اور قابل فہم بنانے کے لیے عبادت کا لفظ صرف ان اعمال صالحہ کے لیے مخصوص کر دبا ہے جن کے ذریعے ہندہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی معبودیت کا اعتراف کرنے ہوئے، اس کے سامنے اپنی بندگی اور اپنے عجز و نیاز کا اظہار کرتا ہے۔

اعمال صالحہ کی دوسری قسم وہ ہے جس سے پیغمبرانہ دعوت و اصلاح کا اظہار ہوتا ہے۔ یعنی ایسے اعمال جو در اصل انبیا علیہم السلام کے ہیں اور دوسرے لوگ ان کو انبیا ہی کے مقصد کو ہیلانے کے لیے کرنے میں جیسے تبلیغ دین اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر (نیکی کو قائم کرنا اور بوانے سے روکنا)۔

اعمال صالحہ کی تیسرا قسم وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی نیات کا رنگ ہے۔ اسے ہی اعمال فنی اصطلاح میں اخلاق کھلانے ہیں، مراد ہے کہ جب انسان اپنے ہم جنسوں اور دوسری مخلوقات سے ایش آئے تو اس حیثیت سے کہ وہ کائنات کے مالک و آقا کا نمایاں ہے۔ اور ابک نمایاں کا چون کہ وہ فرض ہوتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے وہ اپنے کو اسی رنگ میں پیش کرے جو خود مالک کا رنگ ہے، اس لیے انسان کو وہ تمام صفات اپنے اندرا پیدا کر لیں چاہئیں جو خدا کی صفات ہیں۔ مشائی رحم ایک صفت ہے جو در اصل اللہ تعالیٰ میں ہے، اور وہ اس کی وجہ سے رحمان اور رحیم ہے۔ بہر بندوں کو بھی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ وہ اپنے اندر رحم کی صفت پیدا کریں اور ہر قابل رحم مخلوق

وہ حصہ مولانا محمد منظور نسماںی صاحب کی کتاب "قرآن آپ ہے کیا کہتا ہے" اور "دین و شریعت" میں مأمورہ ہے۔ (مرتب)

کے ماتھے رحم کا معاملہ کریں - اسی طرح خطا اور قصور معاف کرنا ، اور دوسروں کے عیب چھپانا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور بندوں کو بھی حکم ہے کہ وہ اپنے اندر بہ صفت پیدا کریں ۔^۱

اخلاق کی تعریف سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اخلاق کا تعلق خدا اور بندے کے باہمی رشتے سے نہیں بلکہ ان تعلقات سے ہے جو انسانوں اور انسانوں کے درمیان قائم ہوتے ہیں - معاشی لین دین ہو یا سیاسی معاملات ، سماجی اہانتا ہو یا افراد خاذدان سے سلوک ، اعلام سب کو اخلاق اصولوں کے مطابق انجام دینے کی تعلیم دینا ہے - قرآن و سنت میں معاملات و معاشرت سے متعلق بالتفصیل ان صفات کا ذکر ہے جو خدا کو پسند یا ناپسند ہیں - ان سب کا احاطہ کرنا اس مختصر باب میں مشکل ہے ، اس لیے صرف چند اہم صفات کا ذکر کیا جاتا ہے ۔

پسندیدہ صفات

① صبر : اسلام کو جو انفرادی اور اجتماعی لیکیاں انسانوں میں مطلوب ہیں ان میں ایک صبر ہے - اردو میں صبر کے معنی بہت محدود ہیں - سمجھا جاتا ہے کہ صبر کا مطلب یہ ہے کہ موت ، ایماری اور فقر و تنگ دستی جیسی مصیبتوں کو اس طرح برداشت کر لیا جائے کہ شور و فغان اور شکوہ و شکایت کا اظہار نہ ہو اور کوئی ظالم اگر ظلم کرے تو اس کا انتقام نہ لیا جائے اور نہ نالہ و فریاد کی جائے ، مگر قرآن کی زبان میں صبر کے معنی اس سے بہت زیادہ وسیع و عمیق ہیں - مختصر الفاظ میں اس حقیقت کو کچھ اس طرح ادا کیا جاسکتا ہے کہ کسی نیک کام کے لیے صدموں ، تکالیفوں اور ناگواریوں کو برداشت کرنا اور ناموافق حالات میں بھی حق اور سچائی ہر مضبوطی سے جیسے رہنا اور نیک کے راستے پر چلتے رہنا صبر ہے ، قرآن ہاک نے صبر کو ایک ذریعہ 'قوت قرار دیا ہے ۔

* چنان چہ ارشاد ہوا کہ " اے ایمان والو ! (مشکلوں اور تکالیفوں میں) صبر اور نیاز سے مدد حاصل کرو ۔ "

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ بندہ اپنے میں خدا کی تمام صفات کا پرتو نہ پیدا کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کا پیدا کرنا ضروری ہے - کچھ صفات وہ ہیں کہ جن کے ناقصوں کو پیدا کرنا ہو گا مثلاً خدا معبود ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ بندہ اپنے میں عبیت پیدا کرے - اس لیے جو بات یہاں کہی گئی ہے وہ عمومی نوعیت کی ہے - اس کے یہ معنی نہیں کہ 'هر صفت خداوندی کا رنگ بندہ پیدا کرے ' کہیں ان صفات کو پرورش دینی ہوگی اور کہیں ان کے ناقصوں کو - (مرتب)

JOIN ME FOR EASY ACCESS TO EBOOKS & NOTES

+92-310-545-450-3

 **Css Aspirants ebooks & Notes**

<https://m.facebook.com/groups/458184410965870>

 **Css Aspirants Forum**

<http://t.me/CssAspirantsForum>

Rules of the group.

*No irrelevant text/pic/Islamic pic/videos

*No Smiley No Pm otherwise Removed + Blocked

*Personal text w/o Mutual consent Consider harassment.

Separate Group For Females with verification

The CSS Group does not hold any rights on shared the Books & Notes, I,m not Responsible for Copyrights.

This book/notes downloaded from the internet.

(۲) سچائی اور راست بازی : قرآن مجید سے جن اخلاق صفات کی بہت زیادہ اہمیت و فضیلت معاوم ہوتے ہیں ان میں ایک سچائی اور راست بازی بھی ہے۔ سچائی کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ زبان سے غلط اور خلاف واقعہ بات نہ کہی جائے، بلکہ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں دل کی سچائی اور عمل کی سچائی بھی شامل ہے۔ دل کی سچائی کا مطلب یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کا نفاق اور کوئی دنخا اور فریب نہ ہو۔ اور عمل کی سچائی کا مطلب یہ ہے کہ جو عینیدہ اور قول ہو وہی عمل بھی ہو اور ظاہر و باطن میں پوری پکستانیت ہو۔ جن ہندوؤں کا حال یہ ہو وہ قرآن کی اصطلاح میں "صادق" ہیں۔ قرآن و سنت میں صدق کو مومن اور منافق کے درمیان وجہ امتیاز قرار دیا گیا ہے۔

(۳) عدل و انصاف : جن اخلاق اور معنوی امور پر اسلام نے سب سے زیادہ رو رکھا ہے ان میں سے ایک عدل و انصاف بھی ہے۔ یہ در اصل سچائی اور راست بازی کی ایک شکل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کے ساتھ بلا رو رعایت وہ معاملہ کیا جائے اور اس کے مارے میں وہ خدا لگتی ہات کہی جائے جس کا وہ مستحق ہے۔ اس عدل و انصاف پر دنیا کا نظام قائم ہے۔ جس قوم اور جس سماج میں عدل و انصاف نہ ہو وہ خدا کی رحمت سے محروم رہے گا اور دنیا میں اس کا انعام بہت ہی برا ہو گا۔ قرآن ہاک، کتاب و نبوت کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان میزان قائم ہو۔ اور میزان سے مراد عدل و انصاف ہی کے تو انہیں ہیں۔ چنانچہ قرآن ہاک میں ہدایت کی گئی ہے کہ معاملات میں عدل و انصاف کو اور سچی خدا لگتی ہات کہنے کو اپنا اصول اور نصب العین بنالو۔ اور پوری دہانت داری اور خدا ترسی کے ساتھ اس فرض کو ادا کرو خواہ اس سے تم کو یا تمہارے اعزازا و اتریا کو کتنا ہی لفڑان بہنچی، لیکن حق و انصاف کے معاملہ میں کسی کی جانب داری نہ کرو اور نہ کسی غریب کی غربت و ناداری پر توس کھا کر اس کی بے جا حمایت کرو۔ انصاف اور سچائی سب سے مقدم ہے۔ غریبوں کی غربت بھی اللہ تعالیٰ تم سے زیاد، دیکھنے والا ہے اور وہی سب کا حقیقتی والی ہے، حتیٰ کہ اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے ساتھ بھی انصاف سے معاملہ کرو، محض ان کی دشمنی کی بنا پر ان سے بے انبیاء کا معاملہ روا لے و کھا جائے اور ان کے

حقوق ہامال نہ کریے جائیں کیوں کہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ اپنے
انصاف کی تلقین تو سب نے کی ہے لیکن یہ اسلام کی خصوصیت ہے کہ وہ دشمنوں
کے ساتھ بھی عدل و انصاف کی تاکید کرتا ہے۔

۴ امانت : سچائی اور راست بازی ہی کی ایک شکل امانت ہی ہے۔ امانت ہے
مراد مخفی اس قدر نہیں کہ کسی نے جو چیز کسی کے پاس رکھ دی ہو وہ مطالبے
ہر جوں کی توں واہس کر دی جائے، بلکہ تمام حقوق و فرانصیں کا دیانت داری کے
ساتھ ادا کرنا اور ہر قابل لحاظ بات کا لحاظ رکھنا ہی امانت کے مضمون میں
شامل ہے۔ یہاں تک کہ کوئی شخص کسی معاملے میں مشورہ لے تو اوری
خیر خواہی سے مشورہ دینا اور اس سے متعلق تمام رازوں کو محفوظ رکھنا ہی
امانت ہی ہے۔ قرآن ہاک میں امانت کے وصف کو اختیار کرنے کی بار بار تاکید
کی گئی ہے۔

۵ عفو و درگزر: مسلمان کو عنفو و درگزر کی بھی تعلیم دی گئی ہے۔ عفو ہے
مراد یہ ہے کہ دوسرے کی خطا اور تصور کو معاف کر دیا جائے اور انتقام کی
طااقت رکھنے ہوئے ہی بخش دیا جائے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ ایک
کال ہر تھہر کھانے کے بعد دوسرا کال ہی بھی ایش کر دیا جائے۔ اس سے تو شرستہ
عناصر کی اور ہی ہمت افزائی ہوئی ہے۔ عفو صرف اس صورت میں مناسب ہے جب
کہ غلطی کرنے والا کسی حد تک اپنی غلطی ہر نادم ہو۔ بعض لوگ عنفو و درگزر
کو اپنے رعب و عزت کی کمی کا باعث تصور کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ
انتقام سے فوری دھاک تو اپنی سکتی ہے مگر ہائیڈار عزت عنفو و درگزر سے ہی
حاصل ہوتی ہے۔

۶ رواداری: عنفو و درگزر ہی ہے ملتی جلتی ایک صفت رواداری ہے۔
رواداری سے مراد یہ ہے کہ پاہمی تعلقات میں خیر خواہی ہے کام لیا جائے
اور دوسرے کی معمولی غلطیوں اور خطاؤں پر گرفت نہ کی جائے۔ رواداری کی بنا پر
معاشرے میں اخوت اور بھائی چاروں کے جذبات پرورش ہاتے ہیں۔

۷ احسان : اونچی نوعیت کے لحاظ سے عفو اور رواداری دراصل احسان کی
مختلف شکلیں ہیں۔ احسان کے معنی یہ ہیں کہ کسی کے ساتھ اپنا برناوی کیا
جائے جو اس کے لیے فائدہ مند ہو اور یہ برناوی عقلاً اور شرعاً صحیح ہو۔ احسان کی

بے شمار صورتیں ہیں۔ مثلاً ضرورت مندوں اور رشتہ داروں کی مالی امداد کرنا، کسی کو مصیبت سے نجات دلانا، کسی کے حق کو خوبی اور سخاوت سے ادا کرنا، انسان کی بے کل نصلی کپھلائی ہے، یعنی کسی کے حق کونہ صرف پورا کرنا بلکہ اس سے کچھ نادہ ادا کرنا یا کسی سے اپنا حق وصول کرنے ہوئے رعایت کرنا یا اس کو بالکل چھوڑ دینا۔ پھر احسان صرف حقوق العباد کے ادا کرنے ہی محدود نہیں ہے بلکہ حقوق اللہ کی ادائیگی میں بھی یہ مطلوب ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ سان اسے کہتے ہیں کہ مارے حقوق ولرانہ اس طرح ادا کہے جائیں جیسا کہ آن کے ادا کرنے کا حق ہے۔

(8) مساویات : معاشری محسن میں مساوات کا بھی بڑا اونچا مقام ہے۔ اسلام میں مساوات سے دو باتیں مراد ہیں۔ ایک قانونی مساوات اور دوسرے معاشری مساوات۔ قانونی مساوات کے تحت تمام المراد ملت کے لیے ایک ہی قانون ہے۔ علام ہو یا أقا، امیر ہو یا محرب، عالم ہو یا جاہل سب کے لیے قانون کی ہابندی بکسان ضروری ہے، کسی کو کسی بنا پر کوئی برتری اور فوکیت حاصل نہیں۔ پھر اسی قانونی مساوات سے مراد یہ بھی ہے کہ ہر ایک کو ترقی کے، خواہ وہ معاشی ہو یا علمی یا معاشری، بکسان موقع حاصل ہوں۔ معاشری مساوات سے مراد یہ ہے کہ نشست و برخاست میں، عبادت میں، سماجی تقریبات میں یا عام اجتماعی زندگی میں کسی کو اولیت و فضیلت حاصل نہیں۔ امیر و محرب سجد میں شانہ بہ شانہ کھڑے ہوں گے، تقریبات میں ایک دوسرے کے قریب بیٹھیں گے، دعوتوں میں ایک ہی ہلیٹ سے کھائیں گے، اسلام میں نہ اونچ لیج ہے، نہ برلنی و نیمتری۔

(9) اخوت : پھر اسلام صرف اسی ہر ایس نہیں کرتا کہ اونچ نیچ کے استیازات کو صرف منفی انداز سے ختم کرے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایجادی طور پر اس بات کی تعلیم بھی دیتا ہے کہ تمام مسلمان ایس میں بھائی بھائی ہیں اور اس لحاظ سے ان کے تعلقات ایسے ہونے چاہئیں جیسے بھائیوں بھائیوں کے ہوتے ہیں۔ یعنی یہ کہ ان میں باہم شفقت اور ترحم ہو اور ایس میں ان کا معاملہ نرمی اور فروتنی کا ہو، ہر ایک دوسرے کا خیر خواہ، خدمت گذار اور لیاڑ مند ہو۔ اور جو چیزیں تعلقات کو خراب کرنے والی اور دلوں میں کدورت

بہدا کرنے والی ہو سکتی ہیں مسلمان ان سب سے اجتناب کریں۔ اخوت کے بہ تعلقات ایک جانب تو ملت اسلامیہ کو بہ ہمیت ایک قوم کے مستعجم کرنے ہیں اور دوسری جانب ایک ہر امن اور مالح معاشرہ کے خامن ہیں۔

(۱۵) تقویٰ : اخلاقی محسن جن میں سے جن چند کا ذکر اوہر کیا گیا ہے اسلام کے نزدیک صرف اس صورت میں قابلِ منائش ہیں جب ان سے خدا کی رضا مقصود ہو۔ اگر اس کے علاوہ کوئی اور مقصود ہے تو ان محسن کے لامن معاشرے اور سماجی نتائج تو ہمیناً قوانین نفسیات و عمرانیات کے تحت نکلیں گے، لیکن آخرت میں ان سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اسلامی اخلاقیات کی بنیاد خوف خدا ہے۔ یہی خوف خدا جب انسان اپنی ہوری زندگی ہر بھیط کر لینا ہے، اور جب وہ ہر قدم الہائی سے بھلے ہے سوچتا ہے کہ کہیں یہ خدا کو ناہست نہیں تو اس کا بد وصف تقویٰ کہلاتا ہے۔ تقویٰ کے دو لوازم ہیں۔ ایک تو ہر شعبہ "زندگی میں خدا کی مکمل اطاعت اور دوسرے اپنے اعمال کا محاسبہ کرنے ہوئے مزید لیک کرنے کی مسلسل کوشش۔ قرآن ہاک میں جہاں تقویٰ و نیکی کی تعلیم دی گئی ہے وہیں متین لوگوں کے لیے آخرت کی زندگی میں فوز و نلاح کی بشارت بھی سنا دی گئی ہے۔ اس کے برعکس وہ لوگ جو خدا کی نافرمانی کرنے ہیں ان کے لیے جہنم کی وعید ہے۔

قرآن و سنت میں جہاں پسندیدہ اخلاق کا ذکر ہے وہاں ناپسندیدہ اوصاف بھی گناہی گئے ہیں تاکہ انسان ان سے بچ کر اپنی آخرت کی زندگی بہتر بن سکے۔

صفات مذمومہ (خاپسہ دیدہ)

صفات محمودہ کی طرح صفات مذمومہ کی بھی ایک طولی فہرست ہے، جن میں فحود و تکبر، بغل، عیب جوئی، چغل خوری، خیانت، جہوث، لعن، کلامی، خود پسندی، شہرت طلبی، تنگ نظری، تنگ ظری، حرص و طمع، تصنیع اور نقلی، اسراف و تکلف، ماپوس اور پست ہمتی، غبیث، کینہ، حسد، وعدہ خلائق، رشتہ، فساد و نفاق، ذخیرہ اندوڑی، حیله سازی، گروہی اور اپانی عصبیت، احسان فراموشی اور شخص و چہرہ دستی و محیرہ شامل ہیں۔ ظاهر ہے کہ ان سب ہر سیر حاصل بحث اس مختصر باب میں ممکن نہیں، صرف چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۱) حرص* : حرص کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) دولت کی حرص (۲) منصب و رہاست کی حرص اور (۳) شہرت کی حرص۔ اور ان سب میں دولت کا لالج ایک محبوب ہلا اور حیرت لاک ایسا ماری ہے جو نفس انسان کو ہر آرام و راحت سے بہروم کر دیتی ہے۔ اعصاب اور جسم (اور روح) تھک جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ”اور مال“ اور ”دولت“ کا سلسلہ آس وقت تک جاری رہتا ہے بہت تک انسان اور آس کی خواہشوں کے درمیان قبر کی مشی حائل نہیں ہو جاتی۔

دولت کی حرص آنے والی نسلوں ہر بھی اثر انداز ہو گی ہے۔ آنے والے
بیانی خوش حالی کی وجہ سے جد و جہد ترک کر دیتے ہیں اور اگر وہ نا اہل
ہونے تو خون جگر اور محنت و مشقت سے حاصل کردہ دولت کراپسے کاموں میں
میر کرتے ہیں جن سے باپ، دادا کا نام بدنام ہوتا ہے۔

حکومت و ریاست کی حرص کی راہ میں کتنے انسانوں کا خون بھایا گیا ہے اور کتنی عزیز اس راہ میں رولڈی کشی ہیں اور کتنی آبادیاں ویران ہوئی ہیں۔ ابتدائے آفرینش سے آج تک ایشتراہی جنگیں حکومت و ریاست کے حصول کے لیے لڑی کشی ہیں اور اس حرص کی کوئی حد اور انتہا نہیں ہے۔ انسان جو کچھ حاصل کر لیتا ہے، ہر بار اس سے بلند تر منصب ریاست کے حصول کے لیے "چائز و ناجائز" کی تیزی کو توک کر کے قدم الہاتا ہے۔ کوئی عہدہ۔ بھر وزارت۔ بھر کسی مملکت کی فرمان روائی اور اس کے بعد ماری دنیا پر تصرف کی خواہش اور بھر معاذ اللہ خدائی کی تمنا۔ "فروعنیت" اس کے سوا اور کیا ہے؟ — ہر قسم کے ظلم، خون ریزی، تکبر، نغوت اور ابیسے ہی دوسرے عمل جو دین اور دیانت کی خلاف ہیں، حرص ریاست سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی سے زمین پر فساد پیدا ہوتا ہے اور فساد پیدا کرنے والوں کو اللہ پسند نہیں کرتا۔ جنت انہی کو ملے گی جو حرص ریاست میں بنتلا ہو کر اللہ کی زمین کو فساد کا گھواہ نہیں بناتے۔

وَتَلَمَّ الدَّارِ الْأَجْنَابُ كَمْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يَحْتَدِفُونَ عَلَمًا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا

آخرت کا ہے گھر ہم الہی لوگوں کے لئے خاص رکھیں گے جو زمین میں نہ اپنا اقتدار اور اپنی کبریاں چاہیں گے اور نہ مسادہ۔

(القصص - ٨٣)

یہاں سے اس باب کے اختتام تک کی پوری بحث آفی سید محمد تقی شیرازی کی فارسی کتاب "سمو فتنہ" جلد اول مانعہ (ترجمہ سید ابوالغیر کٹلی)۔ (مرتب)

(۲) ظالم : "ظلم" ایک قبیح فعل ہے اور اس کی بنیاد انسانوں کو تکلیف دینے کا مذموم جزہ ہے۔ دوسروں کو بلا سبب شرعی (معنی قصاص، حد اور تعزیز کے جواز اور عمل کے بغیر) قتل کرنا، مارنا اور قید کرنا ہی ظلم نہیں ہے بلکہ ہر وہ فعل جس سے دوسروں کے حقوق ہامال ہوں اور ان کو بلا سبب صدیقہ یا تکلیف پہنچے ظلم ہے۔ ظلم نے کتنے ہی گوروں کو ویران کیا ہے، کتنے ہی خاندانوں اور نامیوں کے نام کو صفعہ ہستی سے مٹا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ عادل مطلق ہے اور اس کے انصاف کا تقاضا صرف بھی نہیں ہے کہ وہ خود ظلم نہ رے بلکہ اُس کے انصاف ہے کران کا ایک ہہا وہ بھی ہے کہ وہ ہر ظالم و اپنے "قانون مکافات عمل" کے تحت سزا دے اور ہر مظلوم کو ظالم سے نجات دلائے، چنان چہ فرمایا ہے:

﴿ وَلَا يَسْبِئَ اللَّهَ الْأَعْنَاءَ مَعْلَمَ الظَّالِمِينَ ﴾

﴿ اے پیغمبر، یہ نہ سمجھو ہے کہ افہم ظالموں کے عمل سے غافل ہے ۔ (سورہ ابراہیم - ۴۲) ۔

وہ ظلم کو فراموش نہیں کرتا اور نہ خلفت برتا ہے، کوئی ظلم امن کے علم کی حد سے باہر نہیں ہے۔

ظلم وہ لوگ کرنے ہیں جو قدرت، قوت، ثروت، امارت اور ریاست حاصل کرنے کے بعد خدا اور اس کے قانون کو بھلا دھتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اس کو بھجانتے ہیں، اس کے قدر اور انتقام سے ڈرتے ہیں، اس کے قانون مکافات کو تسابیم کرتے ہیں، آسے ہدیثہ حاضر و ناظر جانتے ہیں، وہ کبھی ظلم و تعدی نہیں کر سکتے۔ کبیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ بندگان خدا کے ساتھ چھوٹے سے چھوٹے ظالم (حتیٰ کہ کامہ اہد) کو بھی خدا تعالیٰ نہیں کرتا۔

(۳) دروغ گولی: جھوٹ بولنا گناہ کبیرہ ہے جو دروغ گو کو لوگوں کی نظرؤں میں ذلیل و خوار، یہی منزلت اور یہ اعتبار بناتا ہے۔ جھوٹ کی گفتگو اور کوہدار ہر کوئی اعتماد نہیں کرتا۔ احادیث میں جھوٹ کی بار بار اور شدت کے ساتھ مذمت کی گئی ہے اور اس سے بڑی سختی کے ساتھ روکا گیا ہے۔ اور جھوٹ کو کفر کے کتبہ کا ایک فرد قرار دیا گیا ہے۔

اسلامی لطام اخلاق

جهوٹ کا سلسلہ بہت طویل ہے، دوکان دار جہوٹ بولنا ہے، خربدار جہوٹ بولنا ہے، تعمیرات کا کام کرنے والے نہیکبدار جہوٹ بولنے ہیں اور خدا کے نام ہر، خدا کی جھوٹ فسیب کہا کر دروغ ایمان سے کام لونے ہیں۔ جب تک جہوٹ کو اس کی تمام شکلوں میں اور بالکل جڑ پھٹکتے ختم نہ کر دیا جائے، معاشرے میں امن اور نیک کا چلن نہیں ہو سکتا۔

ثبیت: ثبیت اصطلاح شرع میں ہے ہے کہ "کسی مسلمان کے بارے میں اس کے دشمن یا جمیع ایسی بات کمہی جانے جسے اگر وہ سنتا تو آزدہ ہوتا ہو اور آئے ہر معلوم ہوتا ہے۔"

جو آمات اور بہت سی احادیث ثبیت کے بارے میں آنے ہیں ان سے ہے چلتا ہے کہ ثبیت ایک گناہ ہے اور اس کا عذاب بہت شدید ہوگا۔
الله تعالیٰ نے فرمایا ہے :

فَإِنْ لِكُلِّ مُنْزَلٍ مُنْزَلٌ مُنْزَلٌ

مر ایسے شخص کے لیے بڑی خرابی
جسے جو (بس پشت) میب نکالنے والا
ہو اور (روبرو) طہ دینے والا ہو۔
(الہسزہ - ۱)

دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ "هیا ز، شا، بنیم" ایک اور مقام
پر ارشاد ہوتا ہے؟

إِنَّ الَّذِينَ يُجْنِبُونَ أَنْ تَكُشِّيَ الْفَاحِشَةُ فِي الْأَذْنَى إِنَّمَا عَذَابُ الْكُفَّارِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ كُلَّ أَنْشَأَ

جو لوگ اس بات کو پسند کرتے کہ ایمان لانے والوں میں یہ حیاتی پہلی
ان کو دنبا اور آخرت میں دکھ دینے والا عذاب ہوگا اور خدا جانتا ہے
اور تم نہیں جانتے۔ (النور ۱۹۰)

ان کے علاوہ اس ضمن کی دوسری آبات اور احادیث انسان کو اس گناہ
کی اہمیت اور برائی سے آکاہ کرنی ہیں۔ ایک حدیث ہے کہ

الغَبَيْةُ أَشَدُّ مِنَ الزَّنَافِ

ثبیت زنا سے زیادہ سخت گناہ ہے۔

هر مسلمان اور صاحب اہمان کا فرض ہے کہ اس گناہ کی شدت کے باش
نظر خود ابھی ثبیت سے ابھی اور دوسروں کو ابھی اس سے روکے۔ چنان چہ

صاحب معراج السعادة نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی سلطان کی محیت میں
ہے اور (اس کی بینہ ایجھی) اس کی حمایت نہیں کرتا تو خدا اسے دنہا اور
آخرت میں ذلیل کرے گا ۔

ناہستہ بدہ اخلاق صفات کے اس بیان کے بعد ہم اپنی بحث کو ان چند
حقوق و فرائض کے ذکر پر ختم کرنے ہیں جو اجتماعی اخلاق کے نقطہ نظر سے
ہڑے اہم ہیں ۔

۱ حقوق و فرائض : ہمسایہ کے حق کی اسلام میں اس قدر تاکید ہے کہ

صادر بعخبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ " وہ ہم میں سے نہیں ہے جو
انہی ہمسائے کے ساتھ لیکر لہ کرے ۔ " اس روایت کی مراد اور مقصد صرف یہ
نہیں ہے کہ مسلمان انہی ہمسائے کے ساتھ براٹی نہ کرے بلکہ مقصد یہ ہے
کہ اس کے ساتھ نیک کرے ۔ اگر وہ غرب میں تو سال مدد دے ، اگر مظلوم
ہے تو اس کا ساتھ دے ، اگر حاجت مدد ہے تو اس کی ضرورت ہر دنی کرے ۔
اور اگر بیمار ہے تو اس کی عہادت کرے ۔ اگر ہمسایہ کوئی براٹی کرے تو
چشم اوشی کرے اور اسے معاف کردنے اور اگر ہمسائے کا کوئی عوبہ معلوم
ہو جائے تو اس کی تشریف لہ کرے ۔ ملاوہ اپنی اگر ہمسائے کو کسی چیز کی
ضرورت ہڑے اور اس نے استطاعت میں ہونے والے دے ۔

والدین ہر اولاد کے حق ہیں ۔ ان میں سے سب سے اہم حق اسلام کے
دستور اور آئین کے مطابق ہجouں کی تربیت ہے ۔ اس کی مختصر کہیت ہے ۔ یہ کہ
سات سال کی عمر سے انہیں ادائیگی نماز کی طرف متوجہ کریں اور نماز (اور دین)
کے اہم مسائل سے مختصراً طور پر (آسان زبان میں) روشناس کرائیں ۔ ہجouں
کو جووٹ ، چووی ، گال اور بد زبان ہے (۴ طریق احسن) روکیں اور اسے
اسکولوں میں داخل کرائیں جہاں اسلام روح اور فضا موجود ہو اور اسے
اسکولوں میں ہرگز لہ ہو یعنی جہاں آئین اسلام کے خلاف عمل ہوتا ہو ۔ ہجouں
اور لڑکیوں کے نقوش ہڑے گھرے ہوتے ہیں اور نتیجے کے طور پر ہڑی خرابیاں
ہوں ہوں ہیں ۔ ایسے مدرسوں سے مسلمان زادے ذہنی طور پر کافر ہو جانے میں
اور ان باب پر، اولاد کے صالح ہونے کی تمنا کا خون ہوتا دیکھتے ہیں اور

۱ آج پاکستان کرنوں والوں کا مذہل غیر مسلم اور مسیحی اسکولوں میں جب
جا رہا ہے اس کی داستان بڑی فردناک ہے یہ چہ باید کرو؟ سوچیں ۔

اسلام لظام اخلاق

۴۱۴

صالح اولاد کے اچھے نتائج سے محروم رہ جاتے ہیں۔ بلکہ وہ خود بھی اپنی
اولاد کے گناہوں کے شریک سمجھے جائیں گے۔ اس کے علاوہ اپنے غیر دینی
ماحول میں اولاد راست گوف، امانت اور عفت سے دور ہو جائے گی اور
دہالت و دین داری ان قبیلہ صفات کے بغیر حاصل نہیں کی جاسکتی۔ اپنے می
غیر دینی مدرسون کے طالب علم اڑے ہو کر انہی قدرت اور اثر کو لوگوں کی دہانات
سلب کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔ بہ بات آج ہم آئے دن انہی معاشرے میں
دیکھتے ہیں۔

ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارہ کے لیے خدا نے عز وجل نے حکم دیا ہے
اور اس مسئلے میں قرآن حکیم میں فرمایا ہے کہ

إِنَّ الْمُؤْمِنَوْنَ لَيُؤْمِنُوا كَمَا أُنْهَىٰ تَأْبِينَ الْقَوْمَ إِنَّمَا

مُؤْمِنٌ نُوْ آپس میں بھائی بھائی ہیں نو
انہی دو بھائیوں میں صلح کرا دیا کرو۔
(الحجرات۔ ۱۰)

اپس میں محبت اس برادری کی بنیاد ہے۔ ”اصول کای“ میں ہے کہ مخیر صادقی
محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”مُؤْمِن، دوسرے مُؤْمِن کا بھائی ہے،
اس کی آنکھ ہے، اس کا راہ نما ہے۔ مُؤْمِن، مُؤْمِن کے ساتھ خیانت نہیں کرتا،
ظلم نہیں کرتا، جھوٹا وعدہ نہیں کرتا۔ اس کی کسی جائز خواہش کو رد
نہیں کرتا۔“ ”اصول کای“ کی ایک اور روایت کے مطابق ”مُؤْمِن، مُؤْمِن کا
بھائی ہے اور مسلمان تن واحد اور روح واحد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مُؤْمِن کی بہجان
یہ ہے کہ اگر دوسرا مسلمان بھوکا ہو تو وہ کہانا نہ کہائے۔“

اسلام کے اخلاق نظام کے جو اہم گوشے اس باب میں ہیں کہیں کہیں،
ان سے بہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کے اخلاق خاطرے ایک طرف تو
الفراد کی زندگی کو ”خیر“ کے قالب میں ڈھانتے ہیں اور دوسری طرف یہ المراد
اسے معاشرے کو جنم دیتے ہیں جس کے اخلاقی معیار اخیائی نہیں بلکہ
خیر سندل ہیں۔

انسان ذہن اخلاق کے جو معیار وضع کرتا رہا ہے وہ ادوار کے ساتھ پہنچنے
رہے ہیں۔ اس کے علاوہ انسان کے بنائے ہوئے خاطرے اخلاق ہر سب کا متعلق
ہونا ممکن نہیں۔ اسلام نے انہی اخلاقی نظام کے ذریعے اسی مسئلے کو انسانیت
کے لیے سهل بنا دیا ہے۔

مزید مطالعے کے لئے

مولانا سید سلیمان نوری، سیرہ النبی (جلد ششم) - دارالصنفین، اسلام گراہ۔

مولانا حظا الرحمن بھوہاروی، اخلاق اور للسماء اخلاق - ندوۃالصنفین، دہلی۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر - اسلامک پیلیکمشٹر لیبلز،

lahore.

امام طرال، اسلامی آداب و اخلاق - (ترجمہ، سعد حسن یوسفی) - کتب خانہ،

دین و دالش، سیدہ آباد۔

مسدی الدزال، مخلص مسلم - لاہور۔

مولانا محمد منظور نعماں، دین و فریعت - مکتبہ القرآن، لکھنؤ۔

اسلام کا معاشرتی نظام

* انسان ایک معاشرتی حیوان ہے، یا ہوں کہیے کہ ہمیشہ ہے مدنی الطبع ہے اور اپنی نظرت میں جماعتی زندگی کا محتاج ہے ① پھر اجتماعت کے اس کی زندگی لاستکن ہے ② انسان اپنی بہائیں کے لئے کو سوت تک معاشرے کا محتاج ہے۔ اس کا جسم، عقل اور مخلوق جیسے اہم عطیات ہیں 'خالق کائنات' جماعتی علاقہ می کے لیے عطا فرماتا ہے ③ کیا میں آتے ہی وہ ایک خالدان میں الکھیں کھولنا ہے اپنی بروڈش کے لیے دوسرا لوگوں (مان، باپ، بھائی ہم، ما رشتہ داروں) کا، محتاج ہوتا ہے ④ پھر ہوش سنبھالتے ہی اس کو ایک سوسائٹی ہے، ایک ہرادری ہے ایک بستی ہے، ایک قوم ہے، ایک نظام تسلیم اور نظام معیشت و سیاست ہے واسطہ ہیں آتا ہے۔ نیز 'فرد'، یا 'انسان' اپنی ہر متعلقہ شے ملک خوراک، لبس، مکان اور زندگی کے دوسرے ہر شعبے میں جماعت کا 'دست نکر' ہے۔ اور اگر اس سے وہ تمام علاوی چنف کر دیجے جائیں جو جماعت کی بدولت اس کو حاصل ہوتے ہیں تو پھر اس کے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہتا اور اس کی جیشت بخوبی کوئی قیمت نہیں ہے۔

⑤ تھوڑے سے خور و فکر سے یہ بات سمجھو میں آجائی ہے کہ ہر ایک فرد یا انسان دوسروں کی زندگی ہر اثر انداز ہوتا ہے اور ان سے سائز بھی ہوتا ہے اور اس لیے اس کو ملکی طور پر مدنی الطبع تسلیم کر لینا ہے دلیل نہیں ہے ⑥ چنان چہ

* اس بحث کا بڑا حصہ مولانا حنف الرحمن سیفیاروی کی کتاب "اخلاق اور فلسفہ اسلام" میں مذکور ہے۔ بحث کو مربوط رکھنے کے لیے جگہ جگہ اضافے کیے گئے ہیں۔ (منب)

جماعت کا وجود افراد جماعت ہر موقوف ہے اور افراد جماعت میں سے ہر فرد کے نفع و نفعان ہر اثر انداز ہوتا ہے اور دونوں ایک دوسرے کے سماں جماعت کے نفع و نفعان ہر اثر انداز ہوتا ہے اور کبھی جماعتوں سے لے کر بڑی جماعتوں تک ہر جگہ تعلق موجود ہے ① چھوٹی جماعت خاندان اور کتبی ہے جو والدین اولاد اور فریبی اعزہ سے بنتی ہے اور جن میں باہمی اعتماد اور خدمت گذاری کا معاملہ رہتا ہے۔ اس کی حیثیت بالکل انسانی جسم کی طرح ہے کہ اگر ایک عمر کو مضرت ہنچ جائے تو تمام اعضا تکلیف محسوس کرنے ہیں۔ مثلاً ایک انسان بد طبیعت ہو جائے تو وہ سارے کتبی کو سعادت و خوش بختی سے محروم کر دیتا ہے اگر باپ شرایب یا جواری ہو تو اس کی بہ خصلت بد ہوئے کتبی کی زندگی اثر انداز ہونے ہے، اور تمام کتبی کی معاشرت کو تنگ اور گھر کے ہوئے مال و انتظامی نظام اور ماحمول کو درہم کر دیتی ہے۔ ہر کتبی سے بڑی جماعتوں میں بھی صورت حال مختلف نہیں ہے۔ مثلاً 'مدرسہ'، 'جہان طلبہ'، 'مدرسین' اور عملہ ایک 'جسم واحد' ہیں۔ ان میں ہر شخص اپنے شخصی عمل سے ملزم کی علمت و پہنچ کا باعث ہن سکتا ہے۔ یہی حال ایک بڑی جماعت با گروہ کا ہے کہ ایک فرد کا کوئی نیا یا کام ساری 'جماعت' یا 'جرگہ' کی قدر و بین کو بڑھا دہنا ہے، اور ایک شخص کی ہی دلائل سے ہوئی جماعت با جرگہ کی ذلت و رسوائی ہو جائے۔ مثلاً مشہور ہے "ایک مردہ مجھلی سارے قابوں کو گنڈھ کر دیتی ہے۔" ہر ان اجتماعی علاقوں میں ملت یا قوم ایک ہے ملaque ہے جو دین یا زبان یا تدن کے ذریعے وحدت کا داعی ہے، اور اس راجح تمام افراد ہر ایک ہی قانون عائد کرتا ہے، اور اس کے تمام افراد نفع و نفعان پر مشترک ہوتے ہیں، اور "ملت" جو جغرافیائی حدود سے بالاتر ہے اور دنیا کے وشی ہے انسانوں میں اخوت عام کے تعلق کو استوار کرنے ہے، اس کی وجہ اجتماعی تو اس قدر دور رہی ہے کہ اگر حقیقی وحدت اسی کو کہا جائے تو بھلے جس طرح جسم کو اس کا کوئی عضو فائدہ یا نفعان پہنچاتا ہے اسی طرح فرم الامت کو بھی اپنے افراد سے نفع و نفعان حاصل ہوتا ہے۔ طلبہ، مدرسین، تاجر، کاشت کار، صنعت کار، بڑھنی وغیرہ سب قوم کے اجزاء ہیں جو اس کا جسم سنوارا اور بناتے ہیں اور اس کے نفع و نفعان ہر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور یہ اثر انسانی کم اور ہر سے اعمال کے مختلف درجات کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے اور فرم کم ترق کا پیمانہ اس کے افراد کے مجموعہ، اعمال کے اعتبار سے ہی بتتا ہے۔ اب اس

جماعت کا وجود افراد جماعت پر موقوف ہے اور افراد جماعت میں سے ہر فرد کا نفع و نقصان جماعت کے نفع و نقصان پر اثر انداز ہوتا ہے اور دونوں ابک دوسرے کے سماںے قائم ہیں ⑤ چھوٹی جماعتوں سے لے کر بڑی جماعتوں تک ہر جگہ پہ تعلق موجود ہے ⑥ سب سے چھوٹی جماعت خاندان اور کنیہ ہے جو والدین، اولاد اور قریبی اعزہ سے بنتی ہے اور جن میں باہمی اعتماد اور خدمت گذاری کا معاملہ رہتا ہے۔ اس کی حیثیت بالکل انسانی جسم کی طرح ہے کہ اگر ایک عضو کو ضرر ہونج جاتی ہے تو تمام اعضا تکلیف محسوس کرنے ہیں۔ مثلاً ایک لڑکا بد طیت ہو جائے تو وہ سارے کنیہ کو سعادت و خوش بختی سے محروم کر دیتا ہے یا اگر باپ شرابی یا جواری ہو تو اس کی بد خصلت بد ہو رے کنیہ کی زندگی پر اثر انداز ہوئے ہے، اور تمام کنیہ کی معاشرت کو تنگ اور گھر کے ہورے مالی و انتظامی نظام اور ماحول کو درہم کر دیتی ہے۔ ہر کنیہ سے بڑی جماعتوں میں بھی صورت حال مختلف نہیں ہے۔ مثلاً 'مدرسہ'، 'جهان طلبہ'، 'مدرسین'، اور عملہ ایک 'جسم واحد' ہیں۔ ان میں ہر شخص اپنے شخصی عمل سے مدرسے کی علامت وہی کا باعث بن سکتا ہے۔ بھی حال ایک بڑی جماعت یا گروہ کا ہے لیکہ ایک فرد کا کوئی ناماباہ کام ساری 'جماعت' یا 'جرگہ' کی قدر و قیمت کو بڑھا دیتا ہے، اور ایک شخص کی ہی دنیافت سے ہو ری جماعت یا جرگہ کی ذلت و رسوانی ہو جاتی ہے۔ مثلاً مشہور ہے "ایک مردہ مجھلی سارے تالاب کو گندھ کر دیتی ہے۔" ہر ان اجتماعی علاقوں میں ملت یا قوم ایک بڑا علاقہ ہے جو دین یا زبان یا تمدن کے ذریعہ وحدت کا داعی ہے، اور اس را سے تمام افراد ہر ایک ہی قانون عائد کرتا ہے، اور اس کے تمام افراد نفع و نقصان میں مشترک ہوتے ہیں اور "ملت" جو جغرافیائی حدود سے بالاتر ہے اور دین کے رشتے ہے انسانوں میں اخوت عام کے تعلق کو استوار کری ہے، اس کی وحدت اجتماعی تو اس قدر دور نہیں ہے کہ اگر حقیقی وحدت اسی کو کہا جائے تو بجا ہے مولا۔

* جس طرح جسم کو اس کا کوئی عضو فائدہ یا نقصان ہونجاتا ہے اسی طرح قوم اور امت کو بھی اپنے افراد سے نفع و نقصان حاصل ہوتا ہے۔ طلبہ، مدرسین، تاجر، کاشت کار، صنعت کار، بڑھنی وغیرہ سب قوم کے اجزا ہیں جو اس کا جسم سنوارتے اور بناتے ہیں اور اس کے نفع و نقصان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور یہ اثر انسان کے اچھے اور ہرے اعمال کے مختلف درجات کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے اور قوم کی ترقی کا پیمانہ اس کے افراد کے مجموعہ اعمال کے اعتبار سے ہی بتتا ہے۔ اب اس

ہے اُنکے بڑھتے ہیں۔ " تمام عالم انسانی " جس، رنگ، روپ، بول، چال، اور مذہب کے اختلاف کے باوجود ایک ہی جسم " انسانیت " کے افراد و اعضا ہیں۔ اسی ایسے ہر قوم دوسری اقوام پر انثر ڈالتی ہے اور صفت و حرمت، تجارت، معارف و علوم اور اخلاق میں ایک دوسرے کو متاثر کرکر رہتی ہے۔ اور اقوام کے دوسرے حصالیں مانع نہیں ہے، جس طرح ایک کتنے کے افراد میں مرد و عورت کا تھہ و فرم ہونا ان کی یکتائی اور ان کے جسم واحد ہوتے کے مناسی نہیں ہے۔

کا ② غرض معاشرے کے یہ ہے شمار روابط ہیں جو ایک انسان کو دوسرے انسانوں سے اور دوسرے انسانوں کو اُس سے جوئے ہوئے ہیں۔ ان ہی کی درستی از، ایک ایک انسان کی، ایک ایک معاشرے کی اور مجموعی طور پر تمام انسانوں کی فلاح و بہبود کا انحصار ہے۔ اور وہ صرف خدا ہی ہے جو انسانوں کو ان روابط کے لئے صحیح اور منصفانہ اور ہائیڈار اصول اور حدود بتاتا ہے۔ جہاں انسان اُس کی ہدایت سے نیاز ہو گر خود مختار ہنا اور اس نے بزعم خود انسان کرنا چاہا تو بہر نہ تو کوئی مستقل اصول باق رہتا ہے اور نہ انصاف و راستی۔ اس لئے کہ خدا کی رہنمائی سے محروم ہو جانے کے بعد نفسانی خواہش اور ناقص علم و تجربہ کے سوا کوئی ہو؛ اسی باق نہیں رہتی جس کی طرف انسان رہنمائی کے لئے رجوع کر سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس سوسائٹی کا نظام لاڈبینیت ہوتے ہیں اور روز بنتے یا نوئتے رہتے ہیں۔ انسان تعلقات کے ایک ایک گوشے میں ظلم، نا انصافی، بے ایمان اور آس کی بے اعتقادی ہوئی ہوتے کا اسکان پیدا ہو جاتا ہے۔ تمام انسانی معاملات میں انفرادی، طبقائی، قوی اور نسلی خود غرضیاں اور انتشار رونما ہو جاتا ہے اور دو انسانوں کے تعلق سے لے کر قوموں کے تعلق تک کوئی رابطہ ایسا نہیں رہتا جس میں کبھی نہ آجائی ہو۔

Islam کا نظام معاشرت ✓

* اسلام اپنا ایک مفہوم اور ہائیڈار نظام معاشرت رکھتا ہے جس کے

" بحث مصر کے مصنف سید قطب شعبہ رحم کی کتاب " اسلام کا نظام عدل " ڈاکٹر سید رمضان کی کتاب " ہم کیا چاہتے ہیں " (انگریزی) اور خورشید احمد کی مسودوں " اسلام آئینیولوژی " (چراخ راہ، نظریہ پاکستان نمبر ۱۹۶۰ ع) میں مذکور ہے۔ (مرتب)

اصول و خواص مسٹقل و بحکم میں، جس کا ہورا مزاج عدل و انصاف سے مرکب ہے، اور جس کے تمام اجزا ہاہم مربوط و ہم آہنگ ہیں۔ یہ نظام ایسا جامع و ہمه کو ہے کہ زندگی کے تمام مظاہر اور ہر طرح کی سرگرمیاں اس کے دائرے میں آجائیں ہیں۔ یہ انسان کے قلب و ضمیر اور اس کے معاملات زندگی دونوں ہر بھی طرف پر اپنی ہدایات اور قانون سازی میں، دین اور دنیا دونوں پر حاوی ہے۔ معاشرہ افراد کے مجموعے کا نام ہے۔ اس لیے اسلام جہاں جماعتی اور معاشرتی اصلاح کرتا ہے وہی فرد کو ہی نظر انداز نہیں کرتا بلکہ اس کی اصلاح کو نقطہ اغاڑ فرار دیتا ہے کیونکہ وہ معاشرے کی بنیادی اکافی ہے اور اس کی اصلاح معاشرے کا سُدھار ہے۔ اس لیے اس کی نظر میں فرد اور مساجع دونوں کی اصلاح و تربیت یکسان اہمیت رکھتی ہے۔

اسلام ہر فرد کی جداگانہ شخصیت کا لائل ہے۔ وہ انسان کو مختص نظام اجتماعی کا ایک نے جان اور سلطنت ہر زہ ما ماحول کا ایک بروتھن لیہیں سمجھتا بلکہ اسے معاشرے کا انتہائی اہم جزو اور اصل "تاریخ ساز" فرار دیتا ہے۔ وہ ایک طرف تو اس میں یہ احسان ہے اور کرتا ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار اور اپنی ہوئی زندگی کے لیے خدا کے سامنے جواب دے ہے۔ خدا کے سامنے ہر فرد کی ذمہ داری اپنی داری ہے۔ اور اس طرح خود معاشرے میں ہی ہر فرد کی شخصیت کے تحفظ اور نشو و ارتقا کا ہورا ہورا موقع ہونا چاہیے:

مَنْ كُلَّمَا لَكِنْهُ أَوْ مَنْ لَمْ يَكُنْهُ

جس کس نے نبک کام کیا تو اپنے لیجے
کیا اور جس کسی نے برالی کو تو بخود
اس کے آگے آجے گ۔ (سم سجدہ ۲۱۰)

ایک حدیث میں انسان کی زندگی کو اس طرح ذمہ دار بنا�ا گیا:

کلم راع و کلم مسئول عن رعيته نم میں ہے سب گله بان (ذمہ دار اور نگران)
(بخاری) ہیں اور ہر ایک گله بان ہے اس کے
(ذمہ داری) کے بارے میں باز پرس ہوگ۔

اور اس احساس ذمہ داری کے پیدا کرنے کے بعد دوسری طرف ضرورت
اس امر کی ہے کہ اپنے کا ایمان خدا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اور

اسلام کا معاشر ق نظام

۲۰۹

انہوں نے بڑا در تازہ کیا جاتا رہے۔ اس سلسلے میں علم دین سے واقفیت سب اہم ہے۔ چنان چہ اسلام حصول علم کو بڑی اہمیت دہنا ہے۔ حضور ملی اللہ علیہ وسلم کو تو بہ دعا مستقل طور پر سکھائی کئی کہ

۱) وَقْلَنَ لِيَنْدَقْنَ هَلْكَنَ

اور کہیے (دعا کیہے) کہ پروردگار میرے علم میں زیادتی فرم۔ (طہ۔ ۱۲۲)

اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

طلب العلم فریضہ علی کل مسلم و مسلمۃ علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور مورث (ابن ماجہ) ہو فرم۔

ہنہاں چہ امام حنفی فرمائے ہیں کہ دین کا اتنا علم کہ اسلام کیا ہے اور اس کے بندی معاملات کیا ہیں فرض عین کا درجہ رکھتا ہے۔ ہر علم دین کے ساتھ ساتھ اس علم کا حصول بھی واجب ہے جو زندگی کے قیام اور تمدن کے فروع کے لیے ضروری ہے۔ کوپا اسلام ایک فرد کو اسے خطوط پر چلانا چاہا ہے جس نے اس کے استحکام اور عمل زندگی کی تعمیر کا انحصار ہے۔

علم دین کا ایک بڑا مقصد عمل زندگی کی اصلاح ہے۔ اس لیے اسلام ہر فرد میں جذبہ عمل پیدا کرتا ہے اور سی و جدوجہد کی اہمیت اس کے ذمہ پر نہ کرتا ہے:

۲) وَقْنَ لِيَنَ الْأَنْكَانَ الْأَمْلَقَنَ

انسان کو وہی کہہ سکتا ہے جس کو وہ کوشش کرلا ہے۔ (الجم۔ ۳۹)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "جو کوشش کرے کا اس کو اس کی کوشش کا بہل ملے کا اور ہر کوشش کرنے والے کو کہہ نہ کہو ملنا شکار" ایک حدیث میں ارشاد ہے۔ "کوشش کرو، اس لیے کہ اتفق نے تم پر کوشش فرض کی ہے۔" جذبہ عمل کو پیدا کوئے اسلام فرد میں بہ احساس ہی پیدا کرتا ہے کہ ایمان کا لازمی تھا ہے کہ وہ اچھی

اسلامی نظام حیات

۳۱

اعمال کرے، کیوں کہ وہ ایمان جس کے نتیجے میں اچھے اعمال (اعمال صالحہ) رونما نہ ہوں اس بیع کی طرح ہے جو ہار اور نہ ہو سکے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد ہے "ایمان، دل سے تصدیق، زبان سے اقرار اور اعضا سے عمل کا نام ہے" اور "اللہ ایمان کو بغیر عمل قبول نہیں کرتا اور عمل کو بغیر ایمان قبول نہیں کرتا۔" گویا ایمان و عمل لازم و ملزم ہیں۔ *

فرد کی اصلاح کا ایک موثر ترین ذریعہ اور اس کی تربیت کا ایک مستقل نظام اسلامی عبادات ہیں جس کا اسلام نے ایک مفصل ہر و گرام دبا ہے اور جس میں کسی کمی اپنی کی ضرورت نہیں کیوں کہ افراط و تنفس سے بجانا بھی اسلام کا ایک خاصہ ہے۔ اس کے نزدیک فرد کو نہ صرف دنیا کا ہو کر رہ جانا چاہیے اور نہ ہی راہب بن جانا چاہیے بلکہ دنیا داری اور دنیا چھے احتساب، دونوں سے بجا ضروری ہے۔ اس لیے اعتدال کی راہ سب سے بہتر ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں "ہر ایک کام میں اوسط درجہ (اعتدال کی راہ) بہتر ہے۔" اسلام ہر فرد میں میانہ روی کی صفت دیکھنا چاہتا ہے۔

بہر اسلام کی نظر میں چوں کہ امت مسلمہ کی حیثیت "آمد وسط" اور "خیر امت" کی ہے اس لیے وہ فرد ہر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ اقامت دین کی جدوجہد کرے، اور اپنی زندگی کو دنیا کمانے کے بجائے دین کو قائم کرنے کے لیے وقف کر دے اور اس راہ میں جس قربانی کی ہی ضرورت ہڑے اسے پیش کرنے سے بالکل دریغ نہ کرے۔ *

سورہ توبہ رکوع و میں موننوں کو حکم دیا گیا ہے کہ دین کی دعوت اور اعلانیے کلمہ الحق کے لیے

لَتُؤْتُوا هَذَا الْأَيْمَانُ الْمُكْحُلُونَ إِنَّمَا الْأَذْوَارُ لِلْكُفَّارِ فِي سَوْءِ الْفُلُو

گھر و دن ہے نکلو اور چل پڑو خواہ تم ہلکھلے ہو یا بھاری ہو، اور افہ ک راہ میں جان اور مال کے کوشش کرو (جہاد کرو)۔ (توبہ - آیت ۲۱)

یہاں ہے ہاد رکھنا ضروری ہے کہ دین اسلام کے قیام سے دنیا میں بھی للاح حاصل ہوئی ہے۔ اس لیے کہ اسلام میں اعتدال اور زندگی کی ضروریات کی ہوئی رعایت موجود ہے۔

۴ وہ موافق باتیں ہیں جو ایک فرد کی اصلاح کے لیے اسلام کو
مطلوب ہیں -

معاشری اصلاح

* جیسا کہ بھلے کہا گیا، اسلام انفرادی اصلاح کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی کی تعمیر و تشکیل کے لیے بھی واضح حدایت اور سوچا سمجھا منصوبہ دھنا ہے۔ اس کے نزدیک معاشرے کی اصلاح اتنی ہی ضروری ہے جتنی خود فرد کی اصلاح۔ اس کے پر عکس جدید مغربی تحریکات کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ بعض خارج میں تبدیل کر کے نظام زندگی میں انقلاب لانا چاہتی ہیں۔ انہوں نے فرد کو نظر انداز کیا۔ نتیجتاً ان کا اصلاحی ہروگرام کامیاب نہ ہو سکا۔ دوسری طرف مشرق کے مذہبی نظاموں نے صرف فرد کی اصلاح کی اور اس کی روح کو جلا بخشنے کے ہروگرام بنانے لیکن اجتماعی زندگی کی درستگی سے بالکل صرف نظر کیا۔ اور نتائج کے اعتبار سے بہ نظام بھی ناکام رہے۔ لیکن اسلام دونوں کو پیکان اہمیت دیتا ہے۔

عوامی طور پر اسلام ایک اپسے معاشرے کا طالب ہے جو ہمہ گیر، مصنوعی اختلافات سے باک، تعصبات و مکروہات سے مُبتہ، نسل، رنگ، وطن اور زبان کی حد پندبوں اور جغرافیائی سرحدوں پر ہے، مساوات، اجتماعی عدل و انصاف اور ایک عالم گیر برادری کی بنیاد پر قائم ہو اور ایک نکری، اخلاقی، نیز اصولی معاشرہ ہو جس کے اراد میں باہم ہمدردی، انسانیت، اور مواساة کا رشتہ ہو۔ اس سلسلے میں وہ حسب ذیل بنیادیں فراہم کرتا ہے۔

نظام معاشرت کی بنیادیں

۱۔ مساوات : اسلامی معاشرے کی سب سے بھلی اور سب سے اہم مخصوصیت اور اس کا سنگ بنیاد ہے کہ سب انسان ایک نسل سے ہیں۔ ہری انسانیت ادم کی اولاد ہے۔ رنگ، زبان، نسل، قبیلہ، برادری، ملک، قوم کی طبقی تقسیم باہمی تعارف کے لیے ہے۔ لیکن ان اختلافات کی وجہ سے

• اس بحث کا برا جسے خورشید احمد کے مفسون "اسلامی آئیپولوجی" (چراغ راء نظریہ پاکستان ندب) میں مانعہ ہے۔ چند الفہاد سید قطب کی کتاب "اسلام کا نظام عدل" میں لمحہ گئے ہیں۔ (رب)

تمصب یا تفریق یا امتیاز اور اونچ نیچ پیدا کرنا غلط ہے ، کیوں کہ اسلام ساوات انسانی اور وحدت انسانی کی بنیاد پر اپنے تمام معاشری تعلقات اسوار کرتا ہے - قرآن میں ہے :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِذَا حَلَّتُمُ الْأَيَّامَ شُعُّبًا وَّمَأْمَلًا تَحْمَدُوا إِنَّ اللَّهَ مُكَفَّهٌ عَنِ الدُّنْيَا وَهُنَّ مُنْهَمُونَ

لوگو ! تم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا پھر تمہاری قومیں اور فیلے زانے زاکہ ایک دوسرے کی شناخت کر سکو ، تم میں سب سے زیادہ با عزت اور فضیلت والا اللہ کے نزدیک وہ جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے ۔ (العجرات ۱۲)

ایک دوسری جگہ ہے :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِذَا قَاتَلُوكُمْ فِي الدِّينِ فَلَا يُحَمِّلُوكُمْ بِمَا لَا يُمْكِنُكُمْ وَلَا يَنْهَا فِي مَنْهَا زَوْجَهَا وَيَكُنْ مِّنْهُمْ مُّلْجَأٌ إِلَيْهَا وَلَا يَنْهَا

لوگو ! اپنے رب سے ڈرو ، وہ رب جن نے تم کو اکیل جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کر دیا پھر ان دونوں کی نسل سے مردوں اور عورتوں کی ایک بڑی تعداد دنیا میں پھیلا دی ۔ (الناء ۱۱)

ایک حدیث میں ہے " لوگو ! یہ شک تمہارا رب ایک ہے - اور یہ شک تمہارا باپ ایک ہے - اور ہاں ! عربی کو عجمی پر ، عجمی کو عربی پر ، سفید کو سیاہ پر اور سیاہ کو سفید پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے - مگر (بعن) تقویٰ کے" (کہ وعی و بہ امتیاز ہے) - ایک دفعہ اپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا " لوگو ! تم سے آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے ۔"

نظریہ توحید صرف نظام کائنات میں وحدت اور ایک خدا ہی کا تصور پیش نہیں کرتا بلکہ وحدت انسان کا تصور یہی اس کا لازمی نتیجہ ہے - شان وحدت کی حامل یہ کائنات ایک ہی ارادے کا فیض ہے - انسان اسی کائنات کا ایک جزو ہے جو دوسرے اجزا سے مربوط ہے - فرداً فرداً نظام کائنات سے ہم آهنگ و مربوط ہونے کا لازمی تقاضا ہے کہ افراد انسانی با ہم یہی عم آهنگ اور مربوط ہو گزر ہیں - اس بنا پر اسلام وحدت انسانیت کے نظریے کا قابل ہے کہ اس وحدت کے اگر اجرا مختلف ہیں تو یہ یہی اتفاق و اتحاد ہی کی خاطر ، اور متفرق ہیں تو اسی لئے مجتمع ہو سکیں - مختلف را ہی اختیار کر کے ایک دوسرے سے تعاون سب کی منزل مقصود ہے - غرض ، انسان بہ حیثیت ایک نوع یہی وحدت ہے اور بہ حیثیت فرد یہی ۔

اسلام کے اس تصور انسانیت کے ہونے ہونے ظاہر ہے کہ تمام انسان صاحبِ عز و شرف ہیں اور سب کا سلسلہ ابک ہی ماں باپ پر منتهی ہوتا ہے۔ اس لیے نہ تو بہ جائز ہے کہ کسی کو ہدف تعریض بنایا جائے، نہ کسی قسم کا لوف، نسلی، وطنی، لسانی انتیاز کوئی حیثیت دکھتا ہے۔ شاہانہ خون کا دعویٰ اب سے آب باطل ہو جاتا ہے۔ ہر قسم کی عصبیت خود بہ خود ختم ہو جاتی ہے۔ ہاں آدمی کو بزرگ صرف اس وجہ سے حاصل ہوگی کہ اس کے اخلاق زیادہ اچھے ہیں اور وہ خدا تو سی میں دوسروں سے زیادہ بڑھا ہوا ہے۔

۲۔ اخوت : تمام مسلمان بوانی بھائی ہیں۔ دین کا رشتہ تمام مسلمانوں کو ابک وحدت میں جوڑ دینا ہے:

أَنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِيمَانُهُمْ

مومن قو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔
(الحجرات - ۱۰)

وَإِنَّمَّا يُحَبِّلُ اللَّهُجِيمًا وَلَا لَذَّةَ فِي

سب مل جل کر افق کی روی کو مضبوطی سے نہایت رہو اور جدا جدا نہ ہو جاؤ (آل عمران - ۱۰۳)

ایک حدیث میں ہے۔ ”ایک مومن دوسرے مومن کے لیے اپنا ہے جیسے دیوار (یا بنیاد) کہ ہر جزو (اینٹ) دوسرے جزو کو تقویت پہنچاتا ہے۔“ ”تو اللہ پر ایمان و کہنے والوں کو ابک دوسرے سے رحم اور محبت اور بہ رہائی میں اپنا دیکھئے کہ جیسے بدن۔ (کہ) ایک غصو (بدن کا) مریض ہو جانے تو سارے اعضا بخار اور درد و کرب کے ساتھ شب بیداری میں اس کے شرپک (ستلا) ہو جانتے ہیں۔“

اس طرح ابک عقیدے اور ابک اخلاق خاطر کو تسلیم کرنے والے اسلامی معاشرہ تعمیر کرنے ہیں جس میں انسان اور انسان کے ملنگے کی بنیاد ہی بہ عقیدہ و خاطر کے ہوئے ہے۔ جو انہیں تسلیم کرے تو وہ خواہ کسی نسل، کسی ملک، کسی رنگ، کسی وطن کا ہو اس معاشرے میں شامل ہو گا جس سب کے حقوق اور معاشر ق مرتبہ بکسان ہوں گے۔ بہ معاشرہ جغرافیائی

محدودوں کو تواڑ کر دوئے زمین کے تمام خطوں پر بھیل سکتا ہے اور اس کی بنیاد پر ایک عالم گیر برادری قائم ہو سکتی ہے۔ اس کے بوعکس جو لوگ اس عقیدے اور ضابطے کو نہ مانیں یہ معاشرہ انہیں اپنے دائرے میں نہیں لیتا مگر انسان برادری کا تعلق ان کے ساتھ قائم کرنے اور انسانیت کے حقوق انہیں دینے میں اسے کوئی تکلیف نہیں۔ ان کا علیحدہ معاشرہ بن جاتا ہے۔

۳۔ رشته نکاح : عورت اور مرد معاشرت کے دو ستون ہیں۔ دونوں کی اپنی اپنی شخصیت ہے اور دونوں سماج کے معمار ہیں۔ عورتوں اور مردوں میں قانونی مساوات ہے۔ اور دونوں کے ایک دوسرے پر کچھ حقوق و ذمہ داریاں ہیں۔ اور خاندان کے نظام میں مرد کی حیثیت قوام اور نگران کی ہے۔ عورت اور مرد کا عام رشتہ بھائی اور بھن کا رشتہ ہے، اور وہ ایک دوسرے کے لئے اس طرح حرام ہیں جس طرح سکرے بھائی ہیں۔ ایکن نکاح وہ طریقہ (یا معاہدہ) ہے جس سے پہ ایک دوسرے کے شریک زندگی ہو سکتے ہیں۔ اور یہی وہ جائز اور صحت مند رشتہ ہے جس کے ذریعے پہ ایک دوسرے کے لئے حلال ہو سکتے ہیں۔ اس رشتے سے خاندان کی بنیاد پڑتی ہے۔

۴۔ خیر خواهانہ فضاء : معاشرے کی عام فضا خیر خواہی، تعاون، امداد، اشتراک عمل، مواساة، ابشار اور بھائی چارہ کی ہوئی چاہیے۔ لوگ جب آپس میں ملیں تو ایک دوسرے پر سلامتی بھیجیں۔ ہر شخص اپنے بھائی کے لئے وہی چاہیے جو وہ اپنے لئے چاہتا ہے۔ ظلم، غیبت، چغل خوری، کنبہ ہروڑی، سوژن، دھوکہ دہی، برا نام رکھنے، رشک، حسد، بغض، تعجم، الزام تراشی، بے حرمتی و بے عزقی کرنے اور بے جا حرف گیری وغیرہ سے سب پر ہیز کر دیں۔ نیکیوں میں ایک دوسرے سے تعاون کروں بلکہ سبقت لئے جانے کی کوشش کروں اور براہیوں سے ایک دوسرے کو روکیں۔ چنان چہ قرآن کا حکم ہے کہ

وَتَعَاوِنُوا عَلَى الْيَقِينِ وَلَا تَعَاوِنُوا عَلَى الْأَثْوَارِ وَالْعَذَابِ

﴿ نبکی اور نقوی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور ظالم کی بازوں میں مدد نہ کرو۔ (الائدہ ۲۰) ﴾

اسلام کا معاشری نظام

۲۱۰

اور سورہ قصص دکوع ۸ میں ارشاد ہوا ہے کہ

وَأَنْسِنْ لَكَ أَحْسَنَ اللَّهُ يَعْلَمُ وَلَا تَبْغِي الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ

لوجوں کے ساتھ بھلانی کرو جس طرح اپنے تم پر احسان کیا ہے اور زمین میں طالب فساد نہ ہو۔ (القصص - ۲۲)

يَأَيُّهَا الَّذِينَ آتُوكُمُ الْأَيْمَنَ فَوْلَادُكُمْ عَنْتَ أَنْ يَكُونُوا تَقْدِيرًا لِّنَفْسِهِمْ وَلَا إِنْسَانٌ أَقْرَنْ بَاهَ عَلَىَ أَنْ يَكُونَ خَيْرًا لِّنَفْسِهِ وَلَا تَلْهِيَنَّ أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَأْبِرُوا لِأَنْفُسِكُمْ

مومنو ! کوئی قوم کسی قوم کا مذاق نہ ازائی ممکن ہے وہ لوگ ان سے بہتر ہوں اور نہ ہورتین ہورتین کا مذاق اڑائیں، مسکن ہے وہ ان سے اچھی ہوں اور (اپنے مومن بھائی کو) عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو (الحجرات . ۱۱) اسکے ارشاد ہوا ہے کہ :

وَلَا تَجْسِدُوا لِأَيْمَنِكُمْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا

اور ایک دوسرے کے بھید نہ ٹولو اور نہ کوئی کسی کی غیبت کرے۔ (الحجرات . ۱۲)

اسی طرح حدیث میں ہے کہ "الدین نصیحة" (دین تو خیر خواہی کا نام ہے) - "سلمان تو وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے سلمان محفوظ رہیں" (نقصان نہ اٹھائیں) - "سلمان کبھی طعنہ دینے والا، بکتے والا نہیں ہو سکتا" وغیرہ۔ گویا اسلام معاشرے کی عام فضا کو حسنات سے بھو دینا چاہتا ہے۔ اور اس کی نظر میں زندگی تعاون، ہمدردی اور موساہ کا نام ہے۔

۵- **ذمہ داری کا نصور:** جس طرح امر بالمعروف اور نهى عن المنکر کو

انفرادی طور پر انجام دینا ضروری قرار دیا گیا ہے، اسی طرح اسلام ان میں اجتماعی ذمہ داری کا تصور بھی ہیدا کرتا ہے اور ہر سے معاشرے میں یہ احسان ایجاد کرتا ہے کہ وہ نیکیوں کو قائم کرنے والا، برائیوں کو روکنے والا اور ایک دوسرے کی مدد کرنے والا ہو۔ ایسی انفرادیت جس میں دوسروں کے حقوق کا خیال نہ رکھا جائے اور جو اجتماعی ذمہ داری کے تصور سے نا آشنا بھی ہو، اسلام کو مطلوب نہیں۔

حضرور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق "وہ سلمان جو لوگوں میں کھل سل کر رہے اور ان کی اذیتوں پر صبر کرتا رہے، اس سے بہتر ہے جو لوگوں سے (الگ تھلگ) گھول سل کرنہ رہے اور ان کی اذیتوں پر صبر نہ کرے۔" "تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور تم میں سے ہر ایک شخص سے اس کی رعیت کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ ہس امام حاکم ہے اور ان سے اس کی رعیت کے بارے میں باز پرس کی جائے گی۔ اور ہر شخص اپنے اہل و عیال کا حاکم ہے اور اس سے اس کی رعیت کے متعلق دریافت کیا جائے گا۔ اور عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگران ہے اور اس سے اس کی رعیت کے متعلق پوچھا جائے گا۔ اور غلام اپنے مالک کے مال کا محافظ ہے اور اس سے اس کی رعیت کے متعلق باز پرس ہوگی۔"

ان عمومی عدایات کے بعد اسلام نے انسانوں کے باہمی حقوق و فرانپڑ کا ایک مکمل نظام بھی دیا ہے۔ جس میں بھائی بھائی کے حقوق، اہل خانہ کے حقوق، رشته داروں کے حقوق، اہل محلہ کے حقوق نیز غیر مسلموں اور عام انسانوں کے حقوق، حتیٰ کہ جانوروں اور درختوں کے حقوق تک کو واضح اور منعین کر دیا گیا ہے، تاکہ انسان محض جذبات کی رو میں بھی کر نالائقاً کا مرتكب نہ ہو اور معاشرہ صحت میں بنیادوں پر قائم رہے اور ارتقا کے مدارج طے کرتا رہے۔

اسلامی نظام معاشرت کی ان بنیادوں کو سمجھہ لینے کے بعد مختصرًا یہ دیکھنا ہے کہ وہ کیا اصول اور طریقے ہیں جو اسلام نے معاشرے میں بکانگی اور ہم رنگی پیدا کرنے اور انسانی اجتماع کی مختلف صورتوں کو ترقی دینے کے لئے مقرر کیے ہیں۔ اس سلسلے میں اسلام نے کچھ مستقل ادارے قائم کیے ہیں جن کا اجمالی خاکہ درج ذیل ہے۔

(۱) خاندان۔ یہ انسان معاشرت کا اولین اور بنیادی ادارہ ہے، اس لئے اسلام کے معاشری نظام میں خاندان کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ خاندان کی بنیاد ایک مرد اور عورت کی باہمی رفاقت سے وجود میں آتی ہے اور ان ہی دو انسانوں سے مل کر بننے والا چھوٹا سا اجتماعی دائرہ انسان کی تمدنی زندگی کی سب سے بہلی کڑی ہے۔ اسلام کے نزدیک مرد اور عورت کی یہ مستقل رفاقت ایک کھلی ہونے مستعکم معاہدے (نکاح) کے ذریعے ہے

وجود میں آئی ہے ۔ بد لکھ ایک ایسا باحرمت رشتہ ہے جو دونوں کی مرپی ہے اور بزرے اعلان کے ساتھ جوڑا جاتا ہے ۔ نکاح کے بغیر مرد و زن کا تعلق بد ترین معصیت اور ایک ایسا جرم ہے جس کی سخت ترین سزا مقرر ہے ۔ معاہدہ نکاح کے ذریعے سے دونوں (مرد عورت) اپنے اپنے اوپر بھابی ذمہ دار بان عائد کر لیتے ہیں اور ہمیشہ کے لئے ان کے پابند ہو جانے ہیں ۔ اس رشتے کی وجہ سے جو ایک چھوٹی سی وحدت پتی ہے ، مرد اس کا نگران اور ناظم اعلیٰ ہوتا ہے اور اس حیثیت سے وہ اپنے اہل و عیال کی دنیوی ضرورتوں اور آخری فلاح دونوں کا خیال رکھنے والا ہے جس کے لیے وہ جواب دے ہے ۔ اور بیوی اس کے زیر ہدایت گھر کا نظم و لسق چلاتی ہے اور اس حیثیت سے اس کی ذمہ داری ہے کہ لہ صرف گھر کے اندر وہ لظم و لسق کو سنبھالے لیکہ شوہر کی حقیقی رفاقت کر کے اور اپنی عفت کو بھروسی طرح حفظ رکھے ۔

عورت اور مرد کے اس ملاب سے ایک لئی نسل وجود میں آئی ہے ۔ اس سے رشتے ، کہنے اور برادری کے دوسرے تعلقات پیدا ہوتے ہیں اور بالآخر یہی رشتے ہمیلنے ہمیلتے ایک معاشرے تک جا ہجتے ہیں ۔ نیز خاندان ہی وہ ادارہ ہے جس میں ایک نسل اپنے بعد آنے والی نسل کو انسانی تمدن کی وسیع خدمات سنبھالنے کے لیے نہایت محبت ، ابشار ، دل سوزی اور خیر خواہی کے ساتھ تیار کرنے ہے ۔ گویا وہ ادارہ وہ تربیت گاہ ہے جہاں سے اسلام اچھے انسان تیار کرنا چاہتا ہے اور اخلاق حسنہ کی ابتدائی تربیت اسی مقام پر دیتا ہے تاکہ شروع ہی سے ہجتے میں اسلام کا احترام پیدا ہو اور اس کی سیرت اسلامی سانچے میں ڈھل جائے ۔

(ب) قرابت ۔ خاندان کے بعد رشتہ داری کی سرحد ہے جس کا دائروہ کافی وسیع ہوتا ہے ۔ جو لوگ مان اور باپ کے تعلق سے با بھائی بھنوں کے تعلق سے با مسراں تعلق ہے ایک دوسرے کے رشتہ دار ہوں ، اسلام ان سب کو ایک دوسرے کا ہمدرد ، مددگار اور غم گسار دیکھنا چاہتا ہے ۔ قرآن میں جگہ رشتہ داروں سے نیک سلوک کا حکم دیا گیا ہے اور حدیث میں صلہ "رحمی کی بار بار تاکید کی گئی ہے اور اسے بڑی نیک شمار کیا گیا ہے ۔ لیکن اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں ہے کہ اسلام کے خلاف یا ناجائز کاموں میں تعاون کیا جائے اور رشتے با قبیلے کی عصیت یا بے جا طرف داری سے کام لیا جائے ۔ خون کے رشتون کو اسلام نے قابیم رکھا ہے ۔ اور وراثت کے قانون کے ذریعے انہیں ایک مستقل مقام دے کر صحت مند و فطری احساسات کو دوام عطا کیا ہے ۔

(ج) محلہ - رشته داری (قربات) کے بعد مسائیگی ہے - قرآن کی رو سے مسایوں کی تین قسمیں ہیں۔ ایک رشته دار مسایہ، دوسرا اجنبی مسایہ اور تیسرا عارضی مسایہ، جس کے پاس بیٹھنے یا ساتھ چلتے کا ادمی کو انتقال ہو۔ یہ سب اسلامی احکام کی رو سے رفات، ہمدردی اور نیک سلوک کے مستحق ہیں، اسے باب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے ارشادات ہیں، مثلاً سب مسایہ کے حقوق کی اتنی تاکید کی گئی کہ میں خیال کرنے لگا کہ شاید اب اسے (بھی) وراثت میں حصہ دار بنا دیا جائے گا۔ وہ شخص مومن نہیں ہے جس کا مسایہ اس کی شرارتیوں سے امن میں نہ ہو۔ وہ شخص ایمان نہیں رکھتا جو خود بیٹھ کر کھالی اور اس کا مسایہ اس کے پہلو میں بھوکا رہ جائے۔ غرض، اسلام ان سب لوگوں کو جو ایک دوسرے کے ہڑوی ہوں اپس میں ہمدرد، مددگار، اور شریک رنج و راحت دیکھنا چاہتا ہے وہ ان کے درمیان ایسے تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے کہ وہ سب ایک دوسرے پر بھروسہ کر سکیں، اور ایک دوسرے کے پہلو میں اپنی جان و مال اور آبرو کو محفوظ سمجھیں۔ اور ایسی معاشرت جس میں ایک دیوار بیچ رہنے والے دو ادمی برسون ایک دوسرے سے نا آشنا رہیں اور جس میں ایک ملے کے رہنے والے باہم کوئی دلچسپی، کوئی ہمدردی اور کوئی اعتماد نہ رکھتے ہوں، اسلام کو مطلوب نہیں، وہ ہر ملے کو معاشرے کا ایک فعال اور موثر جزو مانا ہے۔

(د) مسجد - معاشری تعلقات کو استوار کرنے کے لیے مسجد کی حیثیت ایک مستقل ادارے کی سی ہے، اور اسلام کا معاشری پروگرام مسجد ہی کے ذریعے زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ ان سلسلے میں مسجدوں کی صحیح تنظیم کو بڑی اہمیت حاصل ہے تاکہ مطلوبہ نتائج ہو ری طرح حاصل ہو سکیں۔

(e) احترام روایات - سلم معاشرے کی روایات صحیحہ (عُرف) کا احترام اور ان کا استھکام بھی معاشری پالیسی کا ایک جزو ہے، کیونکہ اس کے ذریعے سلم معاشرہ کبھی بھی اپنے ماضی سے نہیں کتنا۔ ان کے معنی یہ نہیں ہیں کہ روایات میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ زندگی کے ہمه کیر تفاصیل گذرا بنا بر ان میں تبدیلی ضرور ہوتی ہے لیکن یہ تبدیلی مستقل اور خاموش ارتقا کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ کسی ہیجانی اور غیر معمولی بخاوت یا ماضی سے انتظام کے ذریعے سے نہیں۔

(و) نظام تعاہم - معاشرے کے مددگار، اس میں اسلامی اقدار کے تحفظ اور اپنے نظام زندگی کو نئی نسلوں کی طرف منتقل کرنے میں نظام تعلیم بنیادی اہمیت کا حامل ہے اور اسلامی معاشرت کا ایک بہت بڑا ستون ہے۔

(ز) حدود و تعزیرات - معاشرے کی اصلاح کے تمام ذرائع اختیار کرنے کے بعد حدود تعزیرات کا بھی ایک مکمل نظام رکھا گیا ہے جن کے ذریعے معاشرے کو ان افراد سے محفوظ کیا جاتا ہے جو تعلیمی، ترغیبی، اور اخلاقی ذریعے سے اصلاح نہ قبول کریں اور معاشرے کے قانون کی خلاف ورزی کریں۔ ایسے لوگوں کو اسلام قرار واقعی سزا دیتا ہے تاکہ معاشرہ ان کی فتنہ الگیزوں سے امن میں رہے اور اس میں فساد رونما نہ ہونے پائے؛ نیز سماجی جرائم کا انسداد کیا جاسکے۔ گوکہ ایک اسلامی معاشرے میں یہ جرائم غیر معمولی طور پر بہت کم ہوں گے اس لیے ان مزاں کا نفاذ بھی شاذ و نادر ہی ہو گا، لیکن یہ ہر حال قانون کی گرفت اسلام میں ناقابل شکست ہے۔ اسلام کی نظر میں قانون سے بالاتر کوئی نہیں ہوتا۔ امیر و غریب اور خواص و عوام کا یہاں کوئی استیاز نہیں ہے۔ اونچے سے اونچا شخص حتیٰ کہ حکم ران وقت ہوئی قانون کا اسی طرح مکوم ہے جس طرح ایک بے کس قبیر۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ قانون کی بالا دستی کی تاریخ میں اپنی تغیر نہیں رکھنے کے "اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا تعالیٰ ہی چوری کر ق تو خدا کی قسم میں اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔" (بغاری)

مزید مطالعے کے لئے

سید قطب، اسلام کا نظام عدل۔ (ترجمہ نجات اللہ صدیقی)۔ اسلامک پبلیکیشن
لیبلڈ، لاہور۔

چراغ وہ (نظریہ پاکستان نمبر)۔ راتبہ خورشید احمد۔ مکتبہ چراغ راء، کراچی۔
مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلام کا نظام حیات۔ اسلامک پبلیکیشن لیبلڈ،
لاہور۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، تعلیمات۔ اسلامک پبلیکیشن لیبلڈ، لاہور۔
مولانا مناگر احسن گیلانی، اسلام کا نظام تعلیم و تربیت۔ ندوۃ المصنفوں، دہل۔

مولانا محمد ظفیر الدین، اسلام کا نظام مساجد۔ ندوۃ المصنفوں - دہل۔

اسلام کا نظریہ تعلیم*

اسلام میں تعلیم کی اہمیت مسلم ہے۔ تاریخ انسانیت میں یہ منفرد مقام سلام ہی کو حاصل ہے کہ وہ سرایا علم بن کر آیا اور تعلیمی دنیا میں ابک نہ کبھی انقلاب کا ہیام بر ثابت ہوا۔ اسلامی نقطہ نظر سے انسانیت نے اپنے سفر ہ آغاز تاریکی اور جہالت سے نہیں بلکہ علم اور روشنی سے کیا ہے۔ تخلیق آدم کے بعد خالق نے انسانِ اول کو سب سے پہلے جس چیز سے سرفراز فرمایا وہ علم اشیا تھا۔ یہ اشیا کا علم ہی ہے جو انسان کو باقی مخلوق سے ممیز کرتا ہے ور جو قرآن حکیم کے فرمان کے مطابق تمام دوسری مخلوقات پر اس کی برتری قائم کرتا ہے^۱۔ علم قیادت کا ابک خاصہ^۲ اور ان اہم ترین عوامل میں سے ہے جو کسی تہذیب کے صحت مнд ارتقا اور نشوونما کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ بھی وجہ ہے کہ جہاں دنیا کے دوسرے نظاموں نے تعلیم کو زیادہ سے زیادہ سی ضرورتوں میں سے ایک ضرورت سمجھا وہاں اسلام نے اسے اولین ضرورت قرار دیا۔

اسلام کے سوا دنیا کا کوئی مذہب یا تمدن (Culture) ایسا نہیں ہے جس نے تمام انسانوں کی تعلیم کو ایک بنیادی ضرورت قرار دیا ہو۔ بونان اور جین نے غیر بعمولی علمی اور تمدنی ترقی کی، لیکن وہ بھی تمام انسانوں کی تعلیم نے مثل نہ تھی، بلکہ اہل علم کے ایک طبقے پر ہی قانون ہو گئے تھے۔ نظاموں اپنی "جمهوریہ" (Republic) میں جو اونچے سے اونچا خواب دیکھ سکا

* یہ باب مرتب کے قلم ہے اور اس کتاب کے لیے عاشر طور سے تیار کیا گیا ہے۔

^۱ قرآن حکیم، البقرة - ۴۰

^۲ قرآن حکیم، البقرة - ۲۴۷

اس میں بھی فلاسفہ اور اہل نظر کے ایک مخصوص طبقے ہی کو اس امتیاز سے نوازا گیا ہے۔ اسلام وہ واحد مذہب ہے جس نے تمام انسانوں پر تعلیم کو فرض قرار دیا^۱ اور اس فرض کی انجام دہی کو معاشرے کی ایک ذمہ داری بنایا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو بھل وحی نازل ہوئی و علم کے مقام اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں تعلیم و تعلم کی ضرورت و اہمیت ہی کو واضح نہیں کیا گیا بلکہ ذرائع تعلیم — بڑھنا اور لکھنا — کی طرف بھی واضح اشارات موجود ہیں۔

إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْضِ إِنَّهُ أَنْزَلَ لِكُمْ مِّنَ السَّمَاءِ مَا شِئْتُمْ فَمَا لَكُمْ بِغَيْرِهِ مِنْ حِلٍّ

پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔ انسان کو خون سے پیدا کیا۔ پڑھ اور تیرا رب کریم ہے۔ وہ جس نے قلم سے تعلیم دی۔ انسان کو ان چیزوں کی تنظیم دی جن کو وہ نہ جانتا تھا۔ (سورہ علق، ۵۰:۱)

قرآن کریم میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کی جو ذمہ داریان سونی گئی ہیں اور آپ کے جو وظائف مقرر کیے گئے ہیں ان میں تلاوت کتاب، تعلیم کتاب و حکمت، تبین احکام و آیات، تزکیہ نفوس اور تبلیغ و دعوت کو ایک مرکزی مقام حاصل ہے اور بھی وجہ ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:

انما بعثت معلماً
(میں مسلم بننا کر بھیجا گیا ہوں)

(۲)

تعلیم کیا ہے؟

علم اور تعلیم کی اسی سلسلہ اہمیت کے ہیش نظر پر انتہائی ضروری ہے کہ ہم تعلیم کی نوعیت اور اس کے اساسی اصول کا صحیح فہم حاصل کریں۔

تعلیم صرف تدریس عام ہی کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے سے ایک قوم خود اگھی حاصل کرتی ہے، اور یہ عمل اس قوم کو تشکیل دینے والے افراد کے احساس و شعور کو نکھارنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ نئی نسل کی وہ تعلیم و تربیت ہے جو اسے زندگی کی زیارت کے طریقوں کا شعور دیتی ہے اور اس میں زندگی کے مقاصد و فرائض کا احساس پیدا کرتی ہے۔ تعلیم

۱ طلب العلم فرضة ملوك مسلم و مسلمہ (حدیث نبوی)۔

ہی ہے ایک قوم اپنے تقاضی ذہنی اور ذہنی ورنے کو آپنے نسلوں تک پہنچانے میں اور ان میں زندگی کے ان مقاصد سے لکاڑ ہذا کرنے میں جنہیں اس نے اختیار کیا ہے تعلیم ایک ذہنی، جسمانی اور اخلاقی تربیت ہے اور اس کا مقصد اونچے درجے کے ایسے تہذیب پاٹھ میں اور عورتیں ہیدا کرنا ہے جو ابھی انسانوں کی حیثیت سے اور کسی ریاست کے ذمہ دار شہریوں کی حیثیت سے اپنے فرانپس کو انعام دینے کے اہل ہوں۔ ہر دور کے ممتاز ماہرین تعلیم کے نظریات کا مطالعہ اسی تصور تعلیم کا پتہ دیتا ہے۔

لفت کے اعتبار سے تعلیم کا مادہ 'علم' (ع لم) ہے۔ اس کے معنی میں کسی چیز کا ادراک کرنا۔ اس سے باب تفعیل میں "تعلیم" "آتا ہے۔ تعلیم کے معنی ہار بار اور کثرت کے ساتھ خبر دینے کے میں۔ حتیٰ کہ متعلم کے ذہن میں اس کا اندر ہیدا ہو جانے۔

انگریزی زبان کا لفظ Education لاطینی لفظ Edex ہے۔ معنی نکالنا اور Ducer-Duc کا جمع کر دینا اور "معنی صلاحیتوں کو نکھارنا" ہیں۔ یہ نوع اصطلاح لفظ معلومات فراہم کرنے اور متعلم کی معنی صلاحیتوں کو نکھارنے کے مفہوم میں آتا ہے۔

جان استورث مل مغرب کے ان مشاہیر میں سے ہے جنہوں نے تعلیم کے مفہوم کو وسعت دینے کی کوشش کی ہے وہ کہتا ہے:

"تعلیم صرف ان باتوں ہی نہ ہے احاطہ نہیں کرنے سے ہے۔ ہم اپنی فطرت کے کمال سے قریب تر ہونے کی بنا پر، وضع مقصد کی خاطر اپنے لیے کرتے ہیں یا دوسرے ہمارے لیے کرتے ہیں۔ اپنے وسیع تر مفہوم میں اس کی حدود بہت زیادہ ہیں۔ انسانی کردار اور صلاحیت ہر ہڑتے والے آن چیزوں کے بالواسطہ اثرات بھی اس کے دائرہ کار میں شامل ہیں جن کے فوری مقاصد بالکل ہی دوسرے ہوتے ہیں"۔

- ۱
Shipley, Joseph T., *Dictionary of Word Origins*, Ames, Iowa, P. 114.
Inaugural Address as Rector of St. Andrew's University, 1867, vide - ۲
W.O. Lester Smith, *Education*, Pelican, 1958, p. 9.

جان ملٹن تعلیم کی تعریف یوں کرتا ہے :

”میرے نزدیک مکمل اور شریفانہ تعلیم وہ ہے جو انسان دیانت و مہارت اور عظمت کے ساتھ ادا کرنے کے لیے تیار کرف ہے۔“

تعلیم کا یہ وسیع ترین تصور ہے۔

امریکی فلسفی جان ڈبوی کے نزدیک تعلیم افراد اور نظرت سے متعلق بنیادی طور پر عقلی اور جذباتی روئیوں کے تشکیل ہانے کا عمل ہے۔ ذاکثر پارک کا خیال ہے کہ تعلیم رہنمائی یا مطالعے سے علم حاصل کرنے اور عادات اختیار کرنے کا عمل یا فن ہے۔ پس تعلیم وہ مسلسل عمل ہے جس کے ذریعے سے نشی نسلوں کی اخلاقی، ذہنی اور جسمانی نشوونما بھی ہوتی ہے اور وہ اپنے خواہید و تصورات اور تہذیب و ثقافت کی اقدار بھی اس سے اخذ کرنے ہیں۔ ماہرین تعلیم اس لفظ سے دو مفہوم لیتے ہیں۔

وسیع تر مفہوم میں یہ ان تمام طبیعی و حیاتیاتی، اخلاقی و سماجی اثرات کا احاطہ کرتا ہے جو فرد اور قوم کے طرز زندگی کی تشکیل کرتے ہیں اور محدود مفہوم میں یہ صرف ان اثرات پر حاوی ہے جو اساتذہ کے ذریعے سے اسکولوں کالجوں اور دوسری درس گاہوں میں مرتب ہوتے ہیں۔

بہ ہر کیف تعلیم ایک ہمہ گیر عمل ہے اور شاگرد کی زندگی کے تمام بہلوں پر اس کا گمراہ اثر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک قوم کی زندگی کا انحصار ہی اس کی تعلیم پر ہے۔ ایک چینی کہاوت اس بات کی کتنی صحیح عکسی کرفتی ہے:

”تمہارا منصوبہ اگر سال بھر کے لیے ہے تو فصل کاشت کرو،
دس سال کے لیے ہے تو درخت آکاؤ، دائمی ہے تو مناسب افراد
بیدا کرو۔“

Milton, John, *A Reopagitica and other Prose Works*, Everyman's Library, p. 46.

Dewey, John, *Democracy and Education*, quoted by Hughes, A.G. and
Hughes, E G, *Education: Some Fundamental Problems* Longmans,
London, 1960, p. 81.

Park. Dr. Joe, "Introduction", *Selected Readings, in the Philosophy of Education*, Macmillan, New York, 1958, p. 3.

اور تعلیم ہی وہ عمل ہے جس سے افراد کی تعمیر ممکن ہے ۔

(۲)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

تعلیم کسی قوم کے ساجی نظریات اور تقافت سے کھرے طور پر مربوط ہوئے ہے ۔ بنا بریں کسی قوم کا نظام تعلیم انہی مزاج ، مواد اور موضوعات کے اعتبار سے نہ تو نظریات رنگ سے خالی ہو سکتا ہے اور نہ اس میں اتنی معروفیت (Objectivity) ممکن ہے کہ اسے اقدار کی گرفت سے آزاد قرار دیا جاسکے ۔ لیکن بعد جدید میں لبرلزم (Liberalism) اور انفرادیت پسندی (Individualism) کے علم برداروں نے تعلیمی دنیا میں اس غلط فہمی کو بڑے زد و شور سے رانج کرنے کی کوششی کی ہے کہ تعلیم تہذیبی اقدار اور معیارات خیر و شر کے سلسلے میں بالکل اسی طرح غیر جانب دار ہو سکتی ہے جس طرح طبیعی علوم ۔ اس غلط تصور کی بنا پر تعلیم کو مذہب اور اخلاق اقدار سے الگ کر دیا گیا اور یہ کہا جائے لگا ۔ نہ طالب علم کو اپنی صلاحیت کے مطابق نشوونما ہانے کے لئے ہوئی آزادی ملنی چاہیے اور اس کی فکر یا کردار کو کسی مخصوص سائز میں ڈھاننے کے لیے کوئی بیرونی دباؤ نہیں ہوا چاہیے ۔ یہ طریق تعلیم ریاست مائیں متحده امریکہ میں اہ سول ہوا اور اس نے دوسرے یورپی ممالک میں بھی خاصی شہرت حاصل کی ۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ عقیدہ تعلیم کے نتائج کسی طرح بھی حوصلہ افزا نہیں ہیں ۔

بیے عقیدہ تعلیم کے نتائج

اگر ہم آزاد اور بے عقیدہ تعلیم کے نتائج کا جائزہ لیں تو مندرجہ ذیل چیزیں سامنے آتی ہیں ۔

(۱) ”بے عقیدہ“ تعلیم طلبہ میں اجتماعی تصورات پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے ۔ اور جب کوئی قوم ان اجتماعی تصورات کے شعور سے بھرے ہو جائے جو اسے عمل اور قریاق پر ابھارتے ہیں تو تاریخ پر اس کی گرفت ڈھیل بڑ جاتی ہے ۔ ایسی اقوام جو کسی اجتماعی نظریے کے زندہ شعور سے عاری ہو جائیں اور جنہوں نے کسی اعلیٰ اور برتر نصب العین کے لیے جینا اور مرتا نہ سیکھا ہو وہ تاریخ عالم میں کوئی بڑا کارنامہ تو کیا انجام دیں گی ، ابھی وجود تک کو برقرار نہیں رکھے سکیں ۔ تاریخ میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں

اسلام کا نظریہ تعلیم

۸۲۵

ہے کہ جب کسی قوم نے اپنی منزل کا شعور کھو دیا تو وہ نقشہ کی طرح
منادی گئی۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے :

سرگ فرد از خشک رود حیات
سرگ قوم از ترک مقصود حیات

(ب) بے عقیدہ تعلیم نئی نسل کے قلب و روح میں اخلاق اقدار کر آجاگر کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ اس کا تعلق صرف دماغ کے مطالبات ہے ہوتا ہے۔ روح کے مطالبات سے یہ بیکانہوار ہی گزر جاتی ہے۔ دونوں کی نشوونما دو منضاد محتوں میں ہوتی ہے جس کا نتیجہ ایک زبردست قومی نقصان کی صورت میں نکلتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علم اس وقت حقیقی دوست اور رہنمای کام کر سکتا ہے جبکہ اس کا محور دل ہو ورنہ صرف تن پرستی کے چکر میں ہے انسان کے لیے سانپ جیسا خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔

علم را بر تن زف مارے بود
علم را بر دل زف پارے بود

(ج) تعلیم کے بارے میں اسی رجحان کا نتیجہ لا مرکزیت اور علم کی شعبہ جاتی جزو پرستی کی صورت میں نکلا ہے۔ بے عقیدہ تعلیم عام کو ایک ہی محور پر مرکز یا منظم کرنے میں ناکام رہی ہے۔ طلبہ اپنی زندگی اور ارد گرد کی دنیا کو چھوٹی چھوٹی غیر مربوط جزئیات کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ وہ علم کی وحدت اور زندگی کی یک رنگ اور مرکزیت کے احسان سے محروم ہی رہ جاتے ہیں۔

(د) اور آخری بات یہ ہے کہ بے عقیدہ تعلیم ایسے افراد پیدا کرتے ہے جو زلگ کے بنیادی، حقیقی، واقعی اور زندہ مسائل پر کوئی عبور نہیں رکھتے۔ عملی زندگی کے بارے میں ان کا علم اس قدر سطحی سا رہ جاتا ہے کہ اس کی کوئی نہows افادیت باق نہیں رہتی۔ قومی نقطہ نظر سے بھی یہ تعلیم مفہد نتائج حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ ڈاکٹر فرینک ایڈبیلوٹ نے امریکی تعلیم کے بارے میں کہا ہے :

”مقاصد کے بجائے تکنیک اور ذرائع سے وابستگی ادب، فلسفہ، تاریخ اور مذہب کے طالعے کو حقیقی آزادی سے محروم کر رہی ہے۔“

مشہور اہل قلم والٹر لپین نے "اس منظر دنیا میں تعلیم کی کیفیت" کے موضوع پر ایک تقریر میں کہا تھا :

"اسکول اور کالج دنیا میں ایسے افراد بھی جتنے رہے ہیں جو اُس سماں کے تخلیقی اصولوں کو نہیں سمجھہ ہاتے جس میں انہیں رہنا ہے۔ اپنی ثقافتی روایت سے محروم نئے تعلیم یافتہ مغرب افراد انہے ذہن و جذبات میں مغربی تہذیب کے تصورات، اصول اور بنیادوں کا اور اس کی منطق و استدلال کا کوئی احساس و شعور نہیں رکھتے۔ اگر یہی نتیجہ رہی تو موجودہ تعلیم آخر کار مغربی تہذیب کو تباہ کر دے گی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ تباہ کر رہی ہے۔"

امریکی تعلیم پر داک فیلر کی روپورٹ ہی اسی خامی کی نشان دہی کرتی ہے:

"طلبه اپنی زندگی کا کوئی مقصد و مفہوم چاہتے ہیں۔ اگر ان کا زمانہ، ان کی ثقافت اور جب ان کے رہنماء انہیں کوئی عظیم مفہوم، مقاصد و تصورات نہ دیں تو ہم وہ انہے لیے ہیں خیر اور فروما یہ مقاصد متعین کر لیتے ہیں۔"

سر والٹر سوبولے نے اپنی کتاب "بونیورسٹی میں بعران" میں، جو برطانیہ کے تعلیمی حالات کے مطالعے پر مشتمل ہے، لکھا ہے:

"ہم جس الجہن میں گرفتار ہیں وہ یہ ہے کہ ہماری بونیورسٹی میں زیادہ تر طلبہ تعلیم سے فارغ ہو جاتے ہیں مگر اس کا کوئی موقعہ نہیں آتا ہے کہ وہ حقیقی اہمیت کے عظیم مسائل پر اپنا ذہن استعمال کریں۔ تعلیمی غیر جانبداری کے زیر اثر وہ موجودہ سیاست اور ساجی ماحول کے آگے سہر ڈال دینے اور سوچ بھار کی رحمت نہ اٹھانے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ لا دینیت کو بھی تسلیم کر لیتے ہیں اور یہ اس لیے کہ تعلیم کے مختلف اجزاء میں منقسم ہونے کی موجودہ صورت حال کی وجہ سے انہیں

اسلام کا نظریہ تعلیم

۳۲۴

ذمہ دارانہ حیثیت میں مقصد زندگی کو مستین کرنے کا چیلنج ہی
نہیں ملتا۔ ساری تعلیم کے بعد بھی وہ بنیادی طور پر غیر تعلیم باقاعدہ
ہی رہتے ہیں۔ ”

تعلیم کے ہس منظر کے مکمل جائزے کے بعد ہروفیسر ہیرلڈ ایج - لیٹن
لکھتے ہیں :

”تعلیم نے اپنے آپ کو ساضی کے روحانی درست سے الگ کر لیا ہے
مگر ان کا کوفی مناسب متبادل دینے میں ناکام رہی ہے۔ نتیجتاً
بڑھے لکھے افراد بھی ایقان و ایمان سے، زندگی کی اقدار کے صحیح
احساس سے، اور دنیا کے بارے میں کسی ناقابل شکست ہمہ گیر
نقطہ نظر سے عاری ہیں۔“

ان نئے خیالات سے ہتھ چلتا ہے کہ مغرب میں بھی بے عقیدہ اور غیر جانبدارانہ
تعلیم کا نظریہ دم توڑ رہا ہے اور مغرب کے اکثر ماہرین تعلیم اور علمائے عمرانیات
بے محسوس کرنے لگے ہیں کہ تہذیب و تمدن کی ترقی اور ثقافت کے تحفظ کی راہ
میں بھے نظریہ کس قدر نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔

(۲)

تعلیم کے اسلامی اصول

(۱) نصور علم - اسلام نے جو تصور علم دیا ہے اس میں سب سے
بنیادی چیز یہ ہے کہ علم کا سر چشمہ ذات باری تعالیٰ ہے۔ علم اشیا اسی کا
دیا ہوا ہے اور انسان کی ہدایت کا علم بھی اسی کی طرف ہے۔ حواس اور عقل
و تجربہ بڑے اہم ذرائع علم ہیں لیکن وہی سب سے اعلیٰ ذریعہ علم ہے۔ نیز یہ
کہ علم کا تعلق محض لوازمات حیات ہی سے نہیں، مقاصد حیات سے بھی ہے اور
اول الذکر کو ثانی الذکر کے تابع ہونا چاہیے۔ بھی وہ تصور ہے جس سے ہمارے
نظام تعلیم کا ہورا مزاج بتتا ہے۔

Moberly, Sir Walter, *The Crisis in the University*, London, 1949, p. 70 ۱
Titus, Harold H, *Living Issues in Philosophy*, New York, 1953,
pp. 420-421. ۲

اسلام نے علم کا جو تصور دیا ہے اس میں علم اور تربیت دونوں کو بکسان اہمیت دی گئی ہے اور ابک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ نفس دونوں کو ساتھ ساتھ انجام دینا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے مخصوص نظام تعلیم میں تعلیم اور سیرت سازی ایک ہی حقیقت کے دو پہلو رہے ہیں اور اس کا اظہار علم و فضل کی اصطلاح ہے۔ یہی ہوتا ہے جو علم اور نیکی اور اخلاق حسنہ میں بڑھے ہونے والے مفہوم کو ادا کرنے ہے۔

(۳) مقصد تعلیم - تعلیم بجائے خود منزل نہیں، منزل کے حصول کے لئے ایک ذریعہ ہے۔ حقیقی منزل ان لوگوں کا نظریہ حیات اور تمدن و ثقافت میں جن کی خدمت اسے کرفی ہے۔ اے۔ این۔ وایٹ ہیڈ نے بد کہہ کر اس نکتے پر بہت زور دیا ہے کہ "تعلیم کی روح یہ ہے کہ وہ مذہبی ہو۔" اقبال کا خیال یہی یہی تھا کہ اسلام ہماری زندگی اور تعلیم کا مقصد ہونا چاہیے۔ انہوں نے خواجہ غلام السید بن کو ابک خط میں لکھا تھا:

"علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دار و مدار حواس ہو۔
عام طور پر میں نے علم کا لفظ انہی سعنوں میں استعمال کیا ہے۔
اس علم سے وہ طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت
رہنا چاہیے۔ اگر یہ دین کے تحت نہ رہے تو بعض شیطنت ہے۔
سلطان کے لئے لازم ہے کہ علم کو مسلمان کرے۔"

بولہب را حیدر کرار کن

اگر یہ بولہب حیدر کرار بن جائے یا یون کہیے کہ اس کی
قوت دین کے تابع ہو جائے تو نوع انسان کے لئے سوا یہ رحمت ہے۔"

اس تعلیم کا اولین مقصد یہ ہونا چاہیے کہ طلبہ میں ان کے مذہب اور نظریہ حیات کی تفہیم و آگہی پیدا کرے۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ زندگی کا مفہوم اور مقصد، دنیا میں انسان کی حیثیت، توحید، رسالت، آخرت اور انفرادی اور اجتماعی زندگی ہر ان کے اثرات، اخلاقیات کے اسلامی اصول، اسلامی ثقافت کی نوعیت اور ایک مسلمان کے فرائض اور اس کا مشن انہیں سمجھایا جائے۔

الہیں بتایا جانا چاہئے کہ وہ کس طرح اعلیٰ مقاصد کے لیے دنیا کی تمام قوتون کو استعمال کریں - تعلیم کو ایسے افراد پیدا کرنے چاہئیں جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بارے میں اسلامی نظریات ہر بھروسہ یقین کے حامل ہوں - اور اسے ان کے اندر ایک ایسا اسلامی نقطہ نظر پیدا کرنا چاہئے کہ زندگی کے ہر میدان میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اپنا راستہ خود بن سکیں ۔

قرآن حکیم کا فرمان ہے کہ اهل علم حق اور مسجائی کے گواہ ہیں ۔ وہ تعلیم چس کا مقصد اہل علم پیدا کرنا ہو اسے اولین طور ہر اسلام کا علم پیش نظر رکھنا چاہئے ۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے :

شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَالنَّبِيُّكُمْ وَأُولُو الْأَلْوَامِ

خدا خود شاہد ہے کہ اس کے سوا کوئی سبود نہیں اور فرشتے اور صاحبان علم بھی (اس حقیقت کے) شاہد ہیں ۔ (آل عمران - ۱۸) ۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :

”لوگوں میں سے درجہ نبوت کے قریب تر اہل علم اور اہل جہاد ہیں ۔ اہل علم اس وجہ سے کہ انہوں نے لوگوں کو وہ باتیں بتائیں جو رسول لانے تھے اور اہل جہاد اس وجہ سے کہ انہوں نے ہمیں کی لائی ہوئی شریعت ہر اپنی تلواروں سے جہاد کیا ۔“

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا مشن ہے جس کے لیے انبیاء معبوث کیجئے گئے ہیں ۔ ایک ایسا مشن جو صاحبان علم کو مقام نبوت سے قریب کرتا ہے قرآن حکیم کے مطابق اسلام کے ہیفام کی اشاعت و تبلیغ اور ایک عدلانہ اور صحت مند اجتماعی نظام کا قیام تھے ۔ قرآن کہتا ہے :

مُوَالِينَ بَعْدَ فِي الْأَذْيَنَ رَسُولًا وَنَاهِمْ يَعْلَمُ عَلَيْهِمُ الْأَيْمَنَ وَيَنْهَا وَمَنْ يَعْلَمُ مِنْ الْكِتَبِ وَالنَّكِتَبِ وَلَنْ يَأْتُوا مِنْ قَبْلِ لَهُنَّ ضَالِّي مُهْتَدِينَ

وہ (خدا) وہی تو ہے جس نے آمیزوں میں ان ہی میں ہے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو) پیغمبر بناؤ کر بھیجا جوان کے سامنے اس کی آپسی پڑھتے اور ان کو پاک کرنے اور (خدا کی) کتاب اور دافائلی سکھانے ہیں ۔ اور اس سے پہلے تو ہے لوگ صریح گرامی میں مبتلا تھے ۔ (جمعہ - ۲)

لَقَدْ أَنْذَلْنَا إِلَيْكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مِعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُوْمَ الظَّالِمُونَ بِالْفَسْدِ

ہم نے اپنے پیدا بروں کو کھلہ ہوئی نشانیاں دے کر بھیجا اور ہم نے
ان کے ساتھ کتاب اور میزان (عدل) نازل کی تاکہ لوگ اعتدال
پر قائم رہیں - (الحدید - ۲۵)

ہم اسلامی تہذیب و ثقافت کے ہم منظر میں تعلیم گا بنیادی مقصود از
پیغمبرانہ فرانص کی بجا آوری اور انسانوں کو اس مشن اور مقصد کی تعلیم دینا،
ان میں اس مذہب کی سچی روح پیدا کرنا اور انہیں ایک مکمل اور صحت مدد
زندگی کے لیے تیار کرنا ہے۔

یہ مقصد تعلیم کے ہر گوشہ میں اسلامی نظریہ حیات کی روح جاری و ساری
کرنے سے حاصل ہوگا۔ نئی کتابوں کی ترتیب و تدوین بھی اسی نقطہ نظر
سے کی جائی ہوگی۔ اس کے لیے تمام تعلیمی سرگردیوں کی تشکیل نو اور ایک
ایسے ماحول کی تخلیق بھی کرنا ہوگی جو ان مقاصد کے حصول میں مدد و معاف
ثابت ہو۔

(ج) انفرادیت اور اجتماعیت میں توازن - تعلیم کا ایک بنیادی مسئلہ

یہ ہے کہ طالب علم کی انفرادیت کے ارتقا کو کیا اہمیت دی جائے۔ اس پر
ہمارے سامنے متعدد نظریات ہیں۔ بعض کے نزدیک فرد کا ارتقا بنیادی قدر ہے۔
وہ اجتماعی با مشترک ذمہ داری کے تصور کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اسی کے
بر عکس ایسے نظریات بھی ہیں جن میں معاشرے کے معیارات سے مطابقت کو بنیادی
اہمیت دی گئی ہے اور فرد کی اپنی شخصیت کے نشوونما ہر کوئی زور نہیں
دیا گیا۔ یہ دونوں حدیں غلط اور شیر حقیقت پسندانہ ہیں۔ اسلام کی ایک سند
خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ انفرادیت اور اجتماعیت میں ایک توازن پیدا کرتا ہے!
اسلام فرد کی اپنی ذاتی شخصیت میں یقین رکھتا ہے اور ذاتی طور پر ہی ہر ایک
کو خدا کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ ٹھیکراتا ہے۔ اسلام فرد کے بنیادی حقوق
کی ضمانت دیتا ہے اور کسی کو ان میں مداخلت کی اجازت نہیں دینا۔ اس کے
تعلیمی پالیسی میں فرد کی شخصیت کا مناسب ارتقا اہم ترین مقاصد میں سے ایک ہے
یہ اس خیال کا حامی نہیں کہ فرد کو اجتماع یا ریاست میں اپنی انفرادیت کھو دینا

بامہ - قرآن کریم کے مطابق

وَكُنْ لِّلْأَنْشَاءِ الْأَمَانَةُ

اور یہ کہ انسان کو وہ ملتا ہے جس کی رو
کوشش کرتا ہے۔ (النجم - ۲۹)

لَئِنَّ اللَّهَ لَا يَعْلَمُ مَا يَفْعُمُ حَتَّىٰ يُنْظِرَ مَا يَأْنِي بِهِ

بیشک افہ کسی قوم کی (اچھی) حالت بدل نہیں دیتا جب
نک وہ لوگ خود اپنے میں تبدیل نہیں کر اپنے۔
(الرعد - ۱۱)

لَا يُكْلِفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مُسْعَاهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا أَنْتَسَبَ

افہ کسی منفس پر اس کی مقدرت سے بڑا کر ذمہ داری کا
بوجہ نہیں ڈالنا۔ ہر شخص نے جو نیک کیمائی ہے اس کا
پہل اس کے لیے ہے اور جو بدی سیئی ہے اس کا وبال
اسی پر ہے۔ (البقرہ - ۲۸۶)

وَلَا أَغْنِ النَّاسَ لَهُمْ أَغْنَالُهُ

اور ہم کو ہمارے اعمال (کا بدلہ ملی گا) اور تم کو
تمہارے اعمال (کا)۔ (البقرہ - ۱۳۹)

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ابک طالب علم کی انفرادی شخصیت کو
نشووارتقا دینا چاہتا ہے اور اس کی تمام خواہید صلاحیتوں کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔
اور دوسری طرف اسے سماں کے کام کا ابک ذمہ دار فرد بنانا چاہتا ہے تاکہ وہ اجتماعی
زندگی کے وظائف کو بہ حسن و خوبی انجام دے سکے۔

(د) علم کی وحدت اور ہم آہنگ - تعلیم کا ایک اور اصول یہ

ہے کہ طالب علم کو متوازن اور ہم آہنگ تعلیم حاصل ہو۔ اس میں اتنی
قابلیت پیدا ہو جائی چاہیے کہ وہ دنیا کی رنگ رنگ بولگمنیوں کے درمیان
زندگی اور کائنات کی وحدت کو دیکھ سکے۔ اسلام راہ وسط کا داعی ہے اور
اس کا نصب العین متوازن شخصیت کی تعمیر و ارتقا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کے فرمان کے مطابق فکر اور عمل کا توازن نبوت کی خصوصیات میں سے ایک ہے۔
اس لیے تعلیم میں یہ بات لازماً ہیش نظر رہنا چاہیے کہ اختصار کے سر جملے
میں داخل ہونے سے بہلے طالب علم کو علم کے وسیع ہس منظر سے واقفیت حاصل

ہو جائے اور زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں وہ ایک متوازن رویہ منعین کر لے۔

اسلام کی نظر میں علم ایک ہم آہنگ اور باہم مربوط کٹل ہے۔ وہ اس حقیقت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن تمام علوم کا سرچشمہ ہے۔ وہ وہ کتاب ہے جو علم کے ہر مبتلاشی کا ذہن تشكیل کرے گی اور اس کا سوچنے کا انداز منعین کرے گی خواہ ان کے حصول علم کا میدان کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ یہ چیز قدرتاً ہم آہنگ علم کے تصور کی طرف لے جاتی ہے۔ اس بنیادی نقطے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان نفس علم کو چھوٹے غیر مربوط جزئیات میں تقسیم نہیں کریں گے، بلکہ کثرت میں وحدت کا رنگ رونما ہو جائے گا۔ اس سے جزو بہستی اور حد سے بڑی ہوئی شعبہ جاتیت کی خامیاں بھی دور ہو جائیں گی۔ اغلباً یہ تصور تعلیم کے اعلیٰ مرحلے پر ہی اختصاصی تعلیم شروع کرنے کے نقطہ نظر سے زیادہ قریب ہے۔ ابتدائی مرحلوں میں تعلیم کو غیر اختصاصی رہنا چاہیے۔ یہ طریقہ نوجوانوں میں وسعت نظر اور علمی دیانت و رواداری کی خوبیاں پیدا کرنے میں بہت اہم حصہ ادا کرے گا۔

(۵) تعمیر کردار - تعلیم میں سب سے زیادہ اہمیت طالب علم کے کردار

کی تشكیل کو حاصل ہونا چاہیے۔ تعلیم جب تک اچھے کردار تعمیر نہ کرے گی، اپنا حقیقی مقصد کبھی حاصل نہ کر پائے گی۔ اسلام میں نیک اعمال اولین اہمیت کے حامل ہیں۔ قرآن پاک میں ایمان اور عمل صالح کی بہ یک وقت تلقین کی گئی ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بنیادی مشن میں تذکریہ، یعنی انسانی زندگی اور روح کی تطہیر، شامل ہے، اور اسے اولیت حاصل ہے۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ کردار کے بنیادی رجحانات کی اساس زندگی کے ابتدائی دور ہی میں ہڑ جاتی ہے اور اسکوں اور کالج ایک انسان کے کردار کی تعمیر میں اہم حصہ ادا کر سکتے ہیں۔ یہ کام تعلیم کا ہے کہ وہ انسانی کردار کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دے۔ امام غزالی لکھتے ہیں:

”تعلیم کا مقصد یہی نہیں ہونا چاہیے کہ نوجوان ذہن کے علم کی پیاس بجھا دے بلکہ اس کے ساتھ ہی اسے اخلاق کردار اور اجتماعی زندگی کے اوصاف نکھارنے کا احساس بھی پیدا کرنا چاہیے۔“

اسلام کا لطیریہ تعلیم

۳۳۳

ہمارے سامنے انسانی زندگی کا مثالی نمونہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ی ذات مبارک ہے جیسا کہ قرآن کریم میں بھی ہے :

لَقَدْ كَانَ لَكُفَّارٍ فِي رَسُولِ اللَّهِ أَكْثَرُهُمْ حَسَدٌ

رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود ہے
تمہارے لیے - (الاحزاب - ۲۱)

تعلیم کے تمام مراحل پر طلبہ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کی مثالی زندگیاں پڑھائی جانی چاہئیں - استاد کو خود اپنی زندگی اور اپنے کردار اور عمل سے طالب علم میں ایک نیک زندگی اختیار کرنے کا جذبہ پیدا کرنا چاہیے اور درس گاہوں کا ساحول بھی ایسا ہونا چاہیے کہ اس سلسلے میں مدد و معاون ہو سکے ۔

(و) تکمیل حیات - اسلام زندگی اور اس کی مسروتوں کو ترک کرنے کا نام نہیں بلکہ وہ ان کی تکمیل کا داعی ہے - اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہماری تعلیم کو ہمارے نوجوانوں کی زندگی اور اس کے مطالبات کی تکمیل کے لیے تیار کرنا چاہیے - انہیں زندگی گزارنے کے طریقوں کی تربیت دینی چاہیے اور معاشرے کی گونا گون ضروریات کو ہورا کرنے کے لائق بنانا چاہیے ۔

اسلام رہبانیت کا مخالف ہے اور چاہتا ہے کہ انسان زندگی کی کشاکفن کے درمیان حق و انصاف، کے ساتھ اپنی زندگی گزار دے - قرآن ہمیں دنیا اور آخرت دونوں کے بہترین حصول کی تعلیم دیتا ہے । - قرآن کریم میں ان لوگوں کو سختی سے خبردار کیا گیا ہے جو اس کی عنایات سے لطف اندوز ہونے سے انکار کرتے ہیں :

" ان سے کہو کہ کس کے حکم سے تم نے ان لعنتوں سے منہ بھیرا ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے تعلقیں کی ہیں - کہانے بینے کی اور استعمال کی ان چیزوں سے جو اس نے ان کے لیے بنائیں ۔ "

اسلام کا رویہ اس قرآنی آیت سے بالکل ظاہر ہے :

لَمْ يَأْتُوا بِهِمْ رِزْقًا وَلَا أَنْتُ بِهِمْ بَشِّرًا

کہاں پیو مگر اسراف نہ کرو -
(الاعراف - ۲۱)

اسلام کی نظر میں انسان محنت اور مشقت نہایت ہی قابل قدر ہے۔ اسلام ہر فرد کو اپنی روزی خود کے قابل بناتا ہے۔ ہب تعلیم کو دہانت دارانہ، منصفانہ اور معقول معاش کے حصول میں مدد و معاون ہونا چاہیے۔ علاوہ ازیں تعلیم کو معاشرے کی اقتصادی، سماجی، سائنسی اور فنی ضروریات ہو ری کرف چاہئیں۔ ان ضروریات کو نہ صرف ہے کہ نظر انداز نہیں کرنا چاہیے بلکہ تعلیم کو ان کی تکمیل کے لیے بہت طور پر کام کرنا چاہیے۔ پھر تعلیم میں اتنا عملی عنصر ضرور ہونا چاہیے کہ ہر فرد معاشی استحکام حاصل کر سکے۔

ان مقاصد سے ہم آہنگ نظام تعلیم اسلامی اورشون کا ترجمان ہو گا اور
ہنی آدم کے لیے رحمت ثابت ہو گا۔

(۵)

تعلیم کی تاریخی روایت

ہم نے مندرجہ بالا صفحات میں علم اور تعلیم کے بارے میں اسلام کے بنیادی نقطہ نظر کی وضاحت کی ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں مسلمانوں کا ہررا نظام تعلیم اپنی بنیادی ادارے کے حصول کی جدوجہد سے عبارت ہے۔ طریقے مختلف رہے ہیں۔ اصول تنظیم میں بھی تنوع نظر آتا ہے۔ اداروں کی ہیئت بھی بدلتی رہی ہے۔ لیکن بنیادی مقاصد اور مزاج ایک ہی رہا ہے۔

دور نبوی میں تعلیمی روایت

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مت اسلامیہ کے سب سے پہلے معلم تھے۔ اب ہی نے پہلی منظم تعلیم کا مدینہ منورہ میں قائم فرمائی۔ صفحہ نامی چبوڑہ پہلا مدرسہ تھا اور اصحاب... کو متعلم تھے۔ اس مدرسے میں ۸۰ اور ۸۰ بھی بہان معلم کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے تھے۔ اصحاب صفحہ میں سے ایک یعنی حضرت معاذ بن جبل مالی امور کے نگران تھے اور عطیات کی تقسیم کا کام ان ہی کے سہرہ تھا۔ ان متعلمین میں سے مختلف افراد اسلامی حکومت کی مختلف خدمات کے لیے مأمور کر دیے جاتے تھے۔ اور تعلیم و تبلیغ کے لیے تو خصوصیت ہے انہیں اصحاب کو بھیجا جاتا تھا۔ انہی مالی ضرورتوں کو ہررا کرنے کے لیے بے طلبہ خود بھی محنت کرتے اور کہانے۔ دوسرے اہل نبوت

صلی اللہ علیہ وسلم ہی براہ راست ان کی مدد فرماتے اور خود حضور اکرم میں تعلیم کی نسبج قائم کی اور جو روایت اس میں پڑی وہ ہی ہماری تعلیمی روایت بن گئی اور وہ روایت یہ تھی :

(۱) اولین چیز دینی تعلیم ہے - قرآن اور سنت نبوي صلی اللہ علیہ وسلم کو نصیاب تعلیم کا مرکز و محور ہونا چاہئے -

(ب) تعلیم کا مقصد (۱) اچھا مسلمان اور داعی الی الحق بنانا (۲) اول مسلم معاشرے کی ہمه ضروریات کو پورا کرنا ہے -

(ج) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم اور مسجد کا تعلق قائم کیا۔ مسجد دینی محور، سیاسی مرکز اور تعلیم گاہ ہی اور اس کے ذریعے سے طالب علم ایک مخصوص ثقافتی ورثے کے امین بنئے -

(د) متعلین کے لیے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے خود مخت مزدوری کرنا، اور مختلف حرفتوں کو سیکھنا اور ان سے وابستہ ہونا اچھا اور پسندیدہ قرار پایا -

(۵) تعلیم کی آخری ذمہ داری مسلمان معاشرے اور اسلامی ریاست ہر عائد ہوئی ہے اور اسے اس مقصد کے لیے اپنے وسائل استعمال کرنے چاہئیں - مسلمانوں کی قومی آمدی اور بیت العال پر اولین حق زیر تعلیم طلبہ اور ان ہر ہونے والے جملہ مصارف کا ہے -

ادوار مابعد

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ بنیادیہ نسبج پڑی اور ان ہی خطوط پر بعد میں ارتقا ہوا۔ مساجد تعلیم کا مرکز بن گئی۔ ہر جگہ حلقات ہائے درس قرآن و حدیث قائم ہوئے۔ ایک ایک مسجد میں کئی کئی حلقاتے بنے اور ایک ایک حلقاتے میں ہزاروں طلبہ شریک ہونے لگے۔ جو اسٹانڈہ متمول تھے وہ اپنی کفالت آپ کرتے ایکن جو ضرورت... تھے ان کی کفالت بیت العال کرتا۔ خلفائے واشدن نے باقاعدہ تنخواہیں اور وظیفیے مقرر فرمائے اور ہر مسجد ایک مکتب اور ہر میدان ایک تعلیم گاہ بن گیا۔ ہبھل چار صدیوں میں تعلیم کا بھی نظام رائج تھا۔ اصطلاحی مدارس نہ ہونے کے باوجود یہ نظام اتنا مستحکم اور یہ کبھر تھا کہ گھر گھر تعلیم ہبھل رہی تھی اور ایک قسم کی ہمه زم اور

همہ گیر تعلیم موجود تھی۔ اسماء الرجال کی کتابوں میں اس دور کے ۵ لاکھ علم کے منفصل حالات ملتے ہیں۔ اس زمانے کے تعلیمی اداروں میں مرکزی حیثیت ساجد ہی کو حاصل تھی۔ اور ساجد کے فن تعمیر ہر ان کے اس تعلیمی رول کا خاصاً اثر پڑا ہے۔ تینوں سنتوں میں دالالوں کا ہونا اور بڑی تعداد میں حجروں کی موجودگی اس کا ثبوت ہیں۔ اس دور کی اہم تعلیم گاہوں میں سے جو قابل ذکر ہیں اور جو آج بھی موجود ہیں وہ تیولس کی جامع زیتون اور مصر کی جامعہ ازہر ہیں۔ ساجد کے علاوہ خانقاہیں، علماء کے مکانات اور کھلے میدان بھی تعلیم کا کی حیثیت رکھتے تھے اور ہر علاقے میں لاکھوں طلبہ کو صفت تعلیم دی جاتی تھی۔

یہ مسلمانوں کے تعلیمی نظام کا پہلا دور ہے۔ دوسرے دور کا آغاز پانچویں صدی کے اوائل سے ہوتا ہے۔ اس میں ساجد کے علاوہ باقاعدہ مدارس بھی قائم ہوئے اور بڑے وسیع پیمانے پر ہوئے۔ غالباً سب سے پہلا مدرسہ جس کی اپنی عمارت، سرکاری گرانٹ اور وقف املاک برائے عام اخراجات اور سُرتُبہ نصاب تعلیم وغیرہ تھے، سلطان محمود غزنوی نے اپنے پایہ تخت غزنی میں سنہ ۵۲۰ (بے مطابق سنہ ۱۰۱۹ء) میں قائم کیا۔ بے قول ابوالقاسم فرشته "مسجد سے ملحق ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا اور اس کے کتب خانے کو نادر الوجود کتب سے آراستہ کیا اور مسجد و مدرسے کے اخراجات کے لیے بہت سے دیبات وقف کیے ہیں" ۱۔ محمود غزنوی نے اپنی ہوئی سلطنت میں بے شمار مدرسے قائم کیے اور اس کے زیر اثر دوسرے امراء اور ارکان دولت نے بھی بے خدمت انجام دی۔ تاریخ نے محمود غزنوی کو اس کے عسکری حملوں کی وجہ سے تو باد رکھا ہے لیکن علم کی دنیا میں جو انقلاب آفرین اقدام اس نے کیے اس کا قرار واقعی اعتراف نہیں کیا گیا۔ اسے تاریخ کی ستم طریقی نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے۔

دوسرा اہم مدرسہ جس نے تاریخ میں اپنا نام پیدا کیا دولت سلجوقیہ کے مشہور وزیر اعظم نظام الملک، طوسی (المتوفی ۵۸۸ھ) کا قائم کردہ مدرسہ نظامیہ بغداد ہے جسے امام العربین رحمہ اللہ علیہ اور امام غزالی رحمہ اللہ علیہ جسے صابر مدرسین حاصل ہوئے اور جس نے تاریخ پر اپنے انسٹ نوش چھوڑے۔ اس کے بعد مدارس کی ایک رو چل پڑی اور ساری اسلامی قلمروں میں ان کا

۱ تاریخ فرشته، جلد ۱، حالات سلطان محمود غزنوی۔

بھل بچھے گیا - ان میں ایسے عظیم الشان مدارس بھی تھے جن کے تحت
تمدد مدارس کام کرتے تھے - اور ان کی حیثیت اُج کی اصطلاح میں یونیورسٹی^۱
ی می تھی - ان تمام مدارس میں وہی اصول کارفراہ تھے جن کا ذکر ہم اپر
کر چکے ہیں - سفت عوامی تعلیم کا یہ ابک ایسا نظام تھا جس کی نظریہ کسی
دوسرے تمدن میں نہیں ملتی -

بر عظیم میں تعلیمی روایت کا ارتقا

بر عظیم ہاک و ہند میں اسلام کی دعوت دور رسالت اور عہد خلافت راشدہ
بیہنچ چکی تھی - پھر بنو امیہ کے دور میں محمد بن قاسم کے ہاتھوں ایک بڑا
علاقہ فتح ہوا اور اسلامی ریاست قائم ہوئی - اس زمانے میں علوم کو بڑا
فروغ حاصل ہوا - اس دور کے انٹھ اثرات یہاں کی تاریخ اور تمدن ہو ہوئے - لیکن
ہد قسمتی سے دولت اسلامیہ کا یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا - پھر محمود غزنوی کے
ملوؤں نے خیر سے سومنات تک ایک بار پھر اسلام کا غفلہ بلند کر دیا - لیکن
مسلمانوں کی حکومت کا باقاعدہ آغاز معز الدین محمد بن سام کے ہاتھوں ہوا - نطب الدین
سے بہادر شاہ ظفر تک تقریباً سارے سات سو سال مسلمان یہاں حکم ران رہے -
اور اس زمانے میں مسلمانوں نے انہے نظام تعلیم کو نشوونما دینے کی ہوئی کوشش کی -
اس دور کے تعلیمی نظام اور علمی سرگرمیوں کے مطالعے سے جو اہم چیزوں سامنے
آئی ہیں ہم یہاں ان کا مختصر تذکرہ کریں گے -

(۱) تعلیم کا جو مزاج قرون اول میں تشكیل پایا تھا یہاں بھی اس کو
بڑی حد تک قائم رکھا گیا - تعلیم کا مرکز دین اسلام رہا اور تمام تعلیمی
سرگرمیاں اسی محور کے گرد گھومتی رہیں - تعلیم کو ایک عبادت تصویر کیا گیا ،
اور اہل علم کا طریقہ یہ تھا کہ وہ کسی باقاعدہ مدرسے سے وابستہ ہوں یا نہ ہوں ،
علم کی اشاعت کے ذریعے اس کی "زکواہ" برابر نکالتے رہے -

(۲) بر عظیم میں شروع ہی سے باقاعدہ مدارس کا نظام قائم ہوا ، لیکن ،
تعلیم کا ذریعہ صرف مدارس ہی نہ تھے - ابتدائی تعلیم گھروں پر ہوئی تھی -
لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام بھی گھروں پر ہی تھا - پھر قدیم اسلامی روایت کے
طابق مساجد تعلیم کا بہت بڑا مرکز رہیں - اہل علم کے مکانات بھی مستقل
تعلیمی مرکز کی حیثیت رکھتے تھے - کتب خانے مخفی لائبریری کی حوثت نہ

رکھنے تھے بلکہ اعلیٰ تعلیم کا ایک اہم مرکز تھے - بڑے پیمانے پر تعلیمی مجالس کا ذکر بھی تذکروں اور تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے ۔

(۲) ایک اور بڑی اہم چیز یہ ہے کہ گو دینی تعلیم ہوئے نظام کا مرکز و محور تھی ایک دوسری ضرورتوں سے کسی زمانے میں بھی اور کسی سطح پر بھی صرف نظر نہیں کیا گیا ۔ صنعتی تعلیم کا انتظام کرخانوں میں تھا، تجارتی تعلیم کے اپنے سہاجنی اسکول تھے جہاں تجارتی ہندسہ اور تجارت کے اصولوں کی اپنی تعلیم دی جاتی تھی ۔ فنون سپہ گری کی تعلیم کے لیے بے شمار ادارے اور اکیڈمیاں تھیں ۔ آلاتیات، خطاطی، طفری نوبی، فن کوزہ گری، فن تعمیر، غرض ہر ایک اہل فن کے گرد طالبان علم کا عجوم رہتا اور وہ اپنے انہی فن میں پہنچنے رورگار فن کار تیار کرتے ۔ ان کے لیے باقاعدہ مدارس اور اکیڈمیوں کا بھی پتہ چلتا ہے ۔ اس سے نظام تعلیم کی وسعت اور ہمہ گیری کا اندازہ کہا جا سکتا ہے ۔

تعلیم کے اس ہمہ گیر تصور اور انتظام کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ مدارس میں جو نظام تعلیم رائج تھا، اور جس پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے، اس میں اگر ایک طرف قرآن، فقہ، منطق، اور کلام کو اہمیت دی گئی تھی تو دوسری طرف تاریخ اور طبیعیات اور علم ہندسہ اور جغرافیہ کو ایک بنیادی مقام دیا گیا تھا ۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ اس نصاب کا معنی سلمان حکومت کی سول سروس تیار کرنا تھا، خصوصیت سے قضاء و عدالت کی ضروریات کی تکمیل ۔ مسلمان اپنے نظام تعلیم کے مسائل پر جس ذہن سے غور کرتے تھے اس میں جہاں یہ فکر تھی کہ ہر چیز دین کے رنگ میں رنگی ہو وہاں انہیں اس کا بھی خیال تھا کہ اپنے زمانے کے تقاضوں کو وہ پورا کر رہی ہو اور جس کام کے لیے جو علم و مهارت درکار ہے وہ فراہم کر رہی ہو ۔ اس کا اندازہ اور نگزیب عالم گیر کی اس گفتگو سے ہو سکتا ہے جس میں مخاطب مُلا صالح تھے جو شاہی خاندان کی تعلیم پر مامور تھے :

” کیا میرے معلم کا یہ فرض نہ تھا کہ وہ مجھے روئے زمین کی ہر قوم کے امتیازی خصائص سے روشناس کراتا ۔ مجھے علم ہونا چاہیے کہ ان اقوام کے وسائل اور ان کی طاقت کیا ہے، ان کے

آداب و اطوار، مذاہب و طرز حکومت، طریق چنگ وغیرہ کیا ہیں اور وہ کون سے امور ہیں جن میں یہ دلچسپی رکھتی ہیں - اور بھر یہ بھی ضروری ہے کہ باقاعدہ تعلیمی نصاب کے ذریعے بنایا جائے کہ ریاست کا آغاز کیسے ہوا ، قوموں کے عروج و زوال کے اسباب کیا ہیں ، اور وہ کون کون سے اسباب و عوامل اور حوادث ہیں جن کی بنا پر عظیم تبدیلیاں اور مہتم بالشان انقلابات رونما ہوتے رہے ہیں । ”^۱

(۲) اس دور میں جس پیمانے پر تعلیم پھیلی ہوئی تھی اُج اس کا اندازہ کرنا بھی ہمارے لیے مشکل ہے - ابھی مسلمانوں کو ہندوستان میں آئے ہوئے ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ اس ملک میں جس میں تعلیم صرف ہندتوں کا اجارہ تھی اور جہاں اگر شودر کے کان میں مذہبی کتب کے الفاظ پڑ جائے تو اس کی ہاداش میں ان کانوں میں پکھلا ہوا گرم سیسہ ڈالا جاتا تھا ، ہر طرف تعلیم و تعلم کا چوچا تھا اور پورا ملک علوم و فنون کا گھوارہ بن گیا تھا - سلطان محمد تغلق (۱۴۵۷ء تا ۱۵۰۵ء بمعطاب ۱۴۲۳ء تا ۱۴۵۱ء) کے زمانے کے ہارے میں مقریزی کی روایت ہے :

”سلطان محمد تغلق کے عہد میں دہلی کے اندر ایک ہزار اسلامی مدارس قائم تھے جن میں شوافع کا بھی ایک مدرسہ تھا - مدرسین کے لیے شاہی خزانے سے تنخواہیں مقرر تھیں - تعلیم اس قدر عام تھی کہ کنیزیں تک حافظ قرآن اور عالم ہوتیں - مدارس میں علوم دینیہ کے ساتھ معمولات اور ریاضی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی ۔^۲“

سبع الاعشر کا مصنف بھی اس کی شہادت دیتا ہے کہ ہندوستان کے ہابہ تخت دہلی میں اس وقت ایک ہزار مدارس جاری تھے^۳۔ بھر یہ مدارس معمولی قسم کے مدارس نہ تھے ، بلکہ ان میں ایسے مدارس بھی تھے جو

۱ بہ سوالہ ”برنیر کے سفر“ (Bernier's Travels) صفحہ ۱۵۶ ۔

۲ ”کتاب الخطاط مقریزی“ جلد ۳ صفحہ ۹۳۲ (هم اس مواد کے لیے مولانا مناظر احسن گلاني کی کتاب ”مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت“ اور مولانا ابوالحنفات صاحب کی کتاب ”ہندوستان میں قدیم اسلامی درس گاہیں“ کے مرہون منت ہیں) ۔

۳ ”سبع الامثلی“ از نقشبندی، جلد ۵، صفحہ ۶۹ ۔

اج کی بونیورسٹیوں سے ہی زیادہ عظیم الشان تھے۔ مدرسہ فیروز شاہی کے بارے میں مشہور مورخ ضیاء الدین برقی کا یہ قول قابل نقل ہے کہ

”دہلی کا یہ مدرسہ اپنی شان و شوکت، خوبی عمارت، محل وقوع،
حسن انتظام اور تعلیم کی عمدگی کے لحاظ سے اپنی نظریں
رکھتا۔ مصارف کے لیے شاہی وظائف مقرر ہیں۔ پایہ تخت دہلی
کی کوئی عمارت حسن تعمیر اور موقع و محل کے لحاظ سے مدرسہ
فیروز شاہی کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ مدرسے کی عمارت بہت
وسعی ہے اور ایک بہت بڑے باغ کے اندر تالاب کے کنارے واقع ہے۔
هر وقت سینکڑوں طلبہ اور علماء و فضلا بہاں موجود رہتے ہیں۔
طلبہ و اساتذہ کے مکانات بننے ہوئے ہیں۔ باغ کے کنجوں میں
سنگ مرمر کے فرش پر نہایت آزادی کے ساتھ مشاغل میں منہمک
نظر آتے ہیں ।۔“

بہنہ اللہ گیری کا مشہور مغربی کپتان الگزنڈر ہملٹن اپنے سفر نامہ سنده
میں صرف ایک شہر نہیں کے بارے میں لکھتا ہے کہ ومان مختلف علوم و فنون
کے چار سو مدرسے تھے۔ یہ کیفیت ایک شہر کی نہیں، ہر شہر کی نہیں، ایک
علاقے کی نہیں ہر علاقے کی نہیں، اور ایک دور کی نہیں مسلمانوں کے ہوئے
دور حکمرانی کی نہیں۔ مسلمانوں کے ہوئے دور حکومت میں خواندگی ہی نہیں
تعلیم کا معیار بھی بہت بلند تھا۔ اس کی سہولتیں شہر شہر، قصبه، قصبه دیہات
دیہات، محلہ محلہ، گھر گھر پہنچی ہوئی تھیں۔ اور اس سے بدرجہا بہتر حالت
تھی جسے اج کے ماہرین ہمہ رس تعلیم (Universal Education) کہتے ہیں۔

(۵) مسلمانوں کے نظام تعلیم کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ وہ
خالص عوامی تھا۔ حکومتیں تعلیم کے فروغ کے لیے کثیر روپیہ خرچ کرتی تھیں اور
ہر طرح کی سہولتیں فراہم کرتی تھیں ایکن کسی زمانے میں بھی تعلیم کا نظام حکومت
کے تابع نہ تھا۔ کوئی ایک حکمہ ایسا نہ تھا جو تعلیمی اداروں پر حکومت کی طرف
سے نگران رکھنا ہو۔ سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کے دور میں ”صدرالصلوو“
کے ایک عہدے کا نام ضرور ملتا ہے۔ اس کا کام تعلیمی اور اخلاقی امور کی
نگرانی تھا لیکن صرف اس حد تک کہ تعلیمی ضروریات ہوئی ہوں۔ مدرسون

کی آزاد فضا پر اس کا کوئی اثر نہ تھا اور نہ بے نصاب تعلیم کو اپنی گرفت میں رکھتا تھا۔ اس شعبے کا ابک کام بہی تھا کہ جو اچھے باصلاحیت نوجوان نظر آئیں ان کو فتاویٰ اور قضاً کی ذمہ داریوں کے لیے منتخب کرے۔ مسلمانوں نے پورے دور حکومت میں کبھی بھی نصاب تعلیم کو حکومت کے تابع نہیں کیا۔ ہر مدرسہ اپنا نظام چلانے کے لیے آزاد تھا، حتیٰ کہ وہ مدارس جو صرف سرکاری خزانے سے قایم ہوتے تھے وہاں بھی اساتذہ آزاد تھے۔ اگر کسی بڑے عالم نے نصاب میں کوئی تبدیلی کی تو اسے اس کی صحت اور علمی برتری کی بنا پر تو قبول عام حاصل ہوا لیکن ریاست کی قوت کے ذریعے اسے سلط نہیں کیا گیا۔ تعجب یہ ہے کہ اس کے بغیر بھی پورے نظام میں غیر معمولی ہم آہنگ اور مطابقت پائی جاتی ہے جو اس کا ثبوت ہے کہ ہماری ثقافتی قوتوں کی گرفت معاشرے ہر اتنی مضبوط نہیں کہ بالکل فطری انداز میں تعلیم میں پکانکت اور یک رنگ پیدا ہوئی۔ اس آزادی کے باوجود اس طرح کی فطری پکانکت کی مثال بھی دنیا کے کسی دوسرے تمدن میں نہیں ملتی۔

يونانیوں میں آزادی نہیں مگر انہوں نے تعلیم کو ایک ذہنی ورزش بنا دیا تھا۔ چین میں تعلیم ہر خاندان اور حکومت دونوں کی گرفت بہت مضبوط نہیں۔ هندو تہذیب میں عمومی تعلیم کا تصور نہ تھا۔ لیکن مسلمانوں نے ریاست کی طرف سے تعلیم کی حوصلہ افزائی اور غیر معمولی مالی اعانت کے باوجود ایک بالکل آزاد تعلیمی نظام قائم کیا، جوں میں تعلیم کا محور استاد تھا اور نظم و ضبط کو قائم رکھنے والی قوت اخلاق کی قوت تھی۔ یہ ایک عجیب و غریب تجربہ تھا جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ ہماری نگاہ میں اس کی وجہ اسلام کا مخصوص مزاج، اکرام انسانیت اور فرد کی آزادی کا اسلامی تصور، آخرت کی جواب دہی کا احساس اور اسلام کی قایم کردہ معاشری جمہوریت ہے جس سے دنیا کے دوسرے نظام نا آشنا نہیں۔

(۶) ایک طرف یہ آزادی نہیں اور دوسری طرف حکومت کی سرہستی کا عالم یہ تھا کہ وہ تعلیم کو اپنے تمام کاموں سے زیادہ اعم سمجھتی تھی۔ اس کا اندازہ اس ایک جملے سے کیجئے جو نظام الملک طوسی نے ملک شاہ سلجوقي کے جواب میں کہا تھا۔ ہوا یون کہ شاہ کو ابک موقعہ پر تعلیم پر غیر معمولی اخراجات سے کچھ نشویش ہوئی اس نے کہا کہ اس زر کثیر سے تو ابک لشکر جرار تیار ہو سکتا ہے۔ نظام الملک نے کہا کہ ”اے بادشاہ تیری

فوج کے تیر تو فقط جند قدم پر کام دے سکتے ہیں لیکن میں جو فوج تیار کر رہا ہوں اس کے تیر زمین کے سارے طول و عرض میں موثر ہیں اور اس کی دعاؤں اور حسنات کے تیر تو آسمان کی سیر سے بھی نہیں روک سکتے ۔ ” ارباب حکومت تعلیم کو ایک نجارت نہ سمجھتے تھے اور نہ خزانے پر اسے ایک بار تصور کرتے تھے بلکہ انہیں یقین تھا کہ یہ دنیا و آخرت دونوں کو بنانے کے لیے ایک موثر ترین ذریعہ ہے ۔

قطب الدین ایک سے بلجن تک جو حکم ران گزرے ہیں انہوں نے پڑے پہمانے پر مدارس قائم کیے اور مساجد تعمیر کرائیں ۔ فیروز تغلق کے بعد میں ۱۳۹ لا نہ تکہ (جو روپے کے برابر تھا^۱) وظائف وغیرہ کے لیے تھا لیکن اس کا تقریباً ۲۵ فیصد یعنی ۳۶ لا کھ تکہ صرف تعلیم کے فروغ کے لیے استعمال ہوتا تھا اس نے ۴۰ کالج اور ایک یونیورسٹی دہلی میں قائم کی جس کا سارا خرچہ سرکاری خزانے سے پورا کیا جاتا تھا^۲ ۔

ہمیں اور دکن کی حکومتیں بھی تعلیم ہر کثیر رقوم خرچ کر رہی تھیں ۔ مغل بادشاہوں میں عالم کی سرپرستی میں ایک سے ایک بڑھا ہوا تھا ۔ جہانگیر کا ذوق اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ بد قول مصنف تاریخ جان جہان ” اس نے ان مدارس کو از سر نو تعمیر کروایا جو تیس سال سے بند پڑے تھے اور ہرندوں اور جانوروں کی رہائش بن چکے تھے ۔ اور ان کو دوبارہ طلبہ اور اساتذہ سے بھر دیا ۔ ” جہانگیر نے تعلیم پر دل کھول کر خروج کیا اور بقول ایج - جی کین (H. G. Keane) ” اس نے لا تعداد اسکول اور کالج قائم کیے ۔ ” محمد شاہ بھی جسے تاریخ ” رنگلہ ” کے نام سے جانتی ہے تعلیم ہر بے دریغ خروج کرتا تھا اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا مشہور دارالعلوم اسی کی علمی فیاضیوں کا مر ہون منت تھا^۳ ۔

یہ تھا مسلمان حکومتوں کا حال ۔ اسی روشن ہر مسلمان امر، اعیان حکومت زمیندار، جاگیردار اور دوسرے اہل ثروت عمل کرتے تھے ۔ مولانا غلام علی آزاد بلکراںی صوبہ اودھ کا حال لکھتے ہوئے رقم طراز ہیں :

۱ واضح رہ کہ اس زمانے کے ننکے کی توت خرید موجودہ روپیہ کی قوت خرید سے تقریباً تیس گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ تھوڑا ۔

۲ مولانا غلام علی آزاد، p. 51، Promotion of Learning in India by Muhammadans,

Law, N. N. I.,

"پورے صوبہ اودہ اور صوبہ الہ آباد کے بڑے حصے میں بالج ہانچ کوس، زیادہ سے زیادہ دس دس کوں کے فاصیاں پر شرفا اور عالی خاندان لوگوں کی آبادی ہے جو سلاطین و حکام کی طرف سے تنخواہ و جا گیر مدد معاش کے طور پر رکھتے ہیں۔ انہوں نے مساجد، مدارس اور خانقاہیں تعمیر کر رکھتے ہیں۔ اور اساتذہ و مدرسین ہر جگہ علمی فیض رسانی میں مشغول ہیں اور انہوں نے طلب علم کا ایک جذبہ و ولولہ پیدا کر رکھا ہے۔ طلبہ گروہ در گروہ اور فوج در فوج ایک شہر سے دوسرے شہر جا رہے ہیں اور جہاں موقعہ دیکھتے ہیں تحصیل علم میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ ہر بستی کے اہل توفیق ان طلبہ کا خیال رکھتے ہیں اور اس جماعت کی خدمت کو سعادت عظمی شمار کرتے ہیں۔ صاحب قرآن ثانی شاہ جہاں انارکہ برهانہ کا قول تھا کہ "پورب شیراز مملکت ماست ।"

(۶) ایک اور قابل ذکر چیز یہ ہے کہ تعلیم ہمیشہ منف رہی۔

باک و هند کے نظام تعلیم میں نہ صرف یہ کہ تعلیم منف تھی بلکہ طلبہ کے بود و باش اور خورد و نوش کا بھی ہوا انتظام کیا جاتا تھا اور جب خرج کے لیے غریب طلبہ کو سرکاری ذریعے سے اور اسراکی طرف سے وظائف دیے جاتے تھے۔ کچھ مدرسے تو اپسے تھے جو نہایت شان و شوکت کے ساتھ یہ ضروریات ہوئی کرتے تھے۔ مدرسون اور مساجد میں بڑی تعداد میں حجرے ہوتے تھے جو طالب علموں کی رہائش کے کام آتے تھے۔

(۷) اس نظام کی ایک اور خصوصیت استاد و شاگرد کا قلبی تعلق تھا۔ اس تعلیم کے حمور استاد تھے اور شاگرد کی حیثیت معلم اور مرشی کی تھی۔ اساتذہ کا کردار مثالی ہوتا تھا۔ ان کے ابخار و قربانی اور اخلاص اور تعلیمی انہماں کا کردار مثالی ہوتا تھا۔ کہ اسلام کیسے کیسے نئونے تیار کر سکتا ہے کا حال بڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اسلام کیسے کیسے کیسا تھا اور کتنی کثیر تعداد میں کر سکتا ہے۔ اساتذہ کا تعلق اپنے شاگردوں سے کیسا تھا اس کا اندازہ مشہور مدرس حکیم علی گیلانی کے بارے میں "تذکرہ علمائے ہند" کے اس نفرہ سے کیجئے:

" ہیونہ طلبہ را درس کفتے و بے ایشانِ طعام نہ حوردے ۔ ۱ " ۱

(ہدیثہ طلبہ کو درس دیتے اور ان کے بغیر کھانا نہ کھانے ۔)

اپنے طلبہ کا ان کو کتنا خیال تھا ان کا اندازہ اس سے کبھی کہ جب
سذک العلما مولانا عبدالعلی بصر العلوم کو منشی صدر الدین نے بھر (بر:وان)
آنے کی تکلیف دی اور گران قدر تنخواہ کی ہیں کش کی تو مولانا نے عذر فرمایا
۲ میرے ساتھ ۳ ۴ ۵ طلبہ ہیں جب تک ان کے قیام و طعام کا انتظام نہ ہو
میں نہیں آ سکتا ۔ پھر طلبہ کا حال بھی بہ تھا کہ اپنے استاذ سے بے حد محبت
کرنے تھے اور سعادت مندی ، روحانی انبساط اور قلبی وابستگی کی اُخري حدود
کو چھو جاتے تھے ۔

(۹) اس نظام میں صرف استاد اور شاگرد میں قلبی تعلق ہی نہ تھا بلکہ
استاد طلبہ کے تزکیہ نفس اور اصلاح باطن کی فکر بھی کرتے تھے ۔ اور انہیں
هر وقت یہ خیال دامن گیر رہتا تھا کہ طلبہ کا معیار علم ہی بلند نہ ہو، ان کا
معیار اخلاق بھی بلند ہو اور وہ اچھے انسان اور اچھے مسلمان بن کر نکلیں ۔
اگر ان معاشرے میں تقویٰ ، ایفائے عہد ، عصمت و عفت ، ایثار و قربانی ،
صلہ رحمی ، اخلاق و صروت اور ہمدردی و اخوت کا دور دورہ تھا تو ان کی وجہ
بھی تھی کہ تعلیم ایک اخلاق ساز قوت کا کردار ادا کرنی تھی ۔

(۱۰) اس دور کے مطالعے سے بہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمی نظام میں
جمود نہ تھا ۔ یہ نظام نئی نئی پیدا ہونے والی ضرورتوں کو پورا کر رہا تھا اور
ان کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نظام کے تیار کردہ افراد بعض حجروں کی
زینت نہ تھے ، بلکہ نظام حکومت کو بھی چلا رہے تھے اور حکمت و دانش مندی
کے ساتھ چلا رہے تھے ۔ اگر درخت کو اس کے خل سے پہچانا جاتا ہے تو اس
نظام کو ان شخصیات سے پوکھا جا سکتا ہے جنہیں اس نے تیار کیا اور جنہوں نے
زندگی کے ہر شعبے میں نام پیدا کیا ۔

۱ منتخب التواریخ ، صفحہ ۸ ۔

۲ " ہندوستانی مسلمان " از مولانا ابوالحسن علی للوی ، صفحہ ۱۰۸ ۔

مزید مطالعے کے لئے

ضباء الدین احمد، مفکرین تعلیم (باب اول تا سوم)۔ اکیڈمی آف ایجوکیشن
ریسرچ، کراچی۔

محمد حسین خان زبیری، مشاہیر کے تعلیمی نظریے۔ (باب اول تا ششم)
اکیڈمی آف ایجوکیشن ریسرچ، کراچی۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، تعلیمات (باب اول تا هفتہ)۔ اسلامک پبلکیشور
لائپنڈ، لاہور۔

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، مسئلہ تعلیم - حیدرآباد دکن۔

تعالیم کا مسئلہ - ادارہ مطبوعات طلبہ، کراچی۔

مولانا مناظر احسن گلاني، مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت -
ندرۃ المصنفین، دہلی۔

Dr. Muhammad Rafiuddin, First Principle of Education.
Iqbal Academy, Karachi.

* اسلام کے معاشی اصول*

اج کی دنیا میں معاشیات کی اہمیت ناقابل انکار ہے۔ یہ اہمیت صرف اس احساس کی پیداوار نہیں ہے کہ ایک فرد کے لیے معاشی آزادی کے بغیر سیاسی اور معاشرتی آزادی بے معنی ہو جاتی ہے، معاشرے کے لیے معاشی انصاف کے بغیر سکون، سلامتی اور یک جمٹی کا حصول ناممکن رہتا ہے اور قوموں کے لیے معاشی استحکام کے بغیر سیاسی آزادی کو بھی برقرار رکھنا محال ہو جاتا ہے، بلکہ انسان اس حقیقت کے شعور پر بھی بے چین اور مضطرب ہے کہ دنیا میں دولت کی فراوانی، وسائل پیداوار بغير العقول ترق اور بے مثال معاشی ارتقا کے باوجود غربت، افلاس، بے روزگاری اور معاشرتی ظلم کا دور دورہ ہے۔

اج بھی انسانی آبادی کا سائیہ فیصلی حصہ نان شبینہ کا محتاج ہے۔ افلاس و نکبت اس کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اس کے پاس نہ پیٹ بھرنے کو روپی ہے نہ بدن چھپانے کو لباس، اور نہ سرڈاہانے کو معقول مسکن! ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اور تمام ترق کے باوجود ہم مجموعی خوش حالی سے کیوں محروم ہیں؟ معاشی ترقِ حقیقی انسان فوز و فلاح کا باعث کیوں نہیں ہوئی؟

جب ہم ان مسائل پر غور کرتے ہیں تو ہمیں لازماً معاشی نظام کے مسئلے پر اور ان اصولوں پر، جن کی بنیاد پر معاشی زندگی کو مرتب کیا جاتا ہے، غور کرنا پڑتا ہے۔ یہ مسئلہ ہمیں یہ حیثیت ایک ملک کے درپیش ہے، مسلمانوں کو پوری دنیا میں یہ حیثیت ایک ملت کے بھی اس سے سابقہ ہے اور پھر پوری

یہ باب اس کتاب کے لیے مرتب نئے خاص طور پر تیار کیا ہے۔

Castro, Josue De, D. Geography of Hunger, Victor Gollancz Ltd., ۱
London, 1952.

اسلام کے معاشی اصول

۲۳۶

اعتبار سے ہیں ماندہ ہے، مثل کو سامنے رکھ کر پہلے تو نوعیت مسئلہ کو واضح کریں گے اور پھر اسلام کے اصولوں پر گفتگو کروں گے۔

(۲)

اصل مسئلہ

یہ خیال کرونا صحیح نہیں ہے کہ آج کے انسان کا اصل مسئلہ مغض صنعتی ترق کا حصول یا پیداوار پر اضافہ ہے۔ بلاشبہ صنعتی ترق اور معاشی پیداوار میں اضافہ بڑی ضروری چیزیں ہیں لیکن ان سے بھی زیادہ ضروری مسئلہ پورے معاشی نظام کا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ خود معاشی ترق کا انحصار بھی اس مجموعی نظام پر ہے جس کی آغوشیں یہ ہروان چڑھتی ہے۔ نظام سے ہٹ کر ترق کا کوئی تصور مشکل ہے۔

معاشی خوش حالی کا نصیر

معاشی ترق اور خوش حالی کا مفہوم ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ مغض پیداوار میں اضافہ ہو جائے۔ معاشی خوش حالی کا اصل مشہوم ایک بہتر اور خوش حال معاشرے کی تشكیل و تعمیر ہے۔ پروفیسر وی۔ اے۔ ڈینٹ کے الفاظ میں "صنعتی ترق آسی معاشرے کی خوش حالی کا باعث بن سکتی ہے جس کی زرعی بشیادی سنتھکم ہوں، بنیادی اور گھریلو حرفت مضبوط ہو اور جس میں روحانی قوت بھی باقی جاتی ہو۔ اس کے باوجود ایک خاص مرحلے سے آگے بڑھ کر خوش حال کی رو ماند پڑ جاتی ہے، افراد کے فطری تعلقات میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے اور سیار زندگی بڑھنے کے بجائے گھٹنے لگتا ہے۔" ایک صحت مند نظام کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ معاشی سرگرمیوں کو مناسب حدود اور تعمیری انداز میں رو بہ عمل آئے کا موقع دے لیکن اس امر پر بھی نکاہ رکھئے کہ یہ سرگرمیاں زندگی کے اعلیٰ مقاصد اور اقدار کے لئے نقصان دہ نہ بننے پائیں۔

یہ بات ہمیشہ سامنے رہنی چاہیے کہ "حقیقی معاشی ترق ایک ایسا ہے بہلو، انفرادی اور سماجی عمل ہے جس کے تحت افراد کے روپیے اور اعتقادات

اس طور پر لئے سانچوں میں ڈھالے جانے ہیں کہ وہ اپنی روزمرہ کی کثیر تعداد سرگرمیوں میں بھی ایک نئی آزادی محسوس کرنے لکھتے ہیں ۔ اور ان میں سے کئی سرگرمیاں ایسی ہوئی ہیں جنہیں کسی بھی معاشی یا مالی اصطلاح سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا ہے ۔ اور نہ ہی انہیں پیداوار کے اعداد و شمار سے ظاہر کیا جا سکتا ہے ۔ ہم ہمارا اصل کام یہ نہیں ہے کہ ہم چند جزوی اور نامکمل تبدیلیاں عمل میں لیرے آئیں ۔ ہمارا اصل کام ہو رہے نظام کی اصلاح و تبدیلی ہے ۔ اس مسئلے کے بارے میں ہمارا رویہ حقیقت پسندانہ، انقلابی اور تخلیقی ہونا چاہیے ۔ اور اسی طرح ہم کامیاب بھی ہو سکتے ہیں ۔ ای ۔ ڈی ۔ ڈومر کے الفاظ ہیں ”معاشی ترق کا انحصار معاشرے کی روح پر ہوتا ہے اور ترق کے کسی بھی تشریعی نظریے کو اپنے اندر معاشرے کے طبعی ماحول، سیاسی ڈھانچے، ترغیبات، تعلیمی نظام اور قانونی نظام کو جگہ دینی چاہیے نیز اس کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اس معاشرے کے افراد کا سائنس، معاشری تبدیلیاں اور ارتکاز دولت کے بارے میں رویہ کیا ہے؟“^۷

بے معجبنا کسی ہبلو سے بھی دانشمندانہ نہیں ہے کہ ہمارا اصل مسئلہ محض صنعتی ترق یا اس طرح کی کوئی اور چیز ہے ۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اپسی معاشری ترق حاصل کی جائے جو صحیح سمت میں ہو تیز رفتار ہو، صحیح طریقوں سے حاصل کی جائے اور صحیح نتائج بھی نکالے ۔ اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ ہونے والے نظام میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں نہ لائی جائیں، سامراجی دور کے فرسودہ معاشری اور اخلاقی تصورات کے مقابلے میں صحت مند تصورات ملک کے سامنے نہ رکھے جائیں، معاشری پالیسیوں کو بنیادی انسانی اقدار کی اساس پر استوار نہ کیٹا جائے، آجر اور مستاجر، محنت اور سرمائی، اور زمین دار اور کاشت کار کے درمیان آن اقدار کی روشنی میں از سر نو تعلقات قائم نہ کیے جائیں جو ہمارے بنیادی نظریہ حیات کا عطیہ ہیں ۔ مندرجہ ”بالا تجربے سے جو نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) معاشری ترق صرف بہتر معاشری نظام ہی میں ممکن ہے ۔

(ب) ہم ماندہ ممالک کا موجودہ نظام ناقص ہے اور ترق کا باعث بننے کے

S. H. Frankel: *The Economic Impact on Underdeveloped Countries*, Oxford, 1 (1953), p. 78.

E. D. Domar "Economic Growth: An Economic Approach" ۲
American Economic Review, Vol XVII, No. 2, May 1952, p 481.

اسلام کے معاشی اصول

۳۳۹

جنہی ترق کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اس ایسے جب تک اسے تبدیل نہ کیا جائے
حتیٰ ترق کی توقع عبث ہے۔

(ج) اس طرح ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم اس معاشی نظام کو تبدیل
کر کے ایک ایسے نظام کی بنادالیں جو ہماری ضروریات کو پورا کرسکے اور جو
ہمارے تمدن، ہماری اقدار حیات اور ہمارے نظریہ "زندگی کے مطابق ہو۔ اب سوال
یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ نیا نظام کیسماں ہو؟ ہماری یہ ضرورت اسلامی نظام معیشت
ہی پوری کرسکتا ہے اور ہم آیندہ صفحات میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش
کریں گے۔ اور یہ باتیں گے کہ اسلام نے معاشی زندگی کی ترتیب و تہذیب
کے لئے کیا اصول دیے ہیں۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ ان اصولوں کو عام
فہم انداز میں بیان کریں۔ ان کو معاشیات کی اصطلاحی زبان میں بھی ادا کیا
جا سکتا ہے ایکن عام قارئین کی سہولت کے لئے اصطلاحی زبان کے مقابلے میں عام
انداز اختیار کیا گیا ہے۔

(۲)

اسلام کے معاشی اصول

اسلام جو معاشی نظام ہیش کرتا ہے وہ مختصر آ مدرجہ ذیل اصولوں پر
مشتمل ہے۔

۱۔ معاشیات اور اخلاق و مذهب۔ سب سے بہلے وہ فرد اور جماعت دونوں
کے ذہن سے امن باطل نظریے کو ختم کرتا ہے کہ اخلاق اور مذهب کا تعلق
معاشی زندگی سے نہیں اور "تجارت تو بس تجارت ہے!" قرآن پاک بڑے بلیغ
انداز میں معیشت اور اخلاق کا تعلق بیان کرتا ہے:

يَا أَيُّهُ الَّذِينَ أَمْنَأْتُمُ إِذَا نُودِي لِلْحَسْلَةِ مِنْ كُلِّ الْجَمْعَةِ فَأَسْعَاهُ إِلَى ذَكْرِ اللَّهِ وَذِرْ الرِّبْيَةِ ذَلِكُنْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنَّ الْكُفَّارَ
يَعْلَمُونَ ۝ فَلَا أُقْضِيَتِ الْهَلْوَةُ فَإِنْ تَشَرِّفُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ وَآذِلُّوا اللَّهَ كَفِيلًا
لَّمْ يَمْلِمْ تَفْلِيْخُونَ ۝

مسلمانو! جب بھئے کہ دن نماز کے لئے اذان دی جائے تو نم افہ کی یاد کے طرف دروڑو
اور لین دین چھوڑو۔۔۔ اگر تم جانئے ہو تو یہ تو نہیں اسے لیجے بہتر ہے۔ پھر جب
امراز ختم ہو جانئے تو تم زینوں پر پہلی جائی لوں افہ کا قفل کلاش کر دو اور افہ کا ذکر
گھرست کے ساتھ کرنے کرو تاکہ تم فلاح پا۔ (الجمعۃ ۱۰ - ۹۔)

قرآن پاک میں متعدد مقامات پر معاشر کو "فضل اللہ" کہا گیا ہے اور اس سے ذہن میں بہ بات ڈالی گئی ہے کہ یہ سب خدا کی عنایت سے ہے۔ اس کا کھاتما یہ ہے کہ معاشی زندگی کو بھی انسن اسی طرح خدا کی حدود کا پابند بنائے جس طرح باقی تمام زندگی کو اور ان مقاصد کی تعمیل کے لیے استعمال کرے حدود اللہ۔ اخلاق (3) صراط معاشی زندگی میں بھی حدود اللہ کا پابند اور ان اخلاق ضابطوں کا احترام کرنے والا یہ پابندی ہوتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عайд کیے ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ

✓ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ تَبَارَكَ وَلَا يُبَدِّيْعُ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ

[] وہ لوگ جنہیں خرید و فروخت اور
تجارت خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔
(النور۔ ۳۷)

خدا کے ذکر کا ہٹا وسیع مفہوم ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر حال میں وہ خدا کو یاد رکھتے ہیں اور اس کی رضا جوئی کے لیے کوشش رہتے ہیں۔ اسی طرح معاہدہ لکھتے اور صحیح گواہی دینے کو تقویٰ قرار دیا گیا اور ناپ تول میں کمی کو ایسا عظیم گناہ کہ اس کی وجہ سے ایک پوری قوم کا تختہ الٹ دیا گیا۔ یہ وہ بنیادی نقطہ نظر ہے جو اسلام دینا ہے اور جس کی بنیاد معاشیات اور اخلاق کی ہم آہنگی ہر ہے۔ اس طرح اسلامی معاشیات کا انداز اخلاقیاتی اور قدر شناسانہ (Normative Approach) ہے۔

۲۔ معاشی جدوجہد اور اس کا مقام و مقاصد۔ اسلام نے ساری زمین بلکہ پوری کائنات کو انسان کے لیے میدان عمل قرار دیا ہے اور انسان کو ترغیب دی ہے کہ وہ اپنی معاش کے حصول اور خلق خدا کے لیے فارغ البالی کے حصول کے لیے زیادہ سے زیادہ جدوجہد کرے۔ معاشیات کی اصطلاح میں اسے پیداوار کو بڑھانے (Maximisation of Production) کی پالیسی کہہ سکتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ معیشت میں اصل اہمیت نفع کی تکثیر کو حاصل ہوئے جب کہ اسلامی معاشیات میں کل پیداوار کی تکثیر اور خدا کے بندوں کے لیے سامان معاش کی زیادہ سے زیادہ فراوانی کا حصول بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

اسلام کے معاشی اصول

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

۴۵۱

وَلَقَدْ مَكَلَّمَ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَنَا أَذْنَاهُمَا مَعَايِشَ

اور یہ شک ہم ہی نے تم کو زمین پر رہنے کی جگہ دی اور اس میں تمارے لیے سامان معاش پیدا کیے۔ (الاعراف - ۱۰)

الْفَرَسَوْانَ اللَّهُ سَخْرَةُ كُلِّ الْكَوَافِرِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَسْبَبَ عَلَيْهِنَّ نَعْمَةً ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے جو کچھ آنسانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اسے تمہارے لیے سخرا کر دیا ہے اور اس نے تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں۔ (لقمان - ۲۰)

اس بنیادی حقیقت کے اظہار کے بعد اسلام نے انسانوں کو مختلف طریقوں سے محنت، معاشی جدوجہد اور حصول رزق کی کوششیں ہر اکسایا ہے اور اس طرح ہر شخص کو فروغ پیداوار کے لیے سرگرم عمل کر دیا ہے۔

(۱) بے عملی، بے روزگاری اور گداگری کو نا پسندیدہ قرار دیا گیا اور اس ہر سخت و عیید سنائی گئی۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کسی کو زیب نہیں دیتا کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے، اور روزی کی تلاش نہ کرے اور بد کہتا رہے کہ ”اللہ مجھے رزق عطا فرما“۔ تم کو (دعا کے ساتھ) اس کے لیے جدوجہد بھی کرنی چاہیے کیوں کہ تم جانتے ہو کہ آسمان تو سونا چاندی برساتا نہیں۔
(المدنیہ والاسلام بہ حوالہ اسماء تہذیب)

ایک اور حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے لیے کام کرنا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ قیامت کے دن تم اپنے چہرے پر سوال کا داغ لیے ہونے آؤ۔ (ابو داؤد)

(ب) پھر مشتب طور پر رزق کی جدوجہد کی ترغیب دی اور اسے ہر مسلمان پر فرض کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم فجر کی نماز پڑھ لو تو اپنی روزی کی تلاش سے غافل ہو کر سوتے نہ رہو (کنز العمال)۔ ایک اور حدیث میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا کی شرافت غنا اور فراغ دستی ہے اور آخرت کی شرافت تقویٰ و پرهیزگاری ہے (کنز العقائق)

اور خود قرآن پاک میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے :

وَلَا تَنْسِ نَصِيبُكُمْ مِنَ الدُّنْيَا

اور دنیا سے اپنا حصہ لینا نہ بھولو۔
(القصص . ۲۲)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے "کسب حلال" کو "فرضہ بعد الفرضہ" یعنی نماز کے بعد سب سے بڑا فرض قرار دیا ہے بلکہ اسلام کے نقطہ نظر پر ایک واقعے سے بڑی روشنی پڑتی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صعبانی کو دیکھا جو خستہ حال تھے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے آن سے ہوچھا تمہارے پاس کچھ ہے؟ آنہوں نے بتایا دو درهم ہیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان میں سے ایک درہم کی کلمہ اڑی خرید دی اور لکڑیاں کائیں پر لگا دیا۔ اس طرح آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے محنت کے پیدا اور استعمال کی ترغیب دی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

"صنعت و حرفت کے ذریعے سے روزی کی تکمیل انسان ہر فرض (کفایہ) ہے" "بعض گناہوں کا کفارہ روزی کمانے میں معموم و منکر رہتا ہے۔" اور پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:

"جو شخص دنیا کو جائز طریقے سے حاصل کرتا ہے تاکہ سوال سے بھی اور اہل و عیال کی کفالت کرے اور ہمطائی کی مدد کرے تو قیامت کے دن جب وہ انہیں گا تو اس کا چھرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن ہو گا۔" (ابو نعیم فی العلایہ بحوالہ اسماعیل تہذیب)
ان آیات و احادیث سے محنت اور معاشی جدوجہد کی اہمیت ہمارے سامنے آئی ہے اور انہی کی روشنی میں پیداوار کو بڑھانے اور معیشت کو تقویت دینے تی بالمسی اسلام کے معاشی نظام کا ایک اہم جزو قرار ہاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی فقہ میں معاشی جدوجہد کو فرض عین اور پیداوار کو فروغ دینے کی کوشش کو فرض کفایہ (ایسا فرض جو لازم تو ہر شخص ہر ہو البتہ اگر کچھ لوگ اسے ادا کر دیں تو سب ہر سے ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے) اور اگر کوئی بھی ادا نہ کرے تو موافقہ ہر فرد ہو گا) -

اسلام کے معاشی اصول

قرار دیا ہے۔ رد المحتار^۱ میں ہے کہ
ومن فروض الكفاية الصناعة المحتاج

۳۵۳

ضروری صنعتوں کا قیام فرض کفایہ میں
ہے۔

البها

اسی طرح المنهاج^۲ میں یہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ

ومن فروض الكفاية الحرف والصناعات فرض کفایہ میں صنعت و حرفت اور وہ تمام
چیزیں جو معاش کی تکمیل کے لیے درکار ہیں
شامل ہیں

امام ابن تیمیہ رحمہ علیہ اور اس سلسلے میں مختلف فقہاء نے جو نقطہ نظر
بیان کیا ہے اس کا خلاصہ العسبة فی الاسلام میں اس طرح بیان کیا ہے کہ

بہت ہے فقہاء نے جن کا تعقیل شافعی،
حنبل فکر سے نیز دوسرے فقہاء جیسے
امام غزالی اور امام جوزوی وغیرہ نے اس
امر کا اظہار کیا ہے کہ ان صنعتوں کا قیام
فرض کفایہ میں ہے اس لیے کہ
معدش کی تکمیل ان کے بغیر ممکن نہیں ہے
اس (فرض کفایہ) کی حیثیت (ایسی ہی ہے
جیسے) جہاد کی جو فرض کفایہ ہے۔

اصحاب الشافعی و احمد بن حنبل
وغيرهم کابی حامد الغزالی وابی الفرج
الجوزوی وغيرهم ان هذه الصناعات
فرض على الكفاية فانه لا يتم المعاش
الابها كما ان الجihad فرض على الكفاية

امام ابن تیمیہ کی دی ہوئی یہ مثال بڑی اہم ہے۔ معاش کی تکمیل انسانیت
کی تکمیل کے لیے ضروری ہے اور جس طرح انسانیت کی روحانی اور اخلاقی ضرورتوں
کو پورا کرنے اور اسے منکر سے بچانے، طاغوت کے غلبے سے نجات دلانے اور
حقیقی رہنمائی سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کرنے کے لیے۔ یعنی انسانیت کی
تکمیل کے لیے۔ ضروری ہے کہ جہاد دیا جانے اسی طرح انسانیت کی جسمانی
اور مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے صنعت و حرفت کا قیام اور وسائل معاش
کی فراہمی ضروری ہے۔ اور ان دونوں کی حیثیت فرض کفایہ کی ہے۔

یہ وہ اہمیت ہے جو اعلام معاشی جد و جہد کو دیتا ہے اور یہی وجہ ہے
کہ اسلامی معاشیات کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ تمام انسانوں کے لیے معاشی

۱ رد المحتار علی الدر المختار، جلد ۱، صفحہ ۳۲۔

۲ المنهاج، جلد ۲، صفحہ ۱۹۲۔

سہولتیں فراہم کی جائیں، قدرت نے جو وسائل و دینے کیے ہیں ان کو ترقی دی جائے ہے اور کو اسکا حد تک پڑھایا جائے اور رزق کے خزانوں کو چند ہاتھوں میر اس طرح میر کو ز نہ ہونے دیا جائے کہ دوسروں پر اس کے دروازے بند ہو جائیں۔ اسے علم معاشیات کی اصطلاح میں پیداوار کی تکثیر اور وسائل پیداوار کی بہترین تقسیم کہا جا سکتا ہے۔

غربت کے انسداد کا بستہ بھی اسلام کی معاشی ہالیسی میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلام کے معاشی نظام کے ثابت معاشی مقاصد میں غربت کا انسداد اور تمام انسانوں کو معاشی جدوجہد کے مساوی موقع فرمیں کرنا بھی شامل ہے۔ اسلام کا سب سے اہم مقصد کفر کا استیصال ہے اور چون کہ فتو و فاقہ انسان کو کفر کی طرف لے جاتے رہیں اُن لیے اسلام ان کو اپنا بنیادی ہدف سمجھتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

”ابن آدم کا بنیادی حق یہ ہے کہ اس کے لیے ایک گھر ہو جس میں وہ سکے، کپڑا ہو جس سے وہ اپنے جسم کو ڈھانپ سکے، اور کھانے کے لیے روٹی اور پینے کے لیے پانی ہو۔“ (ترمذی)

اسلام اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ سب کو حصول رزق کے موقع دے اور پھر ثابت طور پر ایسی ہالیسیان بنائے جن سے غربت و افلات ختم ہوں اور انسانوں کو ان کی بنیادی ضرورتیں لازماً حاصل ہوں۔

اسلام تنگ کو دور کرنے کا طریقہ حصول رزق کی کوشش اور پیداوار پڑھانے کے ذریعے کی طرف رجوع فرار دیتا ہے اور محض غربت، افلات، معیار زندگی کے گرنے کے خطرے اور قلت وسائل کے واپیلے سے انسان کشی اور نسل کشی کی ہالیسی کی اجازت نہیں دیتا۔ معاشی سستلے کا اصل حل معيشت کو فروغ دینا ہے، انسان کی قطع و برید نہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے :

وَلَا تَقْنِعُوا أَوْلَادَكُمْ خَشِيَّةً إِنْلَاقِ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِنَّ الْمُؤْمِنَاتَ قَنْتَهُمْ كَانَ خَطَاكُمْ يَرِدُوا

اور تم اپنی اولاد کو افلات کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم ہی ان کو رزق دینے ہیں اور تم کو بھی۔ ان کو مار ڈالنا بڑی خطا ہے۔ (بنی اسرائیل - ۲۱)

اسلام آبادی کے حقیقی مسئلے کا حل اضافہ ہے۔

حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

✓ ”رزق کا دروازہ عرش تک کھو ہوا ہے اور اسباب معیشت غیر محدود ہیں۔“ (كنوز العقائق)

✓ ”عورت کو کھر میں خالی بیٹھے رہنے کی جگہ چرخہ کاتنا اچھی کمائی کا مشفہ ہے۔“ (كنوز العقائق)

✓ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال داروں کو حکم دیا کہ بکریاں ہالیں اور غریبوں کو حکم دیا کہ صراغیاں ہالیں تاکہ فراغی حاصل کریں۔“ (ابن ماجہ)

اس طرح اسلام ہر فرد اور ہر قوم کی توجہ کو معاشی وسائل کی ترقی اور ہیداواری امکانات سے ہورا ہورا فائدہ اٹھانے پر کوڑ کرتا ہے۔ وہ ایک طرف معاشرے میں انصاف اور آزادی کو قایم کرتا ہے اور دوسری طرف غربت و افلوس کا خاتمه کر کے بہتر معاشی زندگی کا قیام سعکن بناتا ہے۔ بہاں ہی اس کا مزاج مغرب کی تمام معاشی تعریبات سے مختلف ہے۔

۳- حلال و حرام کی تمیز۔ اسلام ہیداوار کے اخالی اور معیشت کے

همہ جہتی فروغ کی ہالیسی اختیار کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس ہات کی شرط بھی لکاتا ہے کہ آمدیں جائز ذرائع سے حاصل کی جائیں گی۔ ہر نفع کو جو حرام ذرائع سے حاصل ہو وہ دفعہ کی اس قرار دیتا ہے۔ قرآن و حدیث میں رزق حلال کی جتنی اعتمیت بیان کی گئی ہے وہ اس امر کو ثابت کرکے کہ اسلام کے معاشی نظام میں صرف جائز اور حلال رزق کے فروغ کی، کوششیں ہونی اور ان تمام ذرائع کا کلی انسداد کیا جائے کا جو حرام ہیں اور جن کو شریعت ناروا اور ناجائز قرار دیتی ہے۔

يَا أَيُّهُمَا النَّاسُ كُلُّهُمْ مِنَ الْأَرْضِ حَلَّ أَطْهَبُهَا

اے لوگو! جو چیزوں زین میں موجود ہیں ان میں

سے حلال اور پاک چیزوں کھاؤ۔ (البقرہ - ۱۶۸)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”بہترین عمل حلال روزی کمانا ہے۔“ (المدنیہ والاسلام)

”حلال روزی کا طلب کرنا ایسا ہے جیسے خدا کی راہ میں بھادروں سے لڑنا اور جو شخص حلال روزی حاصل کرنے کی کوشش کر کے تھک کر رات کو سو جائے تو خدا اس سے راضی ہے۔“
(المدنیہ والاسلام)

اور حرام سے کمائل ہوئی روزی کے متعلق فرمابا :

”حرام روزی سے پرورش پاپا ہوا گوشت اس کا زیادہ مستحق ہے کہ آگی میں ڈالا جائے۔“

یہ ایک ایسا اصول ہے جس سے آج کے دور کی معاشیات بالکل نا آشنا ہے۔ چون کہ اسلام کا اصل مقصد صرف وسائل معاش کی فراوانی نہیں بلکہ ان کا منصفانہ اور مصلحانہ استعمال ہے اس لیے اس نے معاشی جدوجہد کو حلال و حرام کا ہابند کیا ہے۔ خالص معاشی نقطہ نظر سے یہ وہ چیز ہے جو معاشیات کو محض افادی سطح سے بلند کر کے اصلاحی اور فلاحی سطح پر لے آتی ہے اور اس طرح ایک کی معاشی جدوجہد دوسرے کے لیے معاشی تکمیل یا معاشرے کے لیے ظلم فساد کا ذریعہ نہیں بن پاتی۔ اسلام نے جن چیزوں کو حرام کیا ہے اگر ان کا گھری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ وہ چیزیں ہیں جو یا تو فرد یا معاشرے کی جسمانی اور اخلاقی زندگی کو متروک ہیں اور یا انسانوں کے درمیان حقیقی معاشی تعاون، مساوات، آزادی جدوجہد، عدل و انصاف اور قسط و توازن کا قیام مشکل کر دیتی ہیں۔ خالص معاشی اصطلاح میں اس کا فائدہ یہ ہے کہ اسلامی سعیت میں صرف کی تکثیر (Maximisation of consumption) کی جگہ اس کی انسب سطح کا حصول (Optimisation) پیش نظر رہتا ہے اور ایک حقیقی فلاحی سعیت ظہور میں آتی ہے۔

۲) حرمت سود - اسلام کے بنیادی معاشی اصولوں میں سے ایک حرمت

سود ہے۔ جو معاشی ظلم کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

اسلام نے سود کو اس کی ہر شکل میں حرام قرار دیا ہے۔ سود مفرد ہو یا میں کب وہ ذاتی قرضوں پر لیا جائے یا تجارتی اور پیداواری قرضوں پر، حرام ہے، اور اس کے لینے والے کو خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اعلان جنگ قرار دیا گیا ہے۔ قرآن ہاک میں ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا كُلُوكُ الْتَّبَوَأَ ضَعَافًا فَلْتَعْصِمُهُ وَلَا تَوَالَّهُ لَعْلَكُمْ تُفْلِحُونَ

اے ایمان والو ! سود کے کئی کثی سعسے بڑھا کرنا کھاؤ اور افہمے
ذرتے رہو تو کہ تم فلاج پا جاؤ۔ (آل عمران - ۱۳۰)

ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے کو
سود کا کاغذ لکھنے والے پر اور سود کے گواہوں پر لعنت بھیجی ہے اور ان سب کو
نیادوں ہی پر نہیں بلکہ اس کے خطرناک اقتصادی، سماجی اور سیاسی مضمرات
کی بنا پر بھی ہے۔ سود کی لعنت متعدد قدیم معاشروں کی تباہی کا باعث بنی ہے
اور آج بھی جدید سرمایہ دارانہ معاشرے کی جزوں کو کھو کھلا کر رہی ہے۔
اس کی بنیاد استعمال اور ظلم ہے اور اس کی وجہ سے ملک کی معیشت پر چند
سرمایہ داروں کا اقتدار مسلط ہو جاتا ہے جو صحت مند معاشی جدوجہد کو ختم
کر دیتا ہے اور معیشت میں عدم استحکام کا باعث ہوتا ہے۔

(۵) تجارتی اخلاقیات کا ضابطہ - اسلام نے تجارت اخلاقیات کا ایک
ضابطہ پیش کیا ہے تاہم اهل تجارت اس کا اتباع کوئی۔ یہ ضابطہ اخلاق
تجارتی لین دین میں دیانت داری اور خدا ترسی کے جذبات کو فروغ دیتا ہے
تجارت کے معاملے میں قرآن کی اصولی ہدایت یہ ہے کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا كُلُوكُ الْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَأْتُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ فَإِنَّكُمْ

اے ایمان والو ! اپنے اموال کو آپس میں باطل کی راہ سے نہ کھاؤ بلکہ باعثی
رضامندی کے ساتھ تجارت کی راہ سے نفع حاصل کرو۔ (الناء - ۲۹)

اپنے آپت ربانی کے ذریعے سے قرآن کریم نے معیشت کے ان تمام ذرائع کو منوع
کر دیا ہے جو ظلم و زیادتی اور دوسروں کی حق تلفی پر مبنی ہوں۔ معیشت اور
تجارت کا دائرہ وہ دائرہ ہے جس میں انسان نے نت نئے ظلم کیے ہیں اور خصوصیت
سے اہل سرمایہ اور اہل قوت نے دوسرے فریق پر جو کمزور اور غریب ہو،
اکثر اپنی مرضی مسلط کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انتفاع (Exploitation) کے یہ
مارے دروازے بند کر دیے اور فرمایا کہ معاشی معاملات کی بنیاد باہمی رضامندی
اور تجارت کے حصول پر ہونی چاہیے۔ تجارت میں امانت و دیانت کی اہمیت واضح
کرنے ہوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"امانت دار تاجروں کا حشر صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہو گا۔" (ترمذی)

سخصرًا اسلام کے اصول تجارت حسب ذیل ہیں :

(ا) باهمی رضامندی : تجارت باہمی رضامندی سے ہوف چاہیے - دو نوں

فربق اپنی آزاد مرضی سے کسی جبر یا زبردستی کے بغیر اپنے معاملات کو طے کریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں تجارت کی بنیاد "تعاون باہمی" پر ہے اور تجارت کی وہ تمام شکلیں جن میں دوسرے فربق کی کمزوری سے ناجائز فائدہ انہا کر کوئی خاص شرائط یا معاملات اس پر تھوپ دیے جائے ہیں، وہ ناجائز ہیں۔ اس سے یہ بھی مستنبط ہو سکتا ہے کہ ابھی اشتہار بازی یا نفسیاتی حربوں کا اپسا استعمال جو عقل و فکر کو معطل کر دے اور ایک شخص اپنی مرضی کے خلاف محض نفسیاتی شعبدہ بازی کی وجہ سے کسی چیز کی خرید پر مجبور ہو جائے، اسلام کے مطابق نہیں۔ اسی طرح آزاد منڈی کو کمزور یا مغلوج کرنے والی وہ تمام قوتیں بھی اسلامی میہشت میں کوئی راہ نہیں ہاتیں جن کی وجہ سے جدید دنیا کا منڈی کا نظام درہم برہم ہے اور شدید قسم کی دقتون اور خامیوں میں مبتلا ہو گیا ہے۔

(ب) دیانت : دوسری اصول یہ ہے کہ تجارت دیانت کے ساتھ ہو۔ اس میں

کسی قسم کا دھوکہ یا بد معاملگی نہ ہو۔ مال کی اصل کیفیت لوگوں کے مابینے رکھ دی جائے۔ اور ان کو غلط فہمی میں رکھ کر خرید پر مجبور نہ کیا جائے۔ اسی طرح جان بوجہ کر دوسرے کو نقصان پہونچانا، معاملے پر معاملہ کرنا، خیانت یا وعدہ خلاف کرنا، یہ سب اسلام کی نگہ میں منوع ہیں۔ اسی طرح ناپ تول میں درست ہونا تجارتی دیانت کا ایک اہم پہلو ہے۔

(ج) جائزوں اور مباح کی تجارت : تیسرا اصول یہ ہے کہ تجارت صرف

ان اشیا میں کی جائے جو جائز یا مباح ہوں۔ وہ تمام اشیا جن کا استعمال معصیت کی تعریف میں آتا ہے، یعنی شراب، بت، اصنام، خنزیر، وغیرہ، ان کی تجارت بھی اسلام میں منوع ہے۔

(د) ذخیرہ اندوزی کی ممانعت : پھر اسلام میں اس بات کی بھی

ممانعت ہے کہ ضروریات زندگی کو روک رکھا جائے تاکہ ان کے دام بڑھ جائیں اور اس طرح ہے منافع میں افافہ ہو۔ ذخیرہ اندوزی اور احتکار کو اسلام نے

اسلام کے معاشی اصول

۳۵۹

بھی ہے منع کیا ہے اور ایسا کرنے والے ہر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھی ہے ۔

(۵) - جوا اور سٹہ وغیرہ کی معانعت : اسلام نے تجارت کی وہ تمام

مکلبی بھی بند کر دی ہیں جن میں کسی ذور سے سے ناجائز فائدہ انہیا جا رہا ہو یا جن میں مناسب محنت کیے بغیر دولت ہاتھ آ رہی ہو ۔ بھی وجہ ہے کہ سٹہ، لاثری، اور جونے کی ساری صورتیں اسلام میں منوع ہیں ۔

(۶) - اہل تجارت کا ذاتی اخلاق : اسلام کی تمام تعلیمات کے مطالعے

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہل تجارت میں اعلیٰ اخلاق کردار ہونا چاہیے تاکہ وہ تجارت کا حق ادا کر سکیں اور اسلام کے سچے سفیر بن سکیں ۔ ان میں خصوصیت سے دیانت اور خوش اخلاق ہوف چاہیے تاکہ یہ کیفیت نہ ہو کہ کی جس سے بات اُس نے شکایت ضروری

آنہیں قوم اور خصوصیت سے اپنے صارفین کی خدمت کے جذبے سے کام کرنا چاہیے اور اپنے کاروبار میں ہوری محنت اور دل جمعی سے کام کرنا چاہیے تاکہ وہ اپنی توتوں کو زیادہ سے زیادہ مفید مقاصد کے لیے استعمال کر سکیں ۔ پھر سب سے بڑھ کر وہ مستقل مزاجی اور اعتدال کے ساتھ کام کریں اور بہت جلدی دولت جمع کرنے کی ہوس ہے بچے رہیں ۔

معاش اور اخلاق میں بھی وہ حسین توازن ہے جو اسلام کے معاشی نظام کا امتیاز ہے ۔

(۷) اسراف کی بندشیں - طلب حلال کے ساتھ ساتھ اسلام انسان کو جائز مصارف پر دولت خرچ کرنے کی ترغیب بھی دیتا ہے لیکن اسراف سے روکنا ہے اس وجہ سے دولت کا بے جا استعمال اور اس کا ضیاء رک جاتا ہے اور وہ تعیری اور ہیداواری مقاصد میں استعمال ہونے لگتی ہے :

كُلُّهُوا لِهُرِيْوَا وَلَا لِشِرْقَوَا

کھاؤ اور پیو مگر اسراف
نہ کرو ۔ (الاعراف - ۲۱)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو جائز ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے محنت کرتا ہے وہ اللہ کی راہ میں کام کرتا ہے اور جو محض آن بان د کھانے کے لیے دولت کماتا ہے وہ شیطان کی راہ میں کام کرتا ہے ۔

۷۔ ارتکاز دولت کی ممانعت - پھر اسلام نے دولت کے ارتکاز (ایک یا چند مقامات پر اس کا جمع ہونا) کو بھی بہنہ نہیں کیا ہے اور اس بات کا انتظام کیا ہے کہ مختلف معاشری، اداراتی، قانونی اور اخلاقی تدبیر سے دولت کی تقسیم زیادہ سے زیادہ منصفانہ ہو اور ہر سے معاشرے میں گردش کرے

كُلَّا يَكُونُ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُنْ

ایسا نہ ہو کہ یہ (مال و دولت) تمہارے
دولت مندوں ہی میں گردش کرتا رہے۔
(الحضر۔ ۲۷)

حضور کا ارشاد ہے کہ

إِقْسِمُوا الْمَالَ بَيْنَ الْفَرَائِصِ
عَلَى كِتَابِ اللَّهِ
افہ تعالیٰ ک کتاب کے مطابق اچھا مال ان
لوگوں میں تقسیم کرو جس کا حق مقرر
کیا گیا ہے۔ (ابوداؤد)

دولت کی تقسیم کے لئے مندرجہ ذیل صورتیں تعویز کی گئی ہیں :

**(۱) زکواہ : زکواہ ہر صاحب نصاب مسلمان مرد اور عورت ہر فرض
میں ہے کوئی خیرات نہیں بلکہ فقرا و مساکین کا "حق" ہے۔**

زکواہ جہاں حصہ مال کو کم کرق اور خدا کی راہ میں خرج کرنے اور
مال قربان کرنے کا جذبہ پیدا کرق ہے وہی معاشی نقطہ نظر سے یہ سامنی
فلح کی ایک ہمہ گیر اسکیم ہے۔ جس کے ذریعے سے ملک و ملت کے غریب اور
نادر افراد کی مدد کی جاتی ہے اور انہیں زندگی کی جدوجہد میں براہر کی شرکت
کے لائق بنایا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت یہ ہے کہ ہر شخص
کی دولت صرف اس ہی کے لئے ہے اور معاشی دوڑ میں جو بھی رہ جائے اور جو
گر جائے اسے فنا ہو جانا چاہیے۔ کشمکش حیات میں زندہ رہنے کا حق صرف اس
کو ہے جو مسابقت میں دوسروں سے اگے بڑھ جائے۔ اسلام اس ذہنیت کی نقی
کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو کچھ دولت تم کماتے ہو وہ صرف تمہاری
محنتوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اسیں بھی نظرت کی ہے شمار قوتیں شریک کار ہیں
نیز ہر اس سماں میں اس کے طبقے سے تمہارا معاون و مددگار ہے۔ اس لئے تمہارے
مال میں تمہارے علاوہ دوسروں کا بھی حق ہے۔ اہل ثروت کی ذمہ داری ہے کہ
معاشی دوڑ میں جو بھی رہ جائے آئے سہارا دہی اور اگے بڑھائیں۔ جو معافیوں

کمزوروں کی مدد نہ کرے، ناداروں کو سہارا نہ دے اور گھرتوں کو تہام نہ لے وہ انسان معاشرہ کئے جانے کا مستحق نہیں۔ اسلام نظام زکواۃ کے ذریعے سے معيشت کو صحت مند بنیادوں پر استوار کرتا ہے۔ اور اس میں امداد باہمی کی روح کو جاری و ساری کر دلتا ہے۔

جدید علم معيشت میں سماجی فلاخ کا تصور بہت نیا ہے۔ لیکن اسلام نے ہمیں ہی دن سے فلاخی اور خدمتی ریاست کا تصور پیش کیا اور زکواۃ کی شکل میں معاشرے کے کمزور اور مجبور انسانوں کی ضروریات کی فراہمی کی ضمانت دی۔ اسلامی حکومت نے ابتدا ہی سے اس نظام کو عملہ قائم کیا، آبادی کی مردم شماری کی، ناداروں کے رجسٹر بنائی، ضرورت مندوں کو سرکاری وظیفے دیے اور تھوڑے ہی عرصے میں یہ حال ہو گیا کہ بقول مورخ طبری زکواۃ دینے والے تو سینکڑوں تھے مگر زکواۃ لینے والے نہ ملتے تھے۔

بہر زکواۃ دولت کی تقسیم میں غیر فطری عدم مساوات کو ختم کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس کے ذریعے سے اسیروں کی دولت غریبوں کی طرف منتقل ہوتی ہے۔
معاشی ب гаран کے جس چکر میں سرمایہ دارانہ دنیا گرفتار ہے اس کو دور کرنے میں بھی زکواۃ بڑی مفید و معاون ہو سکتی ہے۔ تجارتی چکر، سرمایہ کاری اور قوت صرفہ میں عدم توازن کی بنا پر رونما ہوتا ہے لیکن زکواۃ جہاں ایک طرف ہیداواری عمل کو تیز کر دیتی ہے وہیں دوسری طرف عوام میں قوت خرید کا افناہ بھی کر دیتی ہے اس طرح یہ معيشت میں معاشی توازن قائم کرنے کا آلہ بن جاتی ہے۔

(ب) صدقات واجبه: بہت سے ایسے صدقات مقرر کئے گئے ہیں جو مختلف موقع پر ہر صاحب حیثیت مسلمان کو ادا کرنے ہوتے ہیں جیسے صدقہ فطر وغیرہ۔ یہ بھی مندرجہ "بالا مقصد پورا کرنے ہیں۔"

(ج) اتفاق: اسلام ہر مسلمان میں اتفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ پیدا کرتا ہے، مال سے محبت کو کم کرتا ہے اور خدا کی راہ میں خرچ کر کے دنیا اور آخرت کی کامیابی حاصل کرنے کی ترغیب دلتا ہے۔

(د) قانون وراثت: اسلام نے وراثت کا جو قانون تعویز کیا ہے وہ اس طرح کا ہے کہ متوفی کا ترکہ "پورے" خاندان میں ایک مناسب ترتیب کے ساتھ

نقیب ہو جاتا ہے اور ساری جائداد مغربی ممالک کی طرح کسی ایک وارث کو لہیں ملتی - اس طرح دولت کے ارتکاز کے بجائے اس کی منصفانہ تقسیم رونما ہوتی ہے ۔

(ز) حق سوی الزکواہ : زکواہ اور صدقات واجبه کے علاوہ بھی اگر ضرورت محسوس ہو تو حکومت کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ لوگوں سے مزید مال بے طور نیکس لے اور اسے استحکام ریاست، قیام انصاف اور فلاح عامہ کے لیے صرف کرے ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "بے شک مال میں زکواہ کے سوا اور بھی حق ہے ۔" (ترمذی)

(ح) العفو : اسلام نے انسان کو صرف انفاق ہی کی ترغیب لہیں دی بلکہ اس میں یہ جذبہ بھی پیدا کیا کہ اس کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ جو بھی ہو آسے خدا کی راہ میں اور دوسروں کی بہتری کے لیے خوج کر دے ۔

وَيَنْهَا نَذْلَةٌ مَا ذَا إِنْفَعُونَ ذَقْلَ الْعَفْوِ

وہ پوچھتے ہیں کہ ہم کیا خرج کریں
کہہ دیجئے المفو (یعنی جو اپنی ضرورت
سے زیادہ ہو) ۔ (البقرہ ۲۱۹۰)

اس طرح اسلام پورے معاشرے میں دولت کی منصفانہ تقسیم رو بہ عمل لاتا ہے ۔
اس کی ہالیسی کے دو بنیادی اصول فروع پیداوار اور دولت کی منصفانہ تقسیم ہیں ۔
وہ ان میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز نہیں کرتا ۔

۸ ملکیت و تصرف کا حق - اسلام تمام زین اور وسائل فطرت کو

اصلًا خدا کی دین اور اس کی ملکیت قرار دیتا ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ تمام معاشی معاملات میں انسان کو اس عظیم تر ملکیت کے تصور کے تحت، انفرادی ملکیت و تصرف کا حق دیتا ہے ۔ یہی وہ شکل ہے جس میں انسان کی معاشی آزادی محفوظ رہ سکتی ہے اور اچھے اخلاق پروان چڑھ سکتے ہیں ۔ لیکن یہ حق غیر محدود نہیں ہے یعنی اگر ملکیت آللہ ؓ ظلم بن جائے یا دوسروں کے حقوق پر اس کا غلط اثر پڑ رہا ہو تو ریاست کو مداخلت کا بھی حق ہے ۔ دراصل اسلام ملکیت کے اس محدود حق کو ایک امانت کی شیکل دیتا ہے اور اس میں تصرف کے اختیار کو بہت سی قانونی اور اخلاقی پابندیوں سے محدود کرتا ہے ۔

ایک مشتبہ تصور پیش کرتا ہے اور سماجی فلاح اور معاشی انعام کے قبام کو جس کے نظام کو ریاست کے ہاتھوں قائم کیا جاتا ہے، معاشی قانون سازی اور عدالت کی طاقتلوں کے ذریعہ ریاست عدل اجتماعی قائم کرنے ہے۔ جس کا کوئی وارث نہیں اس کی ریاست وارت ہے اور جس کا کوئی ولی نہیں، اس کی ریاست ولی ہے۔ ناداروں، اہل ہجوم اور محتاجوں کی مدد ریاست کا فرض ہے اور یہ بھی اس کی ذمہ داری ہے کہ تمام شہریوں کو ان کی بنیادی ضرورتیں فراہم کرے۔

السلطان ولی من لا ولی له

حکومت ہر اس شخص کی ولی (دست گیر و مدد گار)
ہے جس کا کوئی ولی نہ ہو۔ (بخاری)

ایک اور حدیث میں ہے :

من ترك كلا فالينا (بخاری، مسلم)
یعنی جس سرنسے والے نے ذمہ داریوں کا کوئی بار (مثلاً قرض یا بے نہاراً کتبہ) چھوڑا ہو وہ ہمارے ذمے ہے۔

ایک خلیفہ راشد نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی ہے :

” خدا کی قسم اگر میں زندہ رہا تو صفا کی پہاڑیوں میں جو چرواحا اپنی بکریاں چراتا ہے اس کو اس مال میں سے حصہ پہنچ کا اور اس کے لیے اس کو کوئی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی ۔ ”

ا یہ کہا :

” خدا کی قسم اگر اہل عراق کی بیواؤں کی خدمت کے لیے زندہ رہ گیا تو ان کو اس حال میں چھوڑ جاؤں گا کہ میرے بعد ان کو کسی اور امر کی مدد کی احتیاج باقی نہ رہے گی ۔ ”

حضرت علی رضا نے امن بات کو اس طرح ادا کیا ہے :

” اللہ تعالیٰ نے دولت مند لوگوں پر ان کے اموال میں اتنی مقدار مقرر کی ہے جو غربا کے لیے کافی ہو سکے ۔ اس کے باوجود اگر وہ بھوکے، ننگے اور تنگ دست ہوں تو یہ صرف دولت مندوں کی عدم توجیہی اور بخل کی وجہ سے ہو سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے ضروری قرار دیا ہے کہ ان آمرا سے قیامت کے دن محاسبہ کرے گا ۔ ”

ان احکام کے مطابق جو نظام قائم ہوتا ہے اس میں زمین اپنے خزانے کیلیے دیتی ہے اور آسمان اپنی نعمتوں کی بارش کرنے لگتا ہے اور افلاس و تنگ دستی ختم ہو جاتی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

”اے لوگو! صدقہ دو کیوں کہ تم پر ایک زمانہ ایسا آئے کا کہ آدمی صدقہ لیجے لیجے پھرے گا مگر وہ کسی ایسے شخص کو نہ پانے کا جو اسے قبول کرے۔“ (یعنی اس کا حاجت مند ہو)۔

یہ ہے اسلام کا معاشی نظام — اور در حقیقت انسانیت کی نجات انسی اصولوں میں مضمون ہے۔ اس کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ اس کا مرکزی تصور انسان اور اس کی معاشی اور اخلاقی فلاح ہے — وہ معاشی ترقی کو اعلیٰ تربیت مدارج تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ سماجی انصاف، آزادی اور اخلاقی ترقی کو اولین اہمیت دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے اس کا معاشی نظام سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے اپنے مقصد اپنے مزاج اور اپنے اصولوں کے اعتبار سے مختلف ہے اور ہر حیثیت سے ان سے اعلیٰ اور برتر ہے۔

مزید مطالعے کے لیے

ڈاکٹر یوسف الدین احمد، اسلام کے معاشی نظریے۔ حیدرآباد دکن، ۱۹۵۱۔

ڈاکٹر انور اقبال قریشی، اسلام اور سود۔ حیدرآباد دکن۔

امام ابو یوسف، اسلام کا نظام محاصل (ترجمہ نجات اللہ صدیقی)۔ مکتبہ چراغ راہ، کراچی، ۱۹۶۷۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلام اور جدید معاشی نظریات۔ اسلامک پلیکیشنز لمبٹ، لاہور۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، سود۔ اسلامک پلیکیشنز لمبٹ، لاہور۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، اسلام کا تصور ملکیت۔ اسلامک پلیکیشنز لمبٹ، لاہور۔

اسلام کے معاشی اصول

۳۶۵

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، غیر سودی بنکاری - اسلامک پلیکشنز لیٹڈ، لاہور۔
ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، مضاریت کے شرہی اصول - اسلامک پلیکشنز لیٹڈ،
لاہور۔

ڈاکٹر عبداللطیف، اساس تہذیب - حیدر آباد دکن۔

Shaikh Mahmud Ahmed, *Economics of Islam*, M. Ashraf, Lahore.

Dr. M. Umar Chapra, *Economic System of Islam*, Karachi University,
Karachi.

Dr. Nijatullah Siddiqui, *Some Aspects of Islamic Economy*, Islamic
Publications Ltd., Lahore.

* اسلام کا سیاسی نظام

السان نے اپنی اجتماعی زندگی کی ترتیب و تہذیب کے لیے جو ادارے قائم کئے ہیں ان میں ریاست کا ادارہ سب سے زیادہ اہم اور بنیادی ہے۔ ریاست وہ ہیئت سیاسی ہے جس کے ذریعے سے ایک ملک کے باشندے ایک باقاعدہ حکومت کی شکل میں اپنا اجتماعی نظام قائم کرنے ہیں اور اسے قوت قاهرہ اور قوت نافذہ کا اسیں قرار دیتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں :

”ریاست ایک منظم سماج کا نام ہے۔ یہ اس وقت وجود پذیر ہوئے جب کہ ایک طرف افراد پر اقتدار قائم کرنے اور دوسری طرف افراد کی جانب سے اطاعت کرنے کا دو گونہ رابطہ عمل میں آجائے۔ اطاعت کے امر واقع کا دو نا اس بات کو کافی ہے کہ ریاست موجود ہو گئی ۱۔“

اجتماعی زندگی کے لیے ریاست کا وجود نازکبر ہے۔ انسان جب دوسروں سے معاملات کرتا ہے تو ان معاملات کی ضابطہ بنی کے لیے قانون کی اور اس قانون کو نافذ کرنے والے ادارے کی ضرورت پہلے ہی قدم پر محسوس ہوئے ہے۔ ریاست وہ ادارہ ہے جو سماشی تعلقات، معاشی لین دین اور تمدنی معاملات کی استواری کا نگران و محافظ ہے۔ فرد کو اپنے نشو و ارتقا کے لیے ایک ایسے ماحول کی ضرورت ہے جس میں ایک طرف امن و امان قائم ہو اور دوسری طرف وہ فرد کو ایسی تعام سہولتیں فراہم کر دے جو وہ خود حاصل نہیں کرسکتا۔ دفاع، قیام نظم و قانون، حصول عدل، تعلیم وہ چیزیں ہیں جو ریاست کے ذریعے سے انسان کو حاصل ہوئی ہیں۔

* یہ باب مرتب نے اس کتاب کے لیے بہ طور خاص تحریر کیا ہے۔

۱ مبادی علم السیاست از اسٹینن ل کاک۔

اسلام کا سیاسی نظام

۳۶۴

یہی وجہ ہے کہ انسانی زندگی کی تشكیل میں ریاست کا حصہ بڑا اہم ہے۔ حقیقت کو محسوس کر لیتا تھا اور ہوری انسانی تاریخ ریاست کے استحکام، اس کی تنظیم و تہذیب اور اس کے فروغ و ارتقا کی تاریخ ہے۔ اور دور جدید میں عملی طریقوں کا دائرہ کار برابر بڑھ رہا ہے، اس کے اثر و نفع میں اضافہ ہو رہا ہے اور اس کی قوت اور وسائل میں ترقی ہو رہی ہے۔ دنیا کے تقریباً تمام ہی ممالک میں ریاست کا کام مخفی امن و امان اور نظم و ضبط قائم رکھنا ہی نہیں بلکہ اجتماعی عدل اور سماجی فلاح کا قیام بھی ہے۔ ریاست کا ادارہ ایک مشتمل ادارہ ہے جو زندگی کے اور تصور عدل کا غیر معمولی دخل رہا ہے۔ انصاف وہ محور ہے جس کے گرد سیاسی نظم کا ہر ہر زہر حرکت کرتا ہے۔ چنان چہ ریاست اگر معاشی تعلقات کو ترتیب دیتی ہے تو اس کی وجہ سے کہ عدل قائم ہو، قوانین بنائی یا بدلتی ہے تو اس ایسے وہ اصول انصاف سے زیادہ مطابقت اختیار کر سکیں۔ اخلاق احمس کا غلبہ اس درجہ ہے کہ اگر خود غرض عناصر اپنے مفاد کی بنا پر قانون بناتے ہیں تو ان پر بھی اصول اخلاق و انصاف ہی کا جامہ بھنا کر قوم کے سامنے پیش کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی آئین ملکت نے کوئی اسی شکل اختیار کی ہے جو قوم کی چشم اخلاق میں کھنکتی ہو تو جلد یا باذر انتقال واقع ہوا اور ریاست کی بنیاد ہل کی، نیز یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ استحکام اور صحت مند ارتقا اس وقت حاصل ہوا ہے جب آئین و قانون قوم کے اصول اخلاق اور ان کے اجتماعی ضمیر کے مطابق تھے۔

اسلام اخلاق و سیاست کے اس فطری تعلق کو ایک بنیادی حقیقت کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ اس کے نظام نکر و عمل میں اس جاہلانہ تصور کے لیے کوئی گنجائش نہیں کہ دین و سیاست دو جدا چیزوں ہیں۔ ریاست کا مقصد انصاف قائم کرنا ہے اور یہ کام دین کا ہے کہ وہ ان اصول انصاف اور ضابطہ اخلاق کو فراہم کرے جیسے ریاست قائم کرنے کی کوشش کریں ہے۔

اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور وہ حیات انسانی کے ہر ہبلوں کے لیے ہدایت دیتا ہے۔ اس ہمہ گیر ہدایت کا نام شریعت ہے۔ قرآن میں عین

حکم دیا گیا ہے کہ ہم پوری شربت کا اتباع کریں اور اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جائیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَأَيُّهَا الَّذِينَ آتُوكُمْ خُلُقًا فِي الْيَمَنِ هُوَ أَكْفَافُكُمْ

اے ایمان والوا اسلام میں پورے پورے داخل
ہو جاؤ (البقرہ - ۲۰۸)

اہل کتاب جن۔ احکام خداوندی کو اپنی خواہش و پسند کے مطابق ہانتے، ان ہر تو عمل ہیرا ہو جاتے لیکن جو احکام الہی ان کی خواہش و پسند کے مطابق نہ ہوتے ان سے کئی کترنا جاتے، اس بنا پر ان کو خدا کی جانب سے تمدید کی گئی کہ

الْكُوُنُونُ بَعْضُ الْكِتَابِ وَكُلُّهُ قُرْآنٌ يَهْمُونُ

کیا تم کتاب الہی کے بعض حصوں کو مانتے
ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو؟ (البقرہ - ۸۵)

ہر اس روش کی بابت اس ہلاکت خیز سزا کا اعلان فرمایا:

فَمَا يَجِدُ لَا مَنْ يَفْعَلُ ذَلِكَ مَنْ كُلُّ الْأَخْزَى فِي الْحَيَاةِ الَّتِي لَا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْقِيَامَةِ وَيُدْعَ إِلَى أَنْشَأِ الْعَذَابِ

پس تم میں سے جو شخص ایسا کرے گا اس کی سزا دنیا کی زندگی میں سوانحِ ذلت و نامرادی کے اور کیا ہو سکتی ہے اور قیامت کے دن ایسے لوگوں کو شدید ترین عذاب کی طرف لوٹایا جائے گا۔ (البقرہ - ۸۵)

ان احکام کے بعد زندگی کے کسی بھی حصے کو اسلام کے دائرے سے باہر رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسلام نے اپنی پوری تاریخ میں ریاست کی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا، انبیاء کرام وقت کی اجتماعی قوت کو اسلام کے تابع کرنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ ان کی دعوت کا مرکزی تغییر می ہے تھا کہ اقتدار خدا اور صرف خدا کے لیے ہو جائے اور شرک اپنی ہر جل اور خنی شکل میں ختم کر دیا جائے۔ ان میں سے ہر ایک کی پکار یہی تھی۔

يَقُولُ مَاغْبُدُ اللَّهُ مَا لَكُمْ مِّنَ الْوَغْيَةِ

اے (برادران) قوم! اے ہی کی بندگی کرو،
اس کے سوا تمہارا کوئی اے نہیں ہے۔
(الاعراف - ۶۵)

اسلام کا سیاسی نظام

۴۶۹

إِنَّ الْحُكْمَ لِلَّهِ

(من رکھو) قانون اور حکم خدا کے سوا کسی کے
لیے نہیں۔ (یوسف - ۲۰)

اللَّهُ أَكْبَرُ

خبردار! تخلیق (کی کار فرمائی) اسی کی ہے اور
حکم بھی اسی کے لیے ہے۔ (الاعراف - ۵۲)
اور ان سو، سے ہر ایک نے خدا کی حاکیت کے نعایندے کی حیثیت سے
انہی قوم سے مطالبہ کیا:

فَأَنْقُلُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونَ

افہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔
(الشراء - ۱۶۳)

خدا کے ان فرستادہ بندوں نے زندگی کے ہر شعبے کی اصلاح کی جد و جہد
کی تاکہ خدا کی زین پر خدا کا دین اور اسی کا قانون جاری و ساری ہو۔ ان کی
بے جد و جہد ہوئی زندگی کی اصلاح کے لیے تھی اور ریاست و سیاست کی اصلاح
اس کے ذرائع میں سے ایک اہم ترین ذریعہ تھی۔ قرآن کے مطابع سے معلوم ہوتا ہے
کہ حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، اور حضرت سلیمان
علیہ السلام اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے باقاعدہ اسلامی ریاست قائم کی
اور اسے معیاری شکل میں چلا دیا۔

فکر اسلامی میں ریاست کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے
کہ خود خالق ارض و سماوات انہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا سکھاتا
ہے کہ :

وَقُلْ لِتَأْذِنُ لِي مُدْخَلُ هَذِهِ أَخْرِجْنِي فُرْجَهُ وَصُدُقَ وَاجْعَلْنِي مِنْ أَذْنُوكُلَّهُ أَعْلَمُ

اور (ای نبی) دھا کرو! اے پروردگار، مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ
لے جا، اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار
کو میرا مددگار بنادے۔ (بنی اسرائیل - ۸۰)

یہ آیت ہجرت نبوی سے کچھ ہمیں نازل ہوئی تھی۔ اس تاریخی ہس بیتلر
میں اس کی اہمیت اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اے انہا
یا تو مجھے خود اقتدار عطا کر یا کسی حکومت کو میرا مددگار بنادے تاکہ

اس طاقت سے میں دلیا کے بکار کو درست کر سکوں ، برائیوں کے سیلاں کو روک سکوں ، نیکیوں کو قایم کر سکوں اور تیرے قانون عدل کو جاری کر سکوں۔ اس آیت کی یہی تفسیر حسن بصری اور قتادہ نے کی ہے اور اسی کو ابن جریر اور ابن کثیر جیسے جلیل القدر مفسرین نے اختیار کیا ہے ۔ اس کی تائید ان احادیث سے بھی ہوئی ہے :

ان الله لبزع بالسلطان مala يزع
سدباب کر دینا ہے جن کا سد باب فرقان ہے
بالقرآن (تفسیر ابن کثیر) نہیں کرتا۔

الاسلام والسلطان اخوان تو امان
لا يصلح واحد منها الا لصاحب
فالاسلام اسس والسلطان حارس وملا
اسس له ليهدم وما لا حارس له ضائع۔
(كنز العمال)

اسلام اور حکومت و ریاست دو جزوں بھائی ہیں ۔ دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے بغیر درست نہیں ہو سکتا ۔ پس اسلام کی مثال ایک عمارت کی ہے اور حکومت گوریا اس کی نگہبان ہے ۔ جس عمارت کی بنیاد نہ ہو رہ گر جاتی ہے اور جس کا نگہبان نہ ہو وہ لوٹ لیا جاتا ہے ۔

اسلام ایک قانون شہادت دینا ہے ۔ اس کا اپنا فوجداری اور دیوانی قانون ہے وہ تجارت اور معاملات کے لیے قانونی ہدایت دینا ہے ۔ وہ نکاح و طلاق، وراثت و وصیت، بیع و بہہ کے لیے قوانین دینا ہے ۔ اگر حکومت و اقتدار اس کو حاصل نہ ہو تو اس کی شریعت کا ایک حصہ معطل ہے ۔ بے کار اور ناقابل عمل ہو جاتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام اور حکومت دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے بغیر درست نہیں ہو سکتا ۔

* خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا میں ایک بہت بڑا کام اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کا ایک اہم مقصد حکومت الہی کا قائم کرنا اور دنیا میں انسانی نظام سیاست و اخلاق و معاشرت کا جاری کرنا تھا ۔ یہ نکتہ اچھی طرح سمجھنے کے لائق ہے کہ حکومت الہی کے قیام اور اسلامی نظام و قوانین و حدود کے اجرا اور ماحول کی تبدیلی کے بغیر اصلاح کی سب کوششیں کوہ کندن و کاہ برآوردن ثابت ہوں گی ۔ صرف چند خاص لوگوں کی اصلاح ہو گی ، لیکن ضرورت فضا بدلتے اور جڑ مفبوط کرنے کی ہے ۔ یہی وہ نقشہ ہے جس پر رسول اللہ صلی اللہ

* یہ اقتباس مولانا سید ابوالحسن صاحب ندوی کی کتاب "سیرت سید احمد شہید" سے
ماخوذ ہے ۔ ملاحظہ ہو صفحات ۲۵ - ۲۶ : (مرتب)

علیہ وسلم نے کام کیا اور تجربہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ اور ہائیکار کامیابی اسی کو ہونی اور قیامت تک اسلام کی ترقی کا خاتم یہی نظام عمل ہو سکتا ہے۔

اسلام صرف خواص کا مذہب نہیں اور چند منتخب لوگوں کا اس پر عمل کرنا کافی نہیں، اسی طرح اسلام اکثر مذاہب کی طرح چند عقاید و رسوم کا نام نہیں۔ وہ زندگی کا نظام ہے۔ وہ زمانے کی فضا، طبیعت بشری کا مذائق اور سواد اعظم کا رنگ پہلنا چاہتا ہے اور عقاید کے ساتھ ساتھ اخلاق و معاشرت، زندگی کے مقصد و معیار، زاویہ نظر اور انسانی ذہنیت دو بھی اپنے قالب میں ذہلانا چاہتا ہے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ اس کو مادی و سیاسی اقتدار حاصل ہو، صرف اسی کو فتوں سازی اور نینیم کا حق ہو، اسی کے صحیح نمایاں نہیں کے لیے نمونہ ہوں۔ اسلام کے مادی انسار کا ذریعہ نتیجہ اس کا روحانی اقتدار اور صاحب اقتدار جماعت کے اخلاق و اعمال تی اشاعت ہے۔ اس حقیقت کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے :

الَّذِينَ لَنْ يَكُنُوكُمْ فِي الْأَرْضِ أَقْمُوا الصَّلَاةَ وَأَتُوا الزَّكُوَةَ وَأَمْرُوا بِمَا يَعْرُوفٍ وَنَهَا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلَمْ يُوَعِّظْ بِالْأَمْرِ

یہ مسلمان وہ ہیں کہ اگر ہم یے اپنیں زندگی میں صاحب اقتدار کر دیا (یعنی رَدَّ حکم چلنے لگا) تو وہ فیماز قیم کریں گے، ادنے زکوٰۃ میں سرگرم ہوں گے، نبکیوں کا حکم دیں گے، برائیوں سے روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام کار افہمی کے ہٹئے ہے۔ (الحج - ۴۱)

امر بالمعروف و نهى عن المنکر اسلام میں جس قدر اہم فریضہ ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ امت مسلمہ کے بروپا کرنے کا مقصد یہی بنا یا گیا کہ

لَنْ تُمُرِّخُ إِلَّا خَيْرًا لِلَّذِينَ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَا عَنِ الْمُنْكَرِ

جتنی امتیں (یعنی قومیں) لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کا حکم دیتے ہو اور برے کا وہ سے منع کرنے ہو اور افہم پر ایمان رکھتے ہو۔ (آل عمران - ۱۱۰)

اور قیامت تک کے لیے مسلمانوں کا یہی فرض قرار دیا گیا ہے :

وَلَتَكُنْ مِنْكُمْ أَمَةٌ يَدْعُونَ إِلَى النَّحْيِ الْمَيْسُرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَا عَنِ الْمُنْكَرِ

تم میں ایک جماعت ضرور ایسی ہونی چاہیے جو بہلانی کی طرف دعوت دے، نیک کا حکم کرے اور برائی سے روکے۔ (آل عمران - ۱۰۴)

لیکن یہ یاد رہے کہ اس کے لیے امر (حکم) اور نهى (مانع) کے العاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اعلیٰ سُم جانسے دیں کہ امر و نهى کے لفظ میں اقتدار

اور تعکیب کی شان ہے۔ یہ نہیں فرمایا گیا کہ وہ بھلائی اختیار کرنے کی درخواست و عرض کریں گے اور براہی سے باز رہنے کی التجا کریں گے۔ ہم امر و نہیں کے لیے سیاسی اقتدار اور مادی قوت کی ضرورت ہے اور امت کا فرضیہ ہے کہ وہ اس کا انتظام کرے۔ صحیحین^۱ کی مشہور حدیث ہے:

من زائی منک منکر آف بغیرہ بیده فان تم میں (ہے جو شخص کوئی بدی دیکھے ، اس کو ہاتھ سے (نیکی سے) بدل دے، اگر ایسا نہ لم یستطع ، فبلسانہ ، فلان لم یستطع کر سکے، تو زبان سے روکے، اگر زبان سے بھی نہ روک سکے تو دل سے برا سمجھے اور یہ (آخری درجہ) ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔

ظاہر ہے کہ ”تفیر بالید“ (ہاتھ سے بدل دینے اور عملی اصلاح) کے لیے قوت و اختیار کی ضرورت ہے۔ زبان سے روکنے کے لیے بھی کچھ قدرت اور آزادی کی ضرورت ہے۔ اگر یہ کچھ نہیں تو تیسرے درجے ہر قناعت کرنی ہٹے کی جو ایمان کا آخری درجہ ہے اور جس کے بعد، بعض روایات کے مطابق ”ایک ذرہ برابر بھی ایمان نہیں رہ جاتا۔“ مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ غلامی میں بدی کو دل سے برا سمجھنا اور رشت و نیک کا احساس بھی جاتا رہتا ہے۔

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا

کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا فمیرا

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی فطرت اس بات کا مطالبہ کرتی ہے اور قرآن و حدیث کے نصوص اس امر کا تقاضا کرتے ہیں کہ اسلام کی سر بلندی کے لیے آزاد فضا حاصل کی جائے اور ریاست اور حکومت کو دین کے فروغ اور اسلام کے بنائے ہوئے مقاصد حیات کے لیے ان حدود میں رہ کر استعمال کیا جائے جو قرآن و سنت نے معین کر دی ہیں۔ جو ریاست ان مقاصد کے حصول کے لیے کوشش کرے وہ اسلامی ریاست ہے اور ایسی ریاست کے قیام کے بغیر اسلام کا نصب العین نا مکمل رہے گا۔ خود پاکستان کے قیام کی جدوجہد بھی مسلمانوں کے اسی احساس کا نتیجہ تھی کہ ان کی ایسی ریاست ہونی چاہیے جہاں وہ اپنے عقاید و تصورات اور اپنے قانون حیات کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی گزار سکیں۔

فقہ کے ایک بنیادی مسئلے سے بھی اس پر روشنی ہٹتی ہے۔ اسلامی فکر کے تمام مکاتیب خیال اس امر پر متفق ہیں کہ ملت اسلامیہ کے لیے نصب امامت

^۱ یعنی بخاری اور مسلم۔ (مرتب)

اسلام کا سیاسی نظام

۳۷۴

لازمی ہے، خلیفہ اور امام کا تقرر واجب ہے کیونکہ نظم ملت، قیام امن، حصول نفع و دفع ضرر اور نفاذ احکام شریعت، امامت و خلافت کے قیام کے بغیر ممکن نہیں۔ علامہ ابن حزم اپنی کتاب ”الفصل بین العمل والنحل“ میں لکھتے ہیں :

انفق جمیع اہل السنہ و جمیع المرجئۃ
و جمیع الشیعہ و جمیع الخوارج علی
وجوب الامامة و ان الامة واجب علیها
الانقباد لاما عادل یقین احکام الله
و یوسوہم باحکام الشریعة التي اتی بها
رسول الله صلی الله علیہ وسلم^۱

کل اہل سنت، برجه، شیعہ، خوارج ب
کا اتفاق ہے کہ نصب امام واجب ہے اور یہ کہ
امت بر ایسے امام عادل کی اطاعت واجب ہے
جو افہم تعالیٰ کے احکام قابیم کرے اور ان
احکام شریعت کے مطابق ان کا سیاسی نظام قابیم
کرے جو نبی اکرم صل افہ ملہ وسلم لے کر
آئے ہیں۔

اور شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ رقم طراز ہیں :

”مسلمانوں پر جامع شرائط خلیفہ کا مقرر کرنا واجب بالکفایہ ہے
اور یہ حکم قیاست تک کے لیے ہے“^۲۔

یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر ہوئی امت کا اجماع ہے۔ تمام فرقے اس
ہر متفق ہیں۔ اختلاف اگر ہے تو تقرر و انتخاب کی تفاصیل و جزئیات میں یا ان
کے طریق و شرائط میں ہے لیکن نصب امامت کے وجوب ہو کوئی اختلاف نہیں۔
یہ سب کی نگاہ میں لازمی اور ضروری ہے۔

ہماری اب تک کی بحث سے یہ نتائج نکلنے ہیں :

(۱) ریاست کا ادارہ انسانی سماج کی ایک بنیادی ضرورت ہے اور اس کے
 بغیر منظم اجتماعی زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) اسلام انسان کی پوری زندگی کے لیے هدایت ہے اور اس نے اجتماعی
زندگی کے لیے بھی واضح رہنمائی دی ہے۔

(۳) اسلام دین و سیاست میں کسی طریق کا روادار نہیں۔ وہ ہوئی
زندگی کو خدا کے قانون کے تابع کرنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لیے سیاست کو

^۱ ابن حزم ، السحل ، جلد چہارم ، صفحہ ۸۶
^۲ شاہ ولی افہم ، ازالۃ الخفاء ، مقصد اول ، فصل اول ۔

بھی اسلامی اصولوں پر مرتب کرتا ہے اور ریاست کو اسلام کے قیام اور اس کے استعمال کے لیے استعمال کرتا ہے ۔

(۴) یہ روش دنیا و آخرت دونوں میں عتاب الہی کی موجب ہے کہ کچھ احکام الہی کو تسلیم کر کے اس پر عمل کیا جائے اور کچھ دوسرے اسلامی احکام سے صرف نظر اور روگردانی اختیار کی جائے، خواہ خواہش و نفس کی اندر وہنی وحشت کی بنا پر یا کسی بیرونی دباؤ یا مرعوبیت کی بنا پر ۔

(۵) اسلام اور ریاست و حکومت کا اتنا قریبی تعلق ہے اور یہ ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں کہ اگر ریاست و حکومت اسلام کے بغیر ہوں تو وہ ظلم اور بے انصاف کا ذریعہ بن جاتی ہیں اور ان کے نتیجے میں "چنگیزی" رونما ہوتی ہے । اور اگر اسلام ریاست و حکومت کے بغیر ہو تو اس کے ایک حصے پر عمل ہی ممکن نہیں رہتا ۔ اس لیے ضروری ہے کہ ریاست کو اسلامی بنیادوں پر قائم کیا جائے اور حکومت اسلام کی پابند ہو اور اس کے قیام کے لیے سرگرم عمل رہے ۔

آنچے اب یہ دیکھیں کہ اسلام جو ریاست قائم کرتا ہے اس کی خصوصیات کیا ہیں اور دنیا کے دوسرے سیاسی نظاموں سے کس حد تک مختلف ہے ۔

اسلامی ریاست کی خصوصیات

(۱) اصولی اور نظریاتی ریاست

اسلامی ریاست کی سب سے بہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک اصولی اور نظریاتی ریاست ہے ۔ اس ریاست کی بنیاد نہ نسل ہو ہے اور نہ رنگ ہو، لہ زہان ہو ہے اور نہ وطن پر، نہ محض معاشی مفاد کا اشتراک اس کی اساس ہے اور نہ محض سیاسی العاق ۔ اس ریاست کی اصل بنیاد یہ ہے کہ یہ اسلامی نظریہ حیات کی علم بوددار، اس کی تابع اور اس کو قائم کرنے والی ہے ۔ جو ریاست خدا کی سیاسی حاکمیت کا اعلان کرے اور اس کے قانون کو نافذ کرنے والی بنے وہ اسلامی ریاست ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ ہر ریاست کی طرح اسلامی ریاست کے لیے بھی ایک متعین علاقہ اور آبادی ہونا ضروری ہے، اور اس سرزمین کی حفاظت اور

^۱ جلال پدشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو ۔ جدا ہو دین سیاست سے تورہ جتنی ہے چنگیزی (اقبال)

اس کے رہنے والوں کی فلاح و بہبود ہر الحمدہ سر کے ساتھی رہتی ہے ایک اسلام ریاست کی امتیازی خصوصیت یہ ہے وہ ایک اطرافی ریاست ہے اور ایک اپسے اپس کی نظر ہے مگر ہم انسانوں نے اسے بکسانا ہے۔

سورہ حج کی وہ آیت کہدی چکی ہے، جس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

یہ مسلمان وہ ہیں کہ اگر ہم نے انہیں زمین میں صاحب اقتدار کر دیا تو وہ نماز قایم کریں گے، اداۓ زکوٰۃ میں سرگرم رہیں گے، نیکیوں کا حکم دیں گے، برائیوں سے روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام کار خدا کے ہاتھ میں ہے (الحج - ۲۱)

اور ایک دوسری جگہ ارشاد الہی ہے کہ

لَقَدْ أَنْذَلْنَا عَلَيْكُمْ مِنَ الْأَنْفُسِ مَا يُبَغِّضُونَ وَأَنْزَلْنَا مِعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْيَمِينَ لِيَقُولُوا نَأَسُ بِالْفُطُولِ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَلُوشٌ شَدِيدُونَ
مُتَّقِفُرُ لِلثَّالِثِ وَلِعَدْمِ الْمُلْكِ مَنْ يَتَّخِذُهُ وَرُسُلَنَا بِالْفُطُولِ

ہم نے اپنے رسول واضح نشانیاں دے کر بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (محل) اتاری، تاکہ انسان انصاف پر قائم رہیں اور ہم نے اتارا لوہا (ریاست کی قوت و جبروت) جس میں سخت خطرہ ہے اور لوگوں کے لیے بہت فوائد بھی ہیں۔ تاکہ اللہ جان لے کہ کون اس (کے دین) کی اور اس کے وسلوں کی بن دیکھی مدد کرتا ہے۔ (الحدید - ۲۵)

اسی طرح سورہ النور میں ارشاد ہوا ہے کہ

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لِيُتَبَلِّغُنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَحْلَفُتِ الظَّنِينَ مِنْ قِيمَتِهِ وَلَيَكُنْ لَهُمْ دُنْيَا هُمُ الَّذِي أَرَضَنِي لَهُمْ وَلَيَكُنْ لَهُمْ قِيمَنَ بَعْدَ حُوْفَهُمْ أَمَّا نَيْبُدُ وَنَبْتَ لَأَثْيَرُونَ فِي شَيْئِنَا وَمَنْ قَرَرَ بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَسِيقُونَ وَآتِيْمُوا الْأَصْلَوَةَ وَآتُوا الْزَّكُوْرَةَ وَآتِيْمُوا الرَّبُوْلَ لَعَلَّكُمْ تَرْجِمُونَ

تم میں جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو زمین میں حکومت مطا فرمانے گا جس کے ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی اور جس دین کو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے اس کو ان کے لیے قوت دے گا اور خوف و هراس کے بعد ان کو امن بخشی گا۔ وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کریں گے، اور جو اس کے بعد نافرمانی کے روشن اختیار کریں گے وہ فائق ہیں، اور (اے مسلمانو) نماز قایم کرو اور زکوٰۃ کی ادائیگی کرنے رہو اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ (النور - ۵۵ - ۵۶)

ان ایات سے معلوم ہوا کہ اسلام میں حکومت کا مقصد دین کو قائم کرنا، خدا کی کتاب کے مطابق انصاف قائم کرنا، نیکیوں کا حکم دینا اور بروائیوں کو روکنا ہے۔ یہ ریاست ایک نظریاتی اور مقصدی ریاست ہے اور اس کی اصل ذمہ داری اس اصول کی سر بلندی ہے جسے قائم کرنے کے لیے یہ وجود میں لانے جائز ہے۔

اسلام میں قانون حکومت و ریاست پر فوقیت رکھتا ہے اور خود حکومت خدا کے قانون کی ہابند اور اس کے تابع ہوتے ہیں۔ ریاست کلی اختیارات کی حامل نہیں بلکہ یہ اپنے اختیارات خدا کے قانون سے حاصل کرتے ہیں اور اس کی ہابند و ماتحت ہے۔ اس میں اصول اطاعت بھی ہے کہ خدا اور اس کے رسول کی اطاعت ہر اطاعت سے بلند و بالا ہے۔ ہر شخص کی بنیادی وفاداری شریعت سے ہے۔ ریاست کی وفاداری اسی وقت تک ہے جب تک وہ خدا اور اس کے رسول کی وفادار ہے اور اگر وہ ان کی بے وفائی کرے تو مسلمان ہرگز اس کی اطاعت کے ہابند نہیں ہے۔ اس اصول کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذْ يُحِبُّو اللَّهَ وَأَطْبِعُوا الرَّسُولَ وَأُولَئِكَ الْمُرْءُونَ فَإِنَّمَا قَلِيلٌ مِّنَ الْمُجْرِمِينَ فَلَمَّا تَلَقَّعَتْ فِي شَفَقٍ وَفَرَدَوْهُ لِلَّهِ الْفَرِدَادُ
وَالرَّسُولُ لِنَكْثَرُ الظَّمِينُونَ بِهِنْوَ وَالْيَوْمُ الْآخِرُ

ایمان لانے والوں اطاعت کرو افہ کی، اور اطاعت کرو رسول کی، اور ان لوگوں کی تو اے افہ اور رسول کی طرف پہنچو، اگر تم واقعی افہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔ (الناء - ۵۹)

اس آیت ربانی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ —

۱- اصل اطاعت اللہ اور اس کے رسول کی ہے۔ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا مرکز و محور خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری اور وفاداری ہے۔ دوسری اطاعتیں صرف اس صورت میں قابل قبول ہوں گی جب وہ خدا اور رسول کی اطاعت کے تحت اور تابع ہوں۔ خدا اور رسول کے احکام کے علی الرغم کسی کی اطاعت جائز نہیں۔ اسی حقیقت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح واضح فرمایا ہے کہ :

لَا طَاعَةَ لِخَلْقٍ فِي مُعْصِيَةِ الْخَالِقِ . خالق کی فرمانی میں کسی مخلوق کے لیے کوئی اطاعت نہیں۔

۴۔ مسلمانوں کے اولی الامر، یعنی وہ اصحاب اقتدار جنہیں فیصلہ کن سے ہونے چاہئیں۔ "مینکم" (تم میں سے) کا اشارہ اسی حقیقت کی طرف ہے۔ اس لیے اسلامی ریاست کے کالیدی مناصب انہی افراد کے پاس ہونے چاہئیں جو مسلمان ہیں۔

۵۔ اولی الامر کی اطاعت اور ان کی فرمان برداری مسلمانوں کے لیے ضروری کی گئی ہے تاکہ زندگی کا نظام بہ حسن و خوبی چلے اور بے وجہ اس میں اختلال واقع نہ ہو۔ لیکن اولی الامر کی بہ اطاعت خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کے تابع ہے۔ اگر وہ کوئی اپسا حکم دیں جو قرآن و سنت کے خلاف ہو تو اس کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے اولی الامر کی بات سنے اور مانے خواہ اے
ہسند ہو یا ناہسند، تاوقتے کہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے۔ اور
جب اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو ہر اسے نہ کچھ سنتا چاہیے اور
نہ مانتا چاہیے"

(بخاری و مسلم)

اس پر یہ اعتراض کیا جانا ہے کہ اس طرح توہم غیر مسلموں کے ساتھ امتیاز برقراری گے۔ لیکن یہ اعتراض اس حقیقت کو نہ سمجھنے پر ہے کہ اسلامی ریاست ایک اصول و نظریہ ریاست ہے اور اس کا مقابلہ مغض قومی ریاست ہے نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی اصول ریاست اپنا سربراہ امن شخص کو نہیں بنایا سکتی جو اس اصولوں پر ایمان ہے نہ رکھتا ہو۔ یہ بات اتنی صاف اور واضح ہے کہ آج کی مغرب دنیا بھی اسے محصور کر رہی ہے۔ ایک اشتراکی ریاست کا سربراہ ایک غیر اشتراک نہیں ہو سکتا۔ ایک ذافت ریاست کا صدر ایک اشتراکی نہیں بن سکتا حتیٰ کہ جمہوری ممالک بھی سوچ رہے ہیں کہ کیا ان حضرات کو جو جمہوریت پر یقین نہ رکھتے ہوں برسر اقتدار لا دیا جاسکتا ہے؟ کہیا میں الیکشن کے ذریعے اشتراکیوں کی کامیابی نے اس منشاء کو پیدا کیا اور اس پر برطانوی پارلیمنٹ کے لئے کر سیاسی مفکرین نکل کر کہنے پر مجبور ہوئے کہ جمہوریت اس کو گوارا نہیں کر سکتی۔ (ملاحظہ ہو برٹینڈر مل کا مضمون در "مانچستر گارڈین" ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۲ء) ذیل ٹیلیگراف لندن کا سیاسی مبصر اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے: "ہم اشتراکی پارٹی کو اقتدار کے لیے جدوجہد کی آزادی اس لیے دیتے ہیں کہ ہمیں یقین ہے کہ اس کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔ اگر اس کی کامیابی کا کوئی بھی امکان پیدا ہو جائے تو ہماری سیاسی جیلت ہمیں فوراً یہ سوچنے پر مجبور کر دے گی کہ ہم اپنے جمہوری مفروضوں کو بدلتیں۔ اشتراکیت امریکی و برطانوی جمہوری روایت کو اس بڑی طرح تہ و بالا کر دیتی ہے کہ اشتراکیوں کی انتخابی فتح کو بھی

(باقی صفحہ ۲۸ پر)

- اولی الامر سے بحث و مذاکرہ، ان سے اختلاف اور ان پر تنقید و محاسبہ کی اجازت اور ضمالت بھی بہ آبیت دبیتی ہے، ہمیں حق دیا گیا ہے کہ ان سے اختلاف کریں اور بالآخر فیصلہ سرف خدا اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق ہو۔ لیکن یہ تنقید اور اختلاف حدود قانون میں رہتے ہوئے ہونا چاہیے۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :

”تم ہر ایسے لوگ بھی حکومت کریں گے جن کی بعض باتوں کو تم معروف پاؤ گے اور بعض کو منکر۔ تو جس نے ان کے منکرات ہر اظہار ناراضی کیا وہ بڑی الذمہ ہوا اور جس نے ان کو ناپسند کیا وہ بھی بچ گیا مگر جو ان پر راضی ہوا اور پیروی کرنے لگا وہ مانخوذ ہو گا“ (سلم)

یہ اصول وفاداری اس بات کو بالکل واضح کر دیتے ہے کہ اسلامی ریاست ایک اصولی اور نظریاتی ریاست ہے۔ اس کا مقصد ایک نظریے کو سر بلند کرنا ہے اور اس میں اطاعت ایک اصول کی ہے مخفی اقتدار کی نہیں۔

اسلامی ریاست کے اصول اور نظریاتی ہونے سے چند امور ہر مزید روشنی

ہوتی ہے :

(بقیہ صفحہ ۴۴۴)

جمهوری قرار دینا نہایت کھلی کھلی ارتکاد کے متراffد ہو گا۔ (ملحوظہ ہو پیریگرین ورس تھارن کا مضمون ”جمهوریت بنام آزادی“، مطبوعہ اینکاؤنٹر، لندن، جنوری۔ سن ۱۹۵۲ صفحہ ۱۳)

مغربی ممالک کے دستائر کے مطالعے سے معلوم ہونا ہے کہ آج بھی وہ خود مذہبی اور دوسری بینادوں پر شہریوں کے دریان امیگریز کرتے ہیں اور اسے جمهوریت کے منافی نہیں سمجھتے۔ انگلستان میں سربراہ ملک کے لیے پرونست فرقہ میں بھی انگریزی کلب اکا کے دستور کی رو سے صدر یا نائب صدر صرف کبھی کبھی ہونا ضروری ہے۔ ارجمندان میں بادشاہ کے لیے صرف عیانی ہی نہیں بلکہ ایونجیلیکل ہرج (ایک خاص فرقہ) کا پیرو ہونا ضروری ہے۔ ناروے میں بھی بادشاہ کے لیے ایونجیلیکل ہونا ضروری ہے۔ بھی قانون سویڈن کا ہے جہاں بادشاہ کے ساتھ اسٹیٹ کونسل کے ارکان کے لیے بھی ایونجیلیکل ہونا ضروری ہے۔ یونان میں بادشاہ کے لیے مشرقی میسیحی کلب اکا پیرو ہونا ضروری ہے۔ اسپن میں صدر مملکت کے لیے رومی کبھی کبھی ہونا ضروری ہے۔ تھائی لینڈ کے دستور میں صراحةً ہے کہ اس کا سربراہ لازماً بدھ: متاپیرو ہو۔ سوال یہ ہے کہ اگر وہ ریاستیں جو لیے ایک خاص مذہب (حتّیٰ کہ فرقہ) کا پیرو ہونا ضروری سمجھتی ہیں تو اسلامی ریاست بھی ظاہر نظریاتی ریاستیں نہیں ہیں اور اپنے کو لا مذہبی (ایکولر) کہتی ہیں اولی الامر کے جو ہے ہے ایک نظریاتی ریاست اور اس بات کا صاف اعلان بھی کرتی ہے کہ وہ ایک اصول ریاست ہے، یہ کبھی گوارہ کر سکتی ہے کہ اس کے کلیئی مناسب ان افراد کے ہاتھوں میں ہوں جو اصول ہی کو نہیں مانتے۔

(۱) اسلام ملکہ (جامیہ) خود ایک مقصد نہیں بلکہ ایک اعلیٰ ہر مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اس طرح یہ فاسدت ریاست سے بالکل مختلف ہے جہاں ریاست خود مقصد بن جلو ہے اور فرد کی کوئی مستقل بالذات حیثیت نہیں رہتی۔ اسلامی ریاست کا مقصد افراد کو وہ موقع فراہم کرنا ہے جن کے ذریعے سے وہ خدا اور اس کے رسول کے احکام کو ہورا کرسکیں۔ یہ ریاست خود اس بالاتر قانون کی تابع ہے یہی وجہ ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائے ہیں کہ ”انا اول المسلمين“ (میں اطاعت الہی کرنے والوں میں سب سے پہلا ہوں) اور اسلام کا قانون سربراہ سلطنت ہر بھی اسی طرح لاگو ہوتا ہے جس طرح ایک عام شہری ہر۔

(ب) اسلامی ریاست ایک لا دینی قومی ریاست سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ لا دینی ریاست وہ ریاست ہے جو اپنے معاملات اور مسلک کو مذہب اور الہامی ہدایت پر مبنی کرنے کے بغایہِ حضن عقل و مصلحت سے اپنا کام چلاتی ہے اور کسی بالاتر قانون کی ہابند نہیں ہوتی۔ ایسی ریاست مذہب کے معاملے میں غیر جالب دار بھی ہو سکتی ہے اور اجتماعی معاملات میں اس کی مخالف بھی۔ ایسی ریاست اسلام کی بالکل ضد ہے۔ اسلام دنیاہی معاملات کی اصلاح چاہتا ہے لیکن خدا کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر نہیں بلکہ اس کی روشنی میں۔

اسلام اور لا دینی ریاست

اج چون کہ لا دینی ریاست کا چلن ہے اس لیے اس کے بارے میں چند باتوں کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

مغرب میں لا دینی ریاست کا تغییر ایک خاص ہی منظر کی پیداوار ہے۔ وہاں ہاہاٹی نظام نے جو شکل اختیار کر لی تھی اور مذہب کے نام پر بادشاہوں سے گئے جوڑ کے ذریعے سے جن مظالم کو سند جواز دی گئی تھی انہوں نے ایک رد عمل پیدا کیا۔ عیسائیت کی مخالفت میں اتنی بے اعتدال پیدا ہوئی کہ خود مذہب ہی کے خلاف بغاوت کر دی گئی اور اس بغاوت کا سیاسی مظہر لا دینی ریاست تھی۔

سیکولرزم کی تعریک کا باقاعدہ آغاز ۱۸۳۶ء میں ہوا جب جیکب ھولیک نے سیاست کو مذہب سے ہاک رکھنے کی بہ تعریک قابیم کی۔ اس تعریک کی سربراہی اہل فکر و سیاست کے ہاتھوں میں رہی اور بہت جلد اس مسلک کو سیاسی قبولیت حاصل ہو گئی۔ مختصرًا اس تعریک کا مقصد یہ تھا کہ مذہب کا دائیہ انفرادی زندگی تک محدود رہنا چاہیے اور اسے اجتماعی اور سیاسی زندگی میں کوئی مداخلت نہیں کرف چاہیے۔ شروع میں ہات صرف مذہب کے معاملے میں غیر جانب داری اور فرد کی کامل آزادی کی تھی لیکن بعد میں اس تعریک کا ابک حمہ مذہب کی مخالفت اور جارحانہ مادیت یا اشتراکیت کا داعی بن گیا۔

مغرب میں لادینت کے جو اثرات رونما ہوئے ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) سیکولرزم نے تشکیک اور ذہنی ہرگزندگی پیدا کی ہے۔ کوئی ابک نصب العین انسان کے سامنے نہیں رہا اور ایک قسم کی بے عقیدگی انسان میں بھیل گئی ہے۔ بہ اسی ذہنی انتشار اور فکری تشتت ہی کا نتیجہ ہے کہ اشتراکیت اور فسطائیت جیسی تعریکوں نے جنم لہا اور انسان کو مادہ ہرستی کی التہاکی طرف لے گیں۔ اشتراکیت کا مشہور نقاد اُر۔ این۔ کربوہنٹ لکھتا ہے:

”اشتراکیت غربت و افلام اور خراب صاحبی حالات کی پیداوار نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کی اصلی کشش نچلے افلام زدہ طبقات کے مقابلے میں اچھی تنخواہ والے مزدوروں اور تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ کارکنوں کے لیے ہے۔ بہ اس امر کا نتیجہ بھی نہیں ہے کہ عوام میں اب سرمایہ دارانہ نظام کی خبائتوں اور بے انصافیوں کا شعور پیدا ہو گیا ہے اور نہ ہی بہ نظام پیداوار کی اکنادبیے والی یکسانی اور عدم تنوع کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے اور آخری تعزیہ ہمیں اسی نتیجہ تک لاتا ہے کہ اشتراکیت ان نظریات کے مجموعے کا نام ہے جنہوں نے ہماری زندگی کے اس خلا کو پر کیا ہے جسے منظم مذہب کے انهدام نے پیدا کیا تھا اور جو زندگی پر لادینت کے غلبے کا لازمی نتیجہ تھا۔ اور اس نظام فکر و عمل کا مقابلہ اگر کیا جاسکتا ہے تو ابک دوسرے ہمہ گیر نظام حیات ہی سے کیا جا سکتا ہے جو کچھ دوسرے اصولوں کا علم بردار ہو۔“

اسلام کا مہماں نکام

اور جو حضرات اشتراکیت کی طرف نہیں مجھے پڑھو ہے
اضطراب، جذباق تلوں اور بے عقیدگی کا نیکار ہوئے ہیں۔

(۲) فرد کے سامنے نیا نصب العین صری ذاتی المراض و خواصت کو جھکھٹ کر کر رہ گیا اور قومی پیمانے پر مصلحت اور موقع برمنی نے الفرادی اور انسانیت کے سے کو ظلم سے بھر دیا اور کوئی مستقل ظاہطہ، اخلاق ملکی اور نویں رسم کے سے باقی نہ رہا۔ نتیجتاً اس صدی نے دو ایسی ہولناک عالمی جنگوں کا سامنہ کیا جن میں ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی تعداد انسانیت کی ہو ری تاریخ کی تسلیم جنگوں کے مجموعی مقتولین و سجروہین کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔

(۳) اس کے عام اخلاق اثرات بھی تباہ کرنے تھے۔ سنتقل مزاجی، ہماری، جرأت اور سب سے بڑھ کر نیکی اور بدی میں تمیز کا مادہ ختم ہونے لگا اور سفاد ہوتی، مصلحت بینی اور این الوقتی الفرادی اور اجتماعی اخلاق کی بنیاد بن گئے۔ اس کے نتیجے میں ہزاروں سماجی اور ہماشری برابریاں رونما ہوئیں جو عماشے کو سکون و اطمینان سے محروم کرنے ہوئے ہیں۔

(۴) تعجب ہے بتایا ہے کہ اگر خالص مادی فائدہ پیش نظر ہو اور کوئی اعلیٰ اخلاق اور روحانی نظام موجود نہ ہو، تو محض مادی فائدہ بھی انسان کو حاصل نہیں ہوتا ہے، آرنلڈ ٹائن بی سیکولرزم کے نتائج کا جائزہ لے کر کھلی الفاظ میں اس کی ناکامی کا اعتراف کرتا ہے:

” یہ اب واضح ہو گیا ہے کہ اگر صرف دنیاوی خوشی کو مقصد زیست بنا دیا جائے گا تو اس میں فرد کی مادی خوشحالی اور دنیاوی سکون کا حصول بھی ناممکن ہے، خان یہ قابل فہم ہے کہ اگر سیکولرزم سے بلند و بالا کوئی روحانی مقصد سامنے رکھا جائے تو ایک ضمنی نتیجے کی حیثیت سے انسان کو دنیاوی خوشی بھی حاصل ہو جائے گا ۔ ”

(۵) پھر حقیقت یہ ہے کہ سیکولرزم عملاً ناکام ہی نہیں ہوا ہے بلکہ تاریخ اب سیکولرزم سے بہت آگے نکل چکی ہے۔ اگر کھری نکاہ سے دیکھا جائے تو

سیکولرزم اُج ایک دیگانوں اور ارکار رفتہ تصور ہے اور گردش ایام کے اس کی مارف لوٹنے کا کچھ امکان نہیں، سیکولرزم کچھ خاص تاریخی عوامل کی پیداوار تھا اور ایک سختی مخصوص فضا ہی میں وہ کام کر سکتا ہے۔ اگر وہ عوامل موجود نہ ہوں تو اس کا کام اپنے رہنا ممکن نہیں ہے۔

سیکولرزم، جیسا کہ ہم نے اوہر کہا، اس نظام کو کہتے ہیں جس میں سیاسی اور ریاستی معاملات میں مذہب کو کوئی دخل نہ ہو۔ لیکن اگر مزید تعزیز کیا جائے تو بات پہاں آجائی ہے کہ پہ مذہبی اور نظریاتی غیر جانبداری کا داعی ہے۔ انیسویں صدی کی سیاسی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیکولرزم، انفرادیت، قومیت، معاشی امور میں مکمل آزادی اور ریاست کی عدم مداخلت سیاست کے بنیادی تصورات تھے۔ اور یہ تمام تصورات ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ سیکولرزم اس وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب ریاست صرف ایک دفاعی ادارہ (ہولیس اسٹٹ) ہو یعنی اس کی ذمہ داری محض نظم و نسق کو قابو رکھنا اور ملک کو ہیروئن حملے اور اندریونی بدامنی سے بچانا ہو۔ ایسے ہی نظام ریاست میں فرد کو ہوری ہوری آزادی دی جا سکتی ہے کہ وہ جس طرح چاہے زندگی گذارے اور صرف اسی صورت میں حکومت (کم از کم نظری حد تک) مذہبی اور نظریاتی غیر جانبداری کو روکہ سکتی ہے۔ اور یہی تصور انیسویں صدی میں تھا، لیکن اُج ریاست کا تصور بدل گیا ہے۔ اُج ریاست محض ایک عظیم الشان بت نہیں، اُج یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک خاص دائیرے کو چھوڑ دئے ملک میں جو کچھ بھی ہوتا رہنے ریاست عدم مداخلت ہر کاربند رہے گی۔ اُج اس کے وظائف نہایت عظیم اور اس کا دائرة کار نہایت وسیع ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبے کی صورت گری کر دے اور اپنی ہالیسی کے ذریعے سے اس کی خاطری بندی کر دے۔ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ جمہالت کو ختم کرے اور علم کی شعبیں روشن کرے، خربت کو ختم کرے اور دولت کی منصافانہ تقسیم کی کوشش کرے، سماجی بوانیوں کا قلع قلع کرے اور شہریوں کی اخلاق اور معاشری تعلیم کا بندویست کرے۔ بیماریوں کا علاج، مظلوموں کی داد رسی، مجبوروں کی مدد و استعانت کا اہتمام کرے۔ مختصرًا، اُج کی ریاست ایک فلاہی ریاست ہے اور اس کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ نظریاتی غیر جانب داری برت سکے۔ اسے تو کچھ نہ کچھ اقدار کو ماننا ہوگا، کسی نہ کسی نظریے کو قبول کرنا ہوگا، خیر و شر اور فلاح و خسران کے کسی نہ کسی معیار کو اختیار کرنا ہوگا اور

اس کی روشنی میں اپنی پوری ہالیسی کو ترتیب دینا ہوا ۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی ریاست ایک نظریاتی ریاست بنتی جا رہی ہے اور وہ بنیادیں جن پر سیکولرزم کا نظام فکر قائم تھا تاریخی یادوں کی حیثیت سے تو ضرور موجود ہیں لیکن دلیائے حقیقت میں ان کا کوئی وجود نہیں ۔ جن بنیادوں پر یہ قلعہ تعمیر ہوا تھا وہ کرچکی ہیں اور بعض تمناؤں کے ذریعے سے اس خلا کو پُر نہیں کیا جاسکتا ۔ آج دنیا میں سیکولرزم کے لیے کوئی گنجائش نہیں ، تاریخ اسے بہت پیچھے چھوڑ آئی ہے آج کی ضرورت نظریاتی ریاست ہے جو سیکولرزم کی عین ضد ہے اور جسے اسلام قائم کرنے کا داعی ہے ۔

(ج) اسلامی ریاست ایک خالص قومی ریاست سے بھی مختلف ہے اس لیے کہ اس کی بنیاد مخصوص قوم ہر نہیں نظریہ اور اصول ہر ہے ۔ اور ہمار خود اس کا تصور قومیت بھی دوسروں سے مختلف ہے ۔ اسلام ایک بالکل نئی طرز کی قومیت ۔ نظریاتی قومیت ۔ کا تصور پیش کرتا ہے اور اسلامی ریاست اس نئے تصور کی علم بردار ہوئے ۔ اس ریاست کے لیے جغرافیائی حدود تو ناگزیر ہیں لیکن اس کی اصل دعوت یہ ہے کہ انسانیت رنگ ، نسل ، زبان ، اور محدود وطنیت کی معنوی وابندیوں کو توز کر ایک نظریاتی قومیت اختیار کرے اور اسی بنیاد پر ایک عالم گیر ریاست قائم کرے ۔ جب تک یہ نصب العین حاصل ہو جغرافیائی حد بندیوں کو گوارا کرنا ہوا لیکن پوری امت کی وحدت یا کم از کم اس کی ایک دولت مشترکہ کا قیام ایسی ریاست کے پیش نظر رہے گا ۔ اس طرح یہ ان ریاستوں سے بھی مختلف ہوگی جو شخص جغرافیائی قومیت پر بینی ہیں اور جن کے پاس کوئی نظریہ اور دعوت نہیں ۔

(د) اسلامی ریاست بلا شبہ حکومت الہیہ کی داعی ہے لیکن یہ پاپائی ریاست اور تھاکریسی سے قطعاً مختلف ہے ۔

اسلام اور تھاکریسی

تھاکریسی وہ نظام حکومت ہے جس میں حرم رائی کے اختیارات خدا کو ہوں اور سذھبی ہروہتوں کا طبقہ اس کے نمايندے کی حیثیت سے بہ کام انجام دے ۔

روائیوں پانک "مذہب اور مذاہب کی قاموں" میں اس کی بہ تعریف کرتا ہے:

" حکومت کی ایک ایسی قسم جس میں اقتدار اعلیٰ کا مرکز خدا یا خداوں یا کسی اور کتابی قوت کو سمجھا جائے، حقیقی حکم ران پادری یا سذھی پروhet ہوں اور قوانین کو احکام خداوندی سمجھا جائے ۔ "

تاریخی حیثیت سے اس کی مثالیں یہودیوں، عیسائیوں اور برہمنوں وغیرہ میں ملتی ہیں ۔

اسلامی ریاست خدا کی حاکمیت اعلیٰ پر مبنی ہے لیکن بہ تہیا کریسی سے بنیادی طور پر مختلف ہے اور وجہ اختلاف مختصرًا یہ ہیں:

(۱) تہیا کریسی میں حاکمیت کے عملی اختیارات ایک مخصوص مذہبی طبقے کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں جو سیاہ و سفید کا مالک ہوتا ہے، جس کی رائے قانون ہوئی ہے، جس پر کوئی تنقید نہیں کر سکتا، جو خدا کے نام پر سارے اختیارات بلا روک ٹوک استعمال کرتا ہے اور کسی کے سامنے جواب دے نہیں ہوتا۔ اسلام میں ایسے کسی مستقل طبقے کا کوئی وجود نہیں ۔ بندے اور خدا کے تعلق کو استوار کرنے کے لیے بہاں پروہتوں کے کسی واسطہ اور ذریعہ کی ضرورت نہیں۔ اسلام کی تعلیمات نہ صرف ہر مسلمان کے لیے ایک کاملی ہوئی کتاب کی طرح ہیں بلکہ ان سے واقفیت ہر مسلمان کا فرض بھی ہے ۔ سیاست میں بھی نظام حکومت چلانے والے خدا اور آمت دونوں کے سامنے جواب دے ہوتے ہیں اسلامی ریاست کے اصحاب امر کے لیے کوئی شرط ہے تو وہ علم اور تقویٰ کی ہے اور ان کے حصول کے دروازت سے کے لیے کامل ہونے ہیں ۔

(۲) اسلامی تاریخ میں ہمیں کہبی اس قسم کی پاپائیت نظر نہیں آئی جیسی زرپ یا خندوستان، ہماں اور بت میں ملتی ہے ۔ ہمارے بہان علماء، حق کے علم بودار اور آزادی کے محافظت کی حیثیت سے نظر آتے ہیں ۔ وہ خود ظلم و ستم اور استبداد کا نشانہ ہے ہیں؛ ان کا ذریعہ نہیں۔ آزادی کی جدوجہد کے سرخیل رہے ہیں اور عالم ہنسنے کا راسہ ہر شخص کے لیے کھلا رہا ہے ۔ نیز عام سیاسی تاریخ میں بھی کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ حکومت یورپ کے "مذہبی دیوانوں" کی طرح عوام کو نشانہ ستم ناتی ہو ۔ اس کا اعتراف خود مغربی مورخین کرتے ہیں

کہ مذہبی حکومت کے سلسلے میں بورپ کا تجربہ اور عالم اسلامی کا تجربہ انک دوسرے سے بکسر مختلف ہے۔ رابرت بریفاؤٹ لکھتا ہے:

”شرق (مراد ہے عالم اسلام) میں تھیا کریسی کبھی بھی ذہنی استبداد کا موجب نہیں بنی۔ ہم بہان ظلمت پسندی، خیالات ہر قدم نہیں، اور علم ہر ہائیڈی کی کوئی ایسی مثال نہیں ہاتے جس کے لیے مغرب دنیا یونان اور روم سمت مشہور ہے۔“

(۲) دوسرے مذاہب اور تہذیبوں میں تھیا کریسی میں نام تو خدا کا تھا لیکن چون کہ ان کے پاس زندگی کے ہمه جہتی سائل کے لیے کوئی واضح الہامی ہدایت موجود نہ تھی اس لیے ہادریوں اور ہروہتوں نے خدا کے نام ہر اپنی رائے ہیش کی اور خدا کے قانون کے بجائے اپنا قانون چلا جا جو ان تمام کمزوریوں اور خامیوں سے آلوہہ تھا جن سے انسانی قانون، خصوصیت سے جب وہ ایک طبقے کے مفاد کا محافظ بھی ہو، ہوا کرتا ہے، اسی لیے مذہبی طبقے کو تنقید سے بالا فرار دیا گیا تاکہ اس کی ہر بات میں چون و چرا تسلیم کری جائے خواہ وہ کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو۔ اسلام کا سیاسی نظام اس نظام سے بالکل مختلف ہے۔ بہان واضح الہامی ہدایت موجود ہے جو اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہے اور جس میں ایک شوشیر کا تغیری بھی واقع نہیں ہوا ہے اور نہیں کیا جا سکتا۔ اول الامر سے اختلاف کی بوری بوری گنجائش ہے بلکہ ان ہر تنقید اور محاسبہ فرض کیجئے ہیں۔ تاکہ وہ راہ صواب سے نہ ہیں۔ ہر شخص کو اپنی دلیل خدا کے کلام سے لانی ہے جو کسی کا اجارہ نہیں اور جس تک ہر شخص کی رسائی ہے۔ ضرورت صرف علم کی ہے۔ یہ چیز اسلامی نظام کو تھیا کریسی سے بالکل مختلف کر دیتی ہے۔

(۳) تھیا کریسی اور اسلام کے مزاج میں ایک اور بھی بڑا لطیف لیکن یہ حد اہم فرق ہا ہا جاتا ہے۔ تھیا کریسی کا ایک بنیادی تصور یہ رہا ہے کہ یہ دلیا ایک بُری چیز ہے، اس کی زندگی میں گناہ کی ہاداش میں اختیار کرنی ہُری ہے، اس کی حیثیت ایک ”دارالعذاب“ کی سی ہے اور تمام انسانوں کو اس مزما کو برداشت کرنا چاہیے۔ اس تصور کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست کی

اصلاح اور درستگی اور اس کے مظالم کے خلاف آواز بلند کرنا یا جد و جمہہ کرنا ایک غیر مطلوب ہے بن جانے ہیں اور انسان "تسلیم و رضا" کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ اسلام کا نقطہ نظر بالکل مختلف ہے۔ انسان خدا کا خلیفہ بنایا گیا ہے۔ زندگی کی نعمتیں اس کے لیے فراہم کی گئی ہیں اور ریاست کا مقصد زندگی کو نیکیوں اور اچھائیوں سے بھرنا اور ایک فلاحتی معاشرہ قائم کرنا ہے۔ ضرورت صرف علم کی ہے۔ ان طرح جو نفسیات رویہ بھاں پیدا ہوتا ہے وہ تھبیا کریں کی بالکل خد ہے۔

ہم ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کا نظام تھبیا کریں کی بالکل مختلف ہے۔ ہماری یہ پہنچ ہے کہ اسلامی ریاست اپنا ایک مخصوص مزاج رکھتی ہے اور وہ ایک اصولی، مقصدی اور نظریاتی ریاست ہے۔

۲ - شورائی اور جمہوری ریاست

اسلامی ریاست کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اپک شورائی اور جمہوری ریاست ہے، اس میں تمام انسان برابر ہیں اور رنگ نسل، نسب کسی کی بنیاد پر کسی خاص گروہ کو کوئی تفوق حاصل نہیں۔ وحدت آدم اور انسان مساوات اس کے بنیادی اصول ہیں۔ قیادت کی ذمہ داری ان لوگوں کو حاصل ہوئی ہے جو ہماری ملت کے معتمد علیہ ہوں۔ ارباب امر تمام امور سلطنت میں بنیادی ہالیسی باہم شورہ سے طے کرنے ہیں اور نظام حکومت کو جمہور کی سرفی کے مطابق چلاتے ہیں۔ نیز تمام شہریوں کے بنیادی حقوق اور ان کی ذمہ داریاں متعین ہیں۔ حکومت خدا اور اس کے رسول کی طرف سے ان حقوق کی ادائیگی کی ذمہ دار ہے اور ان میں کوئی دخل اندازی نہیں کر سکتی۔ اسلامی ریاست کا مزاج نہ امریت کو کوارا کر سکتا ہے اور نہ موروثی شہنشاہیت کو۔ اس کا مزاج خالص جمہوری اور شورائی مزاج ہے۔

اسلامی جمہوریت کی ہمیں بنیاد انسانی مساوات ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

خَلَقَ اللَّهُ مِنْ تُنْبِئُنَ الْجَدَدَ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَعْدَ مِنْهَا أَبْعَجَ الْكَنْدَادَ وَ زَيَادَ

خدا نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔ اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو دنیا میں پہلا دیا۔ (الناء۔ ۱)

نَأَفَّهَا النَّارُ إِذَا حَلَّفْتُمُوهُ مِنْ ذَكَرٍ وَأَنْثَى وَجَعَلْتُمُ شَعُورًا وَبَيْلَانَ يَتَعَذَّرُ فُؤُلَانَ أَكْرَمْتُمُوهُ عِنْدَ الْمُقْتَلِهِ

لوگو ! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت ہے پیدا کیا اور تم کو گروہ و قبائل بنا دیا تاکہ تم آپس میں پہچانے جاؤ۔ مگر درحقیقت معزز تو تم میں وہی ہے جو زیادہ پرهیزگار ہے (العبرات - ۱۲۰)

وَلَقَدْ لَقَنَابِيَّ أَدَمَ

اور ہم نے اولاد آدم کو صاحب عزت بنایا۔ (بني اسرائیل - ۸۰)

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

اللَّهُمَّ رَبِّنَا وَ رَبِّ كُلِّ شَيْءٍ إِنَّا شَهِيدٌ إِنَّمَا هُمْ يَعْمَلُونَ
إِنَّمَا هُمْ يَعْمَلُونَ
اللَّهُمَّ أَنْعُمْ بِهِمْ أَخْوَةَ
دِيْنِهِمْ كَلِمَتَهُمْ أَخْوَةَ
(احمد اور ابو داؤد)

فتح مکہ کے بعد جو خطبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا، وہ یہ تھا:

” خوب، سن رکھو کہ فخر و ناز کا ہر سو ما یہ، خون اور مال کا
ہر دعویٰ آج میرے قدموں کے نیچے ہے۔ اے اہل قربیش! اللہ نے
تسہاری جاہلیت و نخوت اور ہاپ دادا کی بزرگی کے ناز کو دور کرا یا۔
اے لوگو! تم سب آدم (علیہ السلام) سے ہو اور آدم میں سے تھے۔
نسب کے لیے کوئی فخر نہیں ہے۔ عربی کو عجمی ہر عجمی کو عربی
ہر کوئی فخر نہیں۔ تم میں سب سے زیادہ معززو ہے جو سب سے
زیادہ پرهیزگار ہے۔ ”

قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں اور حاکم اور مکوم، صاحب امر اور
سامور میں اسلام کوئی تمیز نہیں کرتا۔ قانون سب کے لیے ایک ہی ہے۔ ایک
ہار ایک معزز خاتون کو چوری کی سزا میں قطع یہ کی سزا دی جانے والی تھی
کچھ صحابہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم)
نے سفارش کو غصہ سے رد کر دیا اور فرمایا :

وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَوْ سَرَقَتْ
اس ذات کی قسم جس کی مٹھی مید، حد کی
جان ہے اگر فاطمہ بنت محمد نے بھی چوری کی
فاطمۃ بنت مُحَمَّد لفقط مبتدا ہوتی تو میں اس کا بھی ہاتھ ضرور کاٹ دیتا۔

یہ ہے وہ معیاری قانون اور معاشری مساوات جس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

اسلامی جمہوریت کی دوسری بنیاد ارباب اختیار کا معتمد علیہ ہونا ہے۔
یعنی یہ کہ ریاست کی ذمہ داریاں ان کو مونپی جائیں جو اس کم کے اہل ہوں
اور جن پر لوگوں کو اعتماد ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

” تمہارے بھترین امام اور قائد وہ ہیں جن کو تم چاہتے ہو
اور وہ تم کو چاہتے ہوں اور تم ان کو دعائیں دیتے ہو اور وہ تم
کو دعائیں دیتے ہوں اور تم میں بدترین رہنما وہ ہیں جن کو
تم ناپسند کرتے ہو اور وہ تم کو ناپسند کرتے ہوں اور وہ تم پر
لعنت بھیجتے ہوں اور تم ان پر لعنت بھیجتے ہو۔“ (مسلم)

ارباب امر کے معتمد علیہ ہونے پر مسلمانوں کے تمام مکاتیب فکر متفق ہیں،
البته ان کا انتخاب کیوں کر ہو، خصوصیت سے اسیر یا خلیفہ کا، اس پر اختلاف رائے
پایا جاتا ہے۔ شیعی نظریہ، خلافت یہ ہے کہ خاندان نبوت کے سوا کوئی شخص
خلافت کا اهل نہیں اور امامت و خلافت اللہ کی طرف سے مخصوص حقوق ہیں اس لیے
انتخاب کا سوال نہیں۔ فرقہ زیدیہ انتخاب کے اصول کو مانتا ہے لیکن دائرة
استحقاق کو محدود رکھتا ہے۔ خوارج کا خیال تھا کہ ہر پاک سیرت مسلمان
خلافت کا اہل ہے البته عام حالات میں خلیفہ کو معزول کرنا جائز نہیں۔ معززله
ہر فرد کو خلافت کا اہل سمجھتے تھے۔ اہل سنت عمومی خلافت کے قائل ہیں
البته خلیفہ کے لیے علم و اجتہاد، اخلاق فاضلہ، سیاسی تدبیر، فنون حرب میں
سماحت وغیرہ کی شرائط مقرر کرتے ہیں اور طریق انتخاب پر اختلاف کے باوجود
تمام مکاتیب فکر کے سیاسی نظریات میں ارباب امر کا معتمد علیہ ہونا مشترک
نظر آتا ہے۔

اسلامی جمہوریت کی نیسری بنیاد سوری ہے۔ یعنی مسلمانوں کے یہ
معتمد علیہ افراد تمام امور سلطنت کو خدا اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق مسلمانوں
کے مشورے کی روشنی میں طے کریں، اللہ تعالیٰ خود اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)
سے فرماتا ہے :

وَشَأْوُرُهُمْ فِي الْأَمْرِ

اور ان سے معاملات میں مشورہ کرو۔ (آل عمران - ۱۵۹)

^۱ یہ بحث الماورڈی کی کتاب ”الاحکام السلطانیہ“ اور حکیم جیدر زمان صدقی کی تصنیف
”اسلامی نظریہ“ سیاست، ” ہے ماخوذ ہے۔

اسلام کا سیاسی نظام

۳۸۹

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ شہادت دیتے ہیں کہ

ما رأيَتْ أَحَدًا أَكْبَرَ مُشَورَةً لِصَاحْبِهِ
مِنَ الْبَنِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ -
كُسْتُ كُو اپنے اصحاب سے مشورہ کرنے والا
نہیں دیکھا۔ (بخاری و ترمذی)

عام اولی الامر کے بازے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَنِيهِمْ

اور ان کے امور آپ کے سورے سے
ملے ہوتے ہیں۔ (الشوریٰ ۲۸)

خطیب بغدادی حضرت علی رضی سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ:

”میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ! آپ کے بعد کوئی معاملہ ایسا پیش آجائے جس کے متعلق نہ قرآن میں کچھ اترنا ہو اور نہ آپ سے کوئی بات سنی گئی ہو تو ہم کیا کریں ؟ آپ نے فرمایا میری آمت میں سے عبادت گزار اور اطاعت شعار لوگوں کو جمع کرو اور اسے آپ کے مشورے کے لئے رکھ دو ، اور کسی ایک شخص کی رانے پر فیصلہ نہ کرو ۔“ (روح العاقی)

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ایک دوسری حدیث میں اسلامی معاشرے کی صحیح حالت کا نقشہ اس طرح بیان فرمایا گیا ہے :

”جب تمہارے حکام تم بیک اور صالح ہوں ، تمہارے اہل ثروت تم میں فیاض ہوں اور تمہارے امور باہم مشورے سے طے ہوں ۔“ (صحاح)

اس لیے علمائے قانون نے یہ کہا ہے کہ سوری اسلامی نظام کی روح اور اس کا ایک لازمی جزو ہے ۔ چھٹی صدی ہجری کے مشہور عالم قانون عبدالحق بن خالب بن عطیہ لکھتے ہیں :

ان الشوریٰ هی من قواعد الشرعية

شوریٰ شریعت کے قوانین اور محکم احکام و عزائم الاحکام . (بستانی . جلد اول)

میں سے ہے ۔

مشاورت کا یہ حکم ہر ائمہ معمسے اور اس کی ہر منزل کے لیے ہے ۔ اس کی شکل کیا ہو ؟ اس کا تعین ہر زمانے کے حالات کے مطابق کیا جانے گا ۔ لیکن

امر کی روح بہے کہ مشورہ ان لوگوں سے کیا جائے جو اہل حل عقد ہوں، فہم و بصیرت رکھتے ہوں اور لوگوں کے معتمد علیہ ہوں۔ مسلمانوں کے تمام اجتماعی کام مشورے سے طے ہوں اور کوئی شخص اپنی من مانی نہ کرے، کوئی اجتماعی کام جتنے لوگوں سے متعلق ہو مشورہ میں ان سب کو یا ان کے نمائندوں کو شریک کیا جائے اور مشورہ آزادانہ، بے لاس اور مخلصانہ ہو، اگر یہ چیزیں موجود ہوں تو مشورہ کا حق ادا ہو جاتا ہے خواہ اس کی شکل کوئی بھی تعویز کی جائے۔

اسلامی جمہوریت کی آخری بنیاد شہربوں کے حقوق و فرائض کا تعین ہے اور ان حقوق میں در اندازی کا حق کسی کو نہیں ہے۔ یہ تمام حقوق خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عطا کردہ ہیں اور کسی شرعی دلیل یا حق کے بغیر ان میں سے کسی ہر کوئی پابندی نہیں لکھی جا سکتی یا ان میں کوئی رو بدل نہیں ہو سکتا۔

اسلامی ریاست اپنے شہربوں کی دو قسمیں کرتی ہے: مسلمان شہری اور غیر مسلم شہری۔ غیر مسلم شہربوں کو تمام بنیادی انسانی حقوق حاصل ہیں، انہیں مکمل مذہبی اور ثقافتی آزادی حاصل ہے، البتہ انہیں یہ حق حاصل نہیں کہ نظریاتی مملکت کے کالیدی مناسب ہر فایز ہو سکیں۔ اور اسی کی مناسبت سے ان کی ذمہ داریاں بھی کم ہیں۔

اسلامی ریاست کے شہربوں کو یہ حقوق حاصل ہیں:

(۱) جان و مال اور ناموس کی حفاظت۔ یعنی ریاست میانت دیتی ہے کہ اپنے شہربوں کے جان و مال اور ناموس پر نہ خود ہاتھ ڈالے گی اور نہ کسی اور کو ڈالنے دے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

پس پہ وہ مسلم ہے جس کی جان پر مال کی حفاظت کا ذمہ اپنے نہیں لیا ہے۔ نور خبردار،
الله کے ساتھ اس کی دی ہونی ضرانت میں
غداری نہ کرو۔

فذا لك المسلم الذى له ذمته الله ورسوله
فلا تحفروا الله في ذمته۔ (بخاری)

مسلمان کی هر چیز مسلمان پر حرام ہے،
اس کا خون بھی، اس کا مال بھی اور اس کی
آبرو بھی۔

کل المسلم على المسلم حرام دمه و ماله
و عرضه (مسلم)

اسی طرح غیر مسلم ... بی کے باب میں بھی اصول یہ ہے : " جو کوفہ
ہمارا ذمیٰ ہو اس کا خون ہمارے خون کی طرح اور اس کی دبی ہماری دبی کی طرح
اور ان کا مال ہمارے مال کی طرح ہوں گے । "

اسی طرح تمام شہریوں کی ذاتی ملکیت کی ضمانت دی گئی ہے اور یہ قول
قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ اصول یہ ہے کہ

ولیس للامام ان بخراج شيئاً من احد
اما (حکومت) کو یہ حق حاصل نہیں ہے
لا یجتھے ناہتے معروف
کہ وہ کسی ثابت شدہ قانونی حق کے بغیر کسی
(كتاب البخاري . صفحہ ۳۷) شخص کے قبضے سے اس کی کوئی شے نکالے ۔

(۲) شخصی آزادی - ہر شخص کی انفرادی آزادی محفوظ ہوگی اور
اسے یہ ضمانت اس وقت تک حاصل رہے گی جب تک وہ اپنی آزادی کو دوسروں
کی آزادی کے سلب کرنے یا جماعت کے کسی حقیقی مفاد کو نقصان پہنچانے یا
خطرے میں ڈالنے کے لیے استعمال نہیں کرتا ۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبے کے دوران ایک شخص نے
اپنے ہمسایوں کے بارے میں بوجھا جو شبہ کی بنا پر گرفتار کر لیتے گئے تھے ۔
آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دو مرتبہ نسال من کر سکوت فرمایا تاکہ اگر گرفتاری
کی کوئی معقول وجہ ہو تو معلوم ہو جائے اور جب کوئی چیز سامنے نہ آئی تو
آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا :

خلوا له جیرانہ ۔ (ابو داؤد) اس کے ہمسایوں کو رہا کر دو ۔

اسلام کا یہ اصول ہے کہ

لا یوسر رجل فی الاسلام بغير عدل اسلام میں کوئی شخص بغیر عدل کے قید
(موطا) نہیں کیا جا سکتا ۔

(۳) رائے اور مسلک کی آزادی - اسلام ہر شخص کو اپنی آزاد رائے
رکھنے کی اجازت دینا ہے بشرط کہ وہ اختلاف رائے کو خون ریزی اور فتنہ و فساد
کا ذریعہ نہ بنالیے ۔ اس کی بہترین مثال وہ رویہ ہے جو حضرت علی رضا نے خوارج
کے مقابلے میں اختیار فرمایا جو ریاست کے وجود ہی کی نفی کرنے تھے ۔

حضرت علی رضی نے ان کو پیغام بھیجا کہ:

”تم جہاں چاہو رہو، اور ہمارے اور تمہارے درمیان شرط یہ ہے کہ تم خون ریزی اور رہنگی نہ اختیار کرو اور ظلم سے باز رہو“ (نیل الاؤٹار جلد ۱ صفحہ ۱۳۰ -)

اسلام ہرگز پسند نہیں کرتا کہ دین کے معاملے میں جبر و اکراه سے کام لیا جائے۔

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ

دین کے معاملے میں زبردستی نہیں۔ (البقرہ - ۲۵۶)

(۲) قانونی مساوات۔ یعنی تمام شہری خواہ امیر ہوں یا غریب، سیاہ ہوں یا سفید، صاحب امر ہوں یا مامور، قانون کی نگاہ میں برابر ہوں گے اور سب پر ایک ہی قانون لاگو ہو گا۔

(۵) معاشری مساوات۔ یعنی خون، رنگ، نسب، زبان، پیشہ، معاشی مقام وغیرہ کی بنا پر شہریوں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں پڑتا جائے گا۔ سب برابر ہیں۔ عزت و شرف اگر ہے تو صرف علم و تعلیم کی بنا پر۔

(۶) بے لائق اور بے معاوضہ انصاف۔ یعنی اسلامی ریاست ہر شہری کو ہر قسم کے ظلم و زیادتی سے بچائے گی اور حصول انصاف کا انتظام بلا کسی معاوضہ کے کرے گی۔

(۷) فریاد، اعتراض اور تنقید کا حق۔ تمام شہریوں کو یہ حق حاصل ہو گا کہ پوری آزادی کے ساتھ اپنی بات ارباب اختیار تک پہنچائیں، اپنی مجبوریاں اور مسائل ان کو بتائیں ان کی پالیسیوں پر اعتراض اور تنقید کریں۔ ان کی بات سنیں اور انہیں اپنی بات سنائیں۔

(۸) اجتماع، تنظیم بنڈی اور نقل و حرکت کی آزادی۔ انہیں یہ حق بھی حاصل ہو گا کہ سنظم و مجمعع ہو کر کام کریں اور بلا روک ٹوکی ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہوں۔

ان حقوق کے مقابلے میں شہریوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ہر صحیح بات کو قبول کریں اور اطاعت کریں۔ معروف میں عدم اطاعت کی روشن اسلامی ریاست

اسلام کا سیاسی نظام

۶۹۳

کے مزاج کے مناف ہے۔ اسی طرح ان پر ذمہ داری ہے کہ وہ ریاست کی خیرخواہی کریں۔ یعنی دیدہ و دانستہ ایسا کام نہ کروں جو ریاست کو تعصیان ہے جانے والا ہو۔ تغیریبی سرگرمیوں سے خود بھی کلی طور پر محترز رہیں اور دوسروں کو بھی نہ کرنے دیں۔ نیز یہ بھی خیرخواہی ہی کا ایک پہلو ہے کہ امور ریاست پر نگاہ رکھیں اور حکومت یا اس کے کارکنوں کو خدا کے راستے سے ہٹانے نہ دیں، اور اگر کوئی انحراف واقع ہو تو اس کو روکیں، ہاتھ اور زبان دونوں سے۔ اسلامی ریاست کا شہریوں پر یہ بھی حق ہے کہ وہ اس سے تعاون کریں اور امریکی خاطر مال اور اگر ضرورت ہو تو خود جان کی قربانی بخش کریں۔

مندرجہ "بالا چار بنیادوں پر اسلام کا جمہوری نظام قائم ہے۔

اسلام، اشتراکیت اور جمہوریت

اس بحث کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اسلام کا سیاسی نظام اشتراکی امریت اور معمولی طرز کی جمہوریت دونوں سے مختلف ہے۔

۱۔ اشتراکیت مذہب کی نفی پر مبنی ہے اور اسلامی ریاست خدا کے قانون کی تابع اور اسے قائم کرنے والی ہے۔

۲۔ اشتراکیت فرد کی مستقل اور جداگانہ شخصیت کو نہیں مانتی اور اسے طبقے میں ضم کر دیتی ہے اور ریاست کو ایک طبقے کا آلهہ کار بنادیتی ہے۔ اسلام ان میں سے کسی چیز کو بھی درست نہیں مانتا۔ وہ فرد کو بنیاد مانتا ہے اور اس کی شخصیت کو مستحق کرنے اور نشو و ارتقا دینے کے موقع فراہم کرتا ہے۔ وہ طبقات کی نفی کرتا ہے اور تمام انسانوں کو مساوی قرار دیتا ہے۔

۳۔ اشتراکیت کا نظام امرانہ ہے جب کہ اسلام کا نظام شورائی ہے۔ اس میں تمام امور لوگوں کی مرضی کے مطابق طے ہوتے ہیں ان پر اوپر سے تھوڑے نہیں جاتے۔

۴۔ اشتراکیت ریاست کے اختیارات کو غیر محدود کر دیتی ہے اور شخصی اور سیاسی آزادی کی کوئی حقیقی صفائت نہیں دیتی۔ اسلام ریاست کے اختیارات کو ایک خاص دائئرے میں محدود کر دیتا ہے اور معصیت میں اطاعت کو یا حقوق انسانی کے بلا حق شرعی ختم کئے جانے کے امکان کو ختم کر دیتا ہے۔

وہ حکومت کو مسئلول بناتا ہے اور اسے عوام کے مشورے کا ہابند کرتا ہے۔ نیز شخصی اور سیاسی آزادی کی حقیقی ضمانت دیتا ہے۔ اسلامی ریاست ہمہ کبھی تو ضرور ہے لیکن اشتراکیت کی طرح کلیت پسند نہیں ہے۔

ان وجہوں کی بنا پر اسلامی ریاست اشتراکی امریت سے بالکل مختلف ہے۔

پھر اسلامی ریاست خود مغربی جمہوریت سے بھی مختلف ہے۔ اسلام کو جمہوریت کے اس پہلو سے تو قطعاً اختلاف نہیں کہ امور سلطنت عوام کے مشورے سے ان کی مرضی کے مطابق اور ان کے اپنے نمائندوں کے ہاتھوں طے ہونے چاہئے بلکہ وہ جمہوریت کے وکلا سے کچھ زبادہ ہی شد و مدد کے ساتھ اس بات کو بیش کرتا ہے۔ نیز اسے جمہوریت کے اس پہلو سے بھی اختلاف نہیں کہ بنیادی حقوق کی ضمانت ہونے چاہئے اور قانون کی حکم رائی کے اصول پر عمل ہونا چاہئے۔ اسی طرح انسانیت نے بہت سے تجربیات کی روشنی میں عوام کی مرضی کو جائزے اور اس کو موثر بنانے کے لیے جو نظام اور جو ذہانچہ وضع کیا ہے اس سے استفادہ کرنے اور اپنے حالات کے مطابق اسے ڈالنے پر بھی اسلام کو کچھ اعتراض نہیں۔ اسلام جن چیزوں میں مغربی جمہوریت سے اختلاف رکھتا ہے وہ یہ ہیں۔

۱- حاکمیت اعلیٰ کے اختیارات انسان کو نہیں بلکہ خدا اور اس کے قانون کو حامل ہیں۔ انسان کی حیثیت خدا کے خلیفہ کی ہے اور اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ خدا کی ہدایت کے مطابق اپنے معاملات کو طے کرے، بنیادی قانون قرآن و سنت کا قانون ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اگر صدقہ فی صد افراد خدا کے قانون کو بدلنا چاہیں تو بھی انہیں اس کا اختیار نہیں۔ ہاں اس قانون کے تحت معاملات کو طے کرنے کا حق ان کو حاصل ہے، با جن امور میں یہ قانون عام تعلیمات کو سامنے رکھ کر قانون سازی کریں۔ نیز جن امور میں صرف اجمال جمہور کی قانون سازی کے اختیار مطلق کے مقابلے میں اسلام ان کے محدود اختیار کا تصور بیش کرتا ہے۔ اور اس باب میں وہ مغربی جمہوریت سے مختلف ہے۔ جہاں کوئی مستقل اور اعلیٰ تر قانون موجود نہیں۔ ہمارے ہاں ابک مستقل خابطہ ہے اور ہم اپنے معاملات اس کے مطابق ہی طے کرنے کوئے ہیں۔

۴۔ جمہوریت میں ہر لعظہ مخالفت اور پارٹی بازی کی جو فضا رہتی ہے اسلام اسے بھی پسند نہیں کرتا۔ وہ جو طریقہ پیش کرتا ہے وہ یہ ہے :

وَتَعَاوِنُوا عَلَى الْبَرَّ وَلَا تَعَاوِنُوا عَلَى الْأَجْرَ وَالْعُذْلَانَ

فیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کرو۔ (المائدة۔ ۲)

وہ تمام گروہوں اور عناصر کے درمیان خیر خواہی اور تعاون کی فضا قائم کرنا چاہتا ہے۔ اور اس طرح یہ نظام خود جمہوریت سے بھی بہتر اور اعلیٰ تر ہے۔

۵۔ اسلام اس کو بھی پسند نہیں کرتا کہ لوگ عمدوں کے حربیں ہوں اور ان کے لیے اپنا سب کچھ لٹاتے پھریں۔ وہ چاہتا ہے کہ ذمہ داری کے مناصب ان لوگوں کو دیئے جائیں جو ان کی طمع نہ رکھتے ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

”بَخْدًا هُمْ كَسِي ابْسَيْ شَعْصَنْ كَوْ ابْنَى حَكْمَتْ كَكِسِي عَهْدَهْ بِرْ
مَقْرَرْ نَهِيْ كَرْتَنْ جَسْ نَتِيْ اسْ كَيْ دَرْخَوَسْتْ كَيْ هُوْ بَا جَوْ اسْ كَا
حَرْبِيْنْ هُوْ۔“ (بخاری و مسلم)

”هَمَارَيْ نَزَدِ بِكَ تَمْ مِيْ سَبْ سَيْ بِرَا خَائِنْ وَهْ هَيْ جَوْ خَوَدْ حَكْمَتْ
كَيْ كَسِي عَهْدَهْ وَمَنْصَبَ كَأَطَالِبْ هُوْ۔“ (ابو داؤد)

اس طرح اسلام ایک اخلاقی فضا بناتا ہے۔ نیز وہ عہدہ داروں اور ارباب امر کے لیے اخلاقی صفات بھی تعویز کرتا ہے جب کہ جمہوریت ان چیزوں کی کوئی فکر نہیں کریں۔

۶۔ جمہوریت جغرافیائی قومیت کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہے جب کہ اسلامی ریاست ایک اصولی اور نظریاتی ہے اور اس کا پیغام عالم گیر ہے۔

مندرجہ بالا بحث سے ہمارے سامنے اسلامی ریاست کی دوسری خصوصیت یعنی اس کا شورائی اور جمہوری کردار آ جاتا ہے اور ہمیں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ریاست اشتراکی سیاست اور مغربی طرز کی جمہوری ریاست سے کن باتوں میں مختلف ہے۔

۳ فلاہی ریاست

اسلامی ریاست کی تیسرا خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک فلاہی اور خادمِ خلق ریاست ہے۔ اسلام کی نگاہ میں حکومت کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ امن و امان قابیم کرے اور ملکی دفاع کی خدمات انجام دے، بلکہ اس کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں حقیقی اور فطری مساوات قابیم کرے، ان تمام رکاوٹوں کو دور کرے جو سعی و جہد کی مساوات کی راہ میں حائل ہیں اور اپنے نعام شہروں کی، خواہ وہ سلام ہوں یا غیر مسلم، بینیادی ضروریات کی فواہی کی ضمانت دے۔ اگر اسلامی ریاست کی حدود میں کہیں بھی فقر و فاقہ، غربت و افلاس ہے، ظلم و جور ہے، تو اس کا قلع قمع کرے اور اپنی تمام قوتیں ان انسانی مسائل کر حل کرنے کے لیے وقف کر دے۔ اسلام ریاست کا محض ایک منفی تصور نہیں رکھتا۔ اس کی قابیم کردہ ریاست ایک مشتبہ ریاست ہے جو قیامِ انصاف اور ادائیگی حقوق کے ایجادی کام انجام دیتی ہے۔

معاشی زندگی کے بارے میں اسلام نے یہ اصولی عدایت دی ہے کہ اسلامی معاشرے اور حکومت کا فرض ہے کہ وہ افلاس اور غربت کو مٹانے میں اس طرح سرگرم رہیں جس طرح کفر کی ظلمتوں کو دور کرنے میں ہوں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ”فقر انسان کو کفر کی طرف لے جا سکتا ہے، اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دعا فرمائی کہ ”اے اللہ! مجھے کفر اور فقر دونوں سے محفوظ رکھ۔“

اسلام ہر فرد میں معاشی جدوجہد کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور اسے دعوت دیتا ہے کہ اپنی محنت سے روزی حاصل کرے۔ محنت کی روزی اور پاک اور طیب کمانی پر قرآن و حدیث میں غیر معمولی زور دیا گیا ہے۔

اسلام نے انفرادی ملکیت کا حق دیا ہے اور انفرادی سعی و جہد کے دروازے سب کے لیے کھول دیے ہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ موقع فوادھم کرنے کا اہنام بھی کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ تصور بھی پیدا کیا ہے کہ یہ ملکیت ایک امانت کی طرح ہے جس سے جائز اور صحیح راستوں ہی پر صرف کرنے کا اختیار ہے۔ اگر غلط اور حرام طریقوں سے خرچ کیا جائے کا تو امانت میں خیانت ہوگی۔ فرد کا اختیار محدود ہے غیر محدود نہیں، نیز ہر شخص کی دولت میں اس کے اپنے حق کے علاوہ خدا اور اس کے بندوں کا حق بھی ہے۔ ضروری

ہے کہ ہو شخص اپنی جائز ضرورتوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ ریاست اور دوسرے انسانوں کے حقوق کو بھی ادا کرے اور اپنے وسائل کو ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے صرف کرے۔ جو دولت کو جمع کرنے ہیں اور انسانی بہبود کے لیے اسے خروج نہیں کرتے یا اس میں سے دوسروں کے حقوق نہیں نکالتے، ان کے لیے سخت ترین وعید آئی ہے۔ ہر صاحب نصاب مسلمان پر زکواہ فرض کی گئی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ

تَوَلَّ مِنْ أَغْنِيَاءِ هُمْ قَرْدَ عَلَىٰ فَقَرَاءِ هُمْ
ان کے مالداروں سے لے جائی گی اور ان کے
(بخاری و مسلم) محتاجوں میں تقسیم کر دی جائے گی۔

ہر اسے حضن ایک خیرات نہیں بلکہ "حق" قرار دیا گیا ہے۔

وَفِي الْأَمْوَالِ مُحَكَّمٌ الْكَلِيلُ وَالْمُشْرِكُونَ

ان کے مالوں میں حق ہے مدد مانگنے والے کے لیے اور رزق سے محروم رہ جانے والے کے لیے۔ (الاذاریات - ۱۹)

یہ حق حکومت کو وصول کرنا ہے اور حقداروں تک پہنچانا ہے۔

خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ حَدَّهُ

(اے نبی) ان کے مالوں سے صدقہ وصول کیجیے۔ (التوبہ - ۱۰۳)

اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ ان تمام افراد کی کفالت کا بندوست کرے جو مجبور ہوں، اباہج ہوں، لاچار ہوں، یا رزق سے محروم رہ گئے ہوں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

من مات و عليه دین ولم يترك وفاء جو شخص مر جائے اور اس کے ذمہ قرض ہو اور وہ اسے ادا کرنے کے قابل مال نہ چھوڑے فعل قضاءه ومن ترك مالاً فلورثته تو اس کا ادا کرنا میرے (اسلامی ریاست کی) ذمہ ہے اور جو مال چھوڑے تو وہ اس کے وارثوں کا حق ہے۔

من ترك ديناً او ضياعاً فليها تني فانا مولاہ (ابو داؤد)

جو شخص قرض چھوڑے یا ایسے بیس مانگان چھوڑے جن کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو وہ میرے پاس آئے۔ میں اس کا سر پرست ہوں۔

من ترك مالاً فلورثته ومن ترك كلام فالپنا (بخاری و مسلم)

جو مال چھوڑے تو وہ اس کے وارثوں کا حق ہے اور جو ذمہ داریوں کا بار چھوڑ جائے تو وہ ہمارے (یعنی حکومت کے) ذمہ ہے۔

امام ابو یوسف "کتاب الغراج" میں ایک جلیل القدر صحابی کی زبان ہے
یہ اصول بیان فرماتے ہیں کہ

"خدا کی قسم ہم نے اس سے انصاف نہیں کیا اگر جوانی میں اس
سے فائدہ انہایا اور بڑھائے میں اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا ।"

حضرت خالد رضی نے حیرہ کے غیر مسامون سے جو معاہدہ کیا تھا اس میں یہ
صراحت یہ موجود تھا کہ جو شخص بوڑھا ہو جائے گا یا جو کسی آفت کا شکار
ہو گا یا جو مفلس ہو جائے گا اس سے جزیہ وصول کرنے کے بعد ائے مسلمانوں کے
بیت المال سے اس کی اور اس کے کتبے کی کفالات کی جائے گی ۔

یہی وجہ ہے کہ علامہ ابن قیم ان تمام آیات و احادیث و آثار کی روشنی
میں علماء کا یہ اصول بیان فرماتے ہیں کہ

"اور علماء نے کہا ہے کہ حکومت جس طرح اس شخص کی وارث
حقیقی ہے جس نے کوئی وارث نہ چھوڑا ہو اسی طرح وہ اس کا
قرض ادا کرنے کی بھی ذمہ دار ہے جب کہ وہ قرض کی ادائیگی
کے لیے کوئی شیء چھوڑے بغیر مر جائے ۔ نیز وہ اس کی زندگی میں
اس کی کفالات کے لیے بھی ذمہ دار ہو گی جب کہ کوئی اس کی
کفالات کرنے والا نہ ہو ۔"

علامہ ابن حزم یہ اصول بیان فرماتے ہیں کہ

"اور ہر بستی کے ارباب دولت کا فرض ہے کہ وہ فقرا اور غرباکی
معاشی زندگی کے کفیل ہوں اور اگر مال فتحے (بیت المال کی امدنی)
سے ان غرباکی معاشی کفالات پوری نہ ہو تو سلطان (امیر) ان ارباب
دولت کو اس کفالات کے لیے مجبور کر سکتا ہے اور ان کی زندگی کے
اسباب کے لیے کم از کم یہ انتظام ضروری ہے کہ ان کی ضروری

۱ کتاب الغراج ، ص ۲

۲ کتاب الغراج ، ص ۸۵

۳ زاد المعاد ، جلد اول ، ص ۵

حاجات کے مطابق روفی بھیا ہو، ہنرنے کے لمحے گوئی اور سردی دونوں لحاظ سے لباس فراہم ہو اور رہنے کے لیے ایک ایسا مکان ہو جو ان کو بارش، گرمی، دھوپ اور سیلاب جیسے حادث سے محفوظ رکھ سکے۔

اسلامی ریاست کی یہ حیثیت مخفی نظری دلائل ہی ہے ثابت نہیں ہے بلکہ قرن اول میں مسلمانوں نے اس نظام کو من و عن قابیم کیا تھا اور دلیا کی بہل فلامی اور خادمِ خلق ریاست بنائی تھی۔ مشہور مورخ مولانا شبیل نعمانی لکھتے ہیں :

”اس بات کا سخت اهتمام کیا کہ ممالک محرومہ میں کوئی شخص فقر و فاقہ میں بستلا نہ ہونے پائے۔ یہ عام حکم تھا اور اسی ہی شہ تعمیل ہوتی تھی کہ ملک میں جس قدر اپاہج، از کار رفتہ، مفلوج وغیرہ ہوں مب کی تنخواہیں بیتالمال سے مقرر کر دی جائیں۔ لاکھوں سے متتجاوز آدمی فوجی دفتر میں داخل تھے جن کو گھر بیٹھے خوراک ملتی تھی۔ ایک آدمی کو مہینے بھر کی خوراک کے لیے دو جریب آٹا کافی ہوتا تھا اس لیے ہر شخص کے لیے اسی قدر آٹا مقرر تھا غرباً و مساکین کے لیے بلا تخصیص مذہب حکم تھا کہ بیتالمال سے ان کے روزبینے مقرر کر دیے جائیں۔“

یہ نظام اپنی معیاری شکل میں مسلمانوں نے قابیم کیا۔ اور یہ چیز اسلامی ریاست کی تیسرا خصوصیت کو متعین کرتی ہے۔

یہاں ہی اسلامی ریاست دنیا کی دوسری ریاستوں سے بڑی مختلف ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام عوام کی کفالت کی کوئی ذمہ داری نہیں لیتا۔ اس کا اصول ہے کہ

جو بڑھ کر خود انہالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

معاشی دوڑ میں جو بچھے رہ جانے اس کے لیے کوئی سہارا نہیں۔ کشمکش حیات میں اس کے لیے مٹ جانا ہی مقدر ہے، سعی و جهد اور موقع کی

علامہ ابن حزم محلی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں : ”اَللّٰهُ تَعَالٰى نَفَرَ اَهْلَ دُولَتٍ كَ اَمْوَالٍ بِرَأْنَ كَ غَرِيبٍ بِهَايَبُوْنَ كَ مَعَاشٍ حَاجَتْ كَوْ بِدْرَجَهٍ كَفَّا يَتَ پُورَا كَرْنَا فَرْضٍ كَرْ دِيَاَهُ - پس اگر وہ بھوکے ’ننگے‘ یا معاشی مصالب میں مبتلا ہوں گے، شخص اس بنا پر کہ اهل نڑوت اپنا حق ادا نہیں کرتے۔ تو اَللّٰهُ تَعَالٰى ان ۲۳ قیامت کے دن ان کی باز پرس کرے گا اور اس کو تذاہی پر ان کو عذاب دے گا۔“ (محلی، صفحہ ۱۵۸)

مساوات بھی اس نظام میں معصوم ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ امیر کے اسی طریقے
ہونے کے امکانات تو ہر طرف موجود ہیں لیکن غریب کے لئے غربت کے چکر سے
نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ اس نظام میں ظلم اور استھصال کے نت نتھے طریقے
اختیار کیجئے جاتے ہیں اور غیر منصوبہ بند معاشی دوڑ پوری سوسائٹی کو عدم استحکام
اور افراط و تفریط کے چکر میں گرفتار کر دیتی ہے۔ اسلامی ریاست ایک منصفانہ
معاشی اصول پر عمل کرتی ہے اور وہ سب کو مساوی موقع دینے کے ساتھ ساتھ
ایک ہمہ گیر پیمانے پر گرونوں کو تھامنے کا کام بھی انجام دیتی ہے۔

یہ فلامی ریاست اشتراکیت سے بھی مختلف ہے اس لئے کہ یہ کفالت کی
ضمانات تو دیتی ہے لیکن آزادی اور افرادیت کی قیمت وصول کر کے نہیں۔ گلے
قوسی ملکیت اسلام کے مزاج کے مناف ہے۔ وہ مالکانہ حقوق اور آزادی جہد دینے
کے بعد توازن اور انصاف قائم کرتی ہے۔

نیز جدید طرز کی ایک مخلوط اور فلامی ریاست سے بھی یہ مختلف ہے کہ
اس میں معافی خدمات اور بنیادی کفالت ایک حق کے طور پر کی جاتی ہے بعض
سیاسی احتجاج کا منہ بند کرنے کے لئے نہیں۔ بہان اس کا حصول مطالبات اور
احتجاجات پر منحصر نہیں ہے بلکہ یہ ایک بنیادی اصول ہے جسے ہر قیمت پر اور
هر حال میں پورا کرنا ہے۔ یہ سارا کام جبر اور رسہ کشی کے ساتھ نہیں بلکہ
دلی تعاون اور جذبہ عبادت کے ساتھ ہوتا ہے۔ بہان صرف معیار زندگی ہی کو
بلند نہیں کیا جاتا بلکہ معیار اخلاق کو بھی بلند کیا جاتا ہے۔ یہ ایک انقلابی
تصور ہے جو موجودہ دور کے تمام معاشی تصورات سے کہیں زیادہ اعلیٰ اور بہتر ہے
اور اخلاق اور دنیاوی دونوں حیثیتوں سے بہت اونچا ہے۔

۳۔ معلم اور داعی ریاست

اسلامی ریاست کی چونھی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے سپرد و حفظ معاشی
کفالت کی ذمہ داریاں ہی نہیں ہیں بلکہ اخلاق تعلیم اور تہذیب و تمدن کی
ترویج بھی اس کے ذمے ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”میں
علم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔“ وہ ریاست جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نیابت
بندویست بھی کرتی ہے، اور بوری دنیا کے لئے حق کی شاهد اور اسلام کی علم بردار
کی حیثیت رکھتی ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمة علم کا حصول ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس فریضے کی بجا اوری کے لیے ہر ممکن سہولت فراہم کی۔ اس کام کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کبھی کہ غزوہ بدرا میں کفار کے جو قیدی گرفتار ہوئے ان میں سے بعض تعلیم یافتہ قیدیوں کا فدیہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہی قرار دیا کہ مسلمانوں کے کچھ بچوں کو لکھنا ہڑھنا سکھا دیں۔ بعض لوگوں کے لیے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دوسری قوموں کی زبانیں میکھنے کا اہتمام کیا تاکہ بین الاقوامی معاملات کے سلسلے میں وہ حکومت کو اپنی خدمات سے فائدہ ہمچا سکیں۔ بالغ عوام میں تعلیم کو پھیلانے کے لیے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) مختلف مقامات پر وقتاً فوتاً تعلیمی و تبلیغی و فود ہمیجتے رہتے تھے مسجد فبوی کے باہر ایک چبوترہ تھا جسے "صفہ" کہتے ہیں اور جو اسلام کا پہلا مدرسہ بنا۔ یہاں سے تربیت دے کر لوگوں کو پورے عرب میں تعلیم کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ مدینے سے باہر کے مسلمانوں کے لیے یہ قاعدہ تھا کہ ان میں سے ہر گروہ کے لوگ اپنے میں سے باصلاحیت افراد کو مدینہ بھیجتے جہاں وہ تعلیم حاصل کرنے اور واپس جا کر اپنے علاقے میں تعلیم پھیلاتے۔ باہر سے جو وفود آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آتے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان میں سے ذہن اور ذی صلاحیت لوگوں کو ان کی قوم کی تعلیم پر مقرر کرتے۔ جن لوگوں کو سرکاری عہدوں پر مقرر فرمائے ان کو علم پھیلانے کی ہدایت دیتے۔ مثلاً جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ععرو بن حزم کو یمن کا گورنر بنایا تو سب سے پہلے یہ ہدایت دی کہ

"وَهُوَ حَقٌّ بِرَقَائِيمِ رَهِيْسٍ جِيْساً كَمَا كَهَ اللَّهُ نَهَى حَكْمَ دِيَاهُ، اُور لُوْگُونَ كَوْ بِهَلَانِيَ كَيْ خَوْشَ خَبْرِيَ اُور بِهَلَانِيَ كَا حَكْمَ دِيَاهُ، اُور لُوْگُونَ كَوْ قُرْآنَ كَيْ تَعْلِيمَ دِيَاهُ اُور ان مِيْنَ اسَكَى سَمْجَهَ ہِيدَا كَرِيْسَ اُور لُوْگُونَ كَوْ نَأَپَاكِيَ كَيْ حَالَتَ مِيْنَ قُرْآنَ كَوْ هَاتَهَ لَگَانَے سَيْ رُوكِيْسَ اُور لُوْگُونَ كَيْ دَلَ دَارِيَ كَرِيْسَ یَهَانَ تَكَ كَهَ لُوْگَ دِيَاهَ كَافِرِمَ ہِيدَا كَرَنَے كَيْ طَرْفَ مَائِلَ هُوْ جَائِيْنَ ۱"

تعلیم کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت کو بڑھانے کے لیے - وسائلی کے ہر شعبے میں شرف و اعزاز کا معیار علم کو قرار دیا گیا اور سجد کی امامت سے لے کر اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ داروں تک کے تقریر میں جس چیز کو سب سے بہلے دیکھا جاتا تھا وہ قرآن و حدیث کا علم ہے - پوزی اسلامی قلم رو میں - بے شمار افراد کو اس کام ہر مقرر کر دیا گیا تھا کہ لوگوں میں پہلیں جائیں اور ان کی تعلیم کا کام انجام دیں - اور یہ اسی تعلیم کا فیض تھا کہ ایک طرف دین کا علم شہر شهر قریبہ قریبہ ، محلہ محلہ اور گوشے گوشے پر ترویج ہے اور دوسری طرف اسلامی ریاست کو ہر موقع پر ایسے باصلاحیت اور سببیجہ دار کارکن میسر آئے گئے جو زندگی کے ہر شعبے کی قیادت کر سکیں ۔

مسلمانوں کی پوزی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ

۱- تعلیم کو عدیشہ غیر معمولی اہمیت دی گئی اور حکومت اور اہل ثروت نے اس کی دل کھول کر سپورٹی کی ۔ یہ ریاست کی ذمہ داری تھی کہ تمام شہریوں کے لیے ضروری اور بنیادی تعلیم کا انتظام کرے ۔

۲- تعلیم کے نظام میں اولین اہمیت علوم دین کو دی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ ان تمام علوم کی ترویج کی گئی جو دفاع دین اور قیام حیات کے لیے ضروری ہیں - نیز فضول اور لغو مضامین سے اجتناب کی آوشش کی گئی ۔

۳- تعلیم ہر دور میں منت رہی - مسلمانوں نے ایک دن کے لیے بھی اعلیٰ سے علیٰ تعلیم کو بھی فیض کے ساتھ وابستہ نہیں کیا .. علم اور اونچے سے اونچے درجے کے علم کے دروازے ہر شخص کے نیچے بلاد فیض کھلے رہے ۔

۴- تعلیم کے ساتھ کبردار مازی اور اخلاق تربیتے ایک جزو لا ینک کی طرح موجود رہی ۔

پھر یہ ریاست صرف اپنے شہریوں ہی کی تعلیم کا پندویست کر کے مطمئن نہیں ہو جاتی بلکہ پوری دنیا کے سامنے اسلام کی دعوت کو اپنے قول و عمل اور مثال سے بیش کرتی ہے - قرآن کا ارشاد ہے :

لَئِنْ خَيَرَ أَهْلُهُ أَخْرَجَتْ لِلْأَنَّالِسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَايُونَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ

جتنی امتیں (یعنی قومیں) لوگوں میں پیدا ہوئیں تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام کرنے کا حکم دیتے ہو اور برعے کاموں سے منع کرنے ہو اور افہم پر ایمان رکھنے ہو ۔ (آل عمران ۱۱۰-)

وَلَكُنْ مِنْكُمْ أَمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَا مُرْسَلَنَ هَالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَا عَنِ النَّكَرِ

تم میں ایک جماعت ضرور ایسی ہوئی چاہیے جو بھلانی کی طرف دعوت دے، نیک کا حکم کرے اور برالی ہے روکے۔ (آل عمران۔ ۱۰۲۔)

اور اس آمت نے ذمے شہادت حق کا وہی فریضہ عائد ہوا ہے جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد تھا:

لَيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَلَكُنُوا شَهِيدًا عَلَى الْكَافِرِ

تاکہ ہیغمبر تمہارے بارے میں شاہد ہوں اور تم تمام انسانوں کے ساتھی ہو کے گیاہ ہو۔ (حج ۸)

یہ بحث اسلامی ریاست کی ایک بنیادی خصوصیت پر روشنی ڈالتی ہے۔
یہ ریاست ایک معلم کی طرح ہے اسے اپنے تمام شہریوں کی تعلیم و تربیت کا بندوست بھی کرنا ہے اور دنیا کے ساتھ اسلام کی دعوت کو پہش بھی کرنا ہے۔
اس طرح یہ ریاست ایک طرف لوگوں کے معیار عدم و اخلاق کو بلند کرنے ہے اور دوسری طرف ایک عالم لیر پیغام کی داعی ہے۔ یہ قومیت کے کسی تنگ نقطے نظر سے وابستہ نہیں اس کی دعوت تمام انسانوں کے لیے ہے۔ اس پہلو سے یہ ریاست بالکل منفرد ہے۔

اسلامی نصور قومیت

اسلامی ریاست کی بنیادی خصوصیات کے اس مطالعے کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مختصرًا اسلام کے نصور قومیت پر بھی گفتگو کری جائے۔

مدنی اور اجتماعی زندگی کا ایک بنیادی تقاضا ہے کہ انسانوں کے درمیان اشتراک اور تعاون ہو۔ قوم سے صاد انسانوں کا وہ گروہ ہے جس میں اجتماعی وحدت پائی جاتی ہو اور جو ساتھ رہنے کا جذبہ رکھتا ہو۔ اشتراک اور اتحاد کے اس احسان کا نام قومیت ہے۔ یہ احسان ایک عصوبیت ہیدا کرتا ہے جس کے نتیجے میں اپنی قوم کے افراد سے محبت اور ان افراد سے غیریت پیدا ہوئے جو اس دائیرے سے باہر ہوں۔ اس طرح قومی مقاصد کا جذبہ رونما ہوتا ہے جو اگر تیز تر ہو جائے تو انسان سے کھلوا دینا ہے کہ ”میری قوم! خواہ حق پر ہو یا ناحق پر!

اس وحدت و اشتراک کو پیدا کرنے والے عوامل بہت سے رہے ہیں ان میں سے اہم یہ ہیں :

نسل - یعنی ایک خاص نسل سے وابستہ ہونا - یہ "نسلیت" کو پیدا کرتا ہے - دور جدید میں صیہونیت اور نازی ایام اس کی مثالیں ہیں -

رنگ - یعنی ایک خاص رنگ کے لوگ اپنے کو ایک قوم سمجھیں اور دوسرے رنگ کے لوگوں کو اپنی قوم میں شامل نہ ہونے دین - افریقہ کا نسلی امتیاز اس تصور پر مبنی ہے - یہی ضورت امریکہ میں بھی ہے، خصوصیت سے جنوبی ریاستوں میں -

زبان - زبان فکری وحدت پیدا کرنے کا ابک اہم ذریعہ ہے اور قومیت کی تشكیل میں ایک اہم قوت بن جاتی ہے عرب قومیت کی بنیاد زبان ہی ہے۔

معاشی اغراض اور نظام حکومت - ابک ہی معاشی نظام یا ایک ہی سلطنت سے وابستگی بھی قومیت کا جذبہ پیدا کرنے والے عوامل رہے ہیں -

وطن - یعنی ایک خاص خطہ زمین پر آباد ہونا - یہ وطنیت ہے اور اس وقت سب سے زیادہ چلن اسی کا ہے۔

یہ وہ بنیادی عوامل ہیں جو انسانی تاریخ میں اج تک قومیت کی تشكیل کرتے رہے ہیں - اسلام کا نقطہ نظر اس باب میں یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی کلی طور پر قومیت کی بنیاد قرار نہیں دیا جا سکتا اور یہ مسئلہ کو بھی انسان کی حقیقی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتے -

نسل، رنگ، زبان با وطن کو قومیت کی اساس بنانا غیر ممکن اور غیر فطری ہے۔ مخفی کسی نسل سے وابستہ ہونا انسانی اتحاد کے لیے کافی نہیں، خون کے رشته کی ایک اہمیت ہے لیکن چند نسلوں کے بعد یہ رشته کمزیر اور شیز موثر ہوتا جاتا ہے۔ پھر کون اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ کبھی خاص گروہ کی رہگوں میں خاص اسی نسل کا خون گردش کر رہا ہے اور کوئی دوسرا بیل اس میں نہیں سوا۔ پھر اگر نسل غیر کوئی بینا ہے تو اس حقیقت کو کیوں نہ ملعوظ رکھا جائے کہ تمام نسل انسان ایک ہی مان باپ کی اولاد ہے۔ اسلام رشته رحم کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا، قطع رحم کو منع کرتا ہے اور مذہب اور کتبہ کے

اسلام کا سیاسی نظام

۵۰۵

حقوق متعین کرتا ہے لیکن قومیت اور سیاسی مرکزیت کے لئے اسے ابک بنیادی عامل تسلیم نہیں کرتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد، اور حضرت نوح عليه السلام کا بیٹا دین و عقیدہ کے اختلاف کی وجہ سے ان قومیت کا جزو نہ بن سکے جس کی دعوت انبیا علیہم السلام دیتے رہے ہیں۔

رنگ کی بنیاد ہر تفرقیک ایک سراسر غیر عقلی، غیر فطری اور غیر منصفانہ فعل ہے۔ اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ”گورے کو کالے ہو اور کالے کو گورے ہو کوئی فضیلت نہیں“ اور فرمایا کہ ”اگر ابک جبشی غلام بھی تم ہر حاکم مقرر کیا جائے تو اس کی اطاعت کرو۔“

زبان و ادب قومی یک جہتی کو مضبوط کرنے میں بڑا حصہ ادا کرنے ہیں لیکن یہ بھی قومیت کی بنیاد نہیں بن سکتے۔ زبان کے اشتراک سے زیادہ ضروری چیز افکار، نظریات، عقاید اور جذبات کا اشتراک ہے جن کے اظہار کا ایک ذریعہ زبان ہے۔ امر ”القیس عربی زبان کا سب سے بڑا شاعر تھا لیکن جن نظریات کی ان نے تبلیغ کی وہ غلط اور باطل تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بارے میں فرماتے ہیں ”اشعر الشمراء و قائد هم الی النار۔“ (یہ تمام شاعروں کا امام اور ان کو جہنم کی طرف لے جانے والا ہے)۔ معلوم ہوا کہ اسلام کی نکاح میں اصل چیز صحت فکر اور ہاکیزگی بیان ہے، محض ابک خاص زبان و ادب کی پوجا نہیں۔ یہی حال معاشی اغراض اور سیاسی قسمت کے اشتراک کا ہے۔ یہ اپنا کوئی مستقل اور پائیدار وجود نہیں رکھتی اور ابک پائیدار اتحاد کی بنیاد نہیں بن سکتیں۔

آخری چیز وطن کا اشتراک ہے اور بلا شبہ وطن سے محبت ابک فطری جذبہ ہے۔ لیکن سوچنے کی چیز یہ ہے کہ کیا محض وطن انسان معاشرے میں قومیت کی بنیاد بن سکتا ہے؟ وطن کی اصل یہ ہے کہ ابک شخص ابک خاص علاقے میں ہیدا ہوا ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو جس زمین ہر ابک شخص ہیدا ہوتا ہے وہ ایک یا دو سربع گز سے زیادہ نہیں ہوئے۔ اگر اس ایک یا دو سربع گز کو وسیع کر کے ابک ملک کی حدود تک لا جا سکتا ہے تو آخر ہوئی دنیا تک اس کو وسیع کیوں نہیں کیا جا سکتا؟

وطن سے ایک حد تک لگاؤ فطری ہے اور اسلام اس کو نہیں ساختا لیکن زندگی کی بنیادی وفاداری اور اتحاد کی اصل بنیاد وطن کے بجائے اصول اور نظریہ،

سلک اور دین کو فرار دیتا ہے، جس کی خاطر اگر ضرورت بیش آجائے تو وطن سے ہجرت کو بھی ضروری سمجھتا ہے۔ اقبال نے بہت صحیح کہا کہ ہجرت نبی کے نتیجے میں اسلامی ریاست کا قیام وطنی قومیت کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔

یہ تمام عوامل قومیت کے لیے کوئی عقلی اور اصولی بنیاد فراہم کرنے سے قادر ہیں۔ بھی وجہ ہے کہ یہ جس قسم کی قومیت کی تشكیل کرتے ہیں وہ غیر فطری ہے، اس میں تنگ نظری اور تعصیب پایا جاتا ہے اور انسانوں کے معاملات ہر خاص انسانی اور اصولی نقطہ نظر سے، حق و باطل کے اصولوں کی روشنی میں غور ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ دراصل انسانوں کو جوڑنے کے بعد میں باشنا اور ان کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیتی ہیں، غلط عصبیتوں کو جنم دینی ہیں اور انسانیت کو تباہیوں کی طرف دھکیلتی ہیں۔

اسلام ان کے مقابلے میں ایک انقلابی پیغام دیتا ہے۔ وہ تمام انسانوں کو برابر سمجھتا ہے اور اپنی قومیت کی بنیاد خود اسلام پر رکھتا ہے جو ایک عالم گیر نظریہ ہے۔ ہر وہ شخص جو اس دین کو قبول کرے ملت اسلامیہ کا جزو بن جاتا ہے اور جو اس کا باغی ہو وہ ملت کفر میں چلا جاتا ہے۔ اقبال نے صحیح کہا ہے:

اہنی ملت ہو قیاس اقوام مغرب سے نہ کرو
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول هاشمی
آن کی جمیعت کا ہے ملک و نسب ہر انعام
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمیعت تری

*اسلام نے رنگ، نسل، وطن، زبان، معیشت و سیاست کی غیر عقلی تغیریوں کو انہا دیا اور خاص عقلی بنیادوں پر ایک نئی قومیت کی تعبیر کی۔ اس قومیت کی بنیا بھی امتیاز پر تھی مگر مادی اور ارضی امتیاز ہر نہیں بلکہ روحانی اور جوہری امتیاز ہے۔ اس نے انسان کے سامنے ایک فطری صفات بیش کی جس کا نام ”اسلام“ ہے۔ اس نے خدا کی بندگی و اطاعت، نفس کی ہاکیزگی و طہارت، عمل کی نیکی اور پر عیزگاری کی طرف ساری نوع انسانی کو دعوت دی۔ ہر کہہ دیا کہ جو اس دعوت کو قبول کرے وہ ایک قوم ہے اور جو اس کو رد کر دے وہ دوسری قوم ہے۔ ان دونوں قوموں کے درمیان بنائے امتیاز نسل ^{یہاں سے آگے کے چڑ پیر اگراف مولانا مودودی صاحب کے مفسون ”اسلامی تصور قومیت“} مانعہ ہیں۔

اور نسب نہیں اعتقاد اور عمل ہے۔ ہو سکنا ے کہ ایک اب کے دو بیٹے اسلام متعدد ہونے کی وجہ سے ایک قومیت میں مشترک ہو جائیں۔ وطن کا اختلاف بھی ان دونوں قوموں کے درمیان وجہ امتیاز نہیں ہے۔ یہاں امتیاز حق اور باطل کی گھر کے دو آدمیوں کی قومیتیں اسلام اور کفر کے اختلاف کی وجہ سے مختلف کا قومی بھائی بن جائے۔

رنگ کا اختلاف بھی یہاں قومی تفریق کا سبب نہیں۔ یہاں اعتبار چھرے کے رنگ کا نہیں، اللہ کے رنگ کا ہے اور وہی بہترین رنگ ہے:

صَبَّفَ اللَّهُ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ الظَّيْبَانَةِ

اہ کا رنگ (اختیار کرو) اور اللہ کے رنگ
سے بہتر اور کس کا رنگ ہو سکتا ہے۔
(البقرہ - ۱۲۸)

ہو سکتا ہے کہ اسلام کے اعتبار سے ایک گورے اور ایک کالے کی ایک قوم ہو اور کفر کے اعتبار سے دو گوروں کی دو الگ قومیں ہوں۔

زبان کا امتیاز بھی اسلام اور کفر میں وجہ اختلاف نہیں ہے، یہاں منہ کی زبان نہیں مخصوص دل کی زبان کا اعتبار ہے جو ساری دنیا میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور اس کے اعتبار سے عربی اور افریقی کی ایک زبان ہو سکتی ہے اور دو عربوں کی زبانیں مختلف ہو سکتی ہیں۔

معاشی اور سیاسی نظاموں کا اختلاف بھی اسلام اور کفر کے اختلاف میں سے نہیں ہے۔ یہاں جہگڑا دولت زر کا نہیں دولت ایمان کا ہے، انسانی سلطنت کا نہیں خدا کی بادشاہت کا ہے۔ جو لوگ حکومت الہی کے وفادار ہیں اور جو خدا کے ہاتھ پر اپنی جانیں فروخت کر چکے ہیں وہ سب ایک قوم ہیں خواہ کہیں رہتے ہوں اور جو خدا کی حکومت کے باغی ہیں وہ ایک دوسری قوم ہیں خواہ کسی سلطنت کی رعایا ہوں۔

اس طرح اسلام نے قومیت کا جو دائرہ کھینچا ہے وہ کوئی حسی اور مادی دائرہ نہیں بلکہ ایک خالص عقل دائرہ ہے۔ اس دائرے کا محیط ایک کلمہ ہے۔

لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ رَسُولُ اللَّهِ۔ اسی کلمہ ہر دوستی بھی مے اور دشمنی بھی ، اسی افراج جمع کرتا ہے اور اسی کا انکار جدا کرتا ہے ۔

اس بحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام میں ملتِ اسلامیہ کی وحدت ایک بنیادی اصول ہے ۔ اور اگر حالات کی مجبوری کی وجہ سے ملت بہت سے ممالک میں بٹی ہوئی ہوتی بھی ہر ملک کو خالص وطنی قومیت کے مقابلے میں اسلام کی نظریاتی قومیت کو بنیاد بنانا چاہیے اور آہستہ آہستہ اتحاد اسلامی یا مسلمانوں کی دولت مشترکہ کو قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے ۔ اس طرح یہ ممکن ہے کہ بہت سی ریاستیں اسلام کی بنیاد پر قائم ہوں اور انہے اپنے دائرے میں اس انقلابی دین کو قائم کرنے کی کوشش کریں ۔

دور حاضر میں پاکستان کا وجود اسلامی قومیت کا مظہر ہے ۔ یہ ملک خالص نظریاتی بنیادوں پر قائم ہوا اور ہر سے ہندوستان کے مسلمانوں نے اس کے قیام کے لیے جدوجہد کی ۔ یہ نہ ایک جغرافیائی وحدت ہے ، نہ اس میں ایک زبان ہے ، نہ اس کے رہنے والوں کی نسل ایک ہے اور نہ ان کا رنگ ایک سا ہے ۔ جس چیز نے ان کو جوڑ کر ایک وحدت بنا دیا ہے وہ ان کا دین و ایمان اور ان کا نظریہ حیات ہے جسے غالب کرنے کے لیے انہوں نے ایک ملک قائم کیا ہے ۔ اور یہ ملک ہمارے لیے مقدس اس لیے ہے کہ یہ اسلامی نظریہ کا علم بودار ہے ۔

✓ خارجہ ہالبی کے بنیادی اصول

ایک اہم سوال ہر بحث کی مزید ضرورت ہے ۔ یعنی وہ ملک جو اسلامی نظریے کو لی کر انہیں اس کی خارجہ ہالبی کے اصول کیا ہوں ؟ ملت اور ریاست کے تعلقات دوسرے ممالک اور اقوام سے کن بنیادوں پر استوار ہوں ؟ ذیل میں ہم ان اصولوں کی مختصر تشریع کرتے ہیں ۔

(۱) اس سلسلے میں سب سے ۴۶۸ اصول یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ اور اسلامی ریاست کی حیثیت ہوئی دنیا کے سامنے خدا کی شریعت کے علم بودار اور اس کے پیغام کے داعی کی ہے ۔ قرآن اس کو "امت وسط" کہتا ہے اور اس کے منصب کو "شهادت حق" سے تعبیر کرتا ہے ۔ یعنی وہ امت ہے جو خدا کی طرف سے ہوئی انسانیت پر گواہ بنائی گئی ہے ، جو اپنے قول و عمل اور ہالبی اور ہروکرام کے ذریعے سے خدا کے دین کی شہادت دیتی ہے ۔

اس لئے "اسلام" میں "سیاست خارجہ" کا بھلا اصول بہ قرار ہاتا ہے کہ
بہ اسلام کی مبلغ اور حق کی شہادت دینے والی ہے اور بہ کوئی ایسا رویہ اختیار
نہیں کر سکتی جو کسی طرح اس کی حیثیت کو معروض کرنے والا ہو۔

(۲) وطن کی محبت۔ اور اس کے مفاد کا تحفظ امن کی دوسری بنیاد ہے۔ وطن
کی محبت سے مراد ہے کہ ملک اور اس کے بسنے والوں کی حقیقی خبرخواہی،
ان کے مفاد کا بحفظ، ان کے حقوق کے لئے جدوجہد اس کے اوابن فرانس جن سے
ہوں ۔ اسلام وطن سے سچی محبت کو ایمان کے ثوابات میں ہے مجھتنا ہے۔
لیکن پہاں اسلام کے نقطہ نظر میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ اسلام "میرا ملک"
حق یا ناحق! " کے اصول کو صعبج نہیں مجھنا، بلکہ وہ حق کی صورت میں ہر
ممکن تعاون اور جدوجہد، اور ناحق کی صورت میں مخالفت اور درست کرنے کی
کوشش فرض کرتا ہے۔

مثال، ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اہنے بھائی کی
مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔" صحابہ نے ہوچھا "بِاَللّٰهِ رَبِّ الْعٰالَمِينَ" جب وہ
مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم ہے، لیکن اگر وہ ظالم ہو تو پھر اس کی
مظلوم ہو تو اس کی مدد مجھے میں آتی ہے، مدد کیسے اکی جا سکتی ہے؟" حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا "اس کی
مدد اس طرح کرو کہ اس کو ظلم سے روک دو۔" پس یہی اصول اسلام خود
قومی پالیسی کے لئے بھی تعویز کرتا ہے۔

(۳) اسلام کی سیاست خارجہ کا یہ بھی ایک اہم پہلو ہے کہ وہ بوری امت
مسلمہ کی وحدت کا داعی ہے، اور ریاست کو ایسی تدبیر اختیار کرنے کی تاکید
کرتا ہے جو تمام مسلمانوں کو جوڑنے والی اور ان میں تعاون اور بھائی چارہ قائم
کرنے والی ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں کی بہت سی ریاستیں ہوں لیکن ان
کو اہنی اسی "دولت مشترکہ"، بنائی جائیں جو ہر حیثیت سے ان کو ایک
دوسرے کا معاون و مددگار بنادے۔ قرآن میں ہے:

وَإِنْ هُنَّةَ أَشْتَهِمُ أَنْتَهُمْ لَأَمْدَدُهُمْ وَنَحْنُ بِكُمْ فَيَأْتُونَ

اور دیکھو! یہ تمہاری امت فی الحقيقة
ایک ہی انت ہے اور میں تم سب کا
برور دگار ہوں، جسے اختیار کرو۔
(المومنون۔ ۵۱)

وَاعْتَصُمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَنْزِفُوا

سب بل جل کر اللہ کی رسی کو مضمونی
سے نہام لو اور نکڑے نکڑے نہ ہو جاؤ۔
(آل عمران - ۱۰۳)

بھر اس کا تقاضا صرف یہی نہیں ہے کہ مسلمانوں میں عام تعاون ہو بلکہ سیاست خارجہ کا ایک خاص مقصد یورمے عالم اسلام کی سیاسی آزادی ہے۔ مسلمان آزاد رہنے اور صرف خدا کی غلامی کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اور اگر دنیا کے سینے پر ایک مسلمان بین غیر اللہ کی غلامی میں گرفتار ہے تو اسے مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ اس کو طاغوں نظام سے آزاد درائیں۔ اسلامی فقہ کا ایک مسئلہ ہے کہ ”اگر ایک مسلمان عورت مشرق میں قید ہو تو اعلیٰ غرب پر فرض ہے کہ اس کو فدیہ دے کر جھوٹائیں۔ خواہ اس سلسلے میں تمام مسلمانوں کا مال ہی کیوں نہ دینا پڑے“^۱۔ ظاہر ہے اگر ایک عورت تو علامی اور قید سے جھوٹانے کے لئے یہ مسئلہ ہے تو یورے اسلامی معانک دو اغیار کی غلامی اور مشرق و مغرب کے استعماروں سے آزاد کرانے کے لئے ہمارا ملک ایسا ہو سکتا ہے؟

(۲) اسلام فتنہ اور فساد کو ختم کرنے اور امن قائم کرنے کے لئے آیا ہے۔ اور اس کی خارجہ بالیسی کا مقصد امن عالم کا قیام ہو۔ قرآن انسانی خون کے بھانے کو کنہ عظیم قرار دبتا ہے الا یہ کہ حق کے ساتھ ہو:

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أُوْفَقَ لَوْفِي الْأَرْضِ فَكَانَتْ أَقْتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا وَمَنْ لَنِيَلَا فَكَانَتْ أَخْنَى النَّاسَ جَمِيعًا

جس نے سوائیں کے کہ قصاص ایسا دیا۔ ملک میں فائد پہنچانے والوں کو سزا دینی ہو، کسی انسان کو قتل کیا تو اس نے گویا تمام اُن نوں کا خوب کیا اور جس کسی نے کسی کے جان بچانی گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی دے دی۔ (الہدیہ - ۳۲)

پھر قرآن ہے۔ کی زمانی کی مخالفت نوتا ہے:

وَلَا يَجِدُ مَنْكَرٌ شَنَآنٌ قَوْمٌ عَلَى الْأَنْعَدِ لَوْلَمْ

اور دیکھو ایسا نہ ہو کہ ایک گھر کی دشمنی تمہیں ابھی بات پر ابھار دے کہ راہ انصاف سے ہٹ جاؤ۔ (المائدہ - ۸)

^۱ الشرح الصابر بحواره حسن البیان، ”الاخونون المسلمون اور ان کی دعوت“

اسلام کا سیاسی نظام

ام سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا مقصد امن قابض کرنا اور انسانی زندگی کو سکون کی دولت سے مالا مال کرنا ہے۔ لیکن اسلام نے صرف اتنی بات کہہ کر معاملے کو ختم نہیں کر دیا ہے ورنہ اس میں اور اہنہا میں کوئی نرق نہ رہتا۔ اسلام نے ان اسباب کو دور کرنے کی بھی کوشش کی ہے جو امن کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہیں اس ایسے کہا گیا ہے کہ طاغوت کی قوت کو ختم کرو اور زمین سے فتنے کو بالکل منادو۔ تب ہی حقیقی امن قابض ہو سکتا ہے :

وَفِيْكُمْ حَلِيلَ الْأَكْلُونَ فَتَنَّهُ وَيَكُونُ التَّبَرِّنُ بِهِدْوَقَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ ۝

”اور ان سے اس رقت تک لوتے رہو جب تک فتنہ و فساد ختم نہ ہو جائے۔ اور دین افہ کے لیجے خالص نہ ہو جائے۔ اگر وہ فساد سے باز آجائیں تو ظالمین کے سوا کسی بر زیادتی نہیں کرنا چاہیے۔“ (البقرہ - ۱۹۳)

امن طرح اسلام ان اسباب کو بھی دور کرتا ہے جو امن کو تھا و بالا کرنے والے ہیں۔

(۵) اسلام جغرافیائی حدود کو انسانیت کو مستقبل دلوں پر بانٹنے والی حدود نہیں مانتا۔ وہ ایک عالمی انسانی برادری قابض کرنا چاہتا ہے جو ایک قانون کے تابع اور ایک مرکز توابع ہو۔ اور جس میں انسانوں کو گروہوں میں تقسیم کرنے والی چیز نہیں، رنگ، زبان اور وطنی حدود نہ ہوں۔ بلکہ بوری انسانیت ایک خاندان بن جائے۔ اور اگر کسی بنیاد پر ان میں فرق ہو تو وہ ایمان اور تقویٰ ہوں، اور یہ ایسی چیزوں ہیں جو کسی قوم، رنگ یا نسل سے وابستہ نہیں بلکہ پوری انسانیت ان کے سلسلے میں برادر ہے۔ ہر شخص اپنی حاصل کر سکتا ہے۔

حدیث میں پوری انسانیت کو ”عیال اللہ“ کہا گیا ہے :

”ساری مخلوق عیال اللہ ہے اور اللہ سب الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ“ زیادہ محبت اس سے کرتا ہے جو عیال اللہ من احسن اني عياله (بیہقی) کو سب سے زیادہ محبوب رکھتا ہے۔“

امن طرح اسلام ہوئی عالمی انسانی برادری کی تنظیم کا مدعی ہے۔

(۶) عهد و بیان کی ہابندی بھی اسلام کی بین الاقوامی نایسی کی ایک

مول ہے۔ اور اسلام اس پر سختی سے عمل کا حکم دلتا ہے :

نَأْتُهُمُ الَّذِينَ أَمْسَأَوْلَوْا بِالْعَلْوَةِ

”اے ایمان والو ! اپنے معاہدے پورے کرو۔“ (المائدہ ۱۰)

صرف اس صورت میں معاہدہ توڑا جا سکتا ہے جب دوسرا فریق اس کی خلاف ورزی کرے، اس صورت میں قرآنی تعلیم یہ ہے کہ معاہدہ خلاف ورزی کرنے والی فریق کے منہ ہر دمے مارو، جس سے ظاہر ہے علانیہ ہے تعلقی کا اعلان ہو جائے گا :

فَإِذَا لَمْ يَحْمِدُهُمْ عَهْدُهُمْ مُّكْلَفٌ

بس ان سے ان کا عہد ان کے وعدہ نک پورا کر دو۔ (التوبہ ۲۰)

(۷) بین الاقوامی تعلقات میں اسلام بدھے اپنے کو جائز قرار دیتا ہے لیکن یہ لازم کر دیتا ہے کہ بدھے اتنا ہی لیا جائے جتنا حق ہے اور ذرا بھی زیادتی نہ کی جائے۔ نیز اگر در کثر اور حسن سلوک کا طریقہ اختیار کیا جائے تو پہ خوب تر ہے :

وَجَزِّا إِسْبَيْرَةَ سَبَيْرَةً فِي شَلَمَّا

برائی کا بدھے تو بس اس کے برابر درائی ہی ہو سکتا ہے۔ (الشوریٰ ۲۰)

فَمَنْ أَغْتَدَى عَلَيْكُمْ فَأَغْتَدُ فَاعْلَمَنِيهِ بِمِثْلِ مَا أَغْتَدَى عَلَيْكُمْ

بس ہوتم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس کے برابر کی زیادتی کر کے اپنا بدھے لئے سکتے ہو (اس سے زیادہ نہیں)

وَلَنْ عَاقِبَنَّهُمْ فَمَا قَبَوْا وَلَنْ يُؤْتَوْهُمْ وَلَئِنْ صَرَّتْ لَهُمْ خَيْرٌ لَا يُظْهِرُنَّ

اور اگر (معذالتورہ کی سختی کے حواب میں) سختی کرو تو چاہیے کہ ویسی اور اتنی ہی کرو جسی اور جتنی تمہارے سانہ کی گئی ہے۔ اور اگر تم نے صیر کیا تو بلا شہہ صیر کرنے والوں کے لئے صیر ہی بہتر ہے۔ (النحل ۱۲۶)

ان آپات کی روشنی میں سیاست خارجہ کا ایک اصول بہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کو دوسرے ممالک سے بدله لینے کی اجازت ہے لیکن حسن سلوک کی ہالیسی بہ ہر حال قابل ترجیح ہے۔ رہی بہ بات کہ کس موقع پر کون سا رویہ اختیار کیا جائے، تو اس کا فعلہ محالہ واقعات و حقائق کی روشنی میں ہی ہو سکتا ہے۔

مندرجہ "بالا" مباحثت اسلام کے سیاسی نظام کو واضح کر دتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا اپنا ایک سیاسی نظریہ ہے اور وہ ایک مخصوص مزاج کی ریاست قائم کرتا ہے جو دور حاضر کی اور سب ریاستوں سے مختلف اور ان سے بہت اعلیٰ اور بہتر ہے۔

مزید مطالعے کے لئے

مولانا محمد اسحاق سنڈیلوی، اسلام کا سیاسی نظام - مطبع معارف، اعظم گذہ۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ وودودی، اسلامی ریاست - اسلامک پبلیکیشنز لمیٹ، لاہور۔

مولانا امین احسن اصلاحی، اسلامی ریاست - لاہور۔

پروفیسر عبدالحیمد صدیقی، اسلام اور تہجا کربیسی - مکتبہ چراغ راہ، کراچی۔

حکیم حیدر زمان صدیقی، اسلامی نظریہ" میامت - کتاب منزل، لاہور۔

خورشید احمد (مرتب) چراغ راہ (نظریہ" پاکستان نمبر) - مکتبہ" چراغ راہ" کراچی۔

مولانا حامد الانصاری، اسلام کا نظام حکومت - ندوۃ المصنفین، دہلی۔

Muhammad Asad (Leopold Weiss), *Principles of State and Government in Islam*, University of California Press.

* اسلام کے تقاضے *

اسلام کا تصور دین

دنیا میں اس وقت مذہب کے تین مختلف تصور پائے جاتے ہیں ।

(ا) ایک تو یہ کہ دنیا انسان کے لیے حقیقتاً ایک قید خانہ ہے۔ اس کا جسم اس کی روح کے حق میں ایک پنجرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان نجات اسی وقت پاسکنا ہے جب وہ اس قید خانے کی دبواروں کو خود اپنے ہاتھوں سے توڑ ڈالے۔ یعنی وہ دنیا کو چھوڑ کر بستیوں ہے دور ایک گوشے میں بیٹھ کر خدا سے لو لگائے۔ اور دنیا جہاں کے سارے بکھڑوں سے آزاد ہو کر خدا کی جانب تک رਸائی حاصل کر لے۔ دین اور خدا پرستی کے اس نظریے کا نام ”رہبانیت“ یا ”بوگ“ ہے۔

(ب) دوسرے تصور کی رو سے انسان کو دنیا — منہ سوڑنے اور نفس کشی کی حاجت نہیں۔ بلکہ اسے دنیا کو برتنے ہوئے اور اپنی جبلی خواہشوں کو معقول حدود کے اندر پوری کرنے ہوئے خدا کی عبادت کرنا چاہیے۔ جہاں تک دنیوی معاملات کا تعلق ہے انسان صرف انفرادی زندگی میں دین کا باہنہ ہے لیکن اجتماعی زندگی میں وہ آزاد و خود مختار ہے کیونکہ ”عبادت“ فرد کا کام ہے جماعت کا نہیں۔ نیز دین انسان اور خدا کے درمیان ایک نبی معاملہ ہے۔ چنان جہاں عام دنیاوی اور اجتماعی وسائل میں انسان

* یہ باب مولانا صدر الدین اصلاحی کی کتاب "فريضہ" اقامۃ دین اور "اسلام ایک نظر میں" سے ماخوذ ہے۔ (مرتب)

آزاد ہے۔ یہ مذہب کا محدود تصور ہے اور اسے "ادھوری دین داری" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

(ج) تیسرا تصور یہ ہے کہ دنیا سے کنارہ کشی اور نفس کشی دونوں غلط ہیں۔ اور دین و بندگی کو صرف نجی اور انفرادی معاملہ تصور کرنا بھی بالکل غلط ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ انسان اپنی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی میں دین کا پابند اور بندگی کا محتاج ہے۔ اسے جتنی قوتیں دی گئی ہیں وہ صرف بندگی کے لیے عطیہ ہیں۔ یعنی نہ انہیں بالکل آزاد چھوڑا جائے، نہ ان کو کچلا جائے۔ صحیح دین داری اور خدا ہرستی یہ ہے کہ انسان زندگی کا ہر لمحہ احکام الہی کے تحت گذارے اور دنیوی زندگی کا پورا نظام مالک حقیقی کا پسندیدہ ہو۔ یہ اسلام کا تصور دین ہے۔

اسلام کا یہ تصور دین رہبانیت سے کسی قسم کا لکاؤ نہیں کھاتا۔ انسان کے رب نے، جو حقیقی فرمان روا اور قانون ساز ہی ہے، ہری زندگی کے لیے احکام و قوانین مقرر کیے ہیں۔ اس کے بنیادی عقاید و اعمال مثلاً نماز، حج اور زکوٰۃ وغیرہ کی ثہیک ثہیک ادائیگی کے لیے اجتماعیت کو ضروری قرار دیا ہے کیونکہ اجتماعی فضا سے ہٹ کر بہ طور خود نماز روزے کی ادائیگی سے وہ تمام فوائد و مصالح ہرگز نہ حاصل ہو سکیں گے جو شریعت میں مقصود ہیں۔ اور اسلام کے پورے احکام کی بجا آوری اجتماعیت کے بغیر سکن نہ ہوگی۔ نیز قرآن و حدیث میں اس سے صاف برامت کا اظہار کیا گیا ہے۔ مثلاً:

اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں ہے۔

لارہبانیہ فی الاسلام (حدیث)

ایک دوسری حدیث میں ہے۔ "ہبی اللہ تعالیٰ نے رہبانیت کے بجائے آسان اور خالص دین ابراهیمی عطا فرمایا ہے۔" اسی طرح قرآن میں ہے:

وَرَهْبَانِيَةً بِإِتَّدَاعِهَا مُؤْمِنًا مَّا كَتَبْنَا لَهُمْ أَعْلَمُ

"اور انہوں نے رہبانیت کی خود ساختہ را اختیار کر لیا ہے تو انہیں اس کا حکم نہیں دیا تھا۔" (الحدیث۔ ۲۴)

گویا نہ صرف اسلام میں بلکہ خدا کی طرف سے آئی ہوئی کسی شریعت میں
بھی رہبانیت کی تعلیم نہیں دی گئی۔ جناب جہ آپ دیکھیں گے کہ جس طرح دین
کا سزاچ رہبانیت کو برداشت نہیں کرتا اور اس کے بنیادی عقاید، اعمال اس کے
مخالف ہیں، نہیک وہی حال اس کی تسلیٰ تعلیمات کا بھی ہے۔ اس ایسے
نہی میں اسے علیہ وسلم نے ہر اس طرزِ عمل کی معافت فرمائی ہے جس میں رہبانیت
کی ہوتی ہے اور یا اس کی طرف لے جانے والا تھا۔ مثلاً نکاح سے بجننا، ہمیشہ سلسل
روزے رکھنا، فوت گوبائی معطل رکھنا، مسلسل شب بیدار باہن یا وہ عبادات جس
سے جسم آرام اور اہل و عیال اپنے حقوق سے محروم ہو جائیں وغیرہ۔

رہبانیت کی طرح دوسرا مذہبی تصور بھی، جسے ہم نے "ادھوری دین داری"
سے موسوم کیا ہے، اسلام کے تصور سے بالکل مختلف ہے، کوئی کہ دین بندے
اور خدا دنچی معاملہ نہیں ہے۔ اکر ایسا ہوتا تو اس کی تعلیمات انفرادی زندگی
کے مسائل تک ہی محدود ہوتیں۔ وہ صرف مسجد کی باتیں کرتا، نماز رفے کا
حکم اور اخلاقیات کی تلقین میں کافی تھی۔ لیکن واقعہ اس کے برعکس ہے۔ اسلام
کے نزدیک "دین" انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر میدان میں ہادی
اور واجب الاتباع ہے۔ اللہ کا ہر فرمان اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا
ہر ارشاد اسلام کا حصہ اور دین کا جزو ہے۔ اور ان کے کسی بھی حکم کو دین
سے زائد نہیں خیال کیا جا سکتا۔ یوں ہمی سمجھیے تو اس طرح کے خیال میں کوئی
معقولیت نہ مل سکے گی۔ "اسلام" کا مفہوم اگر اللہ تعالیٰ کی غیر مشروط
اطاعت ہے تو اس کے کسی حکم کو آخر دائرہ اطاعت سے کس طرح باہر رکھا
جائے گا۔

غرض اسلام نہ تو رہبانیت کو درست قرار دتا ہے اور نہ اس کا دائرو
انفرادی زندگی کے مسائل تک محدود ہے۔ بلکہ وہ تو ایک مکمل ضابطہ "زندگی
اور ایک کامل اجتماعی سلک" ہے۔ اور ملت اسلامیہ یا آمت مسلمہ وہ با اصول
جماعت ہے جس کا مقصد اسلام کے ذیبی ہونے اصولوں پر اپنی زندگی کی پوری
عمارت کی تعمیر ہے، یہ سلک حیات فطرت کے نہوں حقائق پر مبنی ہے، عالم گیر
اور جهانی ہے، زیان و مکان کی قیود اور قومی و جغرافیائی حدود سے ساواڑا ہے،
غیر متبدل ہے اور انسانی علوم و افکار اور تجربات اس کی کسی ایک اصل میں بھی

قطع و بربد نہیں کرسکتے۔ مختصر یہ کہ وہ ایک ایسا مکمل نظام ہے جو انسان زندگی کے اعتقادی، فکری، اخلاقی، روحانی اور عملی تمام پہلوؤں کو ہوئی طرح گھیرے ہونے ہے بلکہ اسلام دراصل اللہ کی رضا کی خاطر جینے اور اسی کی خاطر مرنے کا نام ہے اور مسلمان وہ ہے جو اپنی نظریں ہمیشہ آخرت پر جانے رکھے اور اس کے مفاد پر دنیا کے مفاد کو ہرگز مقدم نہ ہونے دے۔

اب اس میں تو کسی کو اختلاف نہ ہوگا کہ اسلام کا قبول کر لینا نجات آخری کا باعث ہے۔ اور آخرت کی ساری فلاح و کامرانی ایک "سلم" کے لئے مقرر ہو چکی ہے۔ چنان چہ قرآن میں ہے :

بَلْ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِنَحْنُ وَهُوَ قَرِيبٌ فَلَمَّا آتَجْدَهُ عِنْدَرَيْهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ هُنَّا

ہاں جس ذیے اپنا رخ اللہ کی طرف کر دیا (یعنی اسلام قبول کر لیا) اور وہ نیکو کار ہوا تو اس کے لیے اس کے پروردگار کے ہاں اس کا ثواب ہے۔ اور ان (اسلام قبول کر لینے والوں) کو نہ کوئی خوف ہی ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔
(البقرہ، ۱۱۲۰)

لیکن آخرت کے ثواب اور وہاں کی فلاح و کامرانی سے ہمیں ہر ایک کے ذہن میں بہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دین کی صحیح پیروی کے بعد مسلمان کی "دنیا" کا کیا نقشہ ہوگا۔ کیا اس کے ہام اس دنیا کی کوئی قابل ذکر چیز باقی رہ جائے گی؟ وہ انفرادی حیثیت سے خوش حال اور اجتماعی حیثیت سے ہا عزت و ہا اقتدار بھی باقی رہ سکے گا؟

اسلام کی دنیوی برکتیں

اس سلسلے میں انبیاء کرام علیہ السلام کی دعوتوں کا سرسری جائزہ مفید ہوگا۔ ہر نبی نے اپنی قوم کو اللہ کے دین کی طرف بہ یقین دلانے ہونے پڑایا کہ میری پیروی تمہیں آخرت ہی کی نہیں دنیا کی بھی فلاح بخشے گی۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے اس وعدہِ الہی کا اعلان کیا تھا "لَئِن شَكْرَتُمْ لَازِيدَنَّكُمْ" (اگر تم نے شکر گذاری کی روشنی اختیار کی تو تمہیں مزید بخشش عطا کروں گا) اور جب تک ان کی قوم اس روشن پر جلتی رہی اللہ کا وعدہ پشارت پورا ہوتا رہا، حتیٰ کہ عظمت و شوکت میں ان کی قوم سب سے

اعلیٰ و ارفع مقام ہو ہنچ گئی:

يَهْبِقَ إِعْرَابِنَ أَذْكُرُوا نَفْعَنِي الَّتِي أَنْعَمْتُ عَلَيْهِمْ وَأَنِي فَضَلْلَكُلَّدَعْلَ الْعَلَمَيْنَ

اے بنی اسرائیل! میری نعمتوں کو یاد کرو جو میں فر نہیں دی
نہیں اور یہ کہ میں فر نہیں پوری دنیا پر فضیلت بخشی -
(البقرہ - ۱۲۲)

لیکن جب انہوں نے یہ راہ ترک کر دی تو ان کے اوہر سے عزت و اقبال
کی قبا بھی اتار دی گئی - اور "وضربت علیہم الذله و المسکنه" کی سہراں ہر
لگا دی گئی - کاش! "اگر یہ اہل کتاب تورات دو اور انجیں کو اور ان
ہدایتوں کو قایم کرتے جو ان کے رب کی طرف سے بھیجی گئی تھیں تو رزق ان کے
اوہر سے بھی برستا اور نیچے سے بھی آبلنا -" (المائدۃ)

غرض ساری اقوام کے لیے یہ عمومی قانون الہی رہا ہے کہ

وَلَوْاَنَ أَنْفَلَ الْقُرْبَى أَسْتَوْاْ لِلْعَنَّاقَةِ عَلَيْهِمْ بِرْكَتُنَ الشَّمَاءِ وَالْأَرْضِ

اگر بستیوں والی ایمان لاتھ اور تقویٰ کی راہ چلتی تو تم ان کے
اوہر زمین اور آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے -
(الاعراف - ۹۶)

اور جنہوں نے ایمان اور خدا پرستی کا راستہ اختیار کیا

فَإِنَّمَا اللَّهُ يُوَابُ الدُّنْيَا وَحُسْنَ شُوَّابُ الْآخِرَةِ

تو اللہ نے انہیں دنیا کا بھی اجر دیا - اور
آخرت کا بھی بہترین اجر عطا فرمایا -
(آل عمران - ۱۲۸)

ان مستفقہ شہادتوں کی موجودگی میں کوفی ویچہ نہیں کہ اسلام اور آمت مسلمہ
کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ضابطہ اور فیصلہ بدل جاتا - چنان چہ دنیوی فلاح
کیا جاتا رہا ہے - اور یہ ہر مرحلے میں کہا گیا - مکہ کے تاریک و صبر آزمایا
دور میں بھی اور مدینہ کے پر خطر ماحون میں بھی - آنہیں بھی خطاب کیا گیا جو
اسلام لا چکے تھے اور آنہیں بھی جو ابھی دائرة اسلام میں نہ آئے تھے - چنان چہ

مکہ میں قریش کو ایمان کی دعوت دیتے ہوئے اللہ کا ارشاد تھا :

وَأَنْ أَسْتَغْفِرُ لَهُ رَبِّكُمْ لَمَّا تَوَبَّ إِلَيْهِ يَغْفِرُ كُلُّ ذَنْبٍ إِذَا حَسِنَ

اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو اور پھر اس کی طرف
رجوع کرو تو وہ تمہیں زندگی کا اچھا سامان عطا فرماتا
رہے گا۔ (ہود - ۲)

اور اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انہیں یقین دلا یا تھا کہ ”اگر تم
میرا لایا ہوا ہیغام قبول کرلو گے تو وہ دنیا میں بھی تمہاری خوش نصیبی کا باعث ہو گا
اوہ آخرت میں بھی -“ اور ایک موقع پر اپنے چھا ابوطالب سے سکھا تھا -
”میں انہیں (یعنی قریش کو) صرف ایک بات کی تلقین کرتا ہوں - ایسی بات
کہ جس کی بدولت سارا عرب ان کا مطیع اور سارا عجم ان کا باج گذار ہو جائے گا۔“
ہر اسی طرح ایمان لا چکنے والوں سے خطاب فرمایا گیا :

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْفِفُنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفُوا الَّذِينَ هُنَّ قَبْلَهُمْ وَلَيَعْلَمَنَّهُمْ لَهُمْ دِيْنُهُمُ الَّذِي أَنْتَهُمْ وَلَيَعْلَمَنَّهُمْ مِنْ أَنْتَهُمْ خَوْفٌ مُّبِينٌ

تم میں سے جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور عمل صالح کرنے ہیں اللہ کا ان سے وعدہ ہے
کہ وہ انہیں زمین میں اقتدار عطا فرمائے گا جس طرح کہ اس نے ان سے پہلے کے لوگوں
کو اقتدار عطا فرمایا تھا اور ان کے لیے اس دین کی جزاں بڑی مضبوط جمادے گا جسے
اس نے ان کے لیے پسند فرمایا ہے اور ان کی موجودہ جالت خوف کو حالت امن سے بدل
دے گا۔ (آل النور - ۵۵)

کویا جس طرح آخری فلاح کے لیے ”ایمان“ اور ”عمل صالح“ ایک لازمی
شرط ہے اسی طرح دنیوی فلاح و سعادت کے لیے بھی ”ایمان“ اور ”عمل صالح“
شرط اولین ہے ، اور اسی لیے مسلمانوں (امت مسلمہ) کا عروج و زوال اسی شرط پر
موقوف ہے :

وَلَا تَهْنُوا وَلَا تَخْزُنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَمُ إِنْ كُنْتُمْ فُؤُدُنِينَ

نه تم پریشان ہو اور نہ خوف زدہ ، کامیابی تمہارے لیے
ہے بشرطے کہ تم سچے مومن ہو جاؤ۔ (آل عمران - ۱۳۹)

ملت اسلامیہ کے لیے عروج و زوال کا یہ قانون دوسری قوموں سے بالکل
مختلف ہے - دوسری قوموں کے لیے اللہ کا قانون تو یہ ہے کہ اگر وہ کچھ بنیادی
قسم کی السانی اخلاقیات اپنے اندر پیدا کر لیں اور ترق کی ضروری مادی تدبیریں
اختیار کر لیں تو اوہر انہ سکتی ہیں - لیکن جب آمت مسلمہ کا معاملہ ہو تو صرف
یہ چیزیں ترق کا زینہ بتتے کے لیے ہرگز کاف لہیں ہو سکتیں - کیوں کہ یہ امت

اُس دنہا میں اللہ کے دن کی علم بردار، اور دوسری قوموں کے سامنے جو کی گواہ ہے۔ دوسروں کسی قوم کا منصب نہیں ہے۔ منصب کا اختلاف قطعی طور پر حقوق اور ذمہ داریوں دونوں کا احلاف ہاہما ہے اور اس اعتبار سے معاملے کے ضابطے بھی مختلف ہوں گے۔ دوسری قومیں اگر جو کا راستہ چھوڑ کر چلیں تو الصاف کہتا ہے کہ انہیں یہ جرم اتنا سخت اور فاہل نفرت نہ ہو گا جتنا کہ اس مسلمہ کی طرف سے سرزد ہونے کی شکل میں ہو سکتا ہے۔ اس لیجع دوسری قوموں کو قدرت کی طرف سے اگر بہ رعایت ملی ہے لہ وہ خدا کی فرمان ہرداری اختیار کئے بغیر بھی ہنہ بھول سکتی ہیں اور امت مسلمہ کو لمبی ملی تو ایسا ہونا ہی چاہیے تھا۔ جو اللہ کے مخصوص فضل سے سرفراز ہوا ہے اسے اس مخصوص فضل خداوندی کی ناقدری کی شکل میں اس کے مخصوص عتاب کا سزاوار بھی بتا ہی بٹے گا۔

ان صراحتوں اور شہادتوں سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام اپنے بروں کو دنیا کی فلاخ سے بھی خوب نوازتا ہے لیکن یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ ایسا کیوں اور کیسے ہوتا ہے، کہا جا سکتا ہے کہ مذہب تو انسان کو آخرت کی ترغیب دیتا ہے اور دنیا سے بے ہر واہ بنانا ہے ہر اسے دین کا دامن ہکٹے کے لتعجیے میں یہ دنیا کمن طرح ہاتھ آ جاتی ہے ۹

اس سوال کے جواب کے لئے ہے تو یہ اصولی حقیقت ذہن نشین ہونا چاہیے کہ یہ دولت و عزت اور یہ اقتدار و حکومت و خیر، جنہیں "فلاح دنیا" سے سوسم کیا جاتا ہے، دین کی نگاہ میں ہجائے خود سعیوب و معتوب چیزیں نہیں ہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور اس کا فضل ہیں۔ چنان چہ قرآن کی میں ہے "یاد کرو اہے اوہر اللہ اس نعمت کو جب کہ تم میں سے انبیا بنائے (اپنا کئے) اور تمہیں بادشاہت (اقتدار و حکومت) سے سرفراز کیا۔" یا دوسری جگہوں پر، مثلاً سورہ نعل میں زندگی کی سہولتوں اور رزق کی فراوانیوں کو بھی "انعم اللہ" (الله کی نعمتیں) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی طرح سورہ جمعہ اور دوسرے متعدد مقامات پر ان چیزوں کی "فضل" سے ترجمانی کی گئی ہے:

وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ

اسلام کے تفاضلے

۵۲۱

لیکن یہاں بہ شبهہ ہذا ہو سکتا ہے کہ ہر قرآن و حدیث میں "دنیا" اور "طلب دنیا" کی مذمت کیوں کی گئی ہے؟ اور اس شکل میں اس بات کا مطلب کیا ہوگا کہ "مسلمان وہ ہے جو اپنی نظریں ہمیشہ آخرت ہر جانے والے اور دنیا کے کسی مفاد کو آخرت ہر ترجیح نہ دے؟"

اس سلسلے میں ہمیں بات کا جواب ہے کہ جس دنیا کو ملعون اور اس کی طلب کو مذموم نہ را بنا گیا ہے وہ اور چیز ہے اور وہ "دنیا" جس کی فلاح کا مومن حق دار اور طلب کار ہوتا ہے بالکل دوسری چیز ہے۔ اسلام کی نکاحیں مذموم اور بچنے کے قابل صرف وہ چیزوں ہیں جو انسان کو خدا سے غافل اور اس کے دین کے تفاضلوں سے بے ہرواء بنا دیتی ہیں۔ اور وہ "دنیا" جس کی کتاب و سنت میں مذمت کی گئی ہے دراصل انہی چیزوں کا نام ہے۔ لیکن جو چیزوں انسان کو خدا سے غافل نہ بنائیں اور جو دین کے تفاضلوں کو ہورا کرنے میں روک سنتے کے بجائے مددگار ثابت ہوں، وہ ہرگز مذموم اور قابل نفرت نہیں ہیں بلکہ ہر طرح سے ہسنیدہ اور مطلوب ہیں، اور انہیں قرآن مجید میں مذموم و ملعون لہیں بلکہ دنیا کی بھلانی (فِ الدنیا حسنة) اور دنیا کا اجر (نواب الدنیا) وغیرہ فرمایا گیا ہے۔

چیست دنیا از خدا غافل شدن نے فماش و نقرہ و فرزند و زن

ایک مسلمان کے لیے دنیوی فلاح کا مطلب ابھی ہی چیزوں سے ہوتا ہے جو خدا سے غافل کرنے والی نہ ہوں۔ کیوں کہ فی الحقيقة خدا سے غفلت اور دین کے تفاضلوں سے بے ہروائی کا اصل تعلق تو انسان کے اپنے نفس سے ہے نہ کہ دلیا کی چیزوں سے۔ ایک ہی چیز ایک شخص کے لیے خدا سے غافل ہونے کا سبب بن جاتی ہے لیکن دوسرے کے لیے رجوع الی اللہ کا۔ ایک عام ادمی تو معمولی سی جانیداد پا کر بھی آپے سے باہر ہو جاتا ہے لیکن مسلمانوں کے مثالاً حکمران، جن کو وقت کی عظیم ترین سلطنت کی حکمرانی حاصل تھی، انہیں ابھی سلطنت بھی خدا سے ذرہ برابر غافل نہ کر سک۔ اس لیے امر واقعہ بھی ہے کہ دنیا کی دولت و عزت یا اقتدار و حکومت وغیرہ جیسی چیزوں میں سے کوئی چیز بھی فی لفسمہ بھی اور قابل احتراز نہیں ہے۔ بہ تو دراصل انسان کا اپنا غلط طرز فکر اور غلط طرز عمل ہے جو ان چیزوں کو اس کے حق میں یہ قاتل بنا دیتا ہے۔ لیکن مومن کے بارے میں چون کہ قرآن اور اسلام کا تصور بھی ہے کہ وہ اللہ کی بخشی ہوں

چیزوں کا استعمال غلط طریقے سے نہیں کرتا بلکہ اللہ کی مرضی اور ہدایت کے مطابق ہی کرتا ہے اس لیے اس کے لیے بھی چیزیں وہ "دنیا" نہیں جو سذجہ ، سلسلہ ہے بلکہ وہ دنیا ہے جو محمود و مطلوب ہے ۔

دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ آخرت کو دنیا ہر ترجیح دینے کے سے دنیا سے دست بردار ہو جانے کے نہیں ہیں ، بلکہ یہ ہیں کہ اس کے حاصل کرے میں اور حصول کے بعد اس کے برتنے میں دین کے تقاضوں کو ہامال نہ کیا جائے ، مقررہ حدود سے تجاوز نہ کیا جائے ، اور آخرت کے مفاد کو نہیں نہ لگنے دی جائے گویا چند شرعی حدود و قیود کی پابندی کرنے ہونے دنیا سے منتع ہونا صحیح طرز عمل ہے ۔ دنیا ہر آخرت کو ترجیح دینے کے باوجود مومن کے لیے دنیوی فلاح کی راہ بھی مناسب اور ضروری حد تک بالکل کھلی رکھی گئی ہے ۔ یعنی جہاں یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مومن کا اصل مطبع لفظ فلاح آخرت ہی ہوتی ہے وہاں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلام نے آخرت کی فلاح کا جو راستہ بتایا ہے وہ دنیوی فلاح سے کتنا کر نہیں جاتا بلکہ اس کے اندر سے ہو کر گزرتا ہے ۔ گویا آخرت کو دنیا ہر ترجیح دینے کا مآل خود دنیا کے مفاد کو بھی حاصل کر لینا ہے نہ کہ اس سے محروم ہو جانا ۔

دوسری بات جس کی طرف دوبارہ نشان دہی کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا "خلیفہ" اور نائب بنا کر پیدا کیا گیا ہے ۔ اس کا منصب ہی یہ ہے کہ وہ اس زمین کا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھے ، اور اسے اپنے مالک کے احکام اور مرضیات کے مطابق چلانے ۔

ان تفصیلات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا کی عزت ، دولت اور اقتدار ہرگز ایسی چیزوں نہیں ہیں جن سے تعلق رکھنا اور فائدہ اٹھانا دین و ایمان کے منافی ہو ۔ کیوں کہ جو چیزوں "اللہ کی نعمت" اور "اللہ کا فضل" ہوں وہ اس کے حق شناس بندوں کے لیے منوع نہیں ہو سکتیں ۔ اس طرح کی چیزوں کے بارے میں اللہ کا ارشاد ہے :

فَلِلّٰهِ الْبَيِّنُونَ أَمْتُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَمةِ

فرما دیجیے کہ یہ ساری (پاک چیزوں) دنیا کی زندگی میں بھی (اصلاً) اہل ایمان (ہی) کے لیے میں اور قیامت کے دن تو خالصہ انسی کے لیے ہوں گی ۔
(الاہراف - ۲۲)

اسلام کے تقاضے

۵۲۳

اس کے معنی یہ ہیں کہ ان چیزوں کے اصل حق دار اللہ کے فرمان بردار بندے ہی ہیں۔ اب اگر ان چیزوں کے اصل حق دار اللہ تعالیٰ کے فرمان بردار بندے ہی ہیں تو وہ ان کے لیے ناپسندیدہ اور نامطلوب کسی طرح نہیں ہو سکتیں۔ اب انسان کے پیدائشی منصب کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ اس کا تقاضا کیا ہے؟ اگر اللہ تعالیٰ نے انسان کو اہنا خلیفہ بنایا ہے اور چاہتا ہے کہ اس زمین پر وہ اس کے احکام کے مطابق اپنے اختیارات استعمال کرے تاکہ بہاں بھی اس کی مرضی پوری ہوئی رہے تو جب تک بہاں ایسے لوگ موجود ہوں جو اپنے اس فرض منصبی کا پورا احساس رکھتے ہوں۔ اس وقت تک بہ بات اللہ تعالیٰ کی حکمت و دانائی اور انصاف کے بالکل خلاف ہوگی کہ انہیں اس زمین کے اقتدار سے محروم رکھے اور ان کے ہوتے ہوئے یہ اقتدار ان لوگوں کے سپرد کر دے جو اپنے اس فرض منصبی کے منکر ہوں، اپنے بارے میں نائب کی حیثیت تسلیم ہی نہ کرتے ہوں اور اس دنیا میں اپنی آزاد حاکمیت کے با کسی اور کی حاکمیت کے مدعی ہوں۔ قرآن کی صراحت ہے:

أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادُ الظَّلَمِ لَوْنَهُ

زمین کے وارث (حاکم) میرے صالح بندے
(ہی) ہوں گے۔ (الانبیاء - ۱۰۵)

دوسری طرف ان فرض شناس اور خدا کے فرمان بردار بندوں کے لیے بھی یہ بات خود کسی طرح صحیح نہ ہوگی کہ وہ ان قوتوں کے استعمال کرنے سے بے نیازی ہوتیں جن کے بغیر وہ اپنے فرض خلافت سے کسی طرح عمدہ برا ہو ہی نہیں سکتے۔ جس چیز سے ان کی زندگی کا اصل فریضہ وابستہ ہو وہ تو ان کے لیے صرف پسندیدہ ہی نہیں بلکہ ضروری بھی ہو جائے گی۔ بہر حال، ان سارے پہلوؤں کو سامنے رکھئے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے گی کہ مسلمان صرف آخری فلاخ ہی کا نہیں بلکہ دنیوی فلاخ کا بھی حق دار اور طلب گار ہوتا ہے اور اس کے لیے ایسا ہونا اس کی سچی دین داری کا ہی تقاضا ہے۔

اگر بڑھنے سے پہلے آئیے اب ایک نگاہ باز گشت ڈال کر بہ دیکھ لیں کہ اسلام کی استیازی خصوصیات کیا ہیں تاکہ اسلام کے تقاضوں کا صحیح صحیح ادراک ہو سکے۔

اسلام کی امنیازی خصوصیات اور ان کا تقاضا

ہمہلے ابواب کے مطالعے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ "اسلام" دوسرے تمام مذاہب سے ممتاز و مخصوص ہے۔ صرف اسلام ہی ہر حیثیت سے کامل دین ہے، سارے انسانوں کے لیے ہے، خدا کا آخری پیغام ہے اور نجات کے لیے ضروری ہے کہ اس کی ہیروی کی جائے۔ خدا کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی جو دعوت پیش کی وہ مکمل اور ابھی جامع تھی جس کے بعد کسی اور تعلیم کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ اور یہ ہدایت ہمیشہ کے لیے، ہر زمانے اور ہر قوم کے لیے کافی و شافی ہے۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت عالم گیر ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کسی زمین کے کسی خاص خطے با کسی ایک قوم کے لیے نبی بنا کر نہیں بھیجنے کئے ہیں۔ بلکہ ساری دنیا کے لیے اور تمام انسانوں کے لیے بھیجنے کئے ہیں:

وَمَا أَرْسَلْنَا إِلَّا لِكُلِّ أُمَّةٍ بِغَيْرِ الْأَذْنِ

"اے محمد" ہم (اللہ) نے تمہیں تمام
لوگوں کے لیے خوش خبری سنانے والا اور
ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ (بسا ۲۸۰)

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کا اعلان خود ہی ہے حکم الہی کیا تھا؟

إِنَّهَا النَّاسُ لَفِي رَسُولٍ أَنَّهُ الْبَلَغُ حِينَما

لوگوا میں تم سب لوگوں کے لیے اونچے
کا رسول ہوں۔ (الاعراف - ۱۵۸)

بہ ایک ابھی بات ہے جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کے لیے خاص ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ہمہلے جو انبیا آئے تھے ان میں سے کسی کی حیثیت بہ نہ تھی۔ چنان چہ ایک حدیث میں ہے:

كَانَ النَّبِيُّ يَبْعَثُ إِلَى قَوْمٍ خَاصَّةً (يعنی) سبھ سے پہلے کا ہر نبی مخصوص
وَبَعْثَتِ إِلَى النَّاسِ عَامَةً طور پر اپنی ہی قوم کے پاس نبی بنا کر بھیجا
جاتا تھا لیکن میں تمام لوگوں کے لیے نبی بنا کر
(بخاری و مسلم بحوالہ مشکراۃ) بیہجا گیا ہوں۔

اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت جس طرح عالم کبڑے اسی طرح ہدیتہ کے لئے اہی ہے ۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ماتھے وہی ورسالت کا مسلسلہ اہی آخری حد تک ہنچ کر ختم ہو گیا ۔ اور اب قیامت تک کوئی رسول نہ آئے گا ۔

وَلَكُنْ رَسُولُ اللَّهِ وَخَاتَمُ النَّبِيِّنَ

بلکہ وہ اللہ کے رسول اور سارے نبیوں کے مسلسلے کو ختم کرنے والے ہیں ۔
(الاحزاب - ۲۰)

خود نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اپنے الفاظ ہیں :

ختم بی البيان و ختم بی الرسل . (یعنی) مجھے ہے ثبوت دی عمارت مکمل (بخاری و مسلم بحوالہ مشکواہ) ہو گئی اور میرے ذریعے ہے رسولوں کا سلسلہ ختم ہو گیا ۔
انہ لا نبی بعدی ۔ (الحدیث) بلا شبہ میرے بعد کوئی نبی نہ آئے گا ۔

اس کے مقابلے میں دوسرے ہیغمبروں کی رسالت کا معاملہ کسی شرح و بیان کا محتاج نہیں ۔

پھر جیسا کہ ابتدا میں کہا گیا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) جو دین و شربعت لے کر آئے وہ ہر پہلو سے کامل ہے جب کہ پچھلے تمام دینوں میں سے کسی کو یہ اعزاز نہ ملا تھا ۔ یہ شرف اللہ تعالیٰ نے صرف اسلام کے لیے مخصوص کر رکھا تھا کہ وہ " دین کامل " ہو ۔

الْيَوْمَ الْمُلْكُ لِكُلِّ وِنْدَنْدٍ وَأَمْتَنْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَةِ رَبِّنِيْعَا لَكُلِّ الْإِسْلَامِ وَنِنْدَنْدٌ

آج ہم نے تمہارا دین تمہارے لیے کامل کر دیا اور اپنی نعمتوں تم پر پوری کر دیں اور تمہارے لیے اسلام کو دین پسند کیا ۔
(الماندہ - ۳)

واقعہ یہ ہے کہ پہلے جو دین بھی آیا وہ اس قوم ، اس زمانے اور اس عدالتی کی اصلاح و ہدایت کے لیے مخصوص تھا ۔ اور جس طرح اس کی مخاطبত کا دائیروں محدود تھا اسی طرح اس کی تعلیمات کا مجموعہ بھی مختصر اور محدود تھا ۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کی مشتب اور حکمت کا فیصلہ یہ ہوا کہ اب ابسا نبی بھیجا جائے جو سب کے لیے ہو اور خوبی کے لیے ہو تو اس فیصلے کا فطری تقاضا تھا

کہ اس لبی ہر نازل ہونے والے دین کا مزاج بین الانسانی ہو اور اس کی تعلیمات ہر زمانے، ہر ملک اور ہر طرح کے انسانی مسائل ہر حاوی ہوں۔ قرآن کی مذکورہ بالا آیت اسی فطری تقاضے کی تکمیل کا اعلان کر رہی ہے۔

اسلام کا یہ بھی امتیاز ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر جو کتاب نازل ہوئی وہ جوں کی توب محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گی جس ہر خود قرآن، حدیث اور تاریخ گواہ ہیں۔ اور یہ کتاب ایک ایسی زبان میں ہے جو ایک زندہ ہے۔ کروڑوں آدمی اسے بولتے ہیں اور دنیا کے گوشے گوشے میں اس کے جانے، سمجھنے اور پڑھنے پڑھانے والے بے شمار انسان موجود ہیں۔ اس کے مقابلے میں کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں جو ان صفات کی حامل ہو۔

رسالہ محمدی کی اس امتیازی حیثیت کے پیش نظر کچھ لازمی تقاضے پیدا ہو جانے ہیں۔ چنان چہ اس کا پہلا فطری اور لازمی تقاضا یہ ہے کہ دوسرے عام مذاہب منسون ہو چکے ہیں اور رب اللہ کے نزدیک منظور شدہ دین صرف اسلام ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ عَنْ دِينِهِمْ أَنْجَلُوا إِلَيْنَا مُؤْمِنُو الْأَسْلَامَ

(بلا شہ) دین تو افہ کے نزدیک صرف
اسلام ہے۔ (آل عمران - ۹)

اس لیے ضروری ہے کہ اس پر ایمان لا یا جائے اور ہر قوم، ہر ملک اور
ہر زمانے کا انسان اسی کی پیروی کرے ورنہ :

وَمَنْ يَتَبَّعْ غَيْرَ لِإِسْلَامِ فَوَيْمَنْ يُفْلَمْ مِنْهُ

اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہو گا تو افہ کے یہاں اس کی طرف سے یہ دین ہر گز قبول نہیں کیا جائے گا۔
(آل عمران - ۸۵)

کیوں کہ جب یہ دین ساری دنیا کا دین اور اس کا لانے والا پیغمبر پوری نوع انسان کا پیغمبر قرار دیا گیا ہے تو اب کسی اور دین اور کسی اور پیغمبر کا زمانہ باق نہیں رہ سکتا۔ رسول تو آتا ہی اس لیے ہے کہ جن لوگوں کی طرف وہ بھیجا گیا ہے وہ اسے اللہ کا رسول تسلیم کریں اور اس کی غیر مشروط پیروی کریں۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ إِلَّا يُطَهِّرُ مَا ذَنِبَ الْأَنْشَاءُ

هم نے جو رسول بھیجا صرف اسی لیے بھیجا
کہ افہم کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے ۔
(النساء ۶۲)

اس لیے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سارے انسانوں کی طرف سبعموت ہونا اور
ہر آخری رسول ہونا اس کا کھلا تقاضا کرتا ہے کہ ہر انسان اور ہر زمانے کا
انسان آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لائے اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لائے
ہوئے دین کو اپنا دین مان کر لازماً اس کی پیروی کرے اگر کوئی شخص
آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کو نہیں مانتا اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے
لائے ہوئے دین کا حلقة اپنی گردن میں نہیں ڈالتا تو یہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم)
کے نہیں بلکہ اس فرمانروائی کائنات کے خلاف بغاوت ہے جس نے آپ (صلی اللہ
علیہ وسلم) کو پوری دنیا کا هادی اور آخری نبی بننا کر بھیجا ہے ۔

اس بات کا ثبوت کہ اسلام ہی کی پیروی ضروری ہے حضور اکرم (صلی اللہ
علیہ وسلم) کے عمل میں بھی موجود ہے ۔ اگر یہ بات قرآن کے نزدیک بھی صحیح
ہوتی کہ سارے دین صحیح ہیں اور کسی ایک رسول کی پیروی کافی ہے تو اس کا
بالکل منطقی تقاضا یہ تھا کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) یہود اور نصاریٰ کو
اسلام کی دعوت نہ دیتے کیوں کہ وہ خود صاحب کتاب تھے ۔ اور اگر دعوت دینے
بھی تو کم الا کم اسلام لانے کے مطالبے پر اصرار تو کسی طرح نہ کرتے ۔ اس کے
پرخلاف آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے صرف یہ کہتے کہ مخفی تورات اور
انجیل کی مخلصانہ پیروی کرو ۔ لیکن ساری دنیا جانتی ہے کہ اپس نہیں ہوا ۔
آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انہیں بھی اسی طرح اسلام کی دعوت دی جس طرح
عرب کے مشرکوں کو دی تھی اور ان کے لیے بھی اپنی پیروی کو وسیا ہی
ضروری قرار دیا جیسا کہ ان کے مشرکوں کے لیے ضروری قرار دیا تھا :

يَا أَيُّهُمُ الَّذِينَ أَنْذَلُوا الْكِتَابَ لِيُؤْمِنُوا بِهِ وَمَا أَنْذَلُوا لَهُمْ بِهِمْ كُفَّارٌ فَإِنَّمَا قَاتَلُوكُمْ أَنْ تُنَزِّلَ مِنْ قِبْلَةٍ أَنَّكُمْ تُظْهِرُونَ وَجْهَكُمْ فَتَرَهُ هَؤُلَاءِ الْمُنْكَرُونَ أَذْنَبُوكُمْ أَذْنَابُهُمْ أَذْنَابُهُمْ

اے اهل کتاب ! اس کتاب پر ایمان لازم ہے ہم نے افراہ ہے، جو تمہاری
کتاب کی بھی تصدیق کرتی ہے، قبل اس کے کہ ہم لوگوں کے چہروں کو بگاڑ
کر ان کی پیٹھ کی طرف پہنچ دیں یا ان پر لعنت کریں ۔ (النساء ۲۲)

نہ صرف یہ کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انہیں اسلام لانے کی دعوت دی بلکہ ان میں سے جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا انہیں صاف لفظوں میں "کفر" کا مرتكب قرار دبا گیا حتیٰ کہ بعض مقامات پر تو ان کے اس انکار اسلام کو صرف کفر ہی نہیں بلکہ "بدتونین کفر" اور انہیں صرف کافر ہی نہیں لیں "ہکا کافر" کہا گیا :

"جو لوگ اللہ کے اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کرنے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کر دین اور کہنے ہیں کہ بعض رسولوں کو ہم مانیں گے اور بعض کو نہ مانیں گے اور اس طرح کفر و ایمان کے درمیان کی کوفی راہ اختیار کر لینا چاہتے ہیں وہ پکے کافر ہیں اور ابیسے کافروں کے لیے ہم نے رسوایں عذاب تیار کر رکھا ہے۔" (النساء ۱۵۰ - ۱۵۱)

با اہل کتاب کے انکار اسلام پر ایک جگہ یوں تبصرہ کیا گیا :

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کتاب پر ایمان لاوجسے اللہ نے اتنا رہا تو کہتے ہیں کہ ہم اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر اتنا رہی گئی تھی اور اس طرح وہ اس کے ماسوا هدایات الہی کو تسلیم کرنے سے انکار کر جائے ہیں۔" (البقرة)

دعوت اسلام کے جواب میں وہ جو کچھ کہتے تھے وہ نہیک وہی فلسفہ تھا جو آج وحدت ادبیان کے نظریے کی بنیاد ہے، یعنی یہ کہ جب ہمارے ہास بھی خدا ہی کا بھیجا ہوا دین ہے تو کیا اس پر ایمان رکھنا اور اس کی پیروی کرنا کافی نہیں ہے؟ آخر پھر کسی اور چیز کو اہنانا ہمارے لیے ضروری کیوں ہوا؟ وہ اپنی جگہ حق ہے اور یہ اپنی جگہ حق ہے لیکن ان کے اس "فلسفے" کو اللہ تعالیٰ نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں کہتا بلکہ اسے صاف طور سے "کفر کا فلسفہ" قرار دیتا ہے اور انہیں "یہ بھی حق وہ بھی حق" کہنے کے باوجود اصل حق کا منکر (کافر) نہیں رکھتا ہے۔

اس کے علاوہ جب قرآن کے سوا اب کوئی دوسری کتاب بھی ایسی نہیں رہ گئی ہے جو پوری طرح محفوظ ہو اور جس کی اصل زبان دنیا کی مردہ زبانوں میں شامل نہ ہو چکی ہو تو دوسری کتابوں اور شریعتوں کی نہیک نہیک ہبروی مسکن

بھی کیسے ہو سکتی ہے ؟ یہ صورت حال تو آؤ بآ خود ان کتابوں اور شریعتوں کا اقراری بیان ہے کہ اب ہمارا زمانہ ختم ہو چکا ہے اور ہمیں منسخ قرار دیا جا چکا ہے ۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب ہر شخص کے لیے اسلام ہی کی بہروی ضروری ہے اور اب کوئی اور دین اللہ کے حضور منتظر شدہ اور قابل قبول نہیں رہ گیا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں ہیں کہ اسلام ہی شرط نجات ہے ۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی جن شریعتوں کو اب خود منسخ اور ناقابل قبول نہیں رہ گیا ہے ان کی پیروی پر وہ کوئی اجر کیسے دے گا ؟ چنان چہ ”وَمِنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ الْإِسْلَامَ دِينًا فَلَنْ يَقْبَلَ مِنْهُ“ فرمائے کے بعد وہ اپنے اس فیصلے کا بھی اعلان کر چکا ہے کہ :

وَهُوَ فِي الْأُخْرَةِ مِنَ الْخَيْرِينَ ۝

اور ایسا شخص آخرت میں قطعاً ناماد رہے گا ۔ (آل عمران - ۸۵)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسی فیصلہ خداوندی کی تشریع کرنے ہرنے فرمائے ہیں ۔ ”قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اس آمت (مراد گروہ انسان) میں سے جس کسی بھی شخص تک (مثلاً یہودی یا نصرانی تک) ، سیری نبوت کا پیغام پہنچا اور اس کے باوجود وہ میرے لانے ہوئے دین پر ایمان لانے بغیر مر گیا تو وہ دوزخی ہو گا۔“ (سلم)

اس فیصلہ خداوندی کے تحت جس طرح یہود و نصاریٰ آئے ہیں اسی طرح دوسری قومیں اور متین بھی آئے ہیں ، بلکہ ایک حیثیت سے تو دوسری قوموں اور متلوں کا معاملہ اور زیادہ اہم ہو جاتا ہے کیوں کہ دنیا کی ساری قوموں میں سے صرف یہود اور نصاریٰ ہی وہ دو گروہ ہیں جن کو قرآن نے صاف و صریح لفظوں میں ”اہل کتاب“ کہا ہے ۔ اور جن کو کسی نبی کا آستی اور کسی آسمانی کے نام سے یاد نہیں کیا ہے ۔ اب اگر ایسی متلوں کے افراد کے لیے بھی رسالت شریعت کا حامل قرار دیا ہے ۔ اب اسی طبق میں اس کے لیے ہمیں ”کہ ان قوموں اور متلوں کے لیے حمدی کی پیروی شرط نجات ہے تو عقل“ کہتی ہے کہ ان قوموں اور متلوں کے لیے اس کا شرط نجات ہونا اور زیادہ ضروری ہو گا جن کو قرآن نے صاحب کتاب و شریعت

کے نام سے یاد نہیں کیا ہے ۔

غرض ، جہاں تک اسلام کے اپنے فیصلے کا تعلق ہے وہ بالکل دو ٹوک انداز میں اپنی پیروی کو سارے انسانوں کے لیے ضروری اور شرط نجات قرار دیتا

ہے اور اس سے مستثنی صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جس تک اسلام کا پیغام ہی نہ پہنچا ہو۔ اور اس پہنچا کو ہوری انسانیت تک پہنچانے کی ذمہ داری امت مسلمہ کی ہے، انفرادی اور اجتماعی طور پر مسلمان اس امر کے ذمہ دار ہیں کہ دنیا کے سامنے اس حق کی شہادت دیں۔

امت مسلمہ کی ذمہ داریاں

ان وضاحتیں کے بعد کہ صرف "الام" ہی ہر حیثیت سے جامع، کامل، مارے انسانوں کے لیے، اور آخری دین ہے نیز نجات کے لیے اس کی بیروی شرط ہے، عقل کہنی ہے کہ اسلام کو اگر بے مخصوص حیثیت دی گئی ہے تو اس مخصوص حیثیت کا ایک مخصوص تقاضا بھی ہو گا۔ اور وہ بے کہ اسے دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچانا چاہیے۔ اور برابر پہنچنے ہی رہنا چاہیے۔ قوم قوم کے سامنے اس کی وضاحت ہونی چاہیے اور بیہم ہونی چاہیے۔ فرد فرد کو اس کا پیغام دیا جانا چاہیے اور سلسل دیا جانا رہنا چاہیے۔ ورنہ دنیا اسے جان پہنچان نہ سکے گی۔ اور جب جان ہی نہ سکے گی تو اس پر ایمان کس طرح لاسکے گی، حالانکہ وہ اس پر ایمان لانے کی مکلف فرار دی گئی ہے۔ اور اگر ایمان نہیں لاقی تو بد بعثتی کا شکار ہونی ہے۔ بے تو کوئی انصاف کی بات نہ ہو گی کہ لوگوں کے لیے ان کے مالک کی بھیجی ہوئی شربعت ایک راز بھی رہے اور انہیں بے خبری میں پکڑا جائے۔ اس لیے اگر انسانیت کا بے فرض ہے کہ وہ اسلام ہی کی بیروی کرے تو اس فرض سے بھلے اس کا بے حق ہے کہ اسے دین واقف کراہا جائے۔ اگر بے نہیں ہوتا تو خود اسلام پر بھی ظلم ہے کہ وہ بڑی حد تک بے معرفت ہن کر رہ جاتا ہے اور انسانیت پر بھی ظلم ہے کیوں کہ اس طرح وہ اس نعمت سے لازماً محروم رہ جاتی ہے جس پر اس کا مقدار موقوف ہے۔

جب تک اسلام کا لانے والا رسول دنیا میں موجود تھا بلاشبہ اس نے بہترین طریقے سے انسانیت کا بے حق ادا کیا مگر اس کے چلے جانے کے بعد بھی تو بے حق اہنے ادا کیے جانے کا مطالبہ کر رہا ہے اور تا قیامت کرتا رہے گا۔ اب تو کوئی نبی بھی آئے والا نہیں ہے کہ بے حق اس کا انتظار کرے۔ بے ہر حال اگر اب اسلام کی اس مخصوص حیثیت کے ضروری تقاضے کا کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا تو ضروری ہے کہ وہ ہورا ہو۔ کبیسے ہوڑا ہو گیہ ایک عظیم اہمیت کا سنس ہے جس کا کوئی عمل حل ہونا چاہیے اور صرف اسلام کی زبان ہے ہونا

اسلام کے تفاصیل

۶۲۱

چاہیے کیوں کہ اگر اسلام خدا کا بھیجا ہوا دین ہے اور اسے فی الواقع ماری دنیا کے لئے اور ہمیشہ کے واسطے بھیجا کیا ہے تو ضروری ہے کہ اس مسئلے کو کوئی مقررہ حل اس کے پاس موجود ہو۔

اس ضرورت کے پیش نظر قرآن اس عظیم مسئلے کا عظیم الشان حل ان الفاظ میں پیش کرتا ہے :

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لَهُمُ الْمُطَّالِبُونَ شَهِدَةً عَلَى النَّاسِ وَيَقُولُونَ الرَّسُولُ عَيْنِكُلُّ ثَمَيْدٌ

اور اسی طرح ہم نے تم (سلمانوں) کو بہتر (درمیانی) امت بنا پائے تاکہ تم دوسرے نام لوگوں کے لیے (umarے نازل کردہ دین کے) شاہد ہو اور ہمارا رسول نمازے لیے شاہد ہے۔ (البقرۃ: ۱۴۳)

الله تعالیٰ کے اس ارشاد سے اس حل کی عمل شکل بہ قرار ہاتھ ہے کہ :

(۱) اسلام کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے کا جو کم رسولؐ اپنی زندگی میں کوتا رہا ہے، اس کے چلے جانے کے بعد وہ اس کے بیرون کے ذمے ہو گا ہے۔ اور اب بہ لوگ اس وقت تک کے لیے اس کام کے ذمہ دار ہیں جب تک وہ اس زمین پر موجود ہیں۔

۲۔ اسلام کو دوسروں تک پہنچانے کا مطلب محض عام طرز کی تبلیغ و اشاعت نہیں ہے بلکہ ایسی تبلیغ و اشاعت ہے جسے "شهادت" (گواہی) کہہ سکیں۔

۳۔ "اسلام کی شہادت" دینے کا بھی ایک متعین مفہوم ہے جس کا تعین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل کرتا ہے۔ یعنی اسلام کو لوگوں تک پہنچانے کا کام مسلمان ہر مسکن حد تک نہیک اسی طرح کریں جس طرح کہ خود حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان (صحابہ) تک اس کے پہنچانے کا انتظام کیا تھا۔

معلوم ہوا کہ پچھلی آیتیں اگر صرف ایک ذمہ داری رکھتی رہی ہیں کہ اپنے دین کی مخلصانہ پیروی کرنے رہیں تو آئت مسلمہ اس عام ذمہ داری کے ساتھ ایک ذمہ داری اور بھی رکھتی ہے اور وہ یہ کہ بیرونی دنیا کے سامنے اسلام کی اس طرح گواہی دیتی رہے جس طرح گواہی دینے کا حق ہے اور جس کا عمل نونہ اس کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سامنے رکھ گیا ہے۔ مختصرًا، یہ آئت اپنے

مجموعی وجود میں اپنے پیغمبر کی قائم مقام ہے ۔ اور بہ حیثیت آمت امن کی زندگی کا مشن نہیک وہی ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا تھا ۔

آمت مسلمہ کی بہ ذمہ داری کوئی معمولی ذمہ داری نہیں ہے ۔ بلکہ اتنی بڑی اور ہمہ گیر ذمہ داری ہے کہ وہی اس کے وجود کا کل مقصد بن جاتی ہے ۔ اللہ تعالیٰ کا بہ فرمان کہ ” ہم نے تمہیں ایک بہتر آمت (با آمت وسط) بنایا ہے تاکہ تم باقی سارے انسانوں کے لیے دین حق کے گواہ رہو ” اس آمت کی حیثیت صاف طور سے بھی سفر کر رہا ہے ۔ سزید صراحت اس ارشاد میں ہے ” کنتم خیو آمد ” اخراجت للناس ” (الآیہ) (تم ایک بہتر آمت ہو جو سارے انسانوں (کی اصلاح) کے لیے وجود میں لانی گئی ہے) ۔ ان لفظوں میں صاف نظر آ جاتا ہے کہ بہ آمت صرف اس طرح کی ابک امت نہیں ہے جس طرح کی آستین اب تک وجود میں آئی رہی ہیں ، بلکہ ایسی امت ہے جو باقی ساری نوع انسانی کی ہادی اور پوری انسانیت کی پاسبان بنائی گئی ہے ، اور بھی اس کے وجود کا پہلا اور آخری مقصد ہے ۔ آمت مسلمہ کی اصل قدر و قیمت بھی اسی ” شہادت ” پر موقوف ہے ۔ وہ ” آمت وسط ” اور ” خیر امت ” فی الواقع اسی وقت تک ہے جب تک کہ دنیا کے سامنے حق کی گواہ بن کر کھڑی رہتی ہے ، ورنہ ان خطابات کے استحقاق سے محروم ہو جائے گی ۔ کیوں کہ اس کا بہ نام صفاق نام ہے اور اسے مخصوص طور پر صرف اس لیے ملا ہے کہ اس کی اسلامی ذمہ داریان دوسری آمتوں کے مقابلے میں دوہری تھیں ۔

سورہ حج کے الفاظ قابل غور ہیں :

اس نے تمہیں منتخب کیا ہے اور تمہارے لیے دین میں کوئی
تنگ نہیں رکھی ہے ۔ اپنے باب ابراہیم کے راستے کی ہیروی کرو ۔
اس نے پہلے ہی سے تمہارا نام ” مسلم ” رکھا ہے تاکہ رسول
تمہارے لیے (دین حق کا) شاهد ہو اور تم دوسرے تمام لوگوں
کے شاهد بنو ۔ (الحج-۸۷)

اس آپت میں جہاں بہ بنایا گیا ہے کہ آمت مسلمہ کا نام اور مقام کیا ہے وہیں اسے اور ساری دنیا کو بہ حقیقت بھی سمجھا دی گئی ہے کہ اس نام اور کام کی وجہ اس کا وہ مشن ہے جو اس کے سپرد کیا گیا ہے ۔ اگر وہ اس کام کو انعام دیتی ہے تو بقیناً ” آمت مسلمہ ” ہے اور اس سلسلے میں وہ خدا کے حضور جواب دے بھی ہوگی ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے جہاں ابک ایک مسلمان

کو اپنی انفرادی ذمہ داریوں کے بارے میں جواب دھی کرف ہوگی وہی بوری
امت کو ایک امت کی حیثیت سے اپنی اجتماعی جواب دھی بھی کرف بڑے گی -
بہ کوئی معمولی جواب دھی نہ ہوگی بلکہ کچھ اس طرح کی ہوگی جس طرح
کی انبیا علیہم السلام کی اپنی اپنی پیغمبرانہ حیثیتوں میں ہوگی - کیوں کہ اگرچہ
امت مسلمہ اصطلاحی طور پر پیغمبر نہیں مگر پیغمبری کا فریضہ ضرور رکھتی ہے -
سورہ "اعراف" میں ہے :

فَلَكُنْتُمْ أَنْذِلَنَّ الْأَيْمَنَ وَلَكُنْتُمْ لَنَذَلَّلَنَّ الْمُزَسْلِلِينَ

پس ہم (ضرور) پرمش کریں گے ان لوگوں سے
جن کے پاس پیغمبر بھیجے گئے اور (ان) پیغمبروں
سے بھی پوچھیں گے - (الاعراف - ۶)

شہادت حق

اسلام کی یہ شہادت کیا چیز ہے ؟ اس کا مفہوم اور اس کی عملی شکل
کیا ہے ؟ یہ ایک بہت اہم سوال ہے جو بیہان پہنچ کر لازماً پیدا ہوتا ہے -
اور جس کا جواب ملنا خود اسلام کو سمجھنے کے لئے بہت ضروری ہے -
اس سنسلی میں اصولی طور پر اور مجدد اتنا تو معلوم ہو چکا ہے کہ جس
طرح اسلام اور دین حق ایک متبع چیز ہے اسی دین حق کی اس شہادت کا مفہوم
اور اس کی عملی شکل بھی متبع ہے - اور یہ تبعین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کا اسوہ کرتا ہے -

"شہادت" یا گواہی عرف عام میں اس بات کو کہتے ہیں کہ آدمی
کسی واقعے یا کسی چیز کے بارے میں جو کچھ بتیں کے ساتھ جانتا ہو دوسروں
کو نہیک نہیک بتا دے - اس لئے دین حق کی شہادت کا لغوی اور عرف
مفہوم یہ ہے کہ لوگوں پر اسلام کو جیسا کچھ وہ ہے ، بوری طرح واضح
کر دیا جائے - اب رہا قرآن کا اصطلاحی مفہوم تو اگرچہ یہ مفہوم بھی بنیادی
طور پر بھی ہے مگر اس میں بڑی وسعت اور بلندی آگئی ہے جس کی وضاحت
نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسوہ کی روشنی میں یہ ہے کہ شہادت حق
کے دو بہلو ہیں -

(۱) قولی شہادت : قولی شہادت یہ ہے کہ اسلام کے بنیادی عقاید
سے لے کر اس کے تفصیل احکام تک بوری دنیا کے سامنے موزوں ترین الفاظ اور

عبارات میں پیش کیے جائیں، بہاں تک کہ یہ دین ان کے لیے بالکل کھلی کتاب بن جائے اور غیر مسلموں کے سامنے ان کے اپنے مسلک کی غلطی اور اسلام کی صفات ہا لینے میں کوئی معقول رکاوٹ باقی نہ رہ جائے۔

لیکن اس کام کو صحیح طریقے سے انجام دینے کے لیے چند باتیں ضروری ہیں:

(۱) اسلام کے بنیادی عقاید پر علم و عقل کی ایسی دلیلیں اور فطرت و وجدان کی ایسی شہادتیں مہیا کی جائیں جن سے ان کی سچائی بالکل آشکارا ہو جائے۔ قرآن نے توحید، رسالت، آخرت وغیرہ پر جس زور و قوت کے ساتھ اور جس ہمہ گیر انداز میں دلائل پیش کیے ہیں، اس کا اتباع بنیادی ضرورت ہے۔ نیز زندگی کے مختلف شعبوں میں اسلام کے احکام اور ان کی تفعیل پیش کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ وہ زندگی کے مسائل کسی حسن و خوبی سے حل کر دیتا ہے۔

(۲) غیر اسلام پر منجیدہ اور مدلل تنقید کی جائے۔ اس تنقید کے لیے قدرتی طور پر ضروری ہے کہ پہلے ان افکار و نظریات سے گھری واقفیت حاصل کی جائے جن کی غیر مسلم دنیا ہیروی کر رہی ہے، اور جو اس وقت کے مذہب، تہذیب، اور فلسفوں اور نظاموں کی بنیاد ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان نظریات کے پیدا کیے ہوئے عملی نتائج کو بھی بتایا جائے جنہیں کسی طرح بھی انسانیت کے لیے خوش آئند نہیں کہا جا سکتا۔ غیر اسلام کی یہ مدلل تردید شہادت اسلام کی راہ کا ایک نا گزیر مرحلہ ہے۔

(۳) اسلام کو حق اور غیر اسلام کو باطل ثابت کرنے کا یہ کام دل نشیں اور جدید ترین انداز میں انجام دیا جائے۔ اس زبان میں ہو جس سے وقت کا انسان مانوس ہے، اس طرز کا ہو جو آج کی کے ذہنوں کو اپنی طرف مائل کر سکے، اس طریقے کا ہو جسے سائنس کا یہ دور بعث و استدلال کا طریقہ تسلیم کرتا ہو کیوں کہ اسلام کو حق اور غیر اسلام کو باطل ثابت کرنے کی یہ کوشش مخفی ایک علمی مناظرے کی خاطر نہیں ہے بلکہ دینِ حق کی تبلیغ اور توضیح کی خاطر ہے۔ قرآن نے بھی اپنی دعوت پیش کرنے کے لیے زبان، انداز، اسلوب اور مایز استدلال انتہائی مناسب، مانوس، معیاری اور واضح اختیار کیا ہے جو مخاطب کے لیے سب سے زیادہ موثر ہے۔

اسلام کے نفائی

۵۲۵

الله تعالیٰ نے اپنے نبی کو حق کی دعوت دینے کے بارے میں یہ حدایت ہے ۔
کہ دنبا کو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعے
ریک بالحکمة و الموعظه الحسنة و جادلهم بالتي هي احسن ۔ (آدُعُ إِلَي سَبِيلِ
رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَهِ الْحَسَنَهِ وَجَادَلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ) ۔

(۲) اس تبلیغ و دعوت کے ہمچھے کوف قومی غرور، کوفی حربانہ جذبہ ،
اور کوفی مناظرانہ ذوق ہرگز کار فرمائے ہو۔ بلکہ زبان و قاب سے جو کچھ نکلے
اخلاص واللہت کے ساتھ نکلے ۔ اور محض اپنے فرض کے احسام اور بنی آدم کی
محبت اور خیر خواہی کی بنا پر نکلے ۔

(ب) عملی شہادت : عملی شہادت یہ ہے کہ اسلام کی جو تصویر
الفاظ میں بہش کی جائے وہ پیش کرنے والے کی اپنی زندگی میں بھی دیکھ لی جائے ۔
ام کے افراد اپنی انفرادی حیثیتوں میں اور پوری امت اپنی اجتماعی حیثیت میں
سب کے سب اسلام کے عملی ترجمان ہوں ۔ ان میں توحید، آخرت، رسالت اور
دوسرے عقاید پر کھرا یقین ہو اور یہ یقین ان کی ابک ایک ادا سے نیک رہا ہو۔
ان نے اخلاق و آداب، معيشت و معاشرت، سیاست و معاملات غرض ان کی زندگی
کا پورا نظام اور اس نظام کا ابک ایک شعبہ الہی نقشے کے مطابق تعمیر ہو۔
”عملی شہادت“ کا مرتبہ ”قولی شہادت“ سے مقدم ہے ۔ ان لیے جب تک
کوفی شخص یا گروہ خود ہی کسی دین کی پیروی نہ کر رہا ہو اسے کسی طرح
زیب نہیں دبتا کہ وہ دوسروں کو اس کی دعوت دے، کبھوں کہ نتیجے کے اعتبار
سے بھی اس کی کوشش زیادہ بار اور نہ ہوگی ۔

اس سلسلے میں نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اسوہ حسنہ کے متعلق کچھ عرض
کرنا بالکل تغیر ضروری ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جب بھی ایمان ک
دھون دی تو اس حال میں کہ بھلے خود ابیان و ایقان کے بیکر بن چلنے تھے اور
جب دوسروں کو اللہ کا حکم سنایا تو اس طرح کہ سر مبارک اس کے آگے بھلے
جمک چکا تھا ۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشادات، ”انا اول المؤمنین“ (میں
سب سے بہلا ابیان لانے والا ہوں) اور ”انا اول المسلمين“ (میں سب سے
اطاعت کرنے والا اور سر تسلیم خم کرنے والا ہوں) اس ہو دلالت کرتے ہیں ۔

* انسان کی ذہنیت ابسی ہے کہ وہ پست، درماندہ اور محکوم اقوام کے طریقہ زندگی، فلسفہ اور دین کی طرف راغب نہیں ہوتا۔ لہذا مسلمانوں کا فرض ہے کہ علمی اور اقتصادی میدانوں میں دوسروں کے ہجھے نہ رہ جائیں۔ امن وقت مسلمانوں کی درماندگی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ان میں جوش عمل اور محنت کی عادت کا فقدان ہے اور سہل انکاری، کامیابی اور کم ہمتی ان کی خصلت میں شامل ہو گئی ہیں۔ جب تک مسلمان ان تحرابیوں میں گرفتار رہیں گے نہ ان کا اخلاقی معیار بلند ہو گا اور نہ دنیوی فلاح انہیں حاصل ہو گی؛ وہ ست اور درماندہ رہیں گے اور ان کی وجہ سے اسلام بدنام رہے گا اور دوسری اقوام کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے گا، بلکہ خود مسلمانوں کے ذہن اسلام سے ہٹ کر اور راستے تلاش کریں گے۔ یہ ایک ابسی لعنت ہے جس کے زہر آلود اثرات امن وقت بھی اسلامی معاشرے کو برپا دی کی طرف لیتے جا رہے ہیں۔ مسلمان اسلام کا شاهد اس وقت ہو سکتا ہے جب وہ اپنی کوشش، ابثار، اور محنت سے اپنے لیتے ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کے قابل ہو۔

موائع اور ان کا سدباب

بے دنیا خیر اور شر دونوں کا سکن ہے۔ بہان بھلائی اور برا فی دونوں کی طاقتیں موجود ہیں۔ اور دونوں کو اپنے طور پر کام کرنے کی بوری آزادی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دونوں آپس میں نکراتی رہتی ہیں۔ اور ایک دوسرے کو زبر کر لینے کے لیے برابر زور لگاتی رہتی ہیں۔ اس لیے یہ ایک فطری سی بات ہے کہ اسلام کی راہ بھی روکی جائے۔ اور نہ صرف یہ کہ اس کے "شاهدوں" کی شہادت قبول نہ کی جائے بلکہ سرے سے اس شہادت کو برداشت بھی نہ کیا جائے، جیسا کہ ہر دعوت کی تاریخ اور آئئے دن کا مشاہدہ بتاتا ہے۔

اس لیے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان رکاوٹوں کے ہمارے میں امت مسلمہ کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ اسلام اس سوال کے جواب میں ہدایت دبتا ہے کہ رکاوٹ خر کوئی ہوا سے ہٹانے کی بھروسہ کوشش کی جائے، مسلسل اور آخری حد تک کی جائے۔ اس کوشش کو شریعت نے "جہاد فی سبیل اللہ" کا نام دیا ہے۔ جہاد نے لفظی معنی یہ ہیں کہ کسی کام کے لیے اپنی کوششی صرف کی جائیں اور اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے اپنی ساری طاقت لگادی جائے۔

اس لیے " راہ خدا " میں جہاد کرنے کا مفہوم یہ ہوا کہ صرف اللہ کی رضا کی خاطر اس کے دین کی پیروی اور شہادت کا حق ادا کرنے کے لیے وہ سب کچھ مگر ڈالا جانے جو انسان کے بس میں ہو - پوری قوتیں اس مقصد میں صرف کر دینے کا نام جہاد ہے ۔

جہاد فی سبیل اللہ کی شکل کیا ہو ، اس کا تعین حالات ہی کرتے ہیں ۔ حالات کی مناسبت سے جدو جہد کی شکلیں ہی اختیار کی جاتی ہیں ۔ اسلام نے اصولی طور پر مختلف حالات کے لیے تین مختلف شکلیں مقرر کی ہیں یعنی (۱) داخلی جہاد؛ (۲) دعوق اور فکری جہاد؛ (۳) سلح جہاد ۔

۱- داخلی جہاد ۔ داخلی جہاد کا مطلب یہ ہے کہ خود اسلامی معاشرے میں جو برائیاں سر اٹھائیں ان کے خلاف جدو جہد کی جائے ۔ اور برائیوں کو ختم کر کے نیکیوں کو بروان چڑھایا جائے ۔ کیوں کہ بہ اندر کی برائیاں شہادت اسلام کی راہ کی بڑی خطروناک رکاوٹ ہوتی ہیں ۔ اس بارے میں نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے طوبی ارشاد کا ایک حصہ یہ ہے ۔ " بس جس نے ان (نافرمان ؛ اللہ و رسول کے احکام کو پس پشت ڈالنے والوں) کے خلاف اپنے ہاتھوں سے جہاد کیا وہ مومن ہے ۔ اور جس نے اپنی زبان سے جہاد کیا وہ بھی مومن ہے ۔ اور جس نے اپنے قلب سے جہاد کیا وہ بھی مومن ہے ۔ اس کے بعد رانی کے دانے کے براہر بھی ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہوتا " (مسلم بہ حوالہ مشکواہ) ۔ اس حدیث سے یہ دو باتیں واضح ہو جاتی ہیں کہ

(۱) مسلم معاشرے کے اندر جو برائی اور ضلالت بھی پیدا ہو اے
ختم کر دینے کی کوشش " جہاد " ہے ۔

(ب) اس کوشش یا " جہاد " کی عملی حورتیں کیا کیا ہو سکتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا ابعاقی مرتبہ کیا ہے ؟ سب سے افضل صورت تو یہ ہے کہ اس برائی اور ضلالت کے خلاف مناسب انداز میں قوت کا استعمال کیا جائے ، اور اپنے ہاتھوں سے اس کو ختم کر دیا جائے ۔ لیکن ، اگر اس کا اختیار یا اس کی استطاعت نہ ہو تو پھر زبان سے اس کی برائی کو واضح کیا جائے ۔ برائی کو کھلم کھلا برائی کہا جائے ۔ نصیحت کی جانے ، سمجھایا جانے ، آخرت یاد دلانی جانے ،

الله کی ناراضی سے ڈرایا جائے، اور جب ان باتوں سے کام نہ چلے تو موقع و محل کے مطابق زجر و تنبیہ بھی کی جائے۔ لیکن اگر اتنی ہمت بھی نہ ہو تو ایسا تو لازماً ہونا چاہیے کہ اس برائی کے خلاف دل کے چینی سے بھر جائے۔ وہ آنکھوں میں کانٹا بن کر چھوٹی رہے۔ آرزو اور دعائیں کی جائیں کہ بہ برائی جلد سے جلد مٹ جائے۔

سلم معاشرے کو برائیوں سے پاک کرنے رہنے کی بہ تین عملی شکایتیں ہیں۔ اور یہی تین شکایتیں ممکن بھی ہیں۔ ان میں سے ہر شکل "جہاد" ہے۔ کیوں کہ بہ حق کے قابیم رہنے اور اسلام کی شہادت انجام پانے کی کوششوں کا ایک حصہ ہے۔ اور حق کی خاطر کوشش کرنے ہی کا نام "جہاد فی سبیل الله" ہے۔

پھر برائیوں کے مٹانے کی جن کوششوں کو اس حدیث میں جہاد سے تعبیر کیا گیا ہے نہیک انہی کو بعض احادیث میں "تفیر منکر" سے اس طرح موسوم کیا گیا ہے "تم میں سے جس شخص کو کوئی برائی (منکر) نظر آئے تو چاہیے کہ اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے۔ اور اگر اس کے لئے اس کے لیے اپنی زبان سے کام لے اور اگر اس کی بھی جراحت نہ رکھنا ہو تو بہ کوشش اپنے دل سے کرے اور بہ ایمان کا سب سے نجلا درجہ ہے۔" اور ان ہی کوششوں کو "نهی عن المنکر" کے پیروائے میں بھی ادا کیا گیا ہے۔ چنان چہ سورہ "لقمان" میں ہے۔ "وَأَمْرٌ بِالْمَعْرُوفٍ وَنَهَا عَنِ الْمُنْكَرِ" یعنی بھلانی کا حکم دو اور برائی سے روکو۔ ایک حدیث میں ہے:

اثبروا بالمعروف و ننا هوا عن المنکر
برائی سے ایک دوسرے کو تلقین کرو اور
نیک کی ایک دوسرے کو تلقین کرو۔

بہ "جہاد" آمت کا اجتماعی فریضہ ہے۔ اس فریضے سے نہ تو افراد ہری الذمہ ہیں اور نہ ریاست، بلکہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اس عظیم ذمہ داری میں سبھی شریک ہیں۔ سورہ "توبہ" میں ہے:

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلَى بِالْعَصْرِ فَإِنَّمَّا يُعَذَّبُونَ بِمَا فَعَلُوا وَيَنْهَا عَنِ الْمُنْكَرِ

مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کی رفیق ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو بھلانی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔ (التوبہ - ۱۱)

اسلام کے تفاصیل

۵۲۹

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ بھلانی (معروف) کا حکم دینا اور برائی (منکر) سے لوگوں کو باز رکھنا مسلمان کی کبھی نہ ختم ہونے والی صفت ہے ۔ بد ایمان کی فطرت ہے ۔ بد اسلام کا خاصہ ہے ۔ جہاں مسلمان ہو گا پہ کام بھی وہاں ضرور کیا جا رہا ہو گا ۔ اور جو مسلمان ہو گا وہ بد کام ضرور کرے گا ۔

مسلمان جب قوت و اقتدار کے مالک ہوں تو ان کی ذمہ داری بد قرار دی گئی ہے ، یا دوسرے لفظوں میں اسلامی ریاست کی خصوصیت بد ایمان کی گئی ہے ، کہ

الَّذِينَ لَنْ يَكُنْنُوا فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَاتَّوَلَّوْهُ وَأَمْرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ

یہ وہ لوگ ہیں کہ مگر ہم انہیں زمین میں اقتدار بخش دیں تو نماز قایم کریں گے ، زکوٰۃ دیں گے ، بھلانی کا حکم کریں گے اور برائی سے روکیں گے ۔ (الحج - ۲۱)

گویا مسلمان جس طرح اپنی عام اور انفرادی حیثیت میں بد گوارا نہیں کر سکتا کہ برائی ہنسے اسی طرح صاحب اقتدار ہو کر بھی وہ اسے برداشت نہیں کرے گا ۔ بلکہ منکرات کو مٹانا اس کے اقتدار کے بنیادی مقاصد اور فرائض میں شامل ہو گا ۔

۲ - دعویٰ اور فکری جہاد ۔ دعویٰ اور فکری جہاد کا مطلب یہ ہے کہ غیر مسلم ہلقتوں کی طرف سے اسلام کے خلاف جن شبہات کو پیش کیا جائے ، جو اعترافات الٹھائے جائیں ، جو دلیلیں دی جائیں ، ان کا مناسب جواب دیا جائے اور کوئی شبہ یا اعتراض یا دلیل رد کیجئے بغیر ایسی نہ چھوڑی جائے جو اسلام کے چہرے کا باریک سا بھی حجاب بن سکتی ہو ۔ مکتی دور سراسر اس جہاد کا دور تھا ، جب کہ اللہ تعالیٰ نے انہی نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حکم دے رکھا تھا :

فَلَا تُطِعُ الْكُفَّارَ وَمَلَوِّنُكُمْ بِهِ جَهَادٌ إِلَيْهِ

تم ان منکرین اسلام کا کہنا نہ مانو اور
قرآن کے ہی بھی یہے ان سے پورا پورا جہاد
کرنے رہو ۔ (الفرقان ۵۲۰)

قرآن کے ذریعے ہے جہاد کا مطلب خالباً بھی ہو سکتا ہے کہ منکرین اسلام کے سامنے ان قرآنی دلیلوں کو براہم پیش کرنے رہو جو اسلام کی سجائی کو اور

ان کے وجہ انکار کی ہے وقتی کو کھول کر رکھ دیتی ہیں۔ اور اس طرز استدلال سے ان کے موقف کی کمزوری برابر عیان کرتے رہو جو قرآن نے تمہیں سکھا ہے۔ یہ کام ہر سوئے زور کے ساتھ انجام دیتے رہو یہاں تک کہ انہیں اپنے انکار کے حق میں کہنے کے لیے کوئی نام کی بھی معقول بات نہ رہ جائے اور ہر طرف سے گھر کو ان کے منہ بند ہو جائیں۔

نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی اس کام کو ”زبان کا جہاد“ ہی فرمایا ہے۔ چنان چہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد ہے :

جاهدوا المشرکین باموالکم و الفسم مشرکوں سے اپنے مالوں، اپنی جانوں اور و السنتكم (ابو داؤد) اپنی زبانوں کے ذریعے جہاد کرو۔

امن طرح دعویٰ اور فکری جہاد در اصل عقل و استدلال کے اسلحہ سے لڑنے کا نام ہے۔ اور یہ لڑائی اس وقت تک لڑنی چاہیے جب تک کہ اسلام کی مخالفت کے سارے فکری اور استدلائی قلمیں سمار نہ ہو جائیں، چاہے وہ کسی قسم کے ہوں۔ چنان چہ قرآن پاک نے عربوں کی ایک ایک دلیل اور ان کے اٹھائے ہوئے ایک ایک اعتراض کے جس طرح پر بخیر اڑائے وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں، امن کا جال معلوم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے ان فیصلہ کن الفاظ کو من لینا کافی ہے جس کا اس سلسلے میں اعلان فرمایا گیا تھا :

وَلَا يَتُؤْنَكَ بِمَكَلٍ إِلَّا جَهَنَّمَ يَأْتُكُمْ وَأَنْسَنَ تَقْيِيدًا

(اے محمد!) یہ لوگ تھارے سامنے جو لانو کہیجے اونکھا اعتراف بھی لے کر آئیں گے ہم اس کے جواب میں تمہیں ثہیک بات اور بہترین وضاحت وال دلیل ضرور بتادیں گے۔ (الفرقان - ۲۳)

پھر یہ فکری اور استدلائی لڑائی جس انداز سے لڑنا چاہیے اس کے لیے قرآن نے یہ اصولی ہدایت دی ہے کہ ”بحث و مباحثے کا وہ طریقہ اختیار کرو جو سب سے اچھا ہو“ (وجادلہم بالتی ہی احسن)، یعنی یہ کہ وہ خیرخواہانہ، دل نشین، اور مدلل ہو جس میں مخاطب کے ذہن، عقل و فہم، اور نفسیات کی رعایت رکھی گئی ہو۔ پھر اس جہاد کی ایک لازمی شرط ”صبر و استقلال“ ہے تاکہ داعی طعن و تشنج، سخت کلامی، دل آزاری، ایذا رسان اور مخالفتوں کے طوفان میں عالی ضرف، حق پسندی، دل سوزی، معقولیت اور منجدگی کا ثبوت

دے۔ صحابہؓ کرام رضتک کو اللہ تعالیٰ نے خبردار کیا تھا :

**وَتَسْمَعُ مِنَ الْبَنِينَ أَوْ نُوْالِكِتَ مِنْ كَهْلَكَهْ وَمِنَ الْبَنِينَ أَهْلَكَهْ أَتَىٰ كُبِيْرًا فَإِنْ تَصْبِيْفًا وَتَكْفُوا لِكَلَّٰنَ ذَلِكَ
مِنْ عَزْمِ الْأَكْوَهِ**

اور تمہیں اہل کتاب کی طرف سے بھی اور مشرکوں کی طرف سے بھی بہت سی تکلیف دہ باتیں سنی پڑیں گی۔ اگر ایسے وقت تم فی صبر سے کام لبا اور نقویٰ کی روشن پر جسمے دے تو بلا شبہ یہ بڑے حوصلے کی بات ہوگی۔ (آل عمران۔ ۱۸۶)

لیکن اس کا مطلب پست ہمتی، حق سے اعراض اور مصالحت کا خیال ہرگز نہ سمجھنا چاہیے :

فَاصْدِقْ بِهِ مَا تُؤْمِنُ وَأَغْرِضْ عَنِ الْشَّرِكَيْنَ

جس بات کا تمہیں حکم دیا گیا ہے
اے واسکاف طور پر سنا دو اور مشرکوں
کی پرواہ نہ کرو۔ (الحجر - ۹۲)

۳۔ مسلح جہاد - اس کی تیسرا شکل مسلح جہاد ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی راہ روئنے والوں کے خلاف مسلح جنگ کی جائے، اور اس وقت تک کی جائے جب تک کہ وہ اس راہ کو کھلا چھوڑ کر ہٹ نہیں جائے۔ یہ جہاد کی آخری اور افضل ترین شکل ہے کیونکہ سلمان اس میں اپنا مال، وقت، صلاحیت اور بالآخر اپنی جان خدا کی راہ میں صرف کر دیتا ہے۔ عمل طور پر یہ جہاد کی سب سے مشکل اور صبر آزماء قسم ہے، لیکن یہ اسی وقت مسکن ہے جب اسلامی ریاست موجود ہو۔ اور تاریخ کا ہر طالب علم اس حقیقت سے واقع ہے کہ ریاست اور نظام اجتماعی کے تحفظ کے لیے یہ انتہائی ضروری ہے، جیسا کہ (مسلح) جہاد کا حکم دیتے ہوئے واضح کر دیا گیا تھا :

كُلُّهُ عَنِّيْمَ الْمُكَالِ وَهُوَ لَهُ لَكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تَكْفُوا شَهْنَاهُ لَهُ فَوْخَنَهُ لَكُلُّهُ

(سلانو ۱) تم پر لاائی فرض کر دی گئی ہے اگرچہ وہ تم کو ناگوار محسوس ہو رہی ہے۔ لیکن مسکن ہے کہ تم ایک چیز کو ناگوار محسوس کرو اور فی الواقع وہ تسبارے حق میں بہتر ہو۔ (البقرہ۔ ۲۱۶)

یہ قتال اور یہ جہاد اسلام کے حق میں "بہتر" کس طرح ہے؟ اس کی وضاحت آن آپتوں میں ملے گی جہاں جہاد کی غرض و خاتمہ بتائی گئی ہے۔ من وہ "وقاتلوا هم حتی لا تكون فتنة" و "بکون الدین الله" (اود ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ و فساد باق نہ رہ جائے اور دین (اطاعت) اللہ کے لیے ہو جائے)۔ یعنی جنگ کا

حکم اس اپنے دیا گیا ہے تاکہ اللہ کا نام لبئے اور اس کے احکام کے مطابق زندگی سر کرنے کی راہ صاف ہو جانے اور "فتنه" کی حالت ختم ہو جائے۔ "فتنه" قرآن کا اصطلاحی لفظ ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو اسلام کی پیروی کا حق نہ دیا جائے اور انہیں اپنے معبود حقیقی کی بندگی سے روکا جائے۔ ظاہر ہے یہ ابک اپنا ظلم ہے جس سے بڑا اور کوئی ظلم نبی ہو سکتا، حتیٰ کہ خون ناچ کی بھی اس کے مقابلے میں کوئی اہمیت نبی۔ کیوں کہ اگر کسی کی جان کر دیا گیا لیکن اگر کسی سے اس کی "خدا ہرستی" لے لی گئی اور انہی رب کا بندہ بنتے سے اس کو روک دیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اصل زندگی تباہ کر دی گئی، اور اسے آخرت کی اہدی نعمتوں سے محروم کر دیا گیا۔ بلاشبہ دونوں ہی چیزوں نا پسندیدہ ہیں، لیکن جب دونوں میں سے ایک کا انتخاب ضروری ہو تو ایک احمد بھی ہمیں کے مقابلے میں دوسری کا انتخاب نہ کرے گا۔ اسی لیے قرآن اس کی تصدیق اس طرح کرتا ہے۔ "وَالْفَتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ" (فتنه قتل سے بھی زیادہ (بڑی) چیز ہے)۔ ابک اور آپت مسلح جہاد کی ضرورت ہر منفی ہملو سے روشنی ڈالتی ہے:

وَلَوْلَا دُفَّةُ اللَّوْلَأَسْ بَخْضَهُمْ يَعْيَى لَهُنَّ مَنْ صَوَّافِيمُ وَيَبِيَّنُونَ وَصَدَّاقَةً وَمَسِيدُهُنَّ لَكُرْ فَهَا أَسْعَلُهُمُ الْوَكَافِرُ
وَلَيَنْعَصِرَنَّ اللَّهُ مَنْ يَتَّعَذِّرُ

اور اگر افہ بعض لوگوں کو بعضوں کے ذریعے دفع نہ کیا کرنا تو ڈھا دیجے جاتے صوبیے اور گرجے اور کلبے اور مسجدیں جن میں کثرت سے افہ کا نام لیا جاتا ہے۔ اور افہ ان لوگوں کی ضرور مدد کرتا ہے جو اس (کے دین) کی مدد کرنے ہیں (الحج - ۲۰۰)

اس آیت سے اور زیادہ واضح ہو گیا کہ اگر دین کی حفاظت کی خاطر تلوار نہ انہائی جانے اور "فتنه" کی جڑ نہ کاٹ دی جانے تو خود دین کی جڑ کٹ جائے گی۔ فتنہ پسند عناصر خدا کی زمین کو فساد سے بہر دیں گے اور خود خدا کا نام لینا دو بہر کر دیں گے اور خدا ہرستی کے ایک ایک نشان کو مٹا کر دم لیں گے۔ اس لیے دین کی بقا اور تحفظ کے لیے مسلح جہاد کی ضرورت ناگزیر ہے۔

* لیکن یہاں اسی بات کی وضاحت بے محل نہ ہوگی کہ اسلام تبلیغ دین

اسلام کے مقامی

۵۳۲

کے لیے قوت کے استعمال کو منوع قرار دینا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

لَا إِكْرَأَةَ فِي الدِّينِ

دین کے معاملے میں زبردستی نہیں۔ (البقرہ - ۲۵۶)

مسلح جہاد کی اجازت جن مقاصد کے لیے ہے وہ یہ ہیں۔

(ا) دفاعی : یعنی جب دوسرا آپ پر حملہ کرے تو دین اور اسلامی ریاست کے تحفظ کے لیے تلوار استعمال کی جائے۔

(ب) دفع فتنہ : یعنی جب انسانوں ہر ظلم کیا جائے اور دعوت دین کے دستوری اور قانونی راستے بند کر دیے جائیں اور خدا کے بندوں کو انسانوں کی غلامی میں جکڑ لایا جائے تو شر اور فتنے کا مقابلہ کرنے کے لیے اور منکر کے تسلط کو تزویز کے لیے قوت استعمال کی جائے۔

اسلام طاغوت کے بت کو تزویز کے لیے تو قوت استعمال کرتا ہے لیکن کسی انسان یا گروہ کو جبریہ سلطان بنانے کی کلی مخالفت کرتا ہے۔ ہر شخص کے سامنے دین کی دعوت بھی کر دی جائے۔ حق کو باطل سے ممتاز کر دیا جائے اور پھر آخری فیصلہ اس کے ضمیر ہر چہوڑ دیا جائے۔ اسے حق ہے کہ جو راستہ چاہے اختیار کرے۔ ہمارا فرض طاغوت کے بھیلانے ہوئے جالون کو تزویزا، ظلم کے بندھنوں کو کاثنا اور حق کی دعوت پہنچا دینا ہے۔ پھر اگر کوئی اس دعوت کو قبول کرتا ہے تو وہ امت مسلمہ کا جزو ہے اور اگر قبول نہیں کرتا تو اسے اس کا ہی ہوا ہوا اختیار ہے؛ اور اگر وہ اسلامی ریاست اور مسلم معاشرے میں رہتا ہے تو اس کا مال اور اس کی جان ہمارے لیے اتنی ہی محترم ہیں جتنی کسی مسلمان کی۔ ہماری ذمہ داری حق کی دعوت پہنچا دینے کی ہے۔ اور اگر ہم یہ فرض نہیک نہا ک ادا کر دیتے ہیں تو ہم اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں گے۔ لیکن، اگر ہم دین کی دعوت دینا کے سامنے بھی کرنے میں کوتاہی کرنے ہیں تو ہم سے لازماً باز پرس ہوگی۔

مزید مطالعہ کے لیے

مولانا محمد منظور نصانی ، دین و شریعت ' صفحات ۱۹۹ - ۲۲۰ - مکتبہ
الفرقان ، لکھنؤ۔

مولانا صدرالدین اصلاحی ' اسلام ایک نظر میں - اسلامک پبلیکیشنز لمبٹڈ ،
لاہور -

مولانا صدرالدین اصلاحی ، فریضہ' الامت دین - اسلامک پبلیکیشنز لمبٹڈ ، لاہور۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ، شہادت حق - اسلامک پبلیکیشنز لمبٹڈ ، لاہور۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ' الجہاد فی الاسلام - اسلامک پبلیکیشنز لمبٹڈ ، لاہور۔

مولانا ابوالکلام آزاد ' امر بالمعروف و نهي عن المنكر - لاہور۔

اشاریے

- آخرت - تصور اسلامی ، ۲۵۹
 آدم علیہ السلام ، ۶۶ ، ۱۳۳ ، ۲۱۶ ، ۲۲۱ ، ۲۸۰
 آرٹھر کیتھ ، ۱۹۲
 آرنلڈ ، سینٹھیو ، ۵۰
 آریا ، ۵۲
 آزاد ، خلام علی بلکرائی ، ۲۲۳
 آزادی "اجتماع" ، ۲۹۳-۲۹۲
 آزادی - نقل و حرکت ، ۲۹۳-۲۹۲
 آسمہ (حضرت) ، ۲۶۹
 آئیڈیولوژی ، ۳
 ابراهیم علیہ السلام ، ۳۹ ، ۸۰ ، ۶۶ ، ۲۵۶
 ابلیس ، ۱۲۲
 ابن جریر ، ۳۲۰
 ابن حزم ، ۳۶۰ ، ۳۴۲ ، ۲۹۸
 ابن شہاب زہری ، ۳۲۷
 ابن عباس ، ۲۷۶ ، ۳۴۳ ، ۲۴۵
 ابن قیم ، ۲۹۸
 ابن کثیر ، ۳۲۰
 ابن مسعود ، ۲۶۲ ، ۲۶۹
 ابوبکر (حضرت) ، ۲۴۸ ، ۳۶۰ ، ۳۸۰
 ابو جہل ، ۲۵۶ ، ۲۵۳
 ابو حذرف (حضرت) ، ۲۷۶
 ابو سفیان ، ۲۷۹
 ابو طالب (حضرت) ، ۵۱۹
 ابو لہب ، ۲۵۸
 ابو موسیٰ اشعری ، ۳۲۹
 ابو هریرہ ، ۳۲۹
 ابو یوسف ، ۳۲۱ ، ۳۹۵
 آپنیشاد ، ۵۲
- اتباع رسول (صلعم) ، ۲۵۱-۲۵۲
 اجتماع ، تنظیم بندی اور نقل و حرکت کی
 آزادی ، ۳۹۲-۳۹۳
 اجتہاد ، ۳۸۰
 اچھوت ، ۵۳
 احترام روایات ، ۳۱۸
 احرام ، ۳۰۰
 احسان بندگی و روزہ ، ۳۱۹ ، ۳۱۵
 احسان ، ۳۹۶ ، ۳۹۷
 اخلاق - اهل تجارت ، ۳۵۹
 اخلاق - نظریہ اسلامی ، ۲۸۲
 ارتکاز دولت کی ممانعت ، ۳۹۰
 اسطو ، ۳۴۴
 اسپی نوزا ، ۲۶
 اسحاق (علیہ السلام) ، ۲۲۱
 اسرائیل ، ۸۲
 اسکاٹ ، چارلس اینڈرسن ، ۶۵
 اسلام ، ۳-۳ ، ۱۰ - اصلاحی اور انقلابی
 تعریک ، ۱۶۲-۱۶۳ - الہامی نظام ،
 ان کا تقاضا ، ۵۲۳ - اور تھیا کریں ،
 ۱۵۰-۱۵۱ - استیازی خصوصیات اور
 پسندیدہ صفات ، ۳۹۳ - تصور خدا ،
 ۳۱۰-۳۱۱ - اور جمیوریت ، ۳۹۳ --
 تصور کائنات ، ۱۲۸-۱۳۰ - تمدن ،
 ۲۹ - سادہ اور عقلی مذہب ، ۱۵۹
 عقائد ، ۱۶۶-۱۶۹ - عقیدہ آخرت ،
 ۲۹۱ - نصب العین ، ۱۳۵ - نظام حیات ،
 ۱۵۰ - نظریہ اخلاق ، ۳۸۶ - نظریہ
 انفرادی و اجتماعی زندگی ، ۱۲۸ -

- "الفصل بین العال و التعل" ، ۳۶۰
الموافقات ، ۳۸۱
الوهیت ، ۱۸۵، ۱۸۶، ۲۲۲
الہآباد ، ۲۲۳
الہامی تمدن ، ۲۹
الہامی نظام ، ۱۵۰، ۱۵۲-۱۵۳
الیکزانڈر ہملن ، ۳۳۰
ام سلمہ (حضرت) ، ۵۸
امام الحرمین ، ۳۳۶
امالت ، ۳۹۷
امت مسلمہ کی ذمہداریاں ، ۵۳۰
اسریکہ ، ۶۵، ۵۰۳
انبیا علیہم السلام ، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۶
انسان کا نصب العین ، ۱۳۳، ۱۳۴
انسانی زندگی ، ۴۸
انجیل ، ۶۸، ۲۶۰
السن بن مالک ، ۷۲۹
انسان کی جامعیت ، ۲۶۱
انسانی زندگی ، ۴۸
العار ، ۳۲۸
النصار ، ۸۲، ۸۸، ۸۹، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸
انصاف ، یہ لاگ اور یہ سعاویہ ، ۸۹۲
اتفاق ، ۳۶۱
انفرادیت اور اجتماعیت ، من توازن ، ۱۵۶
اوہ نحمدی ، ۲۳۸-۲۳۷
اورنگ زینب عالمگیر ، ۳۲۸
اہنسا ، ۲۹۰
الترنی ، پروفیسر ، ۸۰
ایران ، ۶۸، ۱۳۲، ۲۵۳، ۲۵۶
ایشیائی وسطی ، ۲۵۷
ایمان ، ۱۲۳، ۱۶۲، ۱۶۸، ۱۶۰، ۱۶۳ - ۱۶۳
ابوال ، ۱۱۶، ۱۲۷
اقلیدس ، ۱۶۵
ابعالیات ، ۱۶۹، ۱۷۵، ۱۷۹، ۱۸۰
ابعالیات ، بنیادی - اور عقل ، ۱۶۹
نظریہ حیات ، ۱۵۰، ۱۵۳-۱۵۰
عقلی مقام ، ۱۳۲
معاشی اچول ، ۱۵۲
برکتیں ، ۱۱۵-۱۱۶
میں غقیدہ کا مقام ، ۱۶۹
میں شخصی آزادی ، ۹۹۱
اسلامی تصور آخرت ، ۲۸۳
آم سلمہ (حضرت) ، ۵۰۳
امام الحرمین ، ۱۲۴
کے قیام میں ایمانیات کا حصہ ، ۱۷۵
اسلامی رفاقت - روح ، ۲۰۱
اسلامی ریاست - خصوصیات ، ۳۲۲
اسلامی نظریہ حیات - تعریف ، ۵-۶
اسلامی نظریہ کا علمی مقام ، ۱۱۱
اما" الرجال ، ۲۶۱
اساعبل علیہ السلام ، ۲۲۱، ۲۵۸، ۳۳۰، ۳۳۰
ایوب نحمدی ، ۲۳۸-۲۳۷
اور دائی نمونے ، ۲۵۶
اشتراکیت ، ۸۲، ۸۸، ۸۹، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸
اشراق ، ۳۲۰-۳۲۱
اشراقی تمدن ، ۲۲-۲۶
اشوکا (راجہ) ، ۵۲
اصول فقه ، ۳۲۴، ۳۲۹
اصولی و نظریاتی ریاست ، ۳۲۷
اماعت رسول (مہلمع) ، ۲۵۰، ۲۵۱
افریقہ ، ۵۰۳
افغانستان ، ۲۵۲
افلاطون ، ۳۲، ۲۵۳، ۲۲۰
افبال ، ۳۲۸، ۳۲۵
الغفو ، ۳۶۲
الاحکام فی اصول الاحکام" ، ۳۸۰

اشاریہ

۱۴۶

- | | |
|--|---|
| <p>پائک، روائشنون، ۳۸۳
پروٹشت، ۶۵
بوب، ۷۶۶۲</p> <p>تاریخ کی مادی تعبیر (مارکسی)، ۹۰
تاریخیت، ۲۵۲
تبت، ۳۸۳
تجارت - جائز و مباح، ۳۵۸
تجارتی اخلاقیات کا ضابطہ، ۲۵۴
ترکستان، ۲۸۵
نزکیہ "نفس"، ۳۲۳، ۳۱۰
تعلیم، ۳۲۳ - ۳۲۱
تعلیم، یہ عقیدہ - نتائج، ۳۲۳ - تاریخی روایت، ۳۳۳ - ۳۳۷ - تعمیر کردار، ۳۳۲
- تکمیل حیات، ۳۳۳ - مقصد ۳۲۸؛ اسلامی اصول، ۳۲۲
تعلیمی ارتقا - بر عظیم، ۳۲۷ - ۳۳۰-۳۳۷
تعمیر سیرت، ۳۰۹، ۳۱۶
تعمیر کردار اور تعلیم، ۳۳۲
تفوی، ۳۹۸
تکمیل حیات، ۳۳۳
سم داری، ۳۲۸
تمدن، اشراقی، ۲۶ - ۲۷ - الہامی، ۲۰ - ۲۱ - اقلاب انگریز اثرات، ۲۰ - حسی، ۲۶ - ۲۷ - غنی، ۲۶
- شمع، ۲۹۰ - ۲۸۹
"نزیہ الفرقان"، ۲۵۹
توحید، ۶۶، ۱۵۹، ۱۸۳، ۱۸۲، ۱۸۱، ۲۱۲، ۲۱۳
انفرادی و اجتماعی، ۲۱۱، ۲۱۵
- دلائل، ۲۰۱
توراة، ۶۰، ۶۲، ۶۴
تہذیب، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱ - ۱۷۴
- اسلامی، ۱۷۲ - ۱۷۳ - ایمانات،</p> | <p>برب نمیہ اسلام، ۲۲۱
ایوجین گانی، چارلس، ۱۹۳
باہل، ۶۹-۶۸
ہاسورتہ استو، ۳۲۷، ۲۶۵
باہمی رضامندی، ۳۵۸
بھرقلزم، ۳۶۰
بھرین، ۳۶۰
بخت لصر، ۶۸
بدر، ۵۰۱
بدھا (بودھ)، بدھ مت، ۵۰، ۵۲، ۵۵، ۵۶
برما، ۵۸، ۵۵
برلمی، ضیاء الدین، ۳۳۰
برونو، ۷۳
برہما، ۵۷، ۵۶، ۵۵
برہمن، ۵۵
بصرہ، ۲۶۹
بغداد، ۳۴۶
بریفالٹ، رابرٹ، ۸۸۵
بشریت انبیا، ۲۲۲
بطیموس، ۳۰، ۳۸
بلال (حضرت)، ۹۵
بلبن، ۳۳۲
ہنوامیہ، ۳۳۲
ہنی اسرائیل، ۵۸، ۵۹، ۲۲۶، ۲۲۷
ہنی صفوہ، ۳۲۸
ہنی فزارہ، ۳۲۸
ہنی نصیر، ۳۶۶
بہادر شاہ ظفر، ۳۳۷
بھار (بردونان)، ۳۳۳
بھمنی، ۳۳۲
بھوٹان، ۵۸
پاکستان، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳
پاستیور، ۳۲</p> |
|--|---|

- | | | |
|-------------------------------|--------------|--|
| کتابت، حفاظت، تدوین، | ۳۷۵ | ثانیہ، آرنلڈ ہے، ۱۰۱، ۳۸۱ |
| حرام، | ۳۶۴ | نہیں، ۳۳۰ |
| حرص، | ۳۹۹ | ٹولر، ای-بی، ۵۰ |
| حرمت سود، | ۳۵۶ | |
| حسن، امام (حضرت)، | ۲۷۰ | جاپر بن عبدالله، ۳۲۹ |
| حسن (بصری)، | ۳۷۰ | جاپان، ۹۹، ۳۸۳ |
| حسن، امام (حضرت)، | ۲۷۰ | "جان جہاں" (تاریخ)، ۳۷۲ |
| حو سوی زکواہ، | ۳۶۲ | جان ڈسوی، ۷۷ |
| حقوق العباد، | ۳۹۷ | جان و مال اور ناموس کی حفاظت، ۴۹۰ |
| حقوق اللہ، | ۳۹۷ | جائز و مباح کی تجارت، ۴۵۸ |
| حقوق و فرائض، | ۳۷۸ | جبڑیل (علیہ السلام)، ۳۵۸ |
| حقیق کائنات، | ۲۸ | జذبہ، قوم پرسی، ۸۰ |
| حلال و حرام کی تمیز، | ۴۵۵ | جزمی، ۱۱۲، ۱۸۰، ۹۹ |
| حليمہ سعدیہ، | ۲۶۹ | جزیرہ، ۳۶۱ |
| حزہ (حضرت)، | ۲۷۹ | جمرات، ۳۲۳، ۳۲۱ |
| حمورابی، | ۲۵۶ | جمهوریہ، ۳۲۰ |
| حوالہ، | ۴۳۶، ۱۹۶، ۱۸ | جو اور سنہ وغیرہ کی ممانعت، ۵۵۹ |
| حیرہ، | ۴۹۸ | جوہ، ۶۲ — داخلی، ۵۲ — دعوی اور فکری، ۵۲۹ |
| حیوانی ازدواج کا نظریہ، | ۸۱ | جون، پروفیسر، ۱۹۱ |
| خاتم النبین، | ۲۸۳ | جهانگیر، ۳۳۲ |
| خالد بن سید، | ۳۵۸ | جمینہ، قبیلہ، ۳۴۸ |
| خالد بن ولید، | ۳۹۸ | جن مذہب، ۲۵۹ |
| خاندان، | ۳۱۶ | جیمز، سر جیمس، ۱۸۹، ۱۹۱ |
| ختم نبوب، | ۴۳۶، ۴۳۳ | چن، ۳۳۱، ۳۳۲، ۲۵۲، ۸۷۸، ۵۸ |
| خدیجہ (حضرت)، | ۴۲۵، ۲۷۰ | |
| خطیب بغدادی، | ۳۸۹ | حاکمیت اعلیٰ، ۴۹۷ |
| خلیفہ اللہ، انسان ہے ہیئت، | ۱۳۲-۱۳۳ | حاکمیت جمہور، ۴۸ |
| خیر، | ۳۳۷، ۲۶۹ | حج، ۶۴، ۳۲۹ — مراسم، ۳۳۰ — شان جامیت، ۳۴۳ |
| خیر خواهانہ فضا، | ۳۱۳ | حجر اسود، ۳۳۲، ۲۷۰ |
| دارا، | ۲۵۳ | حجیت حدیث و سنت، ۳۶۲ — اندرونی شہادت، ۳۶۳ — خارجی شہادت، ۳۶۵ |
| داود علیہ السلام، | ۶۱، ۲۷۱، ۳۶۹ | حدود و تعزیرات، ۴۱۹ |
| دروغ گوئی، | ۴۰۰ | حدیث، ۳۶۱، ۴۶۱ |
| دعوت اسلام، | ۱ | ۳۶۷-۱۳۶۵، ۳۶۳، ۳۶۲، ۳۶۱، ۳۶۰، ۳۶۸ |
| دوز بھی میں تعلیمی روایت، | ۴۳۴ | ۴۰۹، ۳۷۸، ۳۷۴، ۳۷۱، ۳۷۰، ۳۶۸ |
| ادوار مابعد میں تعلیمی روایت، | ۴۳۵ | |

- دھرم شاستر ، ۲۵۶
دلیل ، ۲۳۹، ۲۴۰
دیانت ، ۳۵۸
دہن — تعریف، ۲ — قرآن کی زبان میں، ۳۰۲
— نصرت، ۲۲۵ — مفہوم، ۲
دین و دنیا کی وحدت، اسلام میں، ۱۵۸
دیو جانس کلبی، ۲۵۳
- ڈارون، ۳۴، ۳۵، ۸۳، ۸۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷
ڈوسر، ای-ڈی، ۳۲۸
”ذبیل گزٹ“، ۹۸
ڈیمنٹ، پروفیسر، ۳۳۷
ذبیون ہوث، جان، ۲۶۳
- ذخیرہ اندوزی کی معانعت، ۳۵۸
ذرائع علم، ۲۳-۱۸
ذمہ داری کا تصور، ۳۱۵
- راذوبل، ڈاکٹر، ۲۶۰
راک فیلر، ۳۲۶
رام، ۵۵
رانے اور مسلک کی آزادی، ۳۹۱
رسالت، ۶۶، ۱۵۹، ۱۴۲، ۱۴۶، ۱۴۷، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۲۰
۲۲۱، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶
۲۲۷، ۲۲۸
- رسل، الفرد دلام، ۱۹۵
رسول کی اطاعت، ۲۵۱-۲۵۰
مرستہ، نکاح، ۳۱۳
رمضان، ۳۲۰
رواداری، ۳۹۶
روح، اسلامی ثقافت، ۱
روح القدس، ۶۳
روزہ، ۳۲۱-۳۲۲ — اجتماعی اثرات، ۳۱۹
— اجتماعی فوائد، ۳۱۹-۳۲۰ — احسان
بندگی، ۳۱۵ — اطاعت امر، ۳۱۵
- ۳۱۶ — امداد باہمی کی روح، ۲۲۱
— تعدد سیرت، ۳۱۶-۳۱۷ — تقویٰ
اور ہاکیزگی، ۳۲۰ — جماعتی احسان
۳۲۱-۳۲۰ — نبیط نفس، ۳۱۸-۳۱۷
(روس، ۸۲، ۸۴، ۹۳، ۹۸، ۹۹)
رسوو، ۶۸
روم، ۵۳، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۶، ۲۸۵
ربانیت، ۱۵۳، ۲۹۰
رباست — اصول و نظریات، ۳۲۴ — تصور
اشتراکیت، ۹۶ — نظریہ، ۱۰۰-۸
زرتشت، ۲۵۴
زکریا علیہ السلام، ۲۵۸
زکواہ — ۶۴، ۶۵، ۳۲۹، ۳۲۱، ۳۲۰ — امداد
باہمی، ۳۲۳ — معاشی نقطہ نظر، ۲۲۷
— مقاصد، ۳۲۳ — کی مقدار، ۳۲۵ — کے
محارف، ۳۲۶
زندگی اور عقیدہ آخرت، ۱۵۸، ۲۸۶
زندگی کی وحدت، ۸
زندگی کے بنیادی مسائل اور اسلام، ۲۱-۲۷
زہری، این شہاب، ۳۲۲
زبد بن ثابت، ۳۵۸
سادہ اور عقلی مذہب، ۱۵۹
ساروکن، پروفیسر، ۱۰۱
سائبیریا، ۹۹
سائزرس، ۶۸
سچانی اور راست بازی، ۳۹۵
سرافہ بن مالک، ۳۲۸
سرمایہ دار؛ سرمایہ داری، ۹۶
سعد بن ربيع، ۳۲۹
سعد بن عبادہ، ۳۲۹
سقراط، ۲۵۸
سلجوقیہ، ۳۲۶
سنن، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵

- صبر، ۳۹۳
صحابہ، ۳۶۸، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳
صحاب سنه، ۳۸۰، ۳۶۰
صدرالدین، منشی، ۳۳۳
صدقات واجبہ، ۳۶۱
صفا، ۳۲۳
صفات خدا، ۳۲۰، ۳۹
صفات مذمومہ، ۳۹۸
صفہ، ۳۳۳
صیفہ، زکوٰۃ کے کارکن، ۳۲۶
ضبط نفس، اور روزہ، ۳۱۰ - اور نماز، ۳۱۷
طائف، ۳۶۰
طبری، ۳۶۱
طبقاتی نزاع، ۹۰
ظلم، ۳۰۰
عائشہ (حضرت)، ۳۰۸، ۳۰۵، ۳۰۴، ۳۰۳، ۳۰۲
عبادات نہ تصور اسلامی، ۳۰۸ - ۳۰۳
عباس، ۲۸۰، ۲۷۹
عبدالعلی بحرالعلوم، ۳۳۳
عبدالله ابن ربیعہ، ۳۷۹
عبدالله بن عمر العاص، ۳۲۹
عبدالله (حضرت) بن مطلب، ۲۶۹
عنان (حضرت)، ۳۶۱، ۹۵
عثمان بن مالک انصاری، ۳۲۹
عدل اجتماعی کی ضمانت، ۳۶۳
عدل و الصاف، ۳۹۵
عراق، ۳۶۳
عرب، ۲۴۳، ۱۵۹
عرفات، ۳۳۱
عروہ بن زبیر، ۳۲۹
عصمت انبیاء، ۲۲۷
غفو و درگذر، ۳۹۶
صالح علیہ السلام، ۳۵۸
صالح، ملا، ۳۲۸
صحیح الاعشی، ۳۲۹
شاطبی، امام، ۳۸۱
شافعی، امام، ۳۶۱
شام، ۱۴۲، ۲۲۴
شاه جہاں، ۳۳۳
شا نعیانی، ۳۹۹
شہر آبدی اور اسلام، ۴۹۱
شوق اردن، ۶۶
سرک اور کفر، ۲۱۲، ۲۱۵
شریعت، ۳۳۴، ۳۳۲ - اسلامی کے مأخذ، ۳۳۴
عبدالله بن عمر العاص، ۳۲۹ - کا مقصد اور اسکی عدمہ گیری، ۳۲۹
عبدالله (حضرت) بن مطلب - محمدیہ - ۳۳۶ - و
سفہوم، ۳۳۳
شمیٹ، پروفیسر، ۵۲
شودر، ۵۳، ۵۲
شورائی اور جمہوری ریاست، ۳۸۶
شهادت حق، ۵۲۳
شیوا، ۵۵
 صالح علیہ السلام، ۳۵۸
صالح، ملا، ۳۲۸
صحیح الاعشی، ۳۲۹

اشارہ

۶۵۱

- عقل ، ۱۲، ۱۹، ۲۳، ۱۴۱، ۱۴۲، ۲۰۱
عقل کی کسوٹی ، اور بنیادی ایمانیات ، ۱۶۹
عقلی تمدن ، ۲۶
عقیدہ آخرت ، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۸۳، ۱۸۴، ۲۲۱
فارقلیط ، ۷۰
فاطمہ (حضرت) ، ۲۷۰، ۲۷۶
福德 ، ۶۹
فرانس ، ۹۵
فرشته ، ابوالناسم ، ۲۳۶
فرض شناسی ، ۳۰۸
فرعون ، ۲۵۶، ۲۵۷
فرباد ، اعتراض اور تنقید کا حق ، ۲۹۲
فرینک اینڈیلوٹ ، ۲۲۵
فرینک ایلن ، ۱۹۲
فترا ، ۲۲۶
فقہ ، اصول ، ۳۲۹، ۳۸۲ - اسلامی کے
ماخذ ، ۳۲۹
فلسطین ، ۵۹، ۶۰، ۶۱
فلسفہ تناخ ، ۲۸۹
فلسفہ مادیت ، ۲۲
فیروز نغلق ، ۳۲۲
قاسم بن محمد ، ۳۲۹
قانون ، ۳۵۳
قانون و رائت ، ۳۶۱
قانونی مساوات ، ۵۲۲
قرآن ، تدوین ، جمع و ترتیب اور حفاظت ،
۳۵۷ - موضوعات ، مقصد اور انداز
تغاطب ، ۳۵۲ - قرآنی استدلال ، ۲۷۳
قرابت ، ۱۴۳
قرض دار ، ۳۲۷
قرطاجہ ، ۲۵۷
قربش ، ۲۸۳، ۲۵۳، ۲۵۵، ۲۵۵، ۲۶۶، ۲۶۷،
۲۶۸
قطب الدین ایک ، ۳۳۲، ۳۳۴
قوت نافذہ ، ۳۹۰
قول شہادت ، ۵۲۳
قبصر ، ۲۵۷، ۲۵۸
کابن ، انفرید ، ۹۷۱
غزالی ، امام ، ۳۳۲، ۳۵۶، ۳۰۹، ۲۰۹، ۲۳۶
غزنی ، ۳۳۶
غزوہ احمد ، ۲۴۹
غلام السیدین ، خواجہ ، ۳۲۸
خوری ، معزال الدین ، ۳۳۴
خیبت ، ۳۰۱
فارس ، ۳۶۰، ۳۶۱

- سادہ پرستوں کا نقطہ نظر ، ۲۸۳
 مادیت ، فلسفہ ، ۲۲
 مارکس ، ۸۳ ، ۸۹ ، ۹۰ ، ۹۲ ، ۹۳ ، ۹۴
 مارگولس ، ۲۶۳
 مباح ، ۲۲۴
 متولی ، ۶۸
 مجوہی ، ۲۵۴
 محبت ، ۲۵۲-۲۵۳
 حرکات، اسلامی نظام اخلاق کے ، ۲۹۱
 محمد بن قاسم ، ۳۳۷
 محمد تعلق ، ۳۳۹
 محمد شاہ ، ۳۳۲
 محمود غزنوی ، ۳۳۶
 مدینہ ، ۹۲ ، ۲۵۶ ، ۲۶۹ ، ۳۶۰ ، ۳۶۸
 مذہب کا مقابلی مطالعہ ، ۶۲
 مذہب ، ۱۳ - اور تمدن ، ۲۷-۲۸
 مذہب کی ضرورت کا مسئلہ ، ۳۲ - ایک
 بنیادی خلط مبحث ، ۳۵
 مرتضی ، علامہ سید ، ۲۵۹
 مرسن ، ۶۸
 مرسوم ، ۳۲۳
 صریم (حضرت) ، ۶۳ ، ۶۲
 مساکین ، ۳۲۶
 مساوات ، ۳۹۷ ، ۳۱۱
 مسجد، اسلام کا معاشری ہروگرام اور ،
 مسویں ، ۸۸
 مسیح علیہ السلام ، ۶۱-۶۲ ، ۶۸ ، ۶۶-۶۷
 مشرق تقلید ہندی ، ۶۵
 مصر ، ۵۹ ، ۱۳۲ ، ۳۶۱
 مطاع ، نبی بہ حیثیت ، ۲۲۹
 معاذ بن جبل ، ۳۸۱ ، ۳۳۳
 معاشری ارتقا کا تصور ، ۸۳ - کے بنیادی
 اصول ، ۸۵
 کامل زندگی ، ۲۶۳
 کائنات کی حقیقت ، ۲۸
 کائنات و انسان ، ۱۲۷
 کھل وستو ، ۵۵
 کتابت، حفاظت اور تدوین حدود ، ۳۲۵
 کعبہ ، ۱۲۴ ، ۲۳۱ ، ۲۳۲ ، ۲۳۳ - کعبہ
 کی اہمیت ، ۳۳۰
 کنفیوشن ، ۲۵۸ - کنفیوشنی مت ، ۵۰
 کوبرنیکس ، ۲۸ ، ۳۱ ، ۶۳
 کومت ، آگسٹ ، ۳۶ ، ۳۵ ، ۳۳
 کیتوولک ، ۹۵
 کیریل ، الیکس ، ۸۱
 کین ، ایج جی ، ۲۲۲
 نبی ، ۲۶۵
 کلیلو ، ۶۳ ، ۷۳
 گوبنلز ، ۸۷
 کوتنم بدھ ، دیکھئے بدھا
 لاہاس ، ۱۸۸ ، ۳۷
 لادینیت ، ۷۸ ، ۳۰۷
 لوٹھر ، ۷۶
 لاہور ، ۲۸۶
 لوٹا ، ۶۸
 لی کامتے دونوائے ، ۱۹۰
 لیتر، پروفیسر ، ۱۹۰
 لیلز، جے - بی ، ۱۹۳
 مأخذ، اسلامی نظام کے اخلاق ، ۳۸۹
 - شربعت اسلامی کے ، ۳۲۹ - اول
 الكتاب ، ۳۵۰ - دوم ، السنہ ، ۳۶۱
 - سوم ، اجتہاد ، ۳۸۰

اشاریہ

- معاشی اصلاح ، ۱۱۳
 معاشی سماوات ، ۹۲۳
 معاشی اصول ، اسلامی ، ۳۴۹
 معاشی جدوجہد ، ۵۰۳
 معاشیات اور اخلاقی و مذہبی معرفت ، ۳۴۶ ، ۳۴۷ ، ۳۴۸ ، ۳۴۹
 معزالدین غوری ، ۳۴۷
 مذہبی تہذیب کا مستقبل ، ۹۹
 مقدونیہ ، ۲۵۳
 مقربیتی ، ۳۴۹
 مقصد تعلیم ، ۳۴۸
 مقصد حیات کی یادنگاری اور نماز ، ۳۰۸
 مفہوم ، ۳۴۸
 مکمل خاطرہ زندگی ، ۱۵۲
 مکہ ، ۲۵۶ ، ۲۶۹ ، ۳۶۰ ، ۳۶۱
 مل ، جان اسٹورٹ ، ۳۲۲
 ملک شاہ سلجوقی ، ۳۳۱
 ملکیت و تصرف کا حق ، اسلام میں ، ۳۶۲
 مناسک معج کی حکمتیں ، ۴۲۱
 مناظر احسن گیلانی ، ۳۳۸
 منصب رسالت ، ۲۰۸-۲۰۲ ، ۲۳۳-۲۲۴
 منصب نیابت کی حقیقت ، ۱۳۳
 منکر ، ۳۴۶ ، ۳۴۷ - ۳۴۸
 منوجی ، ۲۵۵
 منی ، ۳۲۵ ، ۳۳۱
 موانع ، ۵۳۶
 موسیٰ علیہ السلام ، ۵۲ ، ۵۹ ، ۶۰ ، ۶۴ ، ۶۹
 نمود ، ۶۹ ، ۶۹ ، ۲۲۳ ، ۲۲۴ ، ۲۵۶ ، ۲۵۸
 نوح علیہ السلام ، ۲۲۱ ، ۲۲۴ ، ۲۴۱ ، ۲۵۸
 نیپال ، ۵۸
 نیوٹن ، ۳۴ ، ۳۸
 واجب ، ۳۴۶
 والتر لب مین ، ۳۴۶
 والٹر موبائل ، ۳۴۶
 والٹر ، ۲۶۵
 نبی ، نبوت - بشریت ، ۲۲۲
 نمونہ - تقلید ، ۲۳۱
 جانب اللہ ، ۲۲۳ - شارح کتاب اللہ ، ۲۲۹
 - شارع اور قانون ساز ، عصمت ، ۲۲۵
 - قاضی اور حکیم ، ۲۳۳ - معلم و مردی ، ۲۳۰
 ۲۲۶ - ہر قوم کے لئے ، ۲۲۶
 نپولین ، ۲۵۸
 نجاشی ، ۳۴۸
 نجد ، ۳۶۰
 ندوی ، مولانا سید ابوالحسن علی ، ۱۶
 نصاری ، ۵۲۹
 نصب انبعث ، اسلامی ، ۱۳۶ ، ۱۳۳
 نظام الملک طوسی ، ۳۴۶ ، ۳۴۷
 نظام تعلیم ، اسلام کا ، ۳۱۹
 نظریہ اخلاق ، اسلامی ، ۳۸۶
 نظریہ ارتقا ، ۱۹۳ ، ۱۹۵
 نظریہ تعلیم ، اسلامی ، ۳۱۹
 نظریہ توحید ، ۳۱۲
 نظریہ حیات ، اسلامی ، ۱۵۰-۱۶۲
 نظریہ حیات ، مغربی ، ۶-۵
 نظریہ ریاست ، ۸-۱۰
 نظریہ قدر زائد ، اشتراکیت کا ، ۹۵
 نکولاں میلیرانش ، ۱۸ (حاشیہ)
 نماز ، ۶۴ ، ۳۰۸ ، ۳۱۱ ، ۳۲۲ - اجتماعی
 فوائد ، ۳۱۱ - ۳۱۳ - تعمیر سیرت ، ۳۰۹
 نمود ، ۳۴۶
 نوح علیہ السلام ، ۲۲۱ ، ۲۲۴ ، ۲۴۱ ، ۲۵۸
 نیپال ، ۵۸
 نیوٹن ، ۳۴ ، ۳۸
 واجب ، ۳۴۶
 والتر لب مین ، ۳۴۶
 والٹر موبائل ، ۳۴۶
 والٹر ، ۲۶۵

وائٹ ہبڈا۔ اے - این ۰ ۱۵۰، ۲۲۸	ہندوستان ، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰
وجود ، ۱۰۶، ۲۱۰	۵۰۸، ۳۸۳، ۳۲۹، ۰۲۵۲
وجود باری تعالیٰ ۰ ۱۸۸ - ورآن کا استدلال ، ۱۹۶	عندہ ۲۸۹
وحدت زندگی ، ۸	ہنپال ، ۲۵۳
وھی ، ۲۳-۲۱ - خفی ، غیر متلو ، ۳۶۳	ہود علیہ السلام ، ۲۵۸
- کی حنایت ، ۲۲	ہیرلہ ، ایچ - نیشن ، ۳۲۴
وئسو ، ۵۵	ہیکل ، ۸۳، ۳۳، ۸۳
ولی اللہ ، شاہ ، ۳۲۳، ۳۳۲	یحییٰ علیہ السلام ، ۲۵۸
ولیم ، میور ، ۳۶۰	برو شلم ، ۶۰
وہب بن منبه ، ۳۲۹	یعقوب علیہ السلام ، ۲۵۱، ۵۸، ۵۹، ۲۵۸
وہبیت ، ۲۲۳	یمامہ ، ۳۶۰
وید ، ۵۳	یعن ، ۲۲۲، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۱، ۵۰۱
وین ہارڈ ، جان ، ۹۸	بوحنا ، ۶۸
ھتلر ، ۸۷	بورپ ، ۲۲، ۲۳، ۲۳، ۲۳، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹
ھلسن شاہ ، میڑز ، ۸۲	یوسف علیہ السلام ، ۲۶۹، ۲۶۱
ھکسلے ، جولین ، ۳۷	یوم آخر ، ۱۴۲
ھمام بن منبه ، ۳۲۹	یونان ، ۲۵۳، ۳۲۰، ۳۲۰
ہندو؛ ہندو مت ، ۵۲، ۵۳، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۸	یونس علیہ السلام ، ۲۶۱
۶۷، ۶۸، ۶۹، ۶۶، ۲۲۶، ۲۲۸، ۳۲۸، ۰۲۹	یہود : یہودی : یہودیت ، ۰۵۱، ۰۵۲، ۰۵۳، ۰۵۴
۲۵۶، ۲۲۴، ۱۰۳، ۶۹	

JOIN ME FOR EASY ACCESS TO BOOKS & NOTES



+92-310-545-450-3



Css Aspirants ebooks & Notes

<https://m.facebook.com/groups/458184410965870>



Css Aspirants Forum

<http://t.me/CssAspirantsForum>

Rules of the group.

*No irrelevant text/pic Islamic pic/videos

*No Smiley No Pm otherwise Removed + Blocked

*Personal text w/o Mutual consent Consider harassment.

Separate Group For Females with verification

The CSS Group does not hold any rights on shared the Books & Notes

I,m not Responsible for Copyrights.

This book/notes downloaded from the internet.

JOIN ME FOR EASY ACCESS TO EBOOKS & NOTES



+92-310-545-450-3



Css Aspirants ebooks & Notes

<https://m.facebook.com/groups/458184410965870>



Css Aspirants Forum

<http://t.me/CssAspirantsForum>

Rules of the group.

***No irrelevant text/pic Islamic pic/videos**

***No Smiley No Pm otherwise Removed + Blocked**

***Personal text w/o Mutual consent Consider harassment.**

Separate Group For Females with verification

The CSS Group does not hold any rights on shared the Books & Notes

I,m not Responsible for Copyrights.

This book/notes downloaded from the internet.

ISBN 969-404-001-9